یادگارِ ولی

جلد چہارم
شمارہ سوم و چہارم

بابت
خورداد [illegible]

الموسیٰ

طلبۂ سٹی کالج کا علمی و ادبی رسالہ

(زیرِ نگرانی)

جناب سید محمد اعظم صاحب ایم اے بی ایس سی (کینٹب) معتمد کلیہ

جناب ابوظفر عبدالواحد صاحب ایم اے
لکچرار اردو

جناب سید محمد صاحب ایم اے
مددگار اردو و فارسی

مدیرین

شیخ عبدالصمد متعلم سال دوم — محمد رفیع زمان متعلم سال دوم

مقامِ اشاعت

دفتر الموسیٰ سٹی کالج حیدرآباد دکن

(۱) شیخ عبدالصمد	متعلم سال دوم
(۲) محمد رفیع زماں	" "
(۳) شیخ محمد علی انصاری	" " "
(۴) ریاض احمد	" " "
(۵) سید محمد طالب	" اول
(۶) سید مبارز الدین	"
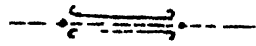
مطبع مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ سے چھپکر دفتر الموسیٰ سٹی کالج سے شایع ہوا

المسمّٰی

یادگارِ ولی

مُرتبہ

سیّد محمد ام-اے (عثمانیہ)

۱۔ طلبۂ کسی کالج کا بہت ماہانہ علمی و ادبی رسالہ "المؤسی" عموماً آذر، اسفندار، خورداد اور شہریور کے پہلے ہفتے میں شائع ہوا کریگا۔

۲۔ اس رسالہ میں عموماً طلبۂ حال و سابق کے دلکش مضامین، افسانے، ڈرامے اور نظمیں شائع ہوا کرینگی نیز کالج کی دلچسپ خبریں پر لطف انداز میں پیش کی جائینگی۔

۳۔ علمی مسائل پر لیکچر اور تعلیمی مضامین بھی وقتاً فوقتاً شائع کیے جائینگے۔

۴۔ دل آزار مذہبی تنقیدوں اور مضامین متعلقہ سیاسیات حاضرہ کو کسی طرح جگہ نہیں دیجائیگی۔

۵۔ رسالہ کی ضخامت عموماً ۱۰۰ صفحات کی ہوگی۔

۶۔ سالانہ چندہ طلبۂ حال سے (۱عہ) اور طلبۂ قدیم سے (۱عے) اور دیگر خریداروں سے (للعہ) لیا جائیگا۔

۷۔ تمام مضامین نظم و نثر مدیر کے نام بھیجے جائیں اور ترسیل زر اور دیگر امور کے لیے منیجر رسالہ سے خط و کتابت کی جائے۔

۸۔ خلاف تہذیب اشتہارات شائع نہیں کیے جائینگے۔

یادگارِ ولی

فہرست مضامین

نشان سلسلہ	عنوان مضمون	صاحب مضمون	صفحۂ قرطاس

یادگار ولی

فہرست تصاویر

یوم ولیؔ

قدیم دکنی ادبیات کے "خاتم الشعراء" اور جدید اُردو شاعری کے "باوا آدم" استاد الاساتذہ ولی اورنگ آبادی کا دو صد سالہ جشن یادگار منانے کی تحریک ابتداءً ہماری بزم ادب کے سرگرم نائب صدر خلیل احمد صاحب آزاد نے اپنی کابینہ کی متفقہ قرار داد کے ساتھ جناب صدر صاحب کلیہ کی خدمت میں پیش کی۔ صاحب معزز کو فن تعلیم کے ساتھ ساتھ ادبیات کا اعلیٰ ذوق اور خصوصاً اُردو زبان و ادب کی توسیع و ترقی کا غیر معمولی خیال ہے انھوں نے اس لائق قدر تحریک کو نہ صرف رسماً منظور فرمایا بلکہ بطور خاص دلچسپی لی اور مندرجۂ ذیل اصحاب کی ایک مجلس انتظامی مقرر فرما کر اس اہم کام کو بعجلت ممکنہ عملی جامہ پہنانے پر زور دیا۔

۱۔ مولوی غلام قادر صاحب بی۔ اے نائب صدر کلیہ
۲۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور ایم۔ اے پی ایچ ڈی (لندن) پروفیسر جامعہ عثمانیہ
۳۔ مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی ایم۔ اے ال ال بی لکچرار تاریخ جامعہ عثمانیہ
۴۔ مولوی ابوظفر عبدالواحد صاحب ایم۔ اے لکچرار اُردو سٹی کالج
۵۔ مولوی عبدالقادر صاحب سروری ایم۔ اے ال ال بی لکچرار اُردو جامعہ عثمانیہ
۶۔ مولوی میر حسن صاحب ایم۔ اے مددگار سٹی کالج
۷۔ خلیل احمد صاحب آزاد نائب صدر انجمن اتحاد سٹی کالج

۸ ۔ سید محمد (معتمد)

اس مجلس نے جناب صدر صاحب کے دولت خانہ پر کئی اجلاس منعقد کیے اور "جشن یادگار ولی" سے متعلق نظام العمل وغیرہ مرتب کیا۔ اس سلسلہ میں بہ اتفاق آرا طے پایا کہ

(۱) حیدرآباد اور بیرون حیدرآباد کے بلند پایہ ادیبوں اور شاعروں کو قلمی اعانت کے لیے مدعو کیا جائے۔

(۲) ہندوستان کے مختلف جامعات کے طیلسانی اور غیر طیلسانی طلبہ سے حسب ذیل موضوع پر مسابقتی مضامین لکھائے جائیں۔ "اردو شاعری میں ولی کا رتبہ"

(۳) قدیم اردو (دکنی) کے نادر اور گراں بہا مخطوطات نیز اس دور سے متعلق قدیم قلمی تصاویر کی ایک شایان شان نمائش کی جائے۔

(۴) سٹی کالج میگزین "الموسیٰ" کا ایک خاص نمبر "یادگار ولی" شائع کیا جائے۔

اس مجلس نے مختلف امور کی انجام دہی کے لیے اساتذہ، طلبہ اور دیگر ہمدردوں کی ذیلی کمیٹیاں بھی مقرر کیں۔ جو حسب ذیل ہیں:-

ادبی کمیٹی

(۱) ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور
(۲) مولوی ابوظفر عبدالواحد صاحب لکچرار سٹی کالج
(۳) " عبدالقادر صاحب سروری لکچرار جامعہ عثمانیہ
(۴) سید محمد (معتمد)

ڈرامے کی کمیٹی

(۱) مولوی ابوظفر عبدالواحد صاحب لکچرار سٹی کالج
(۲) " رکن الدین احمد صاحب قریشی مددگار سٹی کالج
(۳) مسٹر سیون مددگار سٹی کالج
(۴) مسٹر جے ایس بھان مددگار سٹی کالج

نمائش کی کمیٹی

(۱) ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور صدر

(۲) مولوی عبدالرحمٰن شریف صاحب مددگار سٹی کالج

(۳) غلام رسول صاحب مددگار سٹی کالج

(۴) صاحبزادہ محمد علی خاں [illegible] متعلم جامعہ عثمانیہ

(۵) سراج الدین صاحب متعلم سٹی کالج

(۶) سید محمد (معتمد)

ولی کے اس مایۂ ناز شاعر کے دو صد سالہ جشن یادگار کی صدارت کے لیے اس کے شایانِ شان ہستی کا انتخاب کیا گیا۔ عالیجناب نواب سالار جنگ بہادر نے اپنی مشہور خاندانی علم دوستی سے کام لے کر اس ادبی تقریب کی سرپرستی قبول فرمائی اور اس میں اس قدر دلچسپی لی کہ اجلاس اوّل کی صدارت کرنے کے علاوہ اپنے مشہور و معروف خاندانی کتب خانہ سے اردو کے نادر و بیش قیمت مخطوطات اور گراں بہا تصویریں مستعار عنایت فرما کر نمائش کو کامیاب بنایا۔

اردو ادب کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ اس طرح کی کامیاب نمائش منعقد کی گئی جس کی تفصیلی روئداد ایک جداگانہ عنوان کے تحت ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور کے قلم سے جو اس کمیٹی کے صدر تھے آئندہ صفحات میں درج ہے۔

جشن ولی کے دوسرے اجلاس کی صدارت ملک کے مایۂ ناز ہستی اور مشہور علم دوست نواب مہدی یار جنگ بہادر صدر المہام تعلیمات و سیاسیات نے باوجود اپنی غیر معمولی مصروفیات کے قبول فرمائی۔

دونوں جلسوں کے صدر صاحبان نے اس موقع پر جن گراں بہا خیالات کا اظہار کیا ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس قدیم شاعر کی دو صد سالہ یادگار منانے کی ملک کو کتنی ضرورت تھی یہ دونوں صدارتی خطبے آئندہ صفحات میں شائع کیے جا رہے ہیں۔

"یوم ولی" کا پہلا اجلاس ۲۰ فروری سنہ [illegible] بروز چہارشنبہ ۴½ بجے سے شروع ہوا

پہلے نواب سالار جنگ بہادر نے نمائش کا افتتاح فرمایا۔ اس کے بعد مولوی سید محمد اعظم صاحب ام' اے (کینٹب) صدر کلیہ نے خطبۂ استقبالیہ اور ہندوستان کے مختلف علم دوست اصحاب کے پیامات پڑھ کر سنائے۔ پھر صدر عالی قدر کے خطبۂ صدارت کے بعد کلام ولی کی قرأت کے ساتھ جلسہ کا آغاز کیا گیا۔ اس تقریب کے لیے ولی کے وطن اورنگ آباد سے وہاں کے کالج نے بھی نمایندگی کی اور مولوی سید محی الدین صاحب بی' اے (آکسن) صدر اورنگ آباد کالج نے ایک دلچسپ پیام مولوی غلام طیب صاحب بی' اے' بی ٹی لکچرار اُردو کے ذریعہ روانہ کیا جس کو صاحب موصوف نے جلسہ میں پڑھ کر سنایا اور اس کے بعد اپنی ایک نظم بھی سنائی جو خاص اس تقریب کے لیے لکھی گئی تھی۔ مولوی عبدالحق صاحب بی' اے پروفیسر کی تقریر "ولی کی وفات" کے بعد نماز مغرب کے لیے وقفہ دیا گیا۔ اس وقفہ کے بعد حسب ذیل نظمیں اور تقریریں پڑھی گئیں۔

(۱) نظم - مولوی سید سکندر علی صاحب وجد بی' اے' ایچ سی ایس پروبیشنر

(۲) عہد ولی میں دکن کی علمی و تمدنی حالت - از مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی ام' اے ال ال بی لکچرار تاریخ جامعہ عثمانیہ

(۳) نظم - صاحبزادہ مولوی میر محمد علی خاں صاحب میکش (عثمانیہ)

(۴) ولی کی شاعری - مولوی ابوظفر عبدالواحد صاحب ام' اے لکچرار سٹی کالج

ان نظموں اور تحریروں کے درمیان ولی کا کلام تحت اللفظ اور لَے کے ساتھ پڑھا گیا جس کے سننے سے حاضرین پر ایک خاص کیف و اثر طاری ہوتا رہا۔ اس طویل عرصہ یعنی تقریباً چار گھنٹے تک نواب سالار جنگ بہادر نے اس جلسہ کی صدارت فرمائی اور نہایت دلچسپی سے کارروائیوں میں حصّہ لیا۔

"یوم ولی" کا دوسرا اجلاس دوسرے دن صبح میں ۸½ سے ۱۲ بجے تک منعقد ہوا' اس کی صدارت جیسا کہ بیان کیا گیا ہے نواب مہدی یار جنگ بہادر نے فرمائی جنھوں نے پہلے نمائش کو معائنہ فرما کر خاص دلچسپی اور تاثر کا اظہار کیا۔ اس جلسہ میں حسبِ ذیل نظمیں اور تقریریں پڑھی گئیں:-

(۱) نظم - جناب مولوی مخدوم محی الدین صاحب ام' اے

(۲) ولی کا اسلوب شاعری و زبان ۔ جناب مولوی عبدالقیوم خاں صاحب باقی ام، اے
(۳) نظم ۔ جناب مولوی بدرالدین صاحب شکیب بی، اے، ال ال بی
(۴) ولی کا وطن۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور ام، اے، پی، ایچ ڈی
(۵) کلام امجد ۔ حکیم الشعراء مولانا سید احمد حسین صاحب امجد
(۶) ولی سے پہلے دکن کی اردو شاعری ۔ جناب مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی
مددگار دیوانی بلدہ
(۷) نظم ۔ جناب سید عباس حسین صاحب امید
(۸) نظم ۔ جناب مولوی ابوظفر عبدالواحد صاحب ام، اے
(۹) تلامذۂ ولی کا دور ۔ جناب مولوی عبدالقادر صاحب سروری ام، اے، ال ال بی لکچرار اردو جامعہ عثمانیہ

ان دونوں اجلاسوں میں حاضرین کی بڑی تعداد میں تھے۔ اور حیدرآباد کے اکثر عہدہ دار، جملہ ارباب ذوق اور طلبہ شریک رہے۔

اس تقریب کے بعد کئی روز تک مقامی اخبارات اس کی روندادیں اور اس کے متعلق مراسلے شائع کرتے رہے اور اپنے اداریوں میں اس کی کامیابی پر اظہار خیال کیا۔ ان اداریوں اور مراسلوں میں سے ایک کا مختصر سا اقتباس یہاں درج کیا جاتا ہے۔ جس سے پبلک پر اس تقریب کے تاثرات کا اظہار ہوتا ہے۔

(نقل مراسلہ پیام)

دکن کے عظیم الشان شاعر اور اردو شاعری کے باوا آدم کی دو صد سالہ تقریب یادگار نے جوبلی کالج میں شاندار پیمانہ پر منعقد ہوئی، حیدرآباد کی علمی دلچسپیوں میں دو دن تک خاص چہل پہل پیدا کر دی تھی ۔ اس کے اجلاسوں میں سامعین کی کثرت اور ارباب ملک کے علمی ذوق اور احساس بیداری کا خوش گوار نظارہ پیش کر رہی تھی۔ جس طرح یہ جشن اپنے باطن میں ایک شاندار مادی پہلو رکھتا ہے ۔ اسی طرح اس کو ظاہراً بھی شایان شان بنانے کی کوشش کی گئی تھی اور حیدرآباد کے اس قدیم علمی ادارہ کو جس میں دکن کے جگت استاد شاعر کا یادگاری جشن منایا گیا، دلہن کی طرح سنوار کر ایک ہشت مختصر بنا دیا گیا تھا۔

نواب سالار جنگ بہادر کی سرپرستی، مسٹر سید محمد اعظم پرنسپل سٹی کالج، ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور پروفیسر جامعہ عثمانیہ اور مولوی سید محمد صاحب لکچرار سٹی کالج کی مخلصانہ مساعی سے یہ جشن ہر طرح کامیاب اور شاندار رہا۔

اس جشن کی تعمیری کا نمایاں رخ، جو سب سے پہلے دیدہ دل کے لیے باصرہ نواز اور بصیرت افروز ثابت ہوا، وہ دکن کے قدیم قلمی کتابوں اور تصاویر کی گراں مایہ نمائش تھی۔ اس کو دیکھ کر ہمارا یہ احساس قوی تر ہو گیا ہے کہ فرخندہ بنیاد میں قدیم علمی جواہر پاروں کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ اس نمائش میں سب سے بڑا حصہ نواب سالار جنگ بہادر کے علمی خزانے کا تھا جن کی زینت اور شہرت کے بغیر یہ نمائش نامکمل رہتی۔ جامعہ عثمانیہ کے پروفیسر [illegible] حسین علی خاں نائب صدر جامعہ عثمانیہ، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، آغا حیدر حسن صاحب پروفیسر نظام کالج، ڈاکٹر محمد قاسم صاحب اور نصیر الدین صاحب ہاشمی نے بھی اپنے کتب خانوں سے کئی قلمی نسخے مستعار دے کر نہ صرف اپنی علم دوستی کا ثبوت دیا بلکہ ارباب ملک کو اپنے اسلاف کے کارناموں سے واقف ہونے کا سنہری موقع بھی۔

اس نمائش میں تقریباً (۵۰۰) قلمی نسخے موجود تھے۔ ان کے علاوہ ملک اور بیرون ملک کے دوسرے کتب خانوں میں بھی کئی قلمی کتابیں جو خالص دکنی پیداوار ہیں محفوظ ہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بھاگ نگر کی پرانی بستی کا علمی ماحول شروع ہی سے تصنیف و تالیف کا گہوارہ رہا ہے۔

اب وقت آگیا ہے کہ ان کارناموں کو جو شیشوں کی الماریوں میں بطور نمائش بند پڑے ہوئے ہیں، جیسا کہ نواب سالار جنگ بہادر نے ایک جلسہ کی صدارت کرتے ہوئے فرمایا ارباب ملک کے افادہ کی خاطر منظر عام پر لایا جائے۔ ہمیں امید ہے کہ نواب صاحب کی فیاضانہ اعانت اور مولوی سید محمد اعظم صاحب، ڈاکٹر زور اور مولوی سید محمد صاحب کی گرمجوشانہ مساعی سے مستقبل قریب میں اس خوش آئند کام کا آغاز ہو جائیگا۔

اس کے علاوہ نواب مہدی یار جنگ بہادر صدر المہام سیاسیات کی وہ قیمتی تحریک بھی عمل جامہ پہننے کے قابل ہے جو انہوں نے دوسرے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے فرمائی کہ اس قسم کی

آخر میں ہم اپنی محبوب، مادرعلمی کے ہونہار سپوتوں، فاضل اساتذہ اور محترم صدر کو دلی مبارکباد دیتے ہیں کہ ان کی محنتیں چیز ہوئیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر زور کی پرخلوص خدمات اور نواب سالار جنگ بہادر کی مہربانیاں بھی یاد رکھنے کے قابل ہیں۔ "یوم ولی" نے دلوں پر ایسے نقوش مرتسم کیے ہیں جو خوش گوار یاد اور بیداری کی صورت میں ہمیشہ رہینگے۔

کیا ہی اچھا ہو کہ ولی کی طرح دکن کے قدیم شاعروں مثلاً قلی قطب شاہ، وجہی، غواصی، نصرتی وغیرہ کے بھی یادگاری جشن منائے جائیں تاکہ ان کے متعلق بھی ارباب ملک کو واقف ہونے کا موقع ملے۔

سٹی کالج کی اس خوش آئند ابتدا اور یوم ولی کی ہمت افزا کامیابی کے بعد یہ توقع بے جا نہیں فقط اس نمبر میں مذکورہ بالا مضامین کے علاوہ اور بھی کئی دلچسپ مضمون اور نظمیں شریک ہیں جن کے مطالعہ سے اہل ذوق پر واضح ہوگا کہ یہ تقریب کس قدر کامیاب رہی اس سلسلے میں اہل علم حضرات نے جس ذوق دلچسپی کا اظہار کیا اور اس تقریب کے بعد سے ملک میں علمی و ادبی سرگرمیوں میں اضافہ ہوگیا ہے نیز اس کے بعد اندھیری کالج میں جو یوم ولی منایا گیا وہ ظاہر کرتا ہے کہ اپنے قومی ادب اور قومی شاعروں کے ساتھ ہماری دلچسپیاں کسی طرح کم نہیں ہوئی ہیں اور وہ دن دور نہیں جب کہ ہم اپنے ادب کی پوشیدہ قوتوں سے بہ ہمہ وجوہ آگاہ ہو کر دنیا کی دوسری مہذب اقوام کی طرح اس پر بجا ناز کرینگے۔

خطبۂ استقبالیہ

جناب مولوی سید محمد اعظم صاحب ام اے (کنٹب) بی ایس سی پرنسپل سٹی کالج

عالیجناب نواب سالار جنگ بہادر و معزز حضرات!

میں سب سے پہلے آپ کی خدمت میں ہدیۂ سپاس پیش کرتا ہوں کہ آپ نے اپنی گوناگون مصروفیات کو تھوڑی دیر کے لیے بھلا کر اس تقریب سعید میں شرکت کی غرض سے یہاں تک آنے کی زحمت گوارا فرمائی۔ اس شاندار علمی اجتماع کو دیکھ کر ہمارے دلوں میں مسرت کی موجیں اٹھتی ہیں کہ آج کا یہ جلسہ رسمی اور محض ایک دل خوش کن اجتماع نہیں بلکہ ایک ایسا جلسہ ہے جس کی یاد دلوں میں تا دیر قایم رہیگی۔

حضرات! ولی کی عظمت اور اس کے ملہمات شعری کی اہمیت جتانا میرا کام نہیں۔ یہ کام ان حضرات کا ہے جو اس غرض کیلئے بلحاظ موزونیت مختص کردیے گئے ہیں اور جن کے مقالے آپ آج اور کل کے اجلاس میں سنینگے۔ البتہ مجھ جیسا ایک عامی اور اردو ادب کے مشاہیر سے محض سطحی واقفیت رکھنے والا آدمی بھی اس موقع پر کچھ کہنے اور اپنے تاثرات کو پیش کرنے کی جسارت ضرور کرسکتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ اردو ادب کے قدیم و جدید شعراء کی خاصی طویل فہرست میں کوئی شاعر ایسا نہیں جو ولی کی طرح صد فی صد شاعر اور صد فی صد ہندی کہلانے کا مستحق ہو۔ اردو شاعری میں میں ادبا عرض کرونگا۔ مجھے تو یہی عیب نظر آتا ہے اور وہ عیب ہے اس کا یکرخا پن۔

زندگی اور زندگی کی دلچسپیاں اتنی تنگ و محدود نہیں جتنا کہ ہمارے شعرا نے اس کو بنانے کی کوشش کی ہے۔ زندگی کے وسیع میدان میں ہماری تنگ حوصلگی کی ذمہ داری ہمارے شعراء پر عاید ہوتی ہے۔

وہ شگفتگی ، جوشِ عمل ، تنوع اور جذبات انسانی کی جاندار تصویریں اور زندگی کی وہ رنگا رنگ کیفیتیں، جن سے شعرائے عرب یا فرنگی شعراء کا کلام مالا مال نظر آتا ہے، یہ چیزیں ہمارے شعراء کے ہاں عنقا ہیں ۔ اس کی بڑی وجہ غالباً یہ ہے کہ ایک زمانے تک اردو شاعری، فارسی شعراء اور شاعری کی مقلد اور دست نگر رہی ہے ۔ البتہ ولی اس معاملے میں صدفی صد ہندی اور اس کی شاعری زندگی کی عین مین تصویر ہے ۔ یہ مانا کہ خادمِ زبان کی حیثیت سے بھی اس کی عظمت اور برتری مسلم ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ اس کے شاعرانہ کمال اور اس کی ہمہ گیر شخصیت کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے ۔ وہ ایک کامل شاعر اور ایک کامل انسان تھا ۔ ایسے جوہرِ کامل اور باکمال انسان دنیا میں بہت کم پیدا ہوتے ہیں ۔ ان کی دل سے قدر کرنا اور ان کی یاد کو تازہ کرنا صرف اقتضائے بشری اور شرطِ انصاف ہی نہیں بلکہ کسی ملک کی قومی روایات کی شیرازہ بندی کے لیے ازحد ناگزیر ہے ۔ اس موقع پر ایک امر لائقِ اظہار ہے اور وہ یہ کہ استاد ولی کا سنہ وفات ایک حد تک معرضِ بحث میں ہے بعض کا خیال ہے کہ ولی نے ۱۱۱۹ھ میں وفات پائی ۔ بعض نے ۱۱۵۵ھ قرار دیا ۔ اگر آخر الذکر سنہ صحیح ہے تو ہمارا یہ جشن ٹھیک دو سو سال کے اختتام پر منایا جا رہا ہے اگر اول الذکر سنہ درست ہے تو بھی دو سو سال گزر چکنے کے بعد ہم یہ جشن منا رہے ہیں ۔

یہ ہماری خوش بختی ہے کہ جس ساز و سامان اور جس اہتمام کے ساتھ ہم دکن کے جگت استاد کا یادگاری جشن منا رہے ہیں غالباً ہندوستان کے کسی دوسرے مقام کو جو آئندہ استاد ولی کی برسی منانے کا عزم کرے (مثلاً اسمٰعیلیہ کالج صوبۂ بمبئی میں ولی کی دو صد سالہ برسی منائی جانے والی ہے) یہ مواقع اور سہولتیں شاذ و نادر ہی حاصل ہو سکیں ۔ بلدہ حیدرآباد ایک زمانہ تک قطب شاہی سلاطین کی راجدھانی رہا ہے ۔ اس کی شاندار تاریخ اور روادارانہ آئینِ حکومت کے چرچے آج بھی زبان زدِ خاص و عام ہیں، لیکن اس سے کہیں زیادہ مہتم بالشان یادگار اس کی وہ ادبی خدمات ہیں جن کی بدولت اردو زبان میں ادبی زبان بننے کی صلاحیت پیدا ہوئی ۔ چنانچہ اس کا روشن ثبوت وہ انمول قلمی نسخے ہیں جن کی نمائش کا افتتاح آج ان ہاتھوں سے ہوا جن کی رگوں میں میر عالم جیسے مدبر اور سالار جنگ اعظم جیسے محسنِ قوم و ملک کا خون موجزن ہے ۔

یہ ہماری بہت بڑی خوش قسمتی ہے کہ نواب سالار جنگ بہادر دام اقبالہم نے اس موقع پر زحمتِ صدارت قبول فرما کر اپنی آبائی خصوصیاتِ علمی اور خاندانی وجاہت اور معارف نوازی کا ثبوت دیا ہے ۔ نواب صاحب

نے اپنے مشہور معروف کتب خانے سے نہ صرف متعدد نہایت قیمتی اور نادر الوجود قلمی تصاویر و نسخہ جات مستعار مرحمت فرمائے بلکہ اس سے بہت زیادہ اپنے اُن قیمتی مشوروں سے مستفیض فرمایا جو بڑی حد تک اس نمائش کی کامیابی کے ضامن ہیں۔ ان عنایات اور توجہ خاص کا میں اپنی اور اپنے رفقاء کار کی جانب سے پرخلوص ہدیۂ تشکر نواب صاحب کی خدمت میں پیش کرنا اپنا فرض اولین سمجھتا ہوں۔

ہماری مزید خوش قسمتی یہ ہے کہ اس یوم سعید کے دوسرے اجلاس کی صدارت ہماری ریاست ابد مدت کے قابل، علم دوست، اور ہر دل عزیز وزیر تعلیم عالیجناب نواب مہدی یار جنگ بہادر فرما رہے ہیں جن کی ذاتی اور آبائی خصوصیاتِ علمی اور بے لوث ملکی خدمات سے ملک کا ہر طبقہ بخوبی واقف ہے۔

حضرات جس کام کی ابتدا ایسے مبارک ہاتھوں اور خوشگوار حالات میں ہو اس کا انجام لازماً اچھا ہونا چاہیے۔ ع کارے کہ نکو است از بہارش پیداست!

آپ حضرات کا پھر ایک مرتبہ شکریہ ادا کرتے ہوئے میں اپنی یہ کاغذی تقریر ختم کرتا ہوں مجھے امید ہے کہ ولی کا کلام اور ولی کی ولایت کے عالمانہ ذکر و اذکار سے جو ولی کے فاضل پرستار آپ کے سامنے پیش کرینگے آپ مسرور ہونگے۔ آپ کی خوش وقتی ہی ہماری محنت کا صلہ ہے۔ میں اس نمائش کے سلسلہ میں حسب ذیل حضرات کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جن کی اعانت کے بغیر اس کا قیام ہی ممکن نہ تھا۔

عالیجناب نواب سالار جنگ بہادر۔

مولوی آغا حیدر حسن صاحب پروفیسر اردو نظام کالج

مولوی سید علی خاں صاحب پروفیسر مدرسۂ جامعہ عثمانیہ

ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ۔

اور دیگر حضرات

پیامات

(۱)

عالیجناب مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر یمین السلطنت جی، سی، ایس، آئی، ای / کے سی، آئی، ای پیشکار و صدر اعظم باب حکومت سرکار عالی

جناب مولوی سید محمد مہدی صاحب معتمد پیشی عالیجناب مہاراجہ بہادر تحریر فرماتے ہیں:—
عالیجناب مہاراجہ بہادر بالقابہم نے ارشاد فرمایا ہے کہ "کل یوم ولی میں بوجہ ناسازی مزاج شریک نہ ہوسکا، جس کا افسوس ہے۔ بانیان یوم ولی نے دکن اور ہندوستان کے مایۂ ناز اور قدیم شاعر ولی اورنگ آبادی کا دن منانے میں جو اہتمام کیا ہے، وہ قومی بیداری کی علامت اور علمی زندگی کی دلیل ہے۔ اس لیے لائق قدر اور باعثِ مسرت ہے۔ مجھے امید ہے کہ ایسی قومی تقاریب کا سلسلہ جاری رہیگا اور اُن میں میری طرف سے قلمے، درمے شرکت سے مجھے خوشی ہوگی" مورخہ ۴ ہ اسفندار ۱۳۴۶ ف

(۲)

عالیجناب رائٹ آنریبل نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر بی، سی، کے، ٹی / ال ال ڈی صدر المہام فینانس سرکار عالی

"As you Probably know I am still confined to my room and I do not

غالباً آپ کو علم ہوگا کہ ہنوز میری طبیعت نادرست ہے اور میں باہر نہیں نکل رہا ہوں۔

میں شاعر اعظم ولی کے دو صد سالہ جشن یادگار میں شرکت کا بہت خواہشمند تھا مگر میں نہیں سمجھتا کہ میرے معالج مجھے شام میں باہر نکلنے کی اجازت دینگے۔

مورخہ ۲۔ فروری ۱۹۳۰ء

think the doctors will allow me to venture out in the evenings much as I should have liked to have been present at the celebration of the Bicentenary of the Great Poet Wali".

(۳)

عالیجناب نواب سر نظامت جنگ بہادر سابق صدر المہام سیاسیات سرکار عالی

"جشن یادگار ولی" کے موقعے پر آپ حضرات کو مبارک باد کہتے ہوئے اپنا یہ خیال ظاہر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اسلاف کے نمایاں کاموں کی قدر جن لوگوں میں ہوتی ہے وہ ہدایت کے راستے پر آتے ہیں۔ امید ہے کہ آپ کا یہ جلسہ دکنیوں کے اور بھی کاموں کو جو عام نظروں سے پوشیدہ ہوں روشنی میں لانے کا محرک ہوگا۔ مورخہ ۲۶۔ جنوری ۱۹۳۰ء

(۴)

علامہ ڈاکٹر سر اقبال

افسوس کہ میں ایک طویل علالت کی وجہ سے آپ کے جشن میں شرکت سے معذور ہوں۔ آپ نے یوم ولی منا کر شاعر اعظم ولی کی یاد کو جو تازہ کرنے کا ارادہ کیا ہے وہ قومیت اور اسلاف پرستی کا صحیح جذبہ ہے۔ خدا کرے کہ یہ جلسہ کامیاب ہو۔

مورخہ ۲۴۔ جنوری ۱۹۳۰ء

(۵)

جناب سر عبدالقادر ممبر انڈیا کونسل (لندن)

دکن کے شاعر اعظم ولی کے دو صد سالہ جشن یادگار کی کامیابی کے لیے میری مخلصانہ مبارکباد قبول فرمائیے - اپنی غیر حاضری کا افسوس ہے - مورخہ ۲۶ - جنوری ۱۹۳۷ء

(از ذریعہ تار)

"Heartiest good wishes for Successfull celebration of the Second Centenary of Wali, Great Deccan poet. Regret absence".

---

(٦)

نواب صدر یار جنگ بہادر جنرل سکریٹری آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علیگڈہ

"جشن یادگار ولی کامیاب ہو یہ میں تمنا ہے - دل یہ چاہتا ہے کہ موقع ملے تو ولی کے کلام کی بابت کچھ لکھ کر پیش کرسکوں" مورخہ ۱۸ - نومبر ۱۹۳۶ء

(۷)

نواب سر مسعود جنگ بہادر وزیر تعلیمات بھوپال

مائی ڈیر اعظم! دو صد سالہ جشن یادگار ولی میں شرکت کے لیے آپکی عنایت آمیز دعوت کا بہت بہت شکریہ - میں اس میں شرکت کا متمنی ہوں مگر بد قسمتی سے سرکاری مصروفیات کی کثرت مجھے اس پرلطف محفل کی

My Dear Azam

"Very many thanks for your extremely kind invitation to me to attend the Bicentenary of Wali. I wish I could have attended it, but unfortunately owing to heavy pressure of official engagements I am compelled

شرکت سے باز رکھتی ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ یہ میرا کامل ایقان ہے کہ جو لوگ اپنے بزرگوں کی عزت و احترام نہیں کرتے وہ خود بھی دوسروں کی نظروں میں معزز و محترم بننے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی فاضلانہ قیادت و رہنمائی میں یہ تقریب نہ صرف بہت ہی کامیاب رہے گی بلکہ سارے ہندوستان کے تعلیمی اداروں کے لیے ایک قابل عمل نمونہ ثابت ہوگی۔ مورخہ ۲۲۔ نومبر ۱۹۳۶ء

... for the pleasure. You know that it has ever been my firm conviction that those who do not honour their own great men can never succeed in being honoured by others. I am sure that under your able guidance the function will be not only a great success, but also a model example for other educational institutions throughout India to follow."

— (۸) —

علامہ عبداللہ یوسف علی سی، بی، ای، ایم، اے، ایل ایل ایم پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور

آپ نے مجھے اس امر کی دعوت دی ہے کہ میں ولی اورنگ آبادی کے دو صد سالہ جشن یادگار میں جو حیدرآباد میں ۲۰ تا ۳۰۔ جنوری ۱۹۳۷ء کو منعقد ہونے والا ہے شرکت کروں۔ اس دعوت کے لیے میرا شکریہ قبول فرمائیے۔ میں یقین کے ساتھ نہیں بتا سکتا کہ آیا ان ایام میں فارغ بھی ہو سکوں گا یا نہیں۔ اس لیے حاضری سے معافی چاہتا ہوں۔ میں ولی سے متعلق اپنا پیغام بھیج رہا ہوں۔ خداوند کریم آپ کی کانفرنس کو کامیاب کرے۔ میری دلی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

ولی اورنگ آبادی اردو کا قدیم ترین شاعر ہے جس کا تمام کلام ہمارے پاس محفوظ ہے اور وہ اس قابل ہے کہ اس کی یادگار میں مجالس قائم کی جائیں اور اس کی دو صد سالہ برسی منائی جائے۔ یہ فرض اہل دکن پر خاص طور سے عائد ہوتا ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ

ہندوستان والے خاموش رہیں بلکہ تمام اُردو دنیا کو یہ جشن منانا چاہیے۔ مورخہ ۲۳، نومبر ۱۹۳۶ء

(۹)

مولانا سید سلیمان ندوی ناظم دار المصنفین اعظم گڈھ

ولی ہماری زبان کا آدم ہے۔ اس لیے اِس زبان کے سارے بنی آدم کا فرض ہے کہ وہ اپنے اِس محسن اوّل کا شکریہ ادا کریں اور اُس کی برسی کے دن اُس کی مغفرت کی دعا مانگیں۔ آپ کی انجمن مبارک باد کی [illegible] ہے کہ اُس نے اِس فرض کی اہمیت کو دو سو برس کے بعد محسوس کیا۔ ابھی تک ولی کے شعر و ادب اور حسن خدمات و سوانح پر ہماری زبان میں محققانہ مواد فراہم نہیں ہوا ہے۔ امید ہے کہ آپ کی اِس تقریب کے موقعے پر یہ اہم کام تکمیل پا جائے۔ آپ کے کالج کے پرنسپل صاحب کی حسن توجہ کا تمام اہل ادب شکریہ ادا کریں گے۔

مورخہ ۱۷، رمضان المبارک ۱۳۵۵ھ

(۱۰)

جناب علامہ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی

خدائے کریم کو اُس کی قدرت اور فطرت کی گوناگونی سے پہچانا جاتا ہے۔ صوفیائے کرام میں ذات و صفات کا مباحثہ ابھی تک ایک مسئلہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اِس مسئلہ کا اطلاق اگر اُردو کے ارباب بالخصوص شاعری پر کیا جائے تو ہم کو وہ دیوان اور منظوم کلام کے مجموعے جو بہت قدیم زمانے میں مرتب ہوئے لیکن کسی وجہ سے معرض گم نامی میں پڑے رہے، نہ وہ نقد و مقابلہ کے تحت آئے نہ اہالی اُردو اُن سے مستفیض ہو سکے، نظر انداز کر دینے پڑتے ہیں۔ اُردو کا پہلا دیوان یا مجموعۂ کلام جس سے دنیا روشناس ہوئی اور جس کا تتبع اور جس سے استفادہ کیا گیا وہ ولی مرحوم کا ہے۔ اِس لیے میں خلوص دل اور گرم جوشی سے اور فراخدلی سے

حیدرآباد کی سٹی کالج یونین کے کارکنوں کو مبارک باد دیتا ہوں کہ انہوں نے یوم ولی منانے کا عزم کیا۔ میں اس موقعے پر خود حاضر ہوتا اور خالی ہاتھ نہ آتا، لیکن ایسے موانع پیش آئے جنہوں نے معذور کر دیا۔

جس طرح دکن کا خطہ اردو کی تنظیم اور ترقی و توسیع میں بڑا حصہ دار ہے۔ اسی طرح عین مناسب تھا کہ یوم ولی کی تقریب کے انعقاد میں وہیں سے ابتدا کی جائے اور ایسا ہو۔ مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ولی کی وقعت صرف ارباب دکن کے دل میں ہے۔ ولی کی وہ ہستی ہے کہ ہر اہل اردو اس کا نام لے کر قلم کو ہاتھ میں لیتا ہے۔ جہاں تک (وطنیت سے قطع نظر) اردو کا تعلق ہے۔ ہم سب اردو والے ایک ہیں خواہ دکن میں رہتے ہوں یا پنجاب میں۔ ہم اس کلچر کے کلمہ خواں ہیں جو ہندو مسلمان ارتباط سے پیدا ہوئی اور ولی مرحوم جس کا پہلا نمائندہ اور منادی تھا۔

دعا ہے کہ کریم کارساز آپ کی مساعی کو کامیاب اور بارآور کرے۔ مورخہ ۲۲۔ جنوری ۳۵ء

(۱۱)

جناب مولانا عبدالماجد دریابادی

ولی کے مرتبے کو تو کوئی ولی ہی پہچان سکتا ہے۔ البتہ اتنا اندازہ تو ہم نا اہلوں کو بھی کلام دیکھ کر ہوتا ہے کہ شاعر کی نگاہ معرفت بین تھی۔ آپ لوگ قابل مبارک باد ہیں کہ اردو شاعری کے باوا آدم کے فاتحہ کا آپ کو خیال آیا۔ ضرور یادگار منایے اور اس تحریک کو پھیلائیے۔

یہ شرف آپ کی سرزمین کے لیے ازل سے مخصوص ہو چکا تھا کہ اردو شعر و سخن بھی سب سے پہلے آپ ہی کے ہاں جنم لے اور اردو علم و ادب بھی آپ کے شاہ ذی جاہ کے زیر سایہ ترقی کے مدارج طے کرے۔ مورخہ ۲۳۔ جنوری ۳۵ء

(۱۲)

جناب نجیب اشرف ندوی پروفیسر اردو اسمعیلیہ کالج اندھیری

ولی نے دورِ جدید کا آغاز کیا تھا اور مجھے امید کامل ہے کہ یومِ ولی کا جشن اردو ادب کی تاریخ
میں ایک نئے باب کا آغاز کریگا۔ ورنہ زندگی میں وہ ولی تھا تو مرنے کے دو سو سال بعد بھی زندہ ولی کی طرح کشف
وکرامت سے ادبی زندگی میں قوت پیدا کرکے اپنے نام کی عملی صحت کا ثبوت دیگا۔
ولی کو گجرات سے جو وطنی و روحی تعلق ہے، اُس کی بنا پر سارے صوبہ بمبئی کی آنکھیں آپکی
طرف لگی ہوئی ہیں اور ہم لوگ نہایت دلچسپی و توجہ سے دیکھینگے اور اُن سے مستفید ہونگے۔
آپ نے جس اہم کام کی طرف قدم اٹھایا ہے اُس کی ادبی کامیابی کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ خود
ہمارے کالج کی ادبی مجلس مجمع الادب نے یومِ ولی منانا طے کیا ہے۔ اللہ پاک اس شوق کو دوام
کرے۔ مورخہ ۲۲۔ جنوری سنہ ۱۹۳۷ء

(۱۳)

جناب میاں شبیر احمد بی۔ اے (آکسن) بیرسٹرایٹ لا مدیر ہمایوں لاہور

خوشی کا مقام ہے کہ آپ لوگ اردو کے ایک بڑے شاعر کی یادگار میں جشن منا رہے ہیں، خدا آپ کی
مساعی کو کامیاب کرے۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ میں شرکت کا فخر حاصل نہ کرسکونگا۔ ۲۵۔ نومبر سنہ ۳۶ء

(۱۴)

مولانا سید محمد احسن مارہروی پروفیسر اردو مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

باوجود بعد مسافت اور کثرت مصارف میں چاہتا تھا کہ حاضری کی کوشش کروں مگر عین وقت پر

(۱۷)

پیامِ عقیدت بتقریب جشنِ یومِ ولی

منجانب

اہالیانِ طلبا، اساتذہ و کلیۂ عثمانیہ اورنگ آباد

خدا کا شکر ہے کہ ارباب ملک کی توجہ متقدمین کے کارناموں کی طرف مبذول ہو رہی ہے۔ یہ بھی ہمارے آقائے ولی نعمت خسرو دکن کی مسیحائی کا ایک کرشمہ ہے کہ آئے دن قدیم باکمالوں کے شاہکار روشنی میں آ رہے ہیں۔ اعلیحضرت بندگان عالی متعالی مدظلہٗ العالی کی علم نوازی اور شاہانہ کلام کی بلاغت اور فصاحت نے ادب کا جو اعلیٰ ذوق حیدرآباد میں پیدا کر دیا ہے وہ الناس علیٰ دین ملوکہم کا مصداق ہے۔ زبان اردو کے لیے یہ فال نیک ہے کہ اس کے محسنوں کی یاد تازہ کی جا رہی ہے۔ اورنگ آباد کالج نے یوم حالی منا کر سعدی ہند کے ادبی علمی اور قومی خدمات کا اعتراف کیا۔ اہل دہلی نے یوم غالب منایا آج ارباب سٹی کالج اورنگ آباد کے نغزگو باکمال شاعر۔ اردو شاعری کے باوا آدم اور زبان اردو کے سب سے پہلے محسن حضرت ولی کا دو صد سالہ جشن یادگار منا رہے ہیں۔ جامعہ عثمانیہ کی علمی تحریکات میں یہ چیز سب سے زیادہ نمایاں ہے کہ اس نے اپنے علوم اور اپنے باکمالوں کی قدر کا ذوق اہل ملک میں پیدا کر دیا۔

حضرت ولی کا شگفتہ تغزل اور پر کیف اسلوب —— ان کی پاکیزہ سیرت۔ درویشانہ زندگی اور وسیع اخلاق نے اہل ذوق سے خراج تحسین حاصل کیا ہے۔ زبان اردو ان کے خدمات کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ ہماری سوسائٹی کو آج سب سے زیادہ ضرورت ان بزرگوں کی صاف دلی۔ سادگی اور روحانیت کی ہے۔ یہ بزرگ انسانیت کے پیغام بر تھے۔

ان کی پریم الاپون نے ملک میں ایسی خوشگوار فضا پیدا کر دی تھی جس میں ہماری زبان، ادب اور ہند لمانی تمدن کا نشوونما ہوا۔ خدا کرے ان کا زندہ کلام پھر وہی ماحول پیدا کر دے۔ جس میں اتحاد اور اتفاق۔ محبت اور انسانیت کی گرم بازاری تھی۔ ان کی شاعری ان کے دل کی آواز تھی یہ اپنے فن میں ڈوبے رہتے تھے۔ ان کی ذات میں عجیب و غریب کشش تھی۔ اپنے کمال سے یہ عوام و خواص کے دلوں پر حکومت کرتے تھے۔ ہر مذہب و ملت کے افراد ان کی طرف بے اختیار کھنچے چلے جاتے تھے۔ ان کی پاکیزہ سیرت نے شاعری کو چار چاند لگائے اور ان کے ولولہ انگیز ترانوں نے دلوں کو محبت سے بھر دیا۔

اورنگ آباد قدیم زمانے سے جدت و ذہانت کا گہوارہ رہا ہے اس کی خاک میں بڑے بڑے مدبر، شعرا، فضلا اور صوفیائے کرام محو خواب ہیں۔ انہیں بزرگوں کا فیض ہے کہ آج بھی اورنگ آباد کے ویرانے اہل ذوق کی زیارت گاہ بنے ہوئے ہیں۔ اردو کے ہر دور میں اورنگ آبادی مصنفوں اور شاعروں کے نام نظر آتے ہیں۔ اہالیان اورنگ آباد اور اب سٹی کالج کے ممنون ہیں کہ انہوں نے ان کے ایک باکمال شاعر کی یاد دو سو برس کے بعد تازہ کی۔ میں ان کی اور کلیہ عثمانیہ اورنگ آباد کی جانب سے اس ادبی جشن پر جناب مولوی سید محمد اعظم صاحب، جناب مولوی سید محمد صاحب اور دیگر شرکائے کار کو مبارک باد دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ یہ جشن ہر طرح کامیاب رہے اور ان کی مساعی مشکور ہوں۔

سید محی الدین صدر اورنگ آباد کالج

خطبۂ صدارت

عالیجناب نواب سالار جنگ بہادر بالقابہٗ

حضرات!

ہماری زبان کے مایۂ ناز شاعر وَلی اورنگ آبادی کے دو صد سالہ جشن یادگار کی صدارت اور افتتاح نمائش کیلئے آپ نے میرا انتخاب جو فرمایا اس کیلئے میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ جب مولوی سید محمد اعظم صاحب نے جن سے میرے تعلقات قدیمانہ ہیں، اس تقریب کی سرپرستی قبول کرنے کی مجھ سے استدعا کی تو میں کچھ عذر نہ کرسکا کیونکہ میں جانتا تھا کہ وَلی میرے بزرگوں کے وطن اورنگ آباد کا شاعر ہے۔ آپ حضرات سے یہ امر مخفی نہیں کہ میرے خاندان کے افراد کو اورنگ آباد سے قدیمی تعلق رہا ہے۔ چنانچہ میرے اجداد وہیں سے حیدرآباد آئے۔ اگرچہ اس کی موجودہ حالت کو دیکھکر کوئی شخص اس کی قدیم تاریخی عظمت اور رونق کا اندازہ نہیں کرسکتا لیکن یہ مقام شاہی دَور ہی سے عالموں، شاعروں اور بڑے بڑے ارباب فکر و تدبر کا مرکز و مرجع رہا ہے۔

یہ امر ہم سب کیلئے باعث مسرت ہے کہ شعر و سخن میں بھی ہمارے اورنگ آبادہی کے ایک شاعر کی تمام ہندوستان میں قدر و منزلت کی گئی اور اُسی کے وجود سے شمالی ہند خاص کر دہلی میں اُردو شاعری کا آغاز ہوا۔ اسی لیے ہر قدیم تذکرہ نگار اس کو آدم ریختہ یعنے اُردو شاعری کا باوا آدم کہتا ہے۔ اگرچہ ایسا کہنے میں کسی قدر مبالغہ سے کام لیا گیا ہے اور یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ وَلی اورنگ آبادہی اُردو کا پہلا شاعر ہے کیونکہ آپ حضرات ابھی ابھی نمائش میں ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ وَلی سے ڈیڑھ دو سو سال پیشتر کے اردو شاعروں کی بھی کتابیں موجود ہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ شمالی ہندوستان میں فارسی شاعری کا اثر کم کرکے اُردو کو رواج دینے والا وَلی ہی تھا اور اس لحاظ سے وہ آدم ریختہ کہلائے جانے کے یقیناً مستحق ہے۔

ایسی ہستیاں قابلِ فخر ہیں جو اپنے وطن کا نام روشن کرتی ہیں۔ ولی نے اپنے شعر و سخن کے کمال سے دکن کو تمام ہندوستان میں مشہور کردیا اور آنے والی نسلوں کے لیے ایسا سرمایہ چھوڑا جس پر اہلِ ملک بجا طور پر ناز کرسکتے ہیں۔ ہم سب پر بھی فرض ہے کہ اسی طرح اپنے وطن کی خدمت میں اپنی اپنی بساط کے مطابق حصّہ لیں اور ہم سے پہلے جن افراد نے اس کی خدمتگزاری میں اپنی عمریں صرف کردی ہیں اُن کی قدر کریں۔

میں اس [illegible] یاد دیتا ہوں کہ انہوں [illegible] تقریبوں سے علمی و عملی دلچسپیوں، ترقی اور کام کرنے کے وسایل میں اضافہ ہوتا ہے جس کی فی زمانہ [illegible] ہے

لیکن اس اہم اور دلچسپ کام کو اس تقریب کے ساتھ ختم نہ ہوجانا چاہیے۔ بلکہ مناسب یہ ہے کہ اس دوصد سالہ جشنِ ولی کی یادگار میں کوئی مستقل کام آغاز کیا جائے۔ میرے خیال میں اس سے بڑھ کر کوئی اچھا کام نہیں ہوسکتا کہ ولی کے معاصرین اور اُن سے پہلے کے شاعروں اور صاحبانِ تصانیف کی اُردو کتابیں مرتب و شایع کی جائیں۔ ولی سے پہلے بھی ہمارے ملک میں بڑے بڑے شاعر اور انشا پرداز پیدا ہوچکے ہیں۔ خود طبقہ فرمان روایاں میں محمد قلی قطب شاہ اور علی عادل شاہ بلند پایہ شاعر تھے۔ پھر اُن کے دربار کے ملک الشعراء وجہی، غواصی، نصرتی، رستمی، وغیرہ ولی سے کم نہ تھے اور چونکہ ولی سے بہت پہلے گزرے ہیں اس لیے ان کے کلام اور بھی زیادہ قابلِ قدر ہیں۔ بہرحال اس اہم کام کی تکمیل کے لیے ایک جماعت منتخب کرلینی چاہیے۔

مسرت کا مقام ہے کہ خود ہمارے ملک میں اب ایسے اصحاب موجود ہیں کہ ان قدیم کتابوں کے کلام اور زبان کو سمجھ کر اُن کو جدید ترین طریقوں پر مرتب کرکے شایع کرسکتے ہیں۔ میں بھی اس مبارک اور اہم کام میں اس جماعت کا ہاتھ بٹانے تیار ہوں۔

مجھے اس جلسے کے بانی مولوی سید محمد اعظم صاحب کی مستعدی اور توجہ سے یقین ہے کہ اپنی صدارت میں جلد اس کام کو شروع کرادینگے۔

میں سمجھتا ہوں کہ سب سے پہلے [illegible] گزشتہ [illegible] سلاطین دکن [illegible] محمد قلی قطب شاہ، محمد قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ اور علی عادل شاہ وغیرہ شعراء کے کلام کی اشاعت سے اس کام کا آغاز کرنا چاہیے۔ ان کی ترتیب و اشاعت کے بعد دُوسری اہم اُردو کتابیں مثلاً ابراہیم نامہ، علی نامہ، قطب مشتری، پھول بن، خاور نامہ اور گلشنِ عشق وغیرہ بھی چھپوائی جاسکتی ہیں۔ ان سب کتابوں کی اشاعت سے اُردو زبان کے ذخیرہ میں بڑا اضافہ ہوگا اور اُردو بولنے والوں کی معلومات وسیع ہوجائینگی۔

لیکن ہم کو محض قدیم ادبی سرمایہ کی اشاعت ہی تک اپنے کام کو محدود نہ رکھنا چاہیے۔ ہمارے ملک کے نوجوانوں کو جدید طرز کی ضرورتوں اور ملک کے نئے نئے رجحانات و ضروریات کے مطابق بھی تصنیف و تالیف میں حصّہ لینا چاہیے۔ کیونکہ زمانہ ہمیشہ ایک طرح پر نہیں رہتا۔ دنیا بہت کچھ بدل چکی ہے۔ اِن تغیرات کے ساتھ ساتھ ہم کو بھی جدید حالات، رجحانات اور ماحول سے مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ ہمارے ملک میں اب اچھے ادیب اور علمی کام کرنے والے پیدا ہو گئے ہیں اور وہ جدید حالات و خیالات کے مطابق تصنیف و تالیف میں مشغول ہیں۔ یہ نہایت خوش آیند امر ہے اور ظاہر کرتا ہے کہ اِس ملک میں محمد قلی، وجہی، نصرتی وغیرہ نے علم و ادب کی جو شمع روشن کی تھی اور جس کی روشنی ولی اورنگ آبادی نے دُور دُور تک پھیلا دی تھی وہ اب بھی روشن ہے اور مجھے توقع ہے کہ ملک کے ہونہار نوجوان اِس کی روشنی میں اضافہ کرنے اور اپنے بزرگوں کے سرمایہ سے مستفید ہونے میں ہر طرح پیش پیش اور کامیاب رہیں گے۔

خطبۂ صدارت

از

نواب مہدی یار جنگ بہادر ایم اے (آکسن) صدر المہام تعلیمات و معین المہام

حضرات!

آج ہم اپنی زبان کے ایک بہت بڑے شاعر کا دو صد سالہ جشن منا رہے ہیں۔ بنا رہے کہا جائے کہ ولی گجراتی تھے لیکن اس کا جواب یہی ہے، جیسا کہ بعض لوگ اپنی کتابوں پر لکھا کرتے ہیں " اگر کسے دعویٰ کند باطل است" وہ پیدائشی ملکی تھے! ایسے ملکی جن کو کوئی سرٹیفکٹ کی ضرورت نہ ہو۔ یہاں ملکی اور غیر ملکی کا سوال نہیں۔ جو بڑا شاعر ہوتا ہے وہ تمام ملک کی مشترکہ ملک ہوتا ہے اور بڑے شاعر کی خوبیاں سارے عالم میں پھیل جاتی ہیں۔ کسی کے اعلیٰ شاعر ہونے کا معیار یہی ہے کہ اس کا کلام زبان زد خاص و عام ہو جائے۔ ولی کے کلام کا زبان زد عام و خاص ہونا یورپ میں ان کے کلام کے متعدد نسخوں کی موجودگی سے صاف ظاہر ہے۔ یورپ میں کلام ولی کے بہت سے نسخے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ولی دوسری قوموں میں بھی پسندیدہ نظروں سے دیکھے جاتے ہیں۔

حضرات! حیدرآباد نے زبان اردو کی جو حقیقی خدمت کی اس کا مقابلہ ہندوستان کا کوئی اور خطہ نہیں کر سکتا۔ اگرچہ بعض اور صوبوں نے بھی اس کی نشو و نما میں کافی حصہ لیا اور اب بھی اس کی مزید ترقی میں کوشاں ہیں لیکن یہ کوشش پوری زبان پر حاوی نہیں۔ مثلاً صوبہ پنجاب اردو صحافت کی جو خدمت کر رہا ہے اس کا ہم کو بجا طور اعتراف ہے لیکن حیدرآباد اردو کی جو خدمت ہمیشہ سے کرتا آرہا ہے وہ ہر جہتی ہے۔ اردو زبان سلطنت حیدرآباد کی تعلیمی، عدالتی اور سرکاری زبان ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام اور اس کے ساتھ ہی دارالترجمہ کی موجودگی سے جو کام اردو کی ترقی کے لیے ہو رہا ہے وہ اپنی آپ نظیر ہے۔ آج سے پچیس تیس سال قبل اردو زبان میں اعلیٰ علمی کتابیں بہت کم دستیاب ہوتی تھیں لیکن اب دارالترجمہ اور جامعہ عثمانیہ کے سپوتوں کی علمی خدمات کی بدولت ایسی کتابیں ذخیرہ

عام ہو رہی ہیں ۔ یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں ہے کہ حیدرآباد اُردو کی خدمت کر رہا ہے بلکہ وہ اپنی تاریخ کو دہرا رہا ہے آج سے دو تین سو سال پہلے ہی سے حیدرآباد نے اُردو کی خدمت شروع کی تھی اور آج تک بھی وہ اپنے اس قدیم فریضہ کو ادا کر رہا ہے ۔ اُردو کی نشو و نما زیادہ تر دکن ہی میں ہوئی ۔ دکن ہی میں اُردو نظم اور نثر نے جنم لیا ۔ دکن ہی وہ سرزمین ہے جس میں سلطنت گولکنڈہ کی شاہانہ سرپرستیوں کے وجہ سے غواصی جیسے ناظم اور وجہی جیسے نثار پیدا ہوئے جس زمانہ میں شمالی ہند میں عموماً فارسی بولی جاتی تھی اس سے پیشتر یہاں اُردو بولی جانے لگی ۔ اُردو شاعری کا ابھی شمالی ہند میں کوئی ذکر بھی نہ تھا کہ یہاں نظم میں اعلیٰ اعلیٰ کتابیں لکھی گئیں ۔ اُردو نثر کے عام رواج کو تو تھوڑا عرصہ ہوا لیکن دکن میں عرصہ دراز پیشتر ہی سے نثر میں بلند پایہ تصانیف عام ہو گئی تھیں ۔

اُردو کا رسم الخط عربی اور فارسی رسم الخط سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے ۔ کیونکہ ابتدا میں مسلمانوں کی زبان عربی تھی اور ان کی مقدس کتابیں بھی اسی میں ہیں لیکن محض رسم الخط کی عربی رسم الخط سے مشابہت پر اُردو زبان کو مسلمانوں کی زبان سمجھنا صحیح نہیں ۔ اُردو ہندوستانی زبان ہے ۔ اس میں اکثر و بیشتر الفاظ ہندی اور سنسکرت کے ہیں ۔ اس کا صحیح نام "ہندوستانی" ہے اور ہونا چاہیے ۔ "ہندوستانی" تمام ہندوستان کی بولی ہے ۔ اس میں فارسی، عربی، سنسکرت اور ہندی کا اس قدر گہرا میل ہے کہ اب ان کو الگ الگ کرنا محال ہے ۔ اس کی مثال گنگا اور جمنا کی سی ہے ۔ بلاشبہ ان کا پانی سنگم کے قریب تک الگ الگ نظر آتا ہے لیکن آگے جاکر وہ ایک ہی دکھائی دیگا ۔ زبان الفاظ کے ادخال و اخراج سے نہیں بنتی بلکہ استعمال سے بنتی ہے ۔

حضرات ! جس طرح تلسی داس ہندوستان کا بڑا شاعر تھا اسی طرح ولی بھی پورے ہندوستان کا شاعر ہے اس کا کلام سارے ہندوستان کی میراث ہے ۔ ولی کا مرتبہ اُردو میں وہی ہے جو انگریزی میں چاسر کو حاصل ہے تحقیقی و تاریخی نقطۂ نظر سے ولی کا کلام نہایت دلچسپ ہے ۔ اس نے ایسے زمانے میں شعر کہے جب کہ زبان خود ایک انقلابی دور سے گزر رہی تھی ۔ نئی نئی ترکیبیں، نئے نئے الفاظ زبان میں داخل ہو رہے تھے، قدیم الفاظ ترک کئے جا رہے تھے اور فارسی شاعری کے رنگ سے ہٹ کر اُردو شاعری کا ایک نیا رنگ جم رہا تھا ۔ ولی کی شاعری جذبات سے بھری ہوئی ہے، وہ فطرت کا ترجمان تھا ۔ یقیناً اس کا درجہ اُردو شاعری میں نہایت بلند ہے ۔

اساتذہ کی یادگار منانے کی رسم بہت اچھی ہے ۔ شاعری ایک خداداد ملکہ ہے اس لیے ہر شخص شاعر نہیں ہو سکتا ۔ شعر جذبات انسانی کا آئینہ دار ہوتا ہے ۔ ان تقریبوں سے ملک میں اس کا صحیح مذاق پیدا ہوتا ہے ۔ جو لوگ قدرتی شاعر نہیں بلکہ مشاقی سے شاعر بن بیٹھتے ہیں ان سے ادبیات میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا ۔ گل و بلبل کے

افسانے اور معشوق کی کمر کی پیمائش سے زبان اردو کو کوئی فائدہ نہیں۔ اچھے لٹریچر کی یہی پہچان ہے کہ اس کو لوگ ذوق و شوق سے پڑھیں جیسے عمر خیام کی رباعیات، حافظ کی غزلیں اور فردوسی کا کلام کہ یورپ اور امریکہ کی متعدد زبانوں میں ترجمہ ہو کر پڑھا جاتا ہے۔

حضرات! ضرورت ہے کہ ہمارے مشاعروں میں اصلاح کی جائے۔ قدیم ڈگر کو چھوڑ کر نئے راستے بنائے جائیں۔ پرانے راستوں سے ہٹ کر نئے نئے میدانوں میں قدم رکھنا اور ذوق سلیم پیدا کرنا ضروری ہے۔

ہم آج ولی کا یادگار جشن منا کر تاریخ ادب میں ایک اہم باب کا اضافہ کر رہے ہیں۔ امید کہ اس کی یادگار میں ہم اپنے ذوق کی ایسی اصلاح کریں جس سے زبان مالا مال ہو اور اخلاق کو فائدہ پہنچے۔ اس جشن کے سلسلے میں قدیم کتابوں کی جو نمائش کی گئی ہے مجھے اس کے دیکھنے سے بڑی خوشی ہوئی۔ مجھے امید ہے کہ ولی کی یادگار میں اس قسم کی ایک مستقل نمائش قائم کی جائیگی جس سے زبان کو ترقی دینے کی ترغیب و تحریص پیدا ہوتی رہیگی۔

اُستاد الاساتذہ حضرت ولیؔ

—— از ——

حکیم الشعرا حضرت سید احمد حسین صاحب امجدؔ

عزت نہ ملی کبھی مصاحب ہو کر
بے قدر ہوا ہے قلب قالب ہو کر
معیوب ہیں تو عیب بھی زیب سر تاج ہیں
جچتا نہیں سینہ آدمی سے نائب ہو کر

ارشاد ہے جب زاغ تو عنقا ہوگا
پیچھے جب ایک کا تو بیرا ہوگا
گر شیطان بھی ولی ہوتا ہے
پیدا ہی جو ولی ہو تو وہ کیا ہوگا

پڑھتے ہیں ولیؔ شعر ترا عرش پہ قدسی
باہر ہے تری فکرِ رسا حدِّ بشر سے

یہ عجیب بات ہے کہ جو ہستیاں آسمانِ شہرت پر آفتاب بن کر چمکتی ہیں، ان کے حالات و واقعاتِ زندگی کے متعلق مورخوں اور تذکرہ نویسوں میں سخت اختلاف رائے نظر آتا ہے اور بعض وقت ان اختلافات کی کثرت کی وجہ سے اصل حقیقت کا پتہ چلانا مشکل ہوجاتا ہے۔ اُردو شاعری کے ابو الآبا حضرت ولیؔ اورنگ آبادی کا بھی یہی حال ہے ان کی غیر معمولی شہرت اور ان کے کلام کی عالمگیر مقبولیت کے ساتھ ان کے حالات کے متعلق ہمارے تذکرہ نویس بہت ہی مختلف الرائے ہیں ان کے نام، وطن، تعلیم، تربیت، سیر و سیاحت غرض ہر چیز کے متعلق مختلف بیانات پائے جاتے ہیں۔

ان اختلاف بیانیوں کے دو سبب ہیں۔ اوّل یہ کہ اُردو کے تمام تذکرے بارہویں اور تیرہویں صدی ہجری کی تالیفیں ہیں۔ دوسرے یہ کہ ہمارے ان تذکرہ نگار حضرات کے نزدیک حالاتِ زندگی کی تحقیق و صحت کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی بہت

سے تذکرے تو اصل میں بیاضیں معلوم ہوتے ہیں، جن میں مختلف شعرا کے پسندیدہ اشعار نقل کر لیے گئے اور ان اشعار سے پہلے شاعر کا نام اور چند سنی سنائی باتیں اضافہ کر دی گئی ہیں۔ خصوصاً ایسے شاعروں کے متعلق جن کا زمانہ مولف کے زمانے سے بہت پہلے کا ہے، دریافت اور تحقیق سے بہت ہی کم کام لیا گیا۔ اکثر اگلے مصنفوں سے خوشہ چینی کر کے صرف لفظی ہیر پھیر کے ساتھ وہی باتیں بیان کر دیں یا ان سے انحراف کر کے کوئی زبانی روایت نقل کر دی اور اسی کو اپنی تحقیق قرار دیا۔ ولی اورنگ آبادی کے حالات کی نسبت اختلاف بیانیوں کا راز انہی وجوہ میں پوشیدہ ہے۔ میرنے اپنے تذکرۂ نکات الشعرا میں انہیں اورنگ آبادی بتایا، گردیزی نے اسی کو بہ تغیر الفاظ یوں تعبیر کیا کہ "در دکن چہرۂ ہستی بر افروختہ"۔ قایم چاند پوری نے اپنے مخزن نکات میں ان دونوں کے بیان، کے برخلاف فراق گجرات والے قطعہ اور حضرت شاہ وجیہ الدین گجراتی کی مدح اور شہر سورت کی تعریف میں مثنوی دیکھ کر اُن کو گجراتی قرار دیا۔ بعد کے تمام تذکرہ نگاروں کے یہی تین ماخذ ہیں۔ علی ابراہیم خاں مؤلف گلزار ابراہیم، مرزا علی لطف مولف گلشن ہند، فایق مولف مخزن شعرا اور میر حسن نے قایم چاند پوری کے اتباع میں انہیں گجراتی قرار دیا۔ لچھمی نارائن شفیق مولف چمنستان شعرا، حکیم قدرت اللہ خاں قاسم مولف مجموعہ نغز، عبدالجبار خاں ملکاپوری شدومد سے ان کے اورنگ آبادی اور دکنی ہونے کے مؤید ہیں۔

اسی طرح ولی کے نام کے متعلق بھی تذکرہ نویسوں میں سخت اختلاف رائے ہے۔ فتح علی گردیزی، لچھمی نارائن شفیق، قدرت اللہ خاں قاسم نے ان کا نام محمد ولی بتایا ہے۔ خواجہ خاں مولف گلشن گفتار نے ولی محمد لکھا ہے۔ قایم چاند پوری، میر حسن، علی ابراہیم خاں خلیل اور اُن کے اتباع میں مرزا علی لطف اور نساخ نے شاہ ولی اللہ تحریر کیا ہے۔ آب حیات میں شمس ولی اللہ بتایا گیا ہے۔ ان ناموں میں سے اوّل الذکر صحیح ہے۔ کیونکہ اس کے راوی نسبتاً قدیم ہیں اور صاحب تذکرہ سے قربتِ زمانی بھی رکھتے ہیں۔ چونکہ ولی کو حضرت شاہ نورالدین صاحب صدیقی سہروردی سے بیعت تھی۔ وہ صوفی منش

اور فقیر دوست بھی تھے نیز اُن کے کلام سے جو متصوفانہ رنگ ظاہر ہوتا ہے ۔ اُس کی بنا،
پر متوسط عہد کے تذکرہ نگاروں نے اُن کا نام شاہ ولی اللہ سمجھ لیا اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ
اُن کا لقب ہو شمس ولی اللہ کی توثیق کسی اور تذکرہ سے نہیں ہوتی اور یہ غالباً محمد حسین
آزاد کی قیاس ارائی ہے ۔

ولی کی ولادت تقریباً ۱۰۷۹ھ میں ہوئی ۔ اُن کے خاندان، تعلیم و تربیت کا
حال بالکل پردہ تاریکی میں ہے ۔ البتہ اتنا پتہ چلتا ہے کہ بیس برس کی عمر حصول علم کے شوق
میں گجرات کا سفر کیا اور احمد آباد میں حضرت شاہ وجیہ الدین رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ کے
مدرسہ میں تعلیم پائی ۔ وہیں حضرت شاہ نورالدین صدیقی سہروردی سے بیعت ہوئے ۔
احمد آباد کے ایک بزرگ زادے سید ابوالمعالی سے ان کی دوستی ہوگئی جو غیر معمولی
محبت و شیفتگی کے درجے کو پہنچی ہوئی تھی ۔ ابوالمعالی کے ساتھ ہی ولی نے جلوس عالمگیر کے
چوالیسویں سال یعنی ۱۱۱۲ھ میں دہلی کا سفر کیا یہاں حضرت شاہ سعد اللہ گلشن سے جو
دہلی کے بہت بڑے بزرگ اور شاعر بھی تھے ملے میر صاحب اور قائم چاندپوری کا بیان
ہے کہ شاہ صاحب ہی نے ولی کو ریختہ گوئی کی ترغیب دلائی ۔ میر حسن، علی ابراہیم اور
قدرت اللہ خاں قاسم نے لکھا ہے کہ اُن سے استفادہ کیا ۔ فائق نے بھی رسالہ
نورالمعرفت کے حوالے سے لکھا ہے کہ وہ شاہ صاحب کے شاگرد تھے ۔

مصحفی نے اپنے تذکرہ میں ایک جگہ شاہ حاتم کی زبانی یہ بیان دیا ہے کہ "پیش
پیش فقیر نقل می کرد کہ درسن دوئم فردوس آرام گاہ دیوان ولی در شاہ جہاں آباد
آمدہ و اشعار بر زبان خورد و بزرگ جاری گشتہ" بعض لوگوں نے غلط فہمی سے اس کا
یہ مطلب لیا کہ ولی نے دوبارہ محمد شاہ کے عہد میں دہلی کا سفر کیا تھا ۔ وہ اپنے
خیال کی تائید میں یہ شعر بھی پیش کرتے ہیں

اس گدا کا دل لیا دلّی نے چھین جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

لیکن جیسا کہ گلشن گفتار اور چمنستان شعرا سے ثابت ہے کہ یہ شعر ولی کا نہیں بلکہ مضمون کا ہے

لہ مخزن نکات ۔

شاعر کا ہے۔

گلشنِ گفتار سے ولی کا برہان پور جانا بھی ظاہر ہوتا ہے۔ گجرات کے بہت سے شہروں میں ولی کا ضرور قیام رہا ہوگا۔ خصوصاً سورت میں اُن کا قیام، تذکرہ چمنستان شعرا اور اس مثنوی سے بھی ظاہر ہے جو اس شہر کی تعریف میں لکھی گئی ہے۔ شفیق یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ ولی حج بیت اللہ و زیارت حرمین شریفین سے بھی مشرف ہوئے تھے۔

ولی کا سن وفات عام طور پر ۱۱۵۵ھ مشہور ہے۔ مولوی عبدالجبار خاں صوفی ملکاپوری نے مثنوی روضۃ الشہدا کے زمانۂ تالیف وغیرہ کا لحاظ کرکے قیاساً یہ سن اپنے تذکرۂ محبوب الزمن میں درج کیا ہے۔ لیکن کتب خانہ جامع مسجد بمبئی کے ایک قلمی نسخہ میں جو ۱۱۴۱ھ کا لکھا ہوا ہے یہ قطعۂ تاریخ مندرج ہے:۔

مطلع دیوانِ عشق سیدِ اربابِ دل   والیٔ ملکِ سخن، صاحب عرفاں ولی

سال وفاتش خود از سرِ الہام گفت   باد پناہِ ولی ساقیٔ کوثر علی

مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اُردو نے اس قطعہ کی بناء پر ولی کا سن وفات ۱۱۱۹ھ قرار دیا ہے۔ ولی نے احمد آباد میں انتقال کیا اور وہیں نیلی گنبد کے قریب مزار موسیٰ سہاگ اور شاہی باغ کے درمیان مدفون ہیں۔

یوں تو ولی کے بہت سے شاگرد ہونگے۔ اُن کے کلام میں بھی بعض لوگوں کے نام ملتے ہیں۔ لیکن اکثر و بیشتر تذکرے ان کے ذکر سے خالی ہیں۔ صرف گلشنِ گفتار میں ان کے دو شاگردوں اشرف اور رضی کا ذکر ملتا ہے۔ یہ دونوں گجرات کے باشندے تھے اور نواحِ گجرات میں ان کی شاعری کی بہت شہرت تھی۔ اس تذکرہ سے اشرف کا صاحب دیوان ہونا بھی ظاہر ہے۔ نمونتاً اِن دونوں کے جو اشعار دیے گئے ہیں وہ نہ صرف ایک ہی زمین میں بلکہ ایک دوسرے کے جواب میں ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ باہم حریف سخن بھی تھے۔

ولی کی تصانیف میں کلیات کے علاوہ جس میں ہر صنف سخن کا کلام موجود ہے۔ تصوف اور معرفت کا ایک رسالہ موسوم بہ نور المعرفت بھی مشہور ہے۔ اور بعض تذکرہ نویس

نے اس کا ذکر کیا ہے مگر یہ اس وقت تک ناپید ہے۔ مثنوی روضۃ الشہدا کو جو ولی دیلوری کی تصنیف ہے ولی اورنگ آبادی سے منسوب کر دیا گیا تھا اور اس کی وجہ سے اُن کے متعلق بہت سی تاریخی غلط فہمیاں پیدا ہوگئی تھیں مگر اب یہ امر پایۂ تحقیق کو پہنچ چکا ہے کہ مثنوی روضہ الشہدا اُن کی تصنیف نہیں۔

ولی کے کلام کی عالمگیر مقبولیت اور فن ریختہ گوئی میں اُن کی استادی کا اعتراف قدما میں سے بہت سے اساتذہ نے کیا ہے۔ حاتم کہتے ہیں

حاتم یہ فن شعر میں کچھ تو بھی کم نہیں
ولی ولی بھی ہے جہانِ سخن کے بیچ

آبرو کا شعر ہے ؎

آبرو شعر ہے ترا اعجاز پر ولی کا سخن کرامت ہے

میر صاحب نے بھی ایک موقع پر اشارتاً ولی کی استادی کا اعتراف کیا ہے۔

ذیل میں چند مستند نقاد سخن تذکرہ نویسوں کی رائے نقل کی جاتی ہے:۔

۱۔ "کمان پر زورِ سخن را بہ نیروے فکرت کشیدہ و ناوک اندیشہ اش بہ ہدف معنی رسیدہ۔ اشعار آبدارش زیب صفحہ لیل و نہار است و گوشوارہ سخن سرایانِ روزگار"
(تذکرہ فتح علی گردیزی)

۲۔ "سخن این بابا چنان حسن قبول یافت کہ سر بیتِ دیوانش روشن تر از مطلعِ آفتاب گردیدہ و ریختہ را چناں بہ فصاحت و بلاغت می گفت کہ اکثر استادانِ آن وقت زِراہ ہوش شعر ریختہ موزوں می نمودند" (مخزن نکات)

۳۔ "اگرچہ در زمانۂ ماضیہ موزونان این جا شعر را بزبان ریختہ گفتہ اند اما صاحب دیوانے باین متانت و فصاحت از کتم عدم سر نہ کشید و شعرائے سلف چند طوطی شکر

مقالِ بوستانِ سخن دانی اند - لیکن چنین بلبل ہزار داستان بگوش نہ رسید - آرے والی ولایتِ نازک خیالی وشہنشاہ قلمروے خوش مقالی است " (چمنستانِ شعرا)

۴- " از مشاہیر ریختہ گویاں او اوّل کسے است کہ دیوانش در دکھن مشہور و مدون گشتہ " (گلزار ابراہیم)

۵- " تعریفش از احاطۂ تحریر و تقریر بیرون است بنا ریختہ را چنان مستحکم نمود کہ الحال از بلندی طاق سپہر افزود "
(تذکرہ میرحسن)

۶- " کلام حقش بر جملہ سخن پردازان ہندی زبان ثابت است و سخن بر سخنش البلیس منشی و شیطنت - میرخان کمترین کہ خدائش بیامرزد بسیار بموقعہ و بجا گفتہ کہ :-

ولی پر جو سخن لاوے اسے شیطان کہتے ہیں

قطع نظر از زبان دکھنی شعرش بمرتبہ اعلیٰ شاعری و سخنش بدرجۂ علیائے سخنوری است "

(مجموعہ نغز قدرت اللہ خاں قاسم)

۷- " اول کسے کہ آئینہ سخن ہندی را بہ صیقل گری نظم جلا بخشید و ریختہ را بہ گرمی بلاغت نشانید ، ہمین است - درین باب سرگروہ و مقدمۃ الجیش جمیع شاعران ہند و گجرات است " (مخزن شعرا فائق)

۸- غزل گوئی کے اعتبار سے ولی اول درجے کے شاعر تھے - جو غزل گوئی کے تقاضے تھے اُن سے ولی کو پوری اطلاع حاصل تھی - چنانچہ غزل گوئی میں بیشتر شاعری کا داخلی پہلو

پیش نظر رکھتے ہیں۔ اس لیے اُن کی غزل سرائی پر تاثیر نظر آتی ہے۔ ولی کے کلام میں دَرد، سودا، میر، مصحفی، ذوق، ناسخ، آتش سب کے رنگ بکثرت موجود ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ولی کس قدر قوی الدماغ شاعر تھے۔ جو ہر نوع کے کلام پر قدرتِ تامہ رکھتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ مابعد کے جتنے متغزلین موجد لسی طرز کے کہلاتے ہیں درحقیقت اسی پیر طریقت کے مرید ہیں"

(کاشف الحقائق امداد امام اثر)

۹۔"شاعر بلند مقام تھا۔ اول زبان ہندی میں دیوان اس عزیز نے جمع کیا ہے اور نظم ریختہ کو سرزمین دکن میں رواج اس نے دیا ہے۔ شعرائے دکن میں مشہور و ممتاز ہے اور اپنے معاصروں میں سر بلند و سرفراز"

(گلشن ہند مرزا علی لطف)

۱۰۔" اگرچہ بہ زبانے کہ او دارد و در زبانے کہ دریں زمان رائج فرق خورشید و ماہ و شب و روز است گویا می توان گفت کہ این ہر دو یک زبان نیست اما بہ ہمہ حال حق اُستادی وے بر جمیع اہل نظم ریختہ ثابت باشد و عدول بعید۔ (گلشن بے خار شیفتہ)

۱۱۔"ان کی تصانیف بہ اعتبار قدامت اور نیز بہ اعتبار زبان بہت دلچسپ ہیں۔ عبارت آسان اور سہل ہے۔ شعرائے مابعد نے ان کا تتبع کیا ہے اور ان کی شاعری سے شمالی ہند میں شعر کی بنیاد مضبوط ہوئی۔ سادگی، سلاست اور ترنم ان کے کلام کے جوہر ہیں۔ اشعار میں روانی بے تکلفی اور

آمد ہے اور ضایع بدایع بکثرت نہیں ہیں۔ بعض شعر تو ایسے
صاف ہیں کہ بالکل زمانۂ حال کے معلوم ہوتے ہیں"
(تاریخ ادب اُردو سکسینہ)

وَلی اورنگ آبادی

از

مولوی سید سکندر علی صاحب وجد بی۔ اے (عثمانیہ) ایچ سی ایس پروبیشنر

اُلٹ دی گردشِ ایام نے بزمِ قطب شاہی
بجھا دی قصرِ عادل شاہ کی شمعِ سحر گاہی

محبت سوگ میں تھی، حسنِ فطرت بے سہارا تھا
نظر گھائل ہوئی جاتی تھی وہ قاتل نظارہ تھا

گریباں چاک تھے گل، گردِ آتشناک اُڑتی تھی
صبا مجروح تھی، سارے چمن میں خاک اُڑتی تھی

صدائے بربطِ دل کون سنتا زار نالی میں
کمالِ فن نگوں سر تھا عروجِ بے کمالی میں

فنا کی گود میں سستا رہا تھا نغمۂ وجہی
ڈبو دی چرخ نے بحرِ عدم میں فکرِ غواصی

صدائے نُصرتی کی گونج بھی گم ہو گئی آخر
جگایا نیند کے ماتوں کو اور خود سو گئی آخر

گلوں سے حالِ بُلبل پوچھنے والا نہ تھا کوئی
محبت کی پہیلی بوجھنے والا نہ تھا کوئی

نہ تھا کوئی صبا سے حالِ دلبر پوچھنے والا
ہوا میں زلفِ مشکیں کا تعطر ڈھونڈنے والا

کوئی موتی لٹاتا تھا نہ اپنی چشمِ پرنم سے
کوئی لیتا نہ تھا افتادگی کا درس شبنم سے

ترے دم سے ولی باغِ سخن میں بہار آئی
خزاں منظر چمن میں گل کھلے بانگِ ہزار آئی

تری آواز پہ ہر اہلِ محفل سر کو دھنتا تھا
دکن کا ذکر کیا، ہندوستاں خاموش سنتا تھا

ترے شعروں میں گو نکہت بسی ہے موجۂ گل کی
کسک ہے ان میں پوشیدہ دلِ صد چاکِ بلبل کی

سنایا اپنی لے میں جب وفا کا تو نے افسانہ
بھگوئی شمع نے اشکوں سے شب بھر خاکِ پروانہ

ترے نغمے نے پھر سے بزمِ اہلِ شوق گرما دی
تری میٹھی زباں نے عشق کی تقدیر چمکا دی

گرایا جس نے نظروں سے جمالِ ترک[1] "شیرازی"
"دکن کی سانولی"[2] سے سب نے دل کی ہار دی بازی

---

[1] فارسی ۔ [2] اُردو ۔

حلسه ول یوم وں

وَلی کا وطن

(از)

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ایم اے (عثمانیہ) پی ایچ ڈی لندن پروفیسر جامعہ عثمانیہ

خود وَلی نے کیا خوب لکھا ہے ؎

ہرگز وَلی کے پاس تم باتاں وطن کی مت کہو
جو نیستی کے کوچہ تیں ہے اسکوں وطن سوں کیا غرض

ممکن ہے ولی کو اپنے وطن سے کوئی غرض باقی نہ رہی ہو مگر آج ہم ان کی طبیعت کے خلاف ان کے وطن کی باتیں کرنے پر مجبور ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر خود وَلی اپنے وطن سے اتنی بے اعتنائی یا بے غرضی ظاہر نہ کرتے تو آج ہم کو ان کے وطن پر گفتگو کرنے کی ہمت ہی نہ اٹھانی پڑتی اور نہ اردو کے اکثر تذکرہ نگاروں اور مورخوں کو ایک دوسرے کے خلاف بیانات اور متضاد رائیں پیش کرنے کا موقع ملتا۔

یہ عجیب بات ہے کہ اکثر عظیم الشان اور مشہور و معروف ہستیوں کی نسبت آئندہ نسلوں کو بہت کم معلومات حاصل ہوتی ہیں اور جو معلومات ہوتی ہیں وہ بھی ایسی گومگو کہ ان کے متعلق مورخین و محققین میں رفتہ رفتہ اختلاف آرا پیدا ہو جاتا ہے! [illegible] وَلی اورنگ آبادی کی ہستی اتنی مشہور و معروف اور اہم ہے کہ اردو ادب کا کوئی تذکرہ ان کے ذکر سے خالی نہیں۔ تمام اردو دنیا ان کو اردو شاعری کا باوا آدم مانتی ہے اور ان کی یہاں تک تعظیم کی جاتی ہے کہ تقریباً سو سال قبل ہی شمالی ہند کے ایک شاعر میر خاں کمترین نے لکھ دیا تھا کہ ع ولی پہ جو سخن لاوے اُسے شیطان کہتے ہیں۔

لیکن یہ فطرت کی عجیب ستم ظریفی ہے کہ ان کے نام، وطن، اور تاریخ پیدائش و وفات کے متعلق ہمیشہ جھگڑا رہا اور بحثیں ہوتی رہیں۔ خدا خدا کر کے گذشتہ آٹھ دس سال کی ادبی تحقیقات نے یہ واضح کر دیا تھا کہ ان کا نام ولی محمد تھا، اورنگ آباد میں پیدا

ہوئے تھے، عنفوانِ شباب میں تکمیلِ تعلیم کے لیے احمد آباد گئے تھے، ۱۱۱۲ھ میں شاہجہاں آباد کا سفر کیا اور ۱۱۱۹ھ میں احمد آباد گجرات میں انتقال کیا۔ لیکن حال ہی میں انجمن ترقی اردو کی طرف سے (۱۹۳۲ء میں) گجرات کے اُردو شاعروں کا ایک تذکرہ مخزنِ شعرا شایع ہوا ہے جو اگرچہ ولی کی وفات کے ڈیڑھ سو سال بعد لکھا گیا ہے لیکن اس کے مصنف نے جراتِ رندانہ سے کام لیکر ولی کو گجراتی قرار دیا ہے اور اس کے ثبوت میں محض یہ لکھا ہے کہ:۔

محققانِ این فن را درحالِ او اختلاف است کہ آیا ولی از گجرات است و یا از دکھن۔ اما براقم اثم از زبانیِ ثقاتِ بلدۂ احمد آباد بہ ثبوت چنان پیوستہ کہ شاعرِ مزبور از بلدۂ مسطور بودہ، و سالہا بدکھن ہم گذرانید وخطا کرد میر تقی میر کہ در تذکرۂ خود اورا از اورنگ آباد نوشت۔ (مخزنِ شعرا صفحہ ۱۱)

اس کتاب کو انجمن ترقی اُردو کے مستعد معتمد اور اُردو زبان کے بڑے خدمتگذار مولوی عبدالحق صاحب نے مرتب کرکے شایع کیا ہے اور اپنی طرف سے اِس پر ایک دلچسپ مقدمہ بھی لکھا ہے۔ لیکن اس مقدمہ میں اس بحث کے متعلق کوئی قطعی رائے نہیں ظاہر کی گئی اور یہ لکھکر اس مسئلہ کو ادھورا چھوڑ دیا ہے:۔

"یہ اختلاف ایک مدت سے چلا آرہا ہے اور اس وقت اس کا قطعی فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے"
(مخزنِ شعرا صفحہ ۵)

ان دونوں بیانات کی وجہ سے اندیشہ پیدا ہوگیا کہ ولی کے وطن کے متعلق کوئی غلط فہمی نہ رائج ہوجائے۔ اس لیے آج کی صحبت میں اس مسئلہ کی یکسوئی کی خاطر مختلف براہین و شواہد کے ذریعہ سے یہ ثابت کیا جائیگا تاکہ ولی اصل میں اورنگ آباد کے رہنے والے تھے، آخر عمر میں احمد آباد میں قیام پذیر تھے اور وہیں وفات پائی اور مدفون ہوئے۔

اس مضمون میں سب سے پہلے ولی کی طبیعت کے رجحان اور حالاتِ زندگی کو پیشِ نظر رکھ کر یہ بتایا جائیگا کہ وہ کیوں اور کس طرح اورنگ آباد کو چھوڑ کر گجرات کے دلدادہ ہوگئے تھے۔ اور بعد میں عہدِ ولی کے شعرائے گجرات و دکن کے کلام نیز دیگر ذرایع سے ایسے قطعی شواہد پیش کیے جائیں گے جن سے واضح ہوگا کہ ولی دکنی شاعر تھے نہ کہ گجراتی، یہ اور بات ہے کہ وہ عرصہ تک گجرات میں رہے اور اُن کا یہ قیام وہاں کی بجھتی ہوئی شمعِ شعر و سخن کو پھر سے کچھ عرصہ کے لیے روشن کردینے کا باعث ہوا۔ اس کو ولی کی کرامت سمجھنی چاہیے کہ جہاں انہوں نے شمالی ہند کا سفر کرکے شاہجہاں آباد میں اُردو شعر و سخن کی بنا ڈالی گجرات میں بھی انہی کی وجہ سے اُس گئے گذرے زمانہ میں اُردو شاعری ایک آخری بار چمک اٹھی۔

(۲)

ولی کے کلام کا ایک سرسری مطالعہ بھی اس حقیقت کو بے نقاب کرنے کے لیے کافی ہے کہ وہ وسیع المشرب اور

آزادہ رو پیدا ہوئے تھے۔ وہ کسی طرح کی قید یا جکڑبندی کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ سفید و سیاہ اور پست و بلند ان کی نظروں میں ایک تھے وہ خوش باش سے تھے۔ خوش باشی، آشنا پرستی، شوق سیر و سیاحت اور نیازمندی و محبت ان کی فطرت ثانی بن گئی تھی۔ اسی افتادِ طبع نے ان کو عنفوانِ شباب ہی میں اورنگ آباد سے باہر نکلنے پر مجبور کیا اور جب وہ ایک دفعہ مرہٹوں کے اِس ستم دیدہ شہر یعنے شہنشاہ اورنگ زیب کے تباہ حال پایۂ تخت سے باہر نکلے تو گجرات کے حسن دلفریب، اور خاص کر احمد آباد اور سورت کی رنگا رنگیوں نے ایسا فریفتہ کیا کہ اورنگ آباد کے فوجی دیار سے برداشتہ خاطر ہو گئے۔ اور ختم تعلیم کے بعد جب وطن واپس ہوئے تو ایک عرصہ تک اس شہر کی ہولناک جنگجویانہ فضا میں سیماب پا رہنے کے بعد پھر باہر نکلے اور اس طرح نکلے کہ سیر و سیاحت میں تمام عمر گذار دی۔ لیکن محض اس آزادہ روی اور سیر و سیاحت کی بنا پر کوئی کیسے کہہ سکتا ہے کہ وہ دکنی الاصل یا اورنگ آبادی نہیں تھے۔ ایک قدیم کہاوت ہے:۔

ہاتھی پھرے گاؤں گاؤں   جس کا ہاتھی اس کا ناؤں

سرہند ہو کہ گجرات، شاہجہاں آباد ہو کہ سورت ہر جگہ اور ہر وقت وہ ولیؔ اورنگ آبادی ہی رہے۔ اور یہ ممکن ہے کہ چونکہ وہ گجرات سے شمالی ہند کے سفر کے لیے نکلے تھے اور ایک گجراتی خوش طلعت دوست سید ابوالمعالی اُن کے ساتھ تھے اس لیے بعض موقعوں پر اُن کے وطن کے متعلق لوگوں کو شبہ ہوا ہو اور کہیں کہیں ان کی بود و باش کے نسبت پوچھا بھی گیا ہو جس کے جواب میں انہوں نے صاف صاف کہہ دیا:۔

جو نیہ کے کوچہ میں ہے اُس کو وطن سے کیا غرض

نیازمندی و الفت کی راہ میں تمام جغرافیائی اور جملہ علائق ٹوٹ جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ امتیاز ما و تو بھی باقی نہیں رہتا۔

یہی وجہ تھی کہ ولیؔ کسی ایک مقام اور ایک شخص سے دلبستگی نہیں پیدا کرنی چاہتے تھے۔ اُن کو ہر مقام حقیقت و حسن کی تجلیاں نظر آتی تھیں۔ وہ کہتے ہیں:۔

چاروں طرف کھلا ہے گلزار رنگ و بو کا   ہر سیر جانفزا ہے ہر سینہ گلشن کا

عیاں ہے ہر طرف عالم میں حسن بے حجاب اس کا   بغیر از دیدۂ حیراں نہیں جگ میں نقاب اس کا

انہوں نے اپنے کلیات میں اپنے متعدد ہندو و مسلمان دوستوں اور محبوبوں کا ذکر کیا ہے اور ہر کی توجیہ یوں کی ہے کہ:۔

ہر ذرہ عالم میں ہے خورشید حقیقی   یوں بوجھ کہ بلبل ہوں ہر اک غنچہ دہاں کا

معلوم ہوتا ہے کہ نوجوان دوستوں کی خوش روئی اور خوش ادائی کی تعریف اور ان کے ساتھ تعلق خاطر اور محبت کا اظہار کرنے کی وجہ سے ولیؔ پر طعن و تعریض بھی کی گئی تھی لیکن اس کے جواب میں انہوں نے اپنی ایک خواہش کی ہے کہ:۔

یکایک مجھ دلبا اک شہ، جوان اسوار تازی کا　　کہ جن نے حق سوں پایا ہے خطاب "عاشق نوازی" کا
نزک میرے کرم کر کر فصاحت اور بلاغت سوں　　کہیا وہ سرو قد مجھ کوں، سخن یوں سرفرازی کا
محبت یار بے پروا کی سینہ میں ہے رات اور دن　　یہی مطلب ہے رات اور دن نمازی اور نیازی کا
مجھے بولیا کہ "گر عشقِ حقیقی سیں تو واقف نیں　　تو بہتر یوں ہے جا دامن پکڑ عشقِ مجازی کا

سنیا ہے جب سوں یہ نکتہ ولی تیرے بچن سیتے
لگا ہے تب سوں شیوہ جیو کوں میرے عشق بازی کا

ولی کا ایمان تھا کہ بغیر تذکرۂ محبت کے شعر و سخن اینٹ اور پتھر کے برابر ہے۔ وہ کہتے تھے کہ اشعار میں جو کچھ خوبی پیدا ہوتی ہے وہ محض ایک کی نیازمندیوں اور دوسرے کی شان استغنا خوش طلعتی و ناز و ادا کی آئینہ داری کا نتیجہ ہے۔ ان کے شعر ہیں:۔

ہرگز نہیں ہے خشت سوں فرق اسکوں اے ولی　　خوش طلعتاں کی بات نہیں جس کتاب میں
قوس قزح کا مصرع ثانی ہوا ولی　　تعریف اس بھنواں کی لکھی جس سطر منیں
کرتا ہے ولی سحر سدا شعر کے فن میں　　تجھ نین سوں سیکھا ہے مگر جادوگری کوں
اُس انکھیاں پر زلف کا دیکھا ہوں از بس جو طلسم　　شعر تیرا اے ولی یوں سحر بنگالہ اہے
اُس لب کی حلاوت ہے ولی طبع میں میری　　تو شعر مرا جگ منے میٹھا ہے شکر سوں

رنگیلے شعر کا کہنا کیا تھا ترک مدت سے
تراوت ہوا ہے مجھکوں باعث فکر عالی کا

ساتھ ہی یہ بھی ظاہر کر دیتے ہیں کہ میرے شعر محض کسی کے خط و خال یا حسن ظاہری کی تعریف میں نہیں بلکہ میرے نیازمند اور درد آشنا دل کے حقیقی ترجمان ہیں:۔

ولی شعر میرا سراپا ہے درد　　خط و خال کی بات ہے خال خال

اسی سلسلہ میں وہ یہ بھی کہدیتے ہیں کہ میری محبت پاک اور حقیقی ہے نہ کہ مصنوعی اور ہوس پرستانہ۔ اور یہی وجہ ہے کہ میرے کلام میں ایک خاص درد و حلاوت اور لوچ نمایاں رہتا ہے:۔

پاکبازوں میں ہے مشہور ولی
اس سے چہرہ کوں چھپایا کرو

گدا ہیں جو محبت کی گلی کے — جو دایم ہم سفر ہیں بجلی کے
نہیں عاشق وہ ہر گل کی کلی کے — غنیمت بوجھ ملنے کوں ولی کے
نگاہِ پاک بازاں کیمیا ہے

اپنی اس پاکبازی اور بے لوث محبت کا اظہار ولی نے کئی طرح سے کیا ہے۔ بعض جگہ اپنے "جواں قد" محبوبوں کو بزرگوں کی طرح دعائیں بھی دی ہیں۔ ایک مخمس کے بند میں لکھتے ہیں:۔

یا رمیرا ہے سب سوں شیریں تر — سارے خوش طلعتوں میں ہے گا نر
نام رکھا ہوں جس کا میں اثر در — دِلِ دوست مرتضیٰ حیدر
دلربایوں میں دلربا ہے گا

ایک اور شعر ہے:۔

اُس سیس پہ قایم ابھو سایہ محی الدین کا — معشوق میرے کون مد و محبوب سبحانی ہوا

ولی کی پاک نظری اور صحیح نقطۂ نظر نے جن کو اپنا محبوب بنایا تھا ان میں سے اکثر سخن فہم اور سخنداں بھی تھے اور ان کی اس خصوصیت ہی نے ولی کو اچھے سے اچھے شعر کہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ ایک جگہ کہتے ہیں:۔

صنم میرا سخن سوں آشنا ہے — مجھے فکر سخن کرنا بجا ہے
سخنداں آشنا فضل خدا ہے — نہ تنہا حسن خوباں دلربا ہے
ادا فہمی سخندانی بلا ہے

اورنگ آباد کے ایک مشہور اہل اللہ اور صاحب دل شاعر حضرت شاہ سراج بھی جو ولی کی جانشینی کا اس طرح دعویٰ کرتے ہیں ؎

تجھ مثل اے سراج بعد ولی — کوئی صاحب سخن نہیں دیکھا

معلوم ہوتا ہے کہ ولی کے پسندیدہ شاعر اور منظورِ نظر رہ چکے تھے۔ اگرچہ اس بارے میں شبہ کی قطعی گنجایش ہے کہ آیا سراج کی عمر ولی کی زندگی میں اس قابل تھی کہ ان کی شادی میں ولی شریک ہو سکتے۔ بہرحال ولی کے شعر ہیں:۔

پروانہ ہو کے کیوں نہ گرے چاند چہرہ سوں — فانوسِ دل میں شوق ترا ہے سراج آج
وہ شوخ مجھ سیں آکے ملیا اس سبب ولی — شادی میں اس کی صرف کیا ہوں میں لاج آج

ولی کے کلام میں ان کے اور کئی دوستوں اور محبوبوں کا تذکرہ ملتا ہے جو مختلف مذاہب سے متعلق تھے مگر ان سب میں

سید ابوالمعالی ہی کو خصوصیت حاصل ہے۔ یہ گجرات کے مشائخ زادے تھے اور بڑے سخن فہم و سخن سنج۔ انہی کے ساتھ ولی نے شاہجہاں آباد اور سرہند وغیرہ کا سفر کیا تھا اور انہی کی وجہ سے وہ آخر کار احمد آباد ہی میں رہ پڑے۔ ان سے ولی کو جس درجہ تعلق خاطر تھا ان کی ان متعدد غزلوں سے ظاہر ہوگا جو اس نیک نہاد نوجوان کی فرشتہ خوی، اور اوصاف حمیدہ کی تعریف میں لکھی گئی ہیں۔

غرض گجرات میں قیام پذیر ہونے کے اسباب خود ولی نے اپنے اشعار میں بیان کردیے ہیں۔ احمد آباد کی چہل پہل، وہاں کی دلچسپ صحبتیں، حضرت شاہ وجیہ الدین کی خانقاہ اور مدرسہ کی پُرسکون و حیات پرور فضا، ان کے وطن اورنگ آباد کی مرہٹوں کے ہاتوں ویرانی اور وہاں کا خشک و ہولناک فوجی ماحول، گجرات کا حسن طبیع اور سب سے بڑھکر سید ابوالمعالی کی رفاقت یہ سب چیزیں تھیں جنہوں نے ولی کو آخر کار وہیں رہنے پر مجبور کردیا۔ وہ اپنے محبوب کی گلی کے مقابلہ میں کشمیر اور کابل کے حسن زاروں اور شمالی ہند کے بارونق شہروں کو ہیچ سمجھتے ہیں محبوب کا خیال انہیں دو جگ سے بے نیاز کردیتا ہے۔ ان کے شعر ہیں:—

ولی یوں دیکھ بولا تجھ گلی کوں — یہی ہے ہند اور کشمیر و کابل

دلدار کی گلی سوں کیوں جاسکوں ولی میں — لپٹا لپٹ ہے دل کوں جب چیرۂ زری سوں

اے ولی غیر آستانۂ یار — جبہ سائی نہ کر خدا سے ڈر

باغ ارم سے بہتر موہن تری گلی ہے — ساکن تری گلی کا ہر آن میں ولی ہے

دو جگ ہوئے ہیں دل سوں فراموش اے ولی — رکھتے ہیں جب سوں یاد سریجن کی من میں ہم

عالم کی دوستی سے ہے نفرت ولی کو نت — ہر آشنا کے دم سے گریزاں ہے جیوں چراغ

دوسرے ملکوں کی دلچسپیاں تو خیر کوئی ایسی اہمیت نہیں رکھتیں۔ ولی کا عقیدہ تو یہ ہے کہ اپنے دوست کی قیام گاہ کے مقابلہ میں اہل دل اپنے پیارے وطن کو بھی بھول جاتے ہیں۔ کیونکہ بغیر گل و گلشن کے بلبل کی زندگی ممکن نہیں اور جو راہ عاشقی کا سالک ہے اس کو وطن سے کیا کام! اس کی منزل وہی ہے جہاں محبوب ہوئے۔ ان اعتقادات کے تحت میں اگر ولی، اورنگ آباد کو چھوڑ کر احمد آباد ہی میں رہ پڑے تو کیا تعجب! وہ کہتے ہیں:—

کیا دل نے تیری گلی کا مقام — کہ بلبل کوں دائم ہے گلشن وطن

میں دل کوں دیا بند کر اُس سحر بچن کوں — عشاق جسے دیکھ بسارے ہیں وطن کوں

عشق کی راہ میں مسافر کوں — ہر قدم تجھ گلی میں منزل ہے

اے ولی رہنے کو دنیا میں مقام عاشق　　کوچۂ زلف ہے یا گوشۂ تنہائی ہے

ساتھ ہی وہ یہ بھی ظاہر کر دیتے ہیں کہ میں گجرات میں کسی منصب اور جاگیر یا وظیفہ اور خلعت و تشریف کے لالچ سے قیام پذیر نہیں ہوں یہاں اگر مجھے کوئی وظیفہ ہے تو وہ صرف اپنے محبوب کا نام ہے ؎

نہیں منصب و جاگیر نہیں کوئی وظیفہ　　ہر روز ترا ناؤں وظیفہ ہے ولی کوں

کیا مرد ہے میں ایس کے لباس عریانی　　ولی برہ نے دیا یو قبا مجھے تشریف

نیاز مندی اور آزادہ روی کی وجہ سے وہ ہر قسم کے تعلقات اور ہیچ سے بے نیاز ہیں۔ وہ کہتے ہیں ؎

اے ولی غیر عشق حرف دگر　　پختہ مغزاں کے نزد ہے خالی

ولی کوں نہیں مال کی آرزو　　خدا دوست نہیں دیکھتے زر طرف

نہ ہووے حل اس کا عقدۂ مشکل ولی ہرگز　　تماشوں سوں کہ جن نے دل میں اپنے گرہ پکڑی

اے ولی ترک علائق دل کوں لذت بخش ہے　　جیوں ہے دنیا دار کوں فکر سر و ساماں عزیز

چمن میں دہر کے ہرگز نہ مجھ ہوا معلوم　　کہ کب ہے فصل ربیع اور کدھاں ہے فصل خریف

فنا کر کر جو کوئی سمجھا یہاں کی زندگانی کوں　　اسے گزران کرنے کوں جنگل ہور گھر برابر ہے

یہی وہ افتاد طبع تھی جو ولی کو اورنگ آباد میں گجرات کی یاد میں تڑپا رہی تھی۔ جب وہ عنفوان شباب میں تکمیل تعلیم کے لیے اورنگ آباد سے نکل کر احمد آباد پہنچے ہونگے تو انہیں کیا خبر تھی کہ گجرات کا حسن رنگیں انہیں ہمیشہ کے لیے بے تاب اور مضطرب الحال کر دیگا۔ حضرت شاہ وجیہ الدین کے مدرسہ اور خانقاہ کی صحبتوں نے انکے دل و دماغ میں ایک ایسی تڑپ پیدا کر دی تھی کہ جب وہ ختم تعلیم پر اورنگ آباد واپس ہوئے تو فراق گجرات میں ان کا دل "خار خار" ہوگیا۔ انہوں نے اپنی زندگی کے بہترین لمحوں کی اس یاد میں بعض ایسے اچھے شعر لکھے ہیں جو ان کو زندہ جاوید بنانے کا باعث ہوگئے۔ اسی ہجر کی بے چینی اور دوستوں کی یاد نے انکے کلام میں وہ سوز و گداز پیدا کر دیا جو اشعار کو نشتر بنا دیا کرتا ہے۔ جیتے جی وہ اپنے وطن میں مثل سیماب پارہ رہے۔ روز بروز ان کے خیالات میں انتشار پیدا ہوتا گیا ؎

ولی میرا جنوں جو کوئی کہ دیکھے　　اسے کوہ و بیاباں یاد آوے

یوں دوستاں کے ہجر سوں داغاں ہیں سینے پر ولی　　صحرا کے دامن کے اپر جیوں نقش پا سے رہوا

اے ولی اس کی گلی دل یاد کرتا ہے مدام
کیوں کرے نیں یاد جب ایماں ہے حب الوطن

گویا انہوں نے تصفیہ کرلیا تھا کہ اب میرا وطن اورنگ آباد نہیں ہے۔ عاشق کا وطن اصل میں محبوب ہی کی گلی ہے اور اس گلی کی یاد عاشق کا ایمان۔

یہ ممکن ہے کہ آخر زمانہ میں ولی کے سامنے انکے وطن کا ذکر کیا جاتا ہو، یا اثنائے سفر میں لوگ ان کے وطن کے متعلق دریافت کرتے رہتے ہوں لیکن ان سب موقعوں پر اُن کے یہاں ایک ہی جواب تھا کہ :-

هرگز ولی کے پاس تم باتاں وطن کی مت کہو　　　جو نیہ کے کوچہ میں ہے اسکوں وطن سے کیا غرض

ان کے نزدیک عشق و محبت سے بڑھکر کوئی چیز اہم نہیں، اور وہ مال اور دولت، عزت اور وطن، اعزہ اور اقارب غرض ہر چیز کو کھو دینے تیار ہیں مگر عشق کو کھونا نہیں چاہتے۔ رازِ عشق سے آگاہی اُن کے یہاں سب سے بڑا علم ہے اور سب سے بڑی اور اصلی دوربینی ان کے خیال میں اُس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتی جب تک کہ محبوب کے پاؤں کی خاک کو سرمۂ چشم نہ بنالیا جائے۔ وہ کہتے ہیں :-

ولی دل میں ہمارے حاسداں کا خوف نہیں ہرگز　　　بجز دزدی کسی رہزن کوں رہزن کر نہیں کہتے

گر نہیں سرِ عشق سوں آگاہ　　　فخر بے جا ہے فخرِ رازی کا

جو ہوا رازِ عشق سیں آگاہ　　　وہ زمانہ کا فخرِ رازی ہے

چاہو کہ ہو ولی کے نمط جگ میں دور بیں　　　انکھیاں میں سرمہ پیو کی خاکِ چرن کرو

اس انتہائی الفت پیشگی، آفاق دوستی، اور ترک علایق کے باوجود ولی اپنے کلام میں اپنے وطن کا ذکر کیے بغیر نہ رہ سکے اور ممکن ہے کہ یہ بھی غیر ارادی طور پر ہو۔ اُن کے چند شعر جن میں انہوں اپنے کو دکنی کہا ہے یہ ہیں :-

ولی ایران و توراں میں ہے مشہور　　　اگرچہ شاعرِ ملکِ دکھن ہے

یو مکھ کی شمع سوں روشن ہے ہفت اقلیم کی مجلس　　　ولی پروانگی کرتا تری ملکِ دکھن بھیتر

دکھنی زبان میں شعر سب لوگاں کہے ہیں اے ولی　　　لیکن نہیں بولیا ہے کوئی اک شعر خوشتر زیں نمط

دکن کے اس تذکرہ کے علاوہ ولی نے دکن کے بعض شاعروں کا بھی اپنے کلام میں ذکر کیا ہے۔ اگر وہ گجراتی ہوتے تو یقیناً دکن کے شاعروں کے ساتھ ساتھ گجرات کے بھی قدیم اردو شعرا مثلاً بہاؤالدین باجن، خوب محمد، شاہ علی گانوں دھنی، اور امین وغیرہ میں سے کسی کا ضرور ذکر کرتے حالانکہ انہوں نے اپنی غزلوں میں (اور خاص کر شیخ ابوالمعالی کی مدحیہ غزل میں) فارسی کے بھی اکثر شاعروں کے نام لیے ہیں۔ دکن کے شعرا میں ولی نے ملا خیالی حسن شوقی، فراقی، آزاد رنگین اور اشرف وغیرہ کا ذکر کیا ہے :-

حسن شوقی دکن کا مشہور شاعر ہے تالیکوٹ کی لڑائی میں وہ نظام شاہ کی فوج میں تھا اور جب رام راج کو شکست ہوئی تو اس نے ظفرنامہ نظام شاہ اُردو میں ایک مثنوی لکھی نظام شاہ کے بعد وہ محمد عادل شاہ والی بیجاپور کے یہاں چلا آیا اور اس بادشاہ کی تقریب عقد میں ایک طویل مثنوی میزبانی نامہ عادل شاہ مرتب کی۔ یہ دونوں تاریخی مثنویاں موجود ہیں۔ بعد میں شوقی حیدرآباد آیا تھا اور غالباً یہیں اس کا انتقال ہوا ولی کہتے ہیں۔

حسن شوقی:۔ برجا ہے اگر جگ میں ولی پھر کے دوجے بار — رکھ شوق مرے شعر سوں شوقی حسن آئے

حسن شوقی کا تذکرہ اس غزل میں بھی کیا ہے جس میں سید ابوالمعالی کو متعدد شاعروں سے تشبیہ دی ہیں وہ کہتے ہیں [۱]

ولی تجھ قد وابرو کا ہوا ہے شوقی و مائل — تو ہر اک بیت عالی ہے و ہر مصرع خیالی ہے

فراقی:۔ ترے اشعار ایسے ہیں فراقی — کہ جن پر رشک آئے گا ولی کوں

ولی مصرع فراقی کا پڑھوں تب جب کہ وہ ظالم — کہ سوں کھینچتا خنجر چڑھاتا آستیں آئے

رنگیں:۔ ولی یوں مصرع رنگیں ہوا ہے درد جان و دل — فدا ہے عشق میں دلبر کے جان و مال عاشق کا

کہتا ہے ولی دل ستی یہ مصرع رنگین — ہے یاد تیری مجھکوں سبب راحت جاں کا

آزاد:۔ آزاد سے سنیا ہوں یو مصرع مناسب — جس سے کہ یار ملتا ہے ایسا ہنر نہ آیا

اشرف:۔ اشرف کا یو مصرعہ ولی مجھکو ہے دلچسپ — الفت ہے دل و جاں سے مجھے پیم نکر سوں

ولی کو دکنی ثابت کرنے کے لیے صرف اتنی ہی بحث کافی ہے۔ مگر تذکرۂ شعرائے گجرات کے مصنف نے ولی کو گجراتی قرار دینے کے سلسلہ میں یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ عہد ولی میں گجرات اور دکن کو جدا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ چونکہ یہ دونوں خطے شمالی ہندوستان کے جانب جنوب واقع ہیں اس لیے ممکن ہے اہل شمال دکن اور گجرات میں تمیز نہ کرتے ہوں اور سب کو دکنی ہی کہتے ہوں۔

یہ استدلال تاریخی اور جغرافی نظر سے صحیح نہیں۔ اس کا امکان ہو سکتا ہے کہ اہل شمال گجراتیوں اور دکنیوں کو ایک دوسرے سے جدا نہ سمجھتے ہوں مگر ان دونوں مقامات کے رہنے والے تو ہمیشہ خود کو ایک دوسرے سے جدا سمجھتے رہے۔ کوئی گجراتی شاعر اپنے کو دکنی شاعر نہیں کہتا تھا۔ اس وقت تک عہد ولی کے متعدد گجراتی شاعروں کا کلام بھی دستیاب ہو چکا ہے

---

[۱] اس غزل کا مطلع ہے ؎

ترا مکھ مشرقی حسن انوری جلوہ جمالی ہے — نین جامی جبیں فردوسی و ابرو ہلالی ہے

ور باوجود کوشش کے کوئی ایسا شعر نہیں ملا جس میں کسی گجراتی شاعر نے اپنے کو دکھنی لکھا ہو۔ اس کے برخلاف جملہ گجراتی شعرا دکن اور دکنی شاعروں سے خود کو علیحدہ سمجھ کر خاص طور پر ان کے وطن کے ساتھ ان کا نام لیتے ہیں۔

ولی کا ایک گجراتی معاصر ہاشم علی بلند پایہ مرثیہ گو شاعر تھا۔ اس نے مراثی کا ایک ضخیم کلیات "دیوان حسینی" مرتب کیا تھا جو اس وقت موجود ہے۔ اس دیوان میں ہاشم علی نے اپنے وطنی دوستوں اور معاصرین مثلاً روحی، مرزا اور قاد وغیرہ کا اس طرح ذکر کیا ہے:-

ہزار حیف نہیں شاعران دکن | سو روحی و مرزا و قاد نہیں
ہاشم علی عجب نہیں یوں مرثیہ کو سنکر | تجھ پر خلیفہ قادر تحسیں کرے دکھن میں

روحی اور مرزا کے کلام کی طرح خلیفہ قاد کا کلام بھی اس وقت موجود ہے۔ اور ان سب کے کلام کے نمونے بھی شایع ہو چکے ہیں۔ ہاشم علی نے دکنی شاعروں کا ذکر عام طور پر بھی کیا ہے وہ ایک مرثیہ کے ختم پر کہتے ہیں:-

ہاشم علی لکھا توں بیکس دلہن کی باتاں | اس غم سے ہے جگر خوں اور چشم اشک ریاں
گجرات میں پڑے جب یو مرثیہ کو یاراں | سنکر چلے ہیں روتے دکھنی دکھن کوں اپنے

ایک اور شعر ہے ؎

ہاشم علی لے آنے محبان نے یوں خبر | دکھن سے ہو کے نیر سے تخن کربلا چلے

ہاشم علی کے علاوہ گجرات کے ایک اور بلند پایہ شاعر رضا کے کلام میں بھی دکھنی شاعروں کا ذکر ملتا ہے۔ یہ بھی بڑے مرثیہ گو تھے اور ان کے متعدد مرثیے اس وقت محفوظ ہیں۔ یہ اپنے ایک مرثیہ کے آخر میں فخر کرتے ہیں:-

اے رضا قاسم کے جلوہ کا بیاں کر توں مدام | تجھ کوں محشر میں شفیع ہو کر چھڑاویں گے امام
مرثیہ تجھ کن لکھا کر لے گئے ہیں خاص و عام | لے گئے دکھنی دکھن کوں، آج ہے قاسم کا بیاہ

جب عہد ولی میں دکن اور گجرات کے شاعر ایک دوسرے کو جدا جدا ملکوں کے رہنے والے سمجھتے تھے تو ان کے ڈیڑھ سو سال بعد کے ایک تذکرہ نگار کا یہ خیال کہ اس زمانہ میں کوئی امتیاز نہ ہوگا کس طرح صحیح سمجھا جا سکتا ہے؟

جہاں یہ ثابت کر دیا گیا ہے کہ ولی خود کو دکھنی شاعر کہتے ہیں آخر میں ولی ہی کی زبان سے اس امر کی بھی شہادت پیش کر دی جاتی ہے کہ وہ گجرات کے رہنے والے نہ تھے بلکہ وہاں بطور سیر و سیاحت گئے تھے۔ وہ اپنے عہد شباب کے سفر گجرات کے بعد جب اورنگ آباد واپس ہوئے تھے تو یہاں ان کا دل نہیں لگتا تھا۔ گجرات کی یاد رہ رہ کر ان کو تڑپا رہی تھی۔ اس عالم اضطراب میں انہوں نے ایک مثنوی "در فراق گجرات" لکھی تھی جو ان کے کلیات میں چھپ بھی

ہو چکی ہے۔ اس میں گجرات کی تعریف کے سلسلہ میں ولی نے لکھا ہے کہ:-

گجرات کے فراق سوں ہے خار خار دل　　بے تاب ہے سینہ منیں آتش بہار دل

مرہم نہیں ہے زخم کا اس کے جہاں تئیں　　شمشیر ہجر سوں جو ہوا ہے فگار دل

اس سیر کے نشہ سوں اول تر دماغ تھا　　آخر کوں اس فراق میں کھینچا خمار دل

میرے سینے میں آکے چمن دیکھ عشق کا　　ہے جوش خوں سوں تن میں مرے لالہ زار دل

حاصل کیا ہوں جگ میں سراپا شکستگی　　دیکھا ہے مجھ شکیب سوں صبح بہار دل

ہر آشنا کی یاد کی گرمی سوں تن منیں　　ہر دم میں بے قرار ہے مثل شرار دل

حاصل ہوا ہے مجھ کوں ثمر مجھ شکست سوں　　پایا ہے چاک چاک ہو شکل انار دل

افسوس ہے تمام کہ آخر کو دوستاں　　اس میکدہ سوں اٹھ کے چلا سدہ بسار دل

لیکن ہزار شکر ولی حق کے فیض سوں

پھر اس کے دیکھنے کا ہے امیدوار دل

اس نظم میں سیر کے لفظ سے ثابت ہو جاتا ہے کہ ولی گجرات کو بطریق سیر و سیاحت گئے تھے۔ ؎

اس سیر کے نشہ سوں اول تر دماغ تھا　　آخر کوں اس فراق میں کھینچا خمار دل

وہاں کا متوطن کبھی اس طرح نہیں لکھ سکتا۔ آخر میں انہوں نے یہ بھی کہہ دیا کہ اگرچہ ایک دفعہ دیکھ آیا ہوں لیکن

ع　پھر اس کے دیکھنے کا ہے امیدوار دل

اس نظم کے علاوہ انہوں نے اپنے اس سفر کی یاد میں ایک دلچسپ مثنوی بھی لکھی تھی جس میں سورت کی کیفیت کا ذکر کیا ہے یہ بہت طویل ہے یہاں صرف چند شعر پیش کیے جاتے ہیں:-

عجب شہر اِں میں ہے یہ نور اک شہر　　بلاشک ہے وہ جگ میں مقصد دہر

اہے مشہور اُس کا ناؤں سورت　　کہ جاوے اُس کے دیکھے سب کدورت

جگت کی انکھ کا گویا ہے یہ نور　　اچھو اس نور سوں یہ چشم بد دور

شہر جوں منتخب دیواں ہے سب　　ملاحت کی وہ گویا ڈال ہے سب

سرج س آب اس کی جگ میں کانپا　　سمندر موج زناں لگ کے میں کانپا

کنارے اس کے اک دریا ہے بہتی　　کہ دنیا دیکھنے کوں اس کے پیتی

کھلے ہیں ہر طرف رخسار کے گل ہر اک گل کے نزک وہاں پہ ہے سنبل

جو کئی دیکھا ہے اُن کا باغ رخسا۔ ہوا اک دید میں وہ محو دیدار

کہاں ہے ساقی اخلاص انگیز محبت کی کرے مے مجھ اُپر ریز

صفائی سوں کھلے مجھ جیو کا باغ کروں اس دُرد مے کوں مرہم داغ

بھری ہے سیرت و صورت سوں سورت ہر اک صورت ہے وہاں انمول مورت

ہر اک کے لب ہیں جیوں یاقوت انمول کرے وہ بات جب میٹھے لباں کھول

وہ باتاں نہیں سراپا ہے مٹھا قند کہ جن باتاں اُپر ہے نیشکر بند

پڑا شیریں بچن سن کے اُن بس جو پھنسا اس شہد میں جا کر مگس ہو

ہوا اُسکوں نکلنا کام دشوار۔

رہا تا آخری دم لگ گرفتار

گویا اس آخری شعر میں ولی نے شیریں زبان ملیحاں گجرات کے عشق میں گرفتار رہنے کی پیش گوئی کی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ جب دوبارہ وہ اپنے وطن سے نکلے تو آخری دم تک گجرات ہی میں گرفتار رہے۔

اس مضمون کو ختم کرنے سے قبل ہم ولی کے سب سے پہلے گجراتی دوست سید ابوالمعالی ہی کے فرزند سے اس امر کی تصدیق کرا دیتے ہیں کہ ولی گجراتی نہیں تھے۔ یہ عجیب اتفاق کی بات ہے کہ سید محمد تقی ولد سید ابوالمعالی نے خود اپنے قلم سے ولی کے وطن کے متعلق ایک تحریر بطور سند چھوڑی ہے جو اس وقت تک محفوظ ہے۔ اس کو دیکھنے اور معلوم کرنے کے بعد گجرات کا کوئی قدردان ولی خواہ وہ تذکرۂ شعرائے گجرات کا مصنف ہو یا کوئی اور محب گجرات ولی کو گجراتی کہنے کی جرات نہیں کرسکتا۔ سید ابوالمعالی کے فرزند سید محمد تقی نے ۱۱۵۶ھ میں اپنے والد کے مشفق دوست کے دیوان کو خود اپنے قلم سے نقل کیا تھا اور اس کے آغاز و اختتام پر انہوں نے کتاب کا نام اور سن کتابت بھی درج کر دیا ہے۔

سید محمد تقی نے پہلے صفحہ پر کلام شروع کرنے سے قبل لکھا ہے:۔

”تصنیف مغفرت پناہ میاں ولی محمد متوطن دکھن“

اور آخری صفحہ پر مرقوم ہے:۔

”تمت تمام شد دیوان مغفرت نشان میاں ولی محمد متوطن دکھن بتاریخ دویم شہر ذیقعدہ ۱۱۵۶ھ یازدہ ہزار و پنجاہ و شش ہجری بروز پنجشنبہ بوقت صبح تحریر یافت۔ مالک و کاتب این دیوان عاجز المذنب محمد تقی ولد سید ابوالمعالی است

کسے دعویٰ کند باطل است "

دیوان وَلی کا یہ عجیب و غریب و تاریخی نادر قلمی نسخہ انڈیا آفس کے کتب خانہ، لندن میں اس وقت محفوظ ہے جس کا نمبر ۱۵۵ ہے اور جس کے متعلق مزید تفصیلی معلومات رسالۂ معارف نمبر ۲ جلد ۲۵ سے بھی حاصل ہو سکتی ہیں۔

جگت پریم یا پیام شاعر

از

مولوی غلام طیب صاحب بی۔ اے بی ٹی لکچرار اردو اورنگ آباد کالج

(۱) جلوہ گل چمن چمن ـ خنجر بے نیام ہے
ناز ہے مائل کرم دعوت قتل عام ہے
غنچے میں ایک راز ہے پھول میں اک پیام ہے
نبض کی جنبشوں میں دل طائر زیر دام ہے

(۲) پردہ شب میں جلوہ گر حسن کی اک برادری
چاک سحر سے رونما ـ جام نشاط زندگی
زمزمہ طیور میں داغ جگر کی روشنی
پھول بھری ہیں ڈالیاں یا کہ بیاض شاعری

(۳) ذوق سرور چاہیے ـ مے کی یہاں کمی نہیں
درد ذرا بھی ہو اگر ـ تلخ یہ زندگی نہیں
بزم نیاز و ناز میں دھوم کہاں مچی نہیں
ایسے میں جو رکا رہے سنگ ہے آدمی نہیں

(۴) اہل نظر کو کائنات ـ حسن کا ایک جال ہے
عکس جمال یار سے روے بہار لال ہے
دیکھ اسیر آرزو ـ کفر یہاں ملال ہے ـ
گردش جام شوق سے سارا جہاں نہال ہے

(۵) کس کا ہو لوہ بے وفا ـ تیرا اگر ہوا نہیں
جو ہے خدا ہے ہر زمیں ـ کیا وہ تیرا خدا نہیں
لذت غم تو ہے تیری ـ وصل اگر ترا نہیں
عشق کی انتہا نہو کیوں ـ حسن کی انتہا نہیں

(۶) مہر کی ضو فشانیاں ـ سوز و وفا میں جلکے دیکھ
ماہ کی خوش خرامیاں کوچۂ دل میں چلکے دیکھ
صبح و مہ ـ ماکی کروٹیں موج فنا میں پلکے دیکھ
ہے یہ طلسم دیدنی ـ دیکھ ذرا سنبھل کے دیکھ

(۷) نفس کی سازباز نے علم کو سم بنا دیا
عقل کو آب تاب دے برق ستم بنا دیا
ظلم کو توڑ موڑ کر رحم و کرم بنا دیا
بندۂ سوز و ساز کو تیغ دو دم بنا دیا

قطب شاہی خوش نویس محمد رضا کی یک وصلی

ہردو عید و سالگرہ پر سلطان محمد قلی قطب شاہ

(۸) شمع ہوس سے دور رکھ شیشۂ نو بہار کو — دشمن آرزو بنا قلب جنوں شعار کو
رنگ خودی مٹا کے دیکھ صنعت کردگار کو — حسن کے آب و رنگ کو شوق کے کاروبار کو

(۹) باد صبا سے سیکھ لے طرز مدام رہروی — تار نفس سے مانگ لے خدمت شعلہ گستری
آئینہ بن کے چھین لے حسن کی شان دلبری — تاج صدف سے توڑ لے دُرِّ یتیم پروری

(۱۰) تیرے چمن کے پھول ہیں سارے جہاں کے پھول بن — روپ جدا جدا سہی سب پہ ہے یار کی پھبن
سارا جہاں ہے گلزمیں عشق بتائے کیوں وطن — دیر و حرم کو چھوڑ دے شمع کی ہے اگر لگن

(۱۱) ذرہ دل کو پھینک دے ابر شرارہ دار بن — قطرہ کو دیکھتا ہے کیا موجہ آبشار بن
پھولوں کو توڑتا ہے کیوں ۔ باغ سدا بہار بن — سبزہ کا ساتھ کیا بھلا ۔ رفعت کوہسار بن

(۱۲) نفس کی آندھیوں میں کیوں عقل تری پتنگ ہے — بادۂ نارسا نہ پی ۔ نشے کی گر امنگ ہے
تیری جبین ناز پر خون وفا کا رنگ ہے — کوئی نہیں عدو ترا ۔ تیری تجھی سے جنگ ہے

(۱۳) بیر کو دل میں جا نہ دے بیر سے کس کو کیا ملا — چاہیے ہر بشر کو یاں سب سے رہے ملا ملا
مجھ کو جگت کے پریم میں روح کا آسرا ملا — پریم ہے نور زندگی ۔ پریم ملا خدا ملا

ولی کا سنِ وفات

از

جناب مولوی عبدالحق صاحب بی، اے پروفیسر اردو جامعۂ عثمانیہ

ولی کا سن وفات اب تک غیر منحقق ہے۔ اردو شعرا کے جس قدر تذکرے اس وقت تک دستیاب ہوئے ہیں وہ سب اس بارے میں خاموش ہیں۔ البتہ مولوی عبدالجبار خاں مرحوم مولف تذکرہ شعرائے دکن نے اس کا سن وفات (١١٥٥ھ) لکھا ہے لیکن کوئی حوالہ یا ثبوت پیش نہیں کیا۔ بعض حال کے مصنفین نے اس کو صحیح سمجھکر نقل کر دیا ہے بعض صاحبوں نے اس شعر سے ؎

دل ولی کا لے لیا دلی نے چھین — جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

یہ استنباط کیا ہے کہ ولی محمد شاہ کے زمانے میں تھا۔ محمد شاہ کا سن جلوس (١١٣١ھ) ہے لیکن یہ قطعی طور سے ثابت ہے کہ یہ شعر ولی کا نہیں۔ میرے پاس ولی کے بارہ قلمی دیوان موجود ہیں۔ ان میں کہیں یہ شعر نہیں اور نہ کسی اور دیوان (قلمی یا مطبوعہ) میں یہ شعر یا اس شعر کی غزل پائی گئی۔ اور لطف یہ ہے کہ بعض مرتب دیوان جو اس شعر کو سند میں پیش کرتے ہیں۔ خود ان کے مرتب کردہ دیوانوں میں یہ شعر نہیں پایا جاتا۔ اصل میں یہ شعر مضمون کا ہے اور تذکرہ گلشن گفتار[1] (١١٦٥ھ) اور چمنستان شعرا نے مضمون کے ذکر میں اس طرح نقل کیا ہے ؎

اس گدا کا دل لیا دلی نے چھین — جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

اس قسم کی ایک دوسری غلط فہمی بھی ہوئی، جس سے ولی کا محمد شاہ کے عہد میں ہونا ثابت کیا گیا ہے۔ مصحفی نے اپنے تذکرے میں شاہ حاتم کی زبانی یہ بیان کیا ہے کہ "روزے پیش فقیر نقل می کرد کہ در سن دوئم فردوس آرامگاہ دیوان ولی در شاہجہان آباد آمدہ و اشعار بر زبان خورد و بزرگ جاری گشتہ[2]"۔ بعض اصحاب نے اس بیان کو دیکھ کر غلطی سے یہ

---

[1] گلشن گفتار مرتبہ سید محمد صاحب ام۔ اے۔ [2] تذکرہ ہندی صفحہ۔

سمجھ لیا کہ ولی محمد شاہ کے عہد میں دلی گیا تھا۔ حالانکہ اس میں صاف طور پر دیوان کے پہنچنے کا ذکر ہے نہ کہ ولی کے جانے کا۔

یہ سب تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ ولی دلی گیا تھا۔ سوائے قائم[1] کے کسی نے صحیح سن اس کے دلی جانے کا نہیں بتایا۔ قائم لکھتا ہے کہ وہ عالمگیر کے ۴۴ سن جلوس (۱۱۱۲ھ) میں دلی گیا۔ اس کا دوبارہ دلی جانا جیسا کہ بعض صاحبوں نے بیان کیا ہے ثابت نہیں ہوتا۔ غالباً اس شعر سے جو اوپر نقل کیا گیا ہے یہ غلطی پیدا ہوئی۔

ایک مدت کی تحقیق کے بعد اب یہ امر پایۂ تحقیق کو پہنچا ہے کہ ولی کی وفات ۱۱۱۹ھ میں ہوئی۔ اس کی شہادت ہمیں ذیل کے قطعہ تاریخ سے ملتی ہے جو کتب خانہ جامع مسجد بمبئی کے قلمی نسخہ دیوان ولی (نشان ۲۰۹) کے خاتمے پر درج ہے۔

مطلع دیوان عشق سید ارباب دل	والی ملک سخن صاحب عرفان ولی
سال وفاتش خود از سر الہام گفت	بادشاہ ولی ساقی کوثر علی

اس دیوان کی کتابت ۲۱ سن جلوس محمد شاہی میں ہوئی اور کاتب کا نام شہسوار بیگ ہے۔

اس کے بعد اس امر کی مزید صحت و توثیق احمد آباد کے ایک خانگی کتب خانہ کی بیاض سے ہوئی اور اس اثنا میں یہ بھی معلوم ہوا کہ اس قطعہ کے مصنف مولوی حسن غنی ہیں۔ (اردو)

---

[1] تذکرہ مخزن نکات صفحہ ۱۰

ولیؔ

از

مولوی مخدوم محی الدین صاحب ایم۔ اے (عثمانیہ)

جہانِ رنگ و بو سے کھیلنے والا نہ تھا کوئی
شبِ ہجراں کی سختی جھیلنے والا نہ تھا کوئی

زبانِ نغمہ بے تاثیر تھی مستی کی پیاسی تھی
پریشاں خیمت تھے گیتوں کے چہرے پر اُداسی تھی

ترانے حسن و دل کے گانے والا ہی نہ تھا کوئی
حسیں فطرت کا جی بہلانے والا ہی نہ تھا کوئی

اِک ایسی ترجمانی چاہتے تھے راز فطرت کے
کسی داؤد کے محتاج تھے سب ساز فطرت کے

ابھی نا آشنائے لذتِ گفتار تھی دنیا
اسیرِ خامشی تھی، بار تھی، آزار تھی دنیا

یکایک دہرِ تیرہ بخت کی قسمت بدلتی ہے
ہوا بھی زیرِ لب ہنستی ہوئی اتراتی چلتی ہے

اُٹھے انگڑائیاں لیتے ہوئے بستر سے فوارے
پگھل کر بہ چلے موسیقیوں کے منجمد دھارے

وہ پیغامِ سحر آ ہی گیا زنجیرِ شب ٹوٹی
وہ ابھرا مہرِ لود زندگانی کی کرن پھوٹی

حجابِ تیرگی قدرت نے جب چٹکی سے سرکایا
تو گہوارے میں اِک ہنستا ہوا چہرہ نظر آیا

فضائیں احتراماً سر پہ آنچل ڈال لیتی ہیں
سحر کی بیٹیاں رنگینیوں کی ناؤ کھیتی ہیں

صدا دی آسمانوں نے ستاروں نے ولیؔ آیا
مبارک بادیاں گائیں بہاروں نے ولیؔ آیا

ولیؔ وہ ہمدمِ فطرت، وہ پیکِ نورِ وجدانی
وہ جبریلِ سخن، وہ اولیں تلمیذِ رحمانی

یقیں بخشا زباں کو جس نے پہلے اُس کے جینے کا
وہ پہلا ناخدا ہندوستانی کے سفینے کا!

دیے روشن کیے مندر میں کعبے کے چراغوں سے
ہزاروں جنتیں آباد کر دیں دِل کے داغوں سے

وہ میراثِ جہاں وہ خلد کا پیغام آتا ہے
دکن کی سرزمیں پہ زندگی کا جام آتا ہے

ولی کی شاعری

از

جناب مولوی ابوظفر عبدالواحد صاحب ایم۔ اے لکچرر سٹی کالج

(۱)

اُردو ادب کے سخت کوش مورخین کی مخلصانہ کاوشوں نے ولی کے متعلق یوں تو بہت کچھ مسالا کھود نکالا ہے جس کی بدولت آج ہمیں اُس کی زبان اور شاعری کے بارے میں بہت کچھ دلچسپ معلومات حاصل ہیں۔ لیکن اُس کی شاعری کے محرکات نیز وہ چیزیں جو دراصل اس کی شاعری کی جان ہیں ان کے متعلق ابھی بہت کچھ کہنا باقی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اُس کی ولادت، وطن، سیر و سیاحت اور عام شاعرانہ خصوصیات پر خاصی روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ لیکن محض انھیں چیزوں کا اعادہ کرنا میرے نزدیک کوئی جدت نہیں رکھتا۔

یوں تو ولی نے مختلف اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ اور ہر صنف میں اپنے کمال کا زور دکھایا ہے۔ قصیدہ، مثنوی، رباعی، ترجیع بند مستزاد، وغیرہ وغیرہ جن کے نمونے انجمن ترقی اُردو کے شائع کردہ کلیات ولی کی بدولت ہماری نظر سے گزرے، ان سے ہمیں اُس کی قادرالکلامی کا ثبوت ملتا ہے۔ لیکن وہ صنفِ خاص جو ولی کے کلام کی جان ہے، اور جس کی طرف اُس کے پیشرؤوں نے بہت کم توجہ کی ہے، وہ فن غزل گوئی ہے جس میں اُس نے اپنی حسن کاری اور اعلیٰ فن دانی کا بدرجہ اتم ثبوت دیا ہے۔ ولی غزل گوئی کے میدان کا مرد ہے جس کے نقش قدم پر چل کر بعد کے تمام شعراء، بالخصوص میر نے نام کمایا اور سرتاج شعرا کہلائے۔ اس مختصر سے مقالے میں اتنی گنجائش نہیں کہ میر اور ولی کا موازنہ کریں۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ گو میر کی استادی میں کلام نہیں۔ لیکن ولی کے کلام کی سیر کرنے کے بعد میر کی میری کی وہ اہمیت باقی نہیں رہتی۔ اُردو ادب کی تاریخ میں ولی اور میر کی خدمات گراں قدر ہیں۔ البتہ یہ بدقسمتی ہے کہ ولی کی حقیقی عظمت سے حال حال تک بہت کم لوگ باخبر تھے۔ یہ سراسر ہمارا اپنا قصور ہے کہ ہم نے اسے پردہ گمنامی میں رکھا۔

میر کے متعلق تاریخ کا یہ مقولہ زبان زد خاص و عام ہے کہ جو میر کا قائل نہیں وہ آپ بے بہرہ ہے۔ لیکن اس مقولے کو ولی کی بابت

کے شعر کو شیطان کہتے ہیں، بہت کم لوگ واقف ہوں گے۔ قاضی نورالدین حسین گجراتی کے مرتب کردہ شعرائے گجرات کے تذکرے سے ہمیں اس کا ثبوت ملتا ہے۔ ولی کی اشاعت کی ایک روایت تحقیق میں یہاں پر صاحب تذکرہ کے الفاظ میں وہی نقل کرتا ہوں۔ نقل است کہ روزے در مجلس سخن طرازان ۔ این شعر حیف نمودن در حد و شیطان بود ۔ تحسین نمود بیت این باده آشنا از بان حسن بر مجد وہ ولی و از کرد ۔ بیچے از اہل مجمع بدیہتہ این مصرع خواند بیت۔

ولی پر جو سخن لاوے اسے شیطان کہتے ہیں

طامع منفعل و حضرات خوش دل شدند۔

اس شاعر ولی کی والہانہ واقعیت کے جوہر خاص طور پر اس کی غزلوں سے کھلتے ہیں۔ ہم سب سے پہلے ردیف الف کی وہ غزل تقریباً تمام وکمال یہاں پیش کریں گے جس میں صاف و صریح طور پر ولی اپنے ایک محبوب کا خاص انداز و اہتمام کے ساتھ ذکر کرتا ہے۔ اس کے بعد جستہ جستہ اُن اشعار کا بھی ذکر ہوگا جن میں در پردہ اس کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن صاف معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کی چشم تخیل میں کسی خاص الخاص محبوب کا نقشہ ہے۔

پڑا یا دپڑا ہے لعل میں پرتو سجن تجھ مکھ کی لالی کا
بیاں ہے مہ سوں دست اروشن تر اتری صفا کمالی کا

ترا قد، مصرع برجستہ دیوان خوبی ہے
تری یو دیہ، بیت ابرو، شعر دستا ہی ہلالی کا

ترے لب کی حلاوت نے کیا مجھ طبع کو شیریں
ہوا ہے نقل مجلس، ذکر مجھ شیریں مقالی کا

نزاکت تجھ کمر کی دل نشیں ہے اس سبب ساجن
ہوا ہے شہرہ عالم میں مری نازک خیالی کا

رنگیلے شعر کا کرنا کیا تھا ترک مدت سوں
ترا یو قد ہوا ہے پھر کے باعث فکر عالی کا

ولی تجھ شعر کوں سن کر ہوئے ہیں مست اہل دل
اثر ہے شعر میں تیرے شراب پرتگالی کا

آیئے اس غزل کے چند اشارات سے ایک سراپا تیار کرلیں تاکہ آیندہ اشعار میں اس قبیل کے جہاں کہیں الفاظ یا اشارات برتے گئے ہیں۔ اُس سے اس دل نشین ساجن کی خصوصیات حسن کو ہم نظرانداز نہ کرسکیں۔ دراز قد، چھریرا بدن، نستعلیق چال، ایک خاص لچک کی کمر جس کو ولی نزاکت سے تعبیر کرتا ہے۔ بڑی بڑی غلافی اور رسیلی آنکھیں، کھنچی ہوئی محرابی ابرو۔ ابروؤں کے اوپر یا نیچے ایک خال اور ان سب کے مجموعہ شاداب اور قیامت بھری جوانی جس نے شاعر کی حسن کار آنکھوں کے سامنے ایک عجیب طلسمی منظر پیش کر رکھا تھا۔

ان کیفیات کو جس والہانہ انداز سے شاعر پیش کرتا ہے۔ اُس سے نہ صرف شاعر کا سارا وجود مرتعش نظر آتا ہے بلکہ اُس کے مسحور کن نغمے سننے والے بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ البتہ ان اُستادانہ نمونوں میں کہیں بھی وہ بوالہوسانہ رنگ نظر نہیں آتا جس

شفق رہو میں ڈوبا سرسوں پگ تک | تو باندھا سرسوں جب چیرا گلالی
ہوا تیرے خیالاں سوں، سراپا | مرا دل مثل فانوس خیالی
تری انکھیاں دسیں یوں بے پیے مست | پیالا گویا شراب پرتگالی
تری انکھیاں میں وو ڈورے دیکھ کر غنج | بنائی خلق نے ریشم کی جالی
ترے لب اور تیرے ابرو کوں دیکھے | پڑھوں شعر زلالی و ہلالی

ولی تب سوں ہوا ہے کار فرہاد
سنا جب سوں تری شیریں مقالی

بہرحال اس قبیل کے تمام اشعار سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ولی بے شک حسن پرست اور حسن کار تھا کیٹس (Keats) کی طرح اس کے نزدیک بھی حسن صداقت اور صداقت حسن ہے حسن حسن کی خاطر، اور فن فن کی خاطر۔ یہ ہے ولی کا مشرب حسن پرستی۔

(۲)

ولی کے مشرب حسن پرستی سے کہیں زیادہ اہم اُس کا خالص ہندی تخیل ہے جس نے اُس کے کلمات شعری میں ایک خاص دلکشی پیدا کر دی ہو۔ یہ خالص ہندی رنگ ولی کے بعد کے شعرا میں کہیں نہیں پایا جاتا۔ اُن کی شاعری ایرانی آب و رنگ میں رنگی ہوئی نظر آتی ہے۔ میں یہ ماننے کے لئے قطعی آمادہ نہیں ہوں کہ اُردو کے وہ شعرا جنھوں نے ولی کے بعد اردو زبان میں نغمہ سرائی کی محض فارسی شعرا کے نقال تھے۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ ان کی شاعری فارسی کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے۔ اور اُن کی رنگ آمیزیوں میں ہندی ماحول اور ہندی خصوصیات حسن کی جھلک نظر نہیں آتی۔

اس باب میں قدیم دکھنی شعرا بالعموم اور ولی خاص طور پر ہندیت کے علمبردار ہیں۔

آئیے اس نقطۂ نظر سے ہندی نسائیت کے چند دلکش مرقعوں کی بھی سیر کیجئے۔ یہاں بھی شاعرانہ کیف و مستی اور حسن کارانہ سحر آفرینیوں کا وہی عالم ہے۔

گجرات کا حسن اور سورت کی مورت زبان زد خاص و عام ہیں۔ اس کی گہرائیوں میں ولی کے ترک وطن کا راز بھی پوشیدہ ہے بھلا ولی جیسے آزاد مشرب اور حسن پرست انسان کے لئے اورنگ آباد اور بالخصوص عالمگیری عہد کے اورنگ آباد میں دلچسپی کا کیا سامان ہو سکتا ہے۔ اس کا دل تو حسن کی ہنگامہ زا فضا کے لئے بیتاب رہتا ہے وہ تو عبادت کے ساتھ کچھ نظارہ بازی بھی چاہتا ہے۔ اُس کی آنکھیں تو شریت حسن کی متلاشی رہتی ہیں۔ چنانچہ عالمگیری عہد کا یہ کنھیا شریت کی تلاش میں گجرات کے مندروں، پنگھٹوں، اور زردشتی معبدوں کی بھی سیر کرتا نظر آتا ہے۔ دیکھئے نسوانی اور برہمنی حسن کی صداقت شعارانہ مرقع کشی ولی سے پہلے یا بعد اس تفصیل کے ساتھ اور بھی کہیں ملتی ہے جیسا کہ اس جگہ اتنے شمار رہے کے سراپا میں پیش کی گئی ہے۔

مت غصّے کے شعلے سوں جلتے کوں جلاتی جا
ٹک مہر کے پانی سوں یو آگ بجھاتی جا

تجھ چال کی قیمت سوں دل نئیں ہے مرا واقف
اے مان بھری چنچل ٹک بھاؤ بتاتی جا

اس رین اندھیری میں مت بھول پڑوں تس سوں
ٹک پاؤں کے بچھوؤں کی آواز سناتی جا

مجھ دل کے کبوتر کوں پکڑا ہے تری لٹ نے
یہ کام دھرم کا ہے ٹک اس کوں چھڑاتی جا

تجھ مکھ کی پرستش میں گئی عمر مری ساری
اے بت کی پجن ہاری اس بت کوں پجاتی جا

تجھ عشق میں جل جل کر جوگی کی لیا صورت
یک بار اری موہن چھاتی سوں لگاتی جا

تجھ گھر کی طرف سندر رہتا ہے ولی دائم
مشتاق ہے درشن کا ٹک درس دکھاتی جا

یہ دیکھیے غصّے دار، جڑاتی ساڑی، دو گھیر دار گھونگھٹ ، . . وہ دلکش سوغاتی ادائیں ہیں اس کے ساتھ والہانہ انداز بیان اور کلام کی روانی بھی ملاحظہ ہو۔ چستی اور برجستگی کا یہ عالم کہ بقول شخصے قافیے پاؤں پہ گرتے ہیں کہ باندھو ہم کو

تجھ مکھ پہ اے صنم گھونگھٹ ہے شوخ تجھ گھونگھٹ کا
دیکھیں سوں لٹ گیا دل تیری زلف کا لٹ کا

کیا دیکھ کپٹ کوں پڑتے ہیں اشک ٹپ ٹپ (برسات)
کم بات کرتا ہوں شکوہ تری کپٹ کا

تجھ نین دیکھنے کوں دل ٹھاٹھ کر چکا تھا
غمزے کے دیکھ ٹھٹھ کوں ناچار ہو کے ٹھٹکا

ہرگز ولی کسی کن اپنے پاس آشنا کی ترانہ ہوتا
گر تجھ میں اے ہٹیلے ہوتا نہ طور ہٹ کا

ایک ہی ردیف و قوافی کی دو غزلوں کے چند اشعار اور پیش کرتا ہوں یہاں بھی لوچ ہی لوچ ہے۔ الفاظ کا اہتمام بھی ایسا کیا گیا ہے کہ شاعر، مولانا احسن مارہروی کا صوفی نہیں بلکہ گجرات کا پریم پجاری معلوم ہوتا ہے۔

براگی جو کہاتے ہیں نہیں گھر بار کرنا کیا
جوگی جوگن جو کنی پی کی سے سنسار کرنا کیا

جو چوسے پریت کا پانی اسے کیا کام پانی سوں
جو بھوجن غم کا کرتے ہیں انھیں آدھار کرنا کیا

لگی تمناؤں اور زانی یو سوت اور زر نہ سب
ڈھلے جیو سوں جو ہو بیزار اسے ضبط کرنا کیا

مندے گھر داسوں باہر کر اپس کے آپ ضعف ہو
نکالا جیو جو یک یک کر تا با بیسار کرنا کیا

اگے جب سوں نہ آنے کی تھی نسا سن میں تنک
تو مجھ سوں دیکھ ہے سوں پھر جھٹا اقرار کرنا کیا

تو مجھ آشنا کی بات اور مجھا یا تیوں انکھاں اپنی
تو بیگانہ کہ مجھ تیں مجھ کوں یو مکھ بلا کرنا کیا

اپھیاں جب تلک مجھ سوں نہ بولیں گی ولی آکر
مجھے تب تک کسو سوں بات اور گفتار کرنا کیا

ایک اور مثال، ہندی نسائیت اور حیا کی کیا پیاری تصویر ہے!

سجن تم مکھ ستی کھولو نقاب آہستہ آہستہ
کہ جیوں گل سوں نکستا ہے گلاب آہستہ آہستہ

ہزاراں لالہ کے جوباں میں سجن میرے ہیوں یوں کہ
شاہ دیوں میں چھپے مہتاب جیوں آہستہ آہستہ

سلونے سانولے پیتم ترے مکھ کی جھلکاں نے
کیا عقد ثریا کوں خراب آہستہ آہستہ

نزاکت و حیا کی تصویر تو آپ نے ابھی دیکھی۔ ذرا تصویر کا دوسرا رخ بھی ملاحظہ ہو۔

چلنے میں اے چنچل، ہاتھی کوں لجاوے توں
بیتاب کرے جگ کوں، جب ناز سوں آوے توں

یک بارگی ہو نظارہ بے تابی مشتاقاں
جس وقت کے غمزے سوں چھاتی کوں چھپاوے توں

گویا کہ شفق بیچے خورشید ہوا ظاہر
جب اوٹ میں پردے کے چہرے کوں دکھاوے توں

ولی فلک کو میں انگشت تحیر لے
جب پازن نزاکت سوں مجلس میں بجاوے توں

اک تان سنانے میں جیو تان لیا سب کا
اب دل سوں گرو رجاویں، گر بھاؤ بتاوے توں

توبہ کے پیالی سوں شاید کہ کرے توبہ
اس وقت ولی کوں گر یک جام پلاوے توں

ایک آخری مثال، یہ دیکھیے نسوانی حسن کی عام اور خاطر نشین ادائیں جو گجراتی اور ہندی خصوصیات سے گزر کر عام نسائیت کی آئینہ دار ہیں غزل تمام و کمال پیش کی جاتی ہے تاکہ یہ نہ خیال ہو کہ شاید انتخاب سے کام لیا گیا ہے۔

ہوش کھوتی ہے نازنیں کی ادا
سحر ہے سرو گل جبیں کی ادا

گر ہو مطلوب تجھ کوں نقش مراد
دیکھ اس کی بھواں کی چیں کی ادا

ہوش بس میرا نہیں رہا مجھ میں
جب سوں دیکھی ہے نازنیں کی ادا

اے ولی دل کرے آب کرتی ہو
نگہ چشم سرمگیں کی ادا

اہے سورت حقیقت کی نشانی — کہ ہیں مور دواں اہل معانی
شرافت میں یہ ہی جیوں باب کعبہ — تو ہو سب ملک پر اس کا جو سکہ
اگر دیکھے ہیں لوگاں شام و تبریز — نہ دیکھا کوئی ایسا ملک زرخیز
اتی (اتنی) آتش پرستاں کی ہی بستی — سکے نزد واں آتش پرستی
زنگی اس میں بستے ہیں گگر پوش — مذہ ہاں جن کی گنتی میں ہی بیہوش
وہاں ساکن لتے ہیں اہل مذہب — کہ گنتی میں نہ آویں اُنکے مشرب
اگرچہ وہ ہیں سب ابنائے عالم — ولے بینش میں رنگا رنگ عالم
بھری ہی بیت صورت سورت — ہراک صورت ہی واں انمول مورت
ختم ہی امرداں پر رو صفائی — ولے ہے بیشتر حسن نسائی
کشن کی گوپیاں کی نہیں ہی یہ نسل — ہیں سب گوپیاں وہ نقل یہ اصل
نہ لئی دقت سوں کھینچے شوخ چنچل — وہ مکہ کے باغ کن دیوار آنچل
نظر بھر کر دیکھو ہر گل بدن کوں — کہ ہی پڑدے سوں بے پروا امن کوں
شہر بھیتر جو آوے نہان کا دن — ہندو کی قوم کے اشنان کا دن
ہر اک جانب دکھوں میں فوج در فوج — تجلی کے سمندر کی اُٹھے موج

نین کی بیٹھ کشتی پر توں اے پاک
یہ طے کر سیج میں موج خطرناک

آخر میں ولی کی صوفیانہ شاعری کے متعلق جس کا بعضوں نے اتنا بستار باندھا ہے، چند کلمات کہنا نا بے محل نہ ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ ایسا شخص جو اتنا دل پھینک واقع ہوا ہو، بھلا اُس کی زد سے اللہ میاں بچ سکتے ہیں؟ لیکن اللہ میاں پر بھی کبھار نگاہ غلط انداز پڑ جایا کرتی ہے۔ ولی کی شاعری کا خاص رنگ یہ نہیں ہے۔ اس باب میں بعض قدیم تذکرہ نویسوں کی طرح "کلیات ولی" کے فاضل مرتب کو بھی دھوکا ہوا ہے کہ انھوں نے ولی ویلوری کی "دہ مجلس (روضۃ الشہدا)" کو ولی اورنگ آبادی سے منسوب کر کے اس غریب کو اچھا خاصا مذہبی اور صوفی شاعر بنا دیا ہے۔ ولی اپنے رنگ میں بے شک ولی تھا۔ لیکن تصوف کی ولایت سے اُسے یوں سرفراز کرنا سراسر زیادتی ہے۔

یوں (دوستاں کے ہجر میں داماں) ہیں سینے پر ولی　　　(صحرا کے دامن کے اُوپر) جیوں (نقش پائے آہواں)

کیونکہ (میری) آہ (حسن) سوں تیرے　　　(دھوپ کھانے) سوں (پیٹ بھرتا) ہے؟

اے ولی (شہر حسن) کے اطراف　　　(خط) سوں اُس کے (حصار) ڈالے ہیں

مجھ سوں (وحشی) ہیں (گل رخاں) گویا　　　(فوج آہو) میں (سبزہ) آیا ہے
(مشوش)

کہاں تک مثالیں دی جائیں۔ اس قبیل کے صدہا اشعار ولی کے دیوان میں موجود ہیں جو دیکھنے والے کے دامن توجہ کو اپنی طرف کھینچتے ہیں

میں اب دوسری طرف متوجہ ہوتا ہوں۔

چند نمونے سہل ممتنع عبارت، اور اُس حلاوت خاص کے بھی پیش کروں گا جسے عام طور پر غزلیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ دیکھئے تو ولی کے یہ اشعار کیف و مستی میں کس قدر ڈوبے ہوئے ہیں۔ غزل میں سب کچھ ہو لیکن یہ نہ ہو تو کچھ نہیں۔

آشنائی نہیں تو جاتا ہوں　　　کیا کروں جی اداس ہوتا ہے
کیونکہ لپٹے نہ زلفوں تیرے غم میں　　　عاشقی میں نباہ مشکل ہوتا ہے؟
تجھ جدائی میں نہیں اکیلا میں　　　درد و غم آس پاس ہوتا ہے

یک نگہ میں غلام کرتے ہیں　　　خوب رو خوب کام کرتے ہیں
دیکھ خوباں کوں وقت ملنے کے　　　کس ادا سوں سلام کرتے ہیں
کم نگاہی سوں دیکھتے ہیں و لے　　　کام اپنا تمام کرتے ہیں
کیا وفادار ہیں کہ ملنے میں　　　دل سوں سب رام رام کرتے ہیں

یہ مرا رونا کہ ہے تیری ہنسی　　　آپ سن ہنسنا پرسی ہے پرسی
رات دن جگ میں رفیق بیکساں　　　بے کسی ہے بے کسی ہے بے کسی

(۱)

معشوق عربدہ جو

شوخ نکلا جب قدم کوں تیز کر — حسن کے شبدیز کوں مہمیز کر
یک بیک آیا ادا سوں مجھ طرف — ہر پلک کوں دشنۂ خونریز کر
میں لیا یوں عرض از روئے نیاز — مہربانی اس کی دستاویز کر
کہہ آپس کے نرگس بیمار کوں — عاشقاں کے خون سوں پرہیز کر
اے ولی آ تا زدہ مقصود دل — خانۂ دل خون سوں رنگ آمیز کر

(۲)

سوال وجواب

جب ان دو نازنیں کی میں دیکھا ہوں چھب عجب — دل میں مرے خیال ہی تب سوں عجب عجب
بے تاب ہو کے مثل گدایاں نزیک جا — بے باک ہو کے تب یو کیا میں طلب عجب
دہن سوں ترے بندہ بادام کا سوال — سن یو سوال دل میں رہا بستہ لب عجب
(ق)
بولیا مری نگاہ کی قیمت ہیں دو جہاں — جس دیکھنے کوں دل میں ترے ہے طلب عجب
اس دولت عظیم کوں یوں مفت مانگنا — لگتی ہے مجھ کو بات تری بے ادب عجب
کیتا میں اس سوال میں دوجا بھی اک سوال — کر بہرہ مند لب سوں کہ تیرے ہیں لب عجب
یکبار اس سوال میں سن یو دوجا سوال — دل میں رہا آپس کے وہ شیریں لقب عجب
اول تو شوخ آ کے غضب میں غصہ کیا — ترا قدم چو ناز اٹھا وو غضب عجب
آخر آپس کے ہمت عالی پہ کر نظر — شیریں لباں سوں اپنے چکھایا رطب عجب

(۳)

معشوق سے

چھوڑ اے شوخ طرز خود کامی — مت ہو ہر دیدہ باز کا دامی

تجھ لب و زلف کے تماشے کوں — چل کے آئے ہیں مصری و شامی
زلف تری ہوئی ہے چرب زباں — حفظ کر کر قصیدۂ لامی
باغ میں تجھ انکھاں سوں پایا ہے — گل نرگس تخلص جامی
اے نگیں لب دیا ہے حق نے تجھے — زرنگاران حسن میں نامی
چشم بکتا ہوں سب سجن کر پڑھوں — تجھ نگہ سوں قصیدہ جامی
اے ولی غیر شغل حرف دگر — پختہ مغزاں کنے ہے خامی

(۴)

زندگی

سوں وصل جگ میں ہو کیونکا [illegible] زندگی — [illegible] انداز ہے جس کوں [illegible] زندگی
ب [illegible] نیاں سیر گلشن ہے [illegible] — جنت احباب ہے معنی [illegible] زندگی
[illegible] میری نظر میں کعبہ [illegible] — [illegible] دیکھو [illegible] اے چشمہ [illegible] زندگی
جب سوں دیا نہیں نظر [illegible] کامل [illegible] — آب [illegible] پیاسا ہے [illegible] زندگی
کیوں نہ ہوئے اے ولی روشن شب قدر حیات — [illegible] ہم [illegible] زندگی

(۵)

عاشقی

(وہی قوافی رکھے ہیں جو گزشتہ غزل میں آئے ہیں۔ کیوں نہ ہو ولی جیسے عاشق مزاج انسان کے لیے زندگی عبارت ہے عاشقی سے
عاشقی نغمہ نشاط اور غزل حیات ہے)

کیوں نہ آوے نشہ غم سوں دماغ عاشقی — بادۂ حیرت سوں ہے لبریز ایاغ عاشقی
آب سوں دریا کے ہرگز کام نہیں عشاق کوں — گریۂ حسرت سوں ہے سرسبز باغ عاشقی
گر طلب ہے تجھ کوں راز خانۂ دل بوجھیاں — آہ کی آتش سوں روشن کر چراغ عاشقی
درمنداں باغ میں ہرگز نہ جاویں اے ولی — گر نہ دیوے نالۂ بلبل سراغ عاشقی

(۶)

سراپا شعر

(اس شوق کی آخری مثال۔ دیئے ہوئے اشارات سے آپ ہی بتایئے کہ آیا یہ وہی نہیں جو مدت العمر ولی کے قلب و دماغ میں بسا ہوا تھا؟ ایک ایک ادا کو شاعرانہ نام یا تخلص سے منسوب کیا ہے)

ترا لب مشرقی، حسن انوری، جلوہ جمالی ہے — نین جامی، جبین فردوسی و ابرو ہلالی ہے

ریاضی فہم، گلشن طبع و دانا دل، علی فطرت — زباں تیری فصیحی و سخن تیرا زلالی ہے

نگہ میں فیضی، قدسی، سرشت طالب و شیدا — کمال بے بدل اہلی و انکھیاں سو غزالی ہے

توہی ہے خسرو روشن ضمیر و صائب و شوکت — تری ابرو یو مجھ بیدل کوں طغرائے وصالی ہے

ولی تجھ قد و ابرو کا ہوا ہے شوقی و مائل
تو ہر اک بیت عالی اور ہر مصرع خیالی ہے

ولی کی اس والہانہ سوکا بی کے آگے سعدی کا یہ "آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری" پھیکا پڑ گیا۔

میں اس سلسلۂ انتخاب کو اب ختم کرتا ہوں۔ حق یہ ہے کہ ولی کا سارا کلام کیف مستی اور جذبات میں ڈوبا ہوا ہے یہاں وہ نشتر زنی نہیں جو میر کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ سارا کلام ہمارا اور گلے کی حمائل بنانے کے قابل ہے۔

"پستش بغایت پست و بلندش بغایت بلند" کا فتویٰ ولی پر صادق نہیں آتا۔ وہ ہر رنگ میں میر ہے اور میر صرف ایک رنگ میں۔ وہ تنوع جو ولی کے ہاں پایا جاتا ہے میر کے ہاں نہیں۔ ولی زندگی کے ہر پہلو کی ترجمانی کرتا ہے اور میر صرف ایک پہلو کی۔ میر سراپا قنوطیت ہے اور ولی سراپا زندگی اگر اب تک وقت نہیں آیا تھا تو کم از کم اب وقت ہے کہ ؎

ولی ایران و توران میں ہو مشہور
اگرچہ شاعر ملک دکن ہے

مطربِ اوّلیں

(از)

مولوی محمد عبد القیوم خاں صاحب باقیؔ ایم۔ اے (عثمانیہ)

یاد ایام کہ اس خاکِ وطن پر کوئی — لذتِ دردِ محبت سے خبردار نہ تھا

صحنِ گلشن میں نہ تھی بلبلِ شیدا کی پکار — پھول کھلتے تھے مگر کوئی طلبگار نہ تھا

پتیاں غنچۂ نازک کی مچل جاتی تھیں — غم مگر سینۂ گلچین میں بیدار نہ تھا

روز چلتی تھی مہکتی ہوئی گلشن میں نسیم — بوئے گل کا کوئی معصوم خریدار نہ تھا

آہ و فریاد سے مدہوش نہ رہتی تھی فضا — قفسِ تنگ میں اک مرغ گرفتار نہ تھا

گوشے گوشے سے چلی آتی تھی لیلیٰ کی صدا — گوشِ دیوانۂ مجنوں پسِ دیوار نہ تھا

وائے ناکامیٔ تقدیر کہ ہر عاشق کے — درد تھا دل میں مگر قابلِ اظہار نہ تھا

خشک سینوں میں نہ تھی خارِ تمنا کی خلش — آنکھ پُر درد نہ تھی نالہ شرربار نہ تھا

ذوقِ نغمہ سے بہت دور تھے اہلِ محفل

کوئی اس جرم کا قابل نہ سزاوار نہ تھا

اے خوشا بخت کہ بیدار ہوئی محفلِ عشق
درد سینے میں اٹھا، شوق کا آغاز ہوا!

گوشِ انساں نے سنی، لَے میں کہانی دل کی
نغمہ زن انجمنِ درد کا ہر ساز ہوا

نالۂ عشق جو سینہ میں چھپا رہتا تھا
آسمانوں کی طرف مائلِ پرواز ہوا

آنکھ میں حسن کے دیدار کی لذت ہی نہ تھی
اس کا ہر گوشہ اب اک انجمن ناز ہوا

غنچۂ باغِ نظر کھلنے لگا وقتِ سحر
بلبلِ گلشنِ دل زمزمہ پرداز ہوا

اشک آنکھوں میں جب آئے تو طبیعت مچلی
شورِ ہنگامۂ ہستی اثر انداز ہوا

جب اٹھا نالۂ دل دردِ محبت بن کر
ہر ستارہ شبِ غم گوش بر آواز ہوا

ہو گئیں سیکڑوں خاموشیاں صدقے اس پر
نالۂ شوق جو منت کشِ آواز ہوا

اے ولی سب تیری آواز سے بیدار ہوئے
فاش جب سارے زمانہ پہ ترا راز ہوا

آ تجھے نذر دوں اک نالۂ مضطر اپنا
کیونکہ نالے کا ترے عہد سے آغاز ہوا

نغمۂ عشق زمانے کو سکھایا تو نے
ہائے کس شوق سے تو پہلے نوا ساز ہوا

چاہتا ہوں کہ تری طرح جگاؤں دل کو
نغمہ ابتک نہ سنا تھا وہ سناؤں دل کو

کیا تری بزم سے فریاد ملیگی کہ نہیں
آرزو کی مری کچھ داد ملیگی کہ نہیں

زبان سے یہ جملہ ادا ہوا، اور میں نے چپ سی سادھی، اور غور کرنے لگا۔ آہ دکن، تیری بدنصیبی! اردو کا سب سے پہلا شاعر، تیری مبارک زمین سے اٹھا۔ دو سو برس کے بعد دنیا اتنے بھی تجھ سے اس طرح چھین لینا چاہتی ہے! پھر خیال آیا، یہ اتنا آسان نہیں، جو دیوان، یعنی وہ پہلا مرقع جس میں ایک شاعر کے نقوش خیال، حسن ادا اور حسن تصور بنکر، دنیا کی آنکھوں کے سامنے پیش ہوا، دکن کے خیال اور زبان کا وہ مستقل خزانہ ہے جسے کوئی دوسرا ملک تاریخی حیثیت سے اپنا نہیں بنا سکتا اور نہ اس کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ دیوان ولی، ہمارے وطن کی پیداوار ہے اور جبتک ذوق ادب قائم ہے یہ ہمیشہ اس کا ثبوت دیتا رہیگا!

شاعر کی آفرینش حضرات! غور فرمائیے، کسی سرزمین پر، کسی قوم میں، ایک شاعر کا پیدا ہونا کوئی معمولی سی بات نہیں ہے جسے واہ واہ کر کے ٹال دیا جائے۔ شاعری کی دیوی کے تیشے پرستار **شیلے** نے کہا تھا "انسان کی آواز اور تکلم بھی شعر ہے"! اس جملے کے مفہوم سے زیادہ اس رنگین تصور، اس وجدانی خیال، اس ذوق نغمہ، اور اس بیتابی دل کی داد دیجئے، جس کی بدولت یہ آٹھ لفظوں والا جملہ پیغمبرانہ پیام بنکر اسکی زبان سے نکلا، جب ہر انسان کی آواز اور تکلم بھی شعر ہے تو پھر شاعر کی آواز اور اسکے تکلم کا کیا عالم ہوگا!

ایک بے چین سرزمین، ایک مٹتے ہوئے تمدن، ایک سیاسی طوفان میں گھرے ہوئے ملک اور ایک مظلوم قوم کی حالت زار کا اندازہ کرنا دشوار ہے۔ ایسے وقت جبکہ سرزمین دکن کا ذرہ ذرہ، ایک آہ، ایک آنسو ہے، وہاں، ذوق، نغمہ، حسن اور ترنم کو کیا دخل ہو سکتا ہے، مگر قدرت بھی عجب سادہ و پُرکار واقع ہوئی ہے کہ بعض وقت بقول اقبال۔

تو جو چاہے تو اُٹھے سینۂ صحرا سے حباب ۔۔۔ رہرو دشت ہو سیل زدۂ موج سراب

وہ انسان کے آگے اپنے نت نئے کرشمے پیش کرتی رہتی ہے اور انسان انھیں دیکھ دیکھ کر حیران ہوتا رہتا ہے۔

یہی دکن میں ہوا۔ دیکھتے دیکھتے ساری زمین رنگین ہوگئی، ہواؤں میں مہک، پھولوں میں دلفریبی اور بلبل کی آواز میں درد پیدا ہوگیا، انسان کے آگے خیال کی موج، نغمے کے رنگ اور تصور کے جلوے، الفاظ اور رنگین الفاظ کے قالب میں بیتاب ہونے لگے۔ ماہتاب کو دیکھو تو ایسا معلوم ہوا گویا محبوب مسکرا رہا ہے، درخت پر نظر ڈالو تو شادابی بہار، اور صبح کی ٹھنڈی ہوائیں اس پر جھولا جھول رہی ہیں، ستارے گا رہے ہیں، شفق آسمان کے چہرے پر غازہ مل رہی ہے، خاک کے فرش پر قدرت کی سب سے زیادہ پیاری صنعت یعنی ہمارے شاعر کے الفاظ میں "سجن" اس طرح قدم اٹھا کر چل رہا ہے جیسے تاروں کے جھرمٹ میں مہتاب (یہی وہ

تشبیہ ہے جو ہمارے شاعر نے اپنے ایک شعر میں لکھی ہے اور کل یہ شعر آپ کے سامنے پڑھا گیا تھا) اچھا تو گویا
شاعر کیا پیدا ہوا، دل کی آنکھیں کھل گئیں، نگینوں نے دربار سجایا۔ غور فرمائیے، کیا یہ قدرت کی کوئی
معمولی نعمت ہے؟

شعر اور تدوین | اس سے ایک قدم آگے بڑھیے تو شاعر نہ صرف ہمیں شعر کی دولت بخشتا ہے بلکہ اس دولت
کو ایک جگہ اکٹھا کر کے قوم کے سپرد کر جاتا ہے تاکہ وہ اُسے سنبھال کر رکھے، اور اُسے اپنی ادبی تونگری اور حسن کارانہ
سرمایہ کا جیتا جاگتا ثبوت بنا کر پیش کرتی رہے۔ یہ گویا ایک لازوال خزانہ ہے جس کا خرچ کرنا اصلی آمدنی
بڑھاتا ہے!

نغمۂ عشق | ایک قدم اور آگے چلئے تو معلوم ہوگا کہ ابھی انسان نے دیکھنا تو سیکھا، بولنا بھی سیکھا تھا۔ کونسی
بولی؟ قدرت کی صنعتوں پر دیوانہ وار گرنے، اُن کی خوبیوں کے بیان ہونے کی بولی۔ دل کی بولی۔ آنکھ کی
بولی۔ نغمے کی زبان اور ترنم کا پیرایہ بیان۔ ایک انسان نے زمانے کو نغمۂ عشق سکھایا، دل کی نگینیوں کو زبان
سے ادا کرنے، اور ذوق نظر کی لطافتوں کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے اپنے شعروں کی صورت میں خوبصورت
سانچے بنا دیئے۔ اگر ادب کے اس فیض اولین، اور کسی ادبی ہیئت کے نقش اول کی تاثیروں کا بغور مشاہدہ کیا
جائے تو بعد آنے والے بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں کی حقیقت بہت کچھ بے نقاب ہو جاتی ہے اور اُنکی
عظمت و شان کے حقیقی راز دنیا پر کھل جاتے ہیں۔ ادب درحقیقت ایک چراغ ہے، اور اسی دیات دوسرے
دیئے جلتے رہے ہیں، بڑا محترم، بڑا بلند پایہ ہے وہ شخص جو پہلے ادب کا چراغ جلاتا اور ایک ادبی سلسلہ میں
اُجالا کرتا ہے!

تاریخ پر روشنی ڈالنے والے فاضل مقررین نے کل آپ کے سامنے بتا دیا کہ ولی سے بہت پہلے کئی شعرا
اور صاحبان تصنیف کے دور گزر چکے ہیں لیکن ولی خود اپنی زبان سے کہتا ہے ۔۔ اہل تحقیق نے تسلیم بھی کر لیا ہے
کہ ریختہ کا پہلا بلند پایہ شاعر اور مکمل کلیات کا مرتب وہی ہے اور یہی دکن میں اس کا بڑا کارنامہ ہے!

کل کے مضمون میں ایک فاضل مصنف نے فرمایا کہ ولی بڑا حسن پرست تھا۔ اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟
ہر سچا شاعر حسن پرست ہی ہوتا ہے۔ اس تاریک عہد میں جبکہ اہل زمین کو حسن کی نہ پرستش کرنی آتی تھی اور نہ ان
کے ذوق نظر کی ترجمانی کے لئے زبان تھی، ایک حسن پرست نے "ریختہ گوئی" سکھائی گویا اہل دل کو حسن مجازی
کے تصورات اور اظہار خیال کے لئے مستقل سانچے بنا کر عشق کے آسمانی رستے لگا دیا۔ اب ان سالکوں کا کام

کہ وہ اس آراستہ گلشن کا نظارہ کرتے ہوئے اپنے اپنے حوصلوں کے مطابق آگے بڑھتے جائیں۔ یہ ایک بدیہی امر ہے کہ ابتدائی سانچے خام اور بھونڈے ہوتے ہیں لیکن ہمارے شاعر نے وہ سانچے بنائے جو بالکل نئے پختہ، مستقل اور خوبصورت تھے اور ابتک بھی محبت بھری نظروں سے دیکھے جانے کے قابل ہیں! آئیے ان سانچوں پر ایک نگاہ ڈالیں اور انکی خوبصورتی کا اندازہ کریں۔

شعر کے سانچے | یہی بات تو یہ ہے کہ ہمارے شاعر کے ہاں مختلف بحروں اور زمینوں کی اتنی کثرت پائی جاتی ہے جسے دیکھ کر پہلے ہی اسکے ذوق و نظر کی وسعت کا اندازہ ہونے لگتا ہے۔ دیوان (مطبوعہ انجمن ترقی اردو) شاہد ہے کہ اسمیں طویل اور مختصر بحروں کی کتنی رنگا رنگی موجود ہے۔ یہ گویا جذبات کے سانچے ہیں اور ان کا تنوع بتاتا ہے کہ اس مطرب اولین کے دل میں جذبہ اور تصور کی کتنی صورتیں قالب بند ابھرتے تھے۔ جذبات کا سانچہ بنانا حسن کاری کا ایک اہم مقدمہ ہے۔ اسمیں سجاوٹ اور دلکشی پیدا کرنے کے لیے ایک اہل نظر صاحب دل کی ضرورت ہے۔

زبان نغمہ | شعر جس طرح خیال کا عکس اور تصور کا آئینہ ہے اسی طرح الفاظ کی زنجیر بھی ہے۔ ان الفاظ کی رگوں میں ضروری ہے کہ نغمے کا خون دوڑتا رہے۔ خیالات میں سمندر کی لہروں اور اسکی تہ کی طرح چمک اور چھاؤں پائی جائے۔

ولی کے جذباتی سانچے سمندر کی موج کی طرح چلا کیے اس میں الفاظ کی شیرینی ایسی ہے جیسے بہتے پانی میں ہلکا ہلکا ترنم۔ اپنے ایک شعر میں اپنے محبوب کو مخاطب کرکے کہتا ہے۔

(۱) آج گلگشتِ چمن کا وقت ہے اے نو بہار — بادۂ گلرنگ سوں ہے جام گل لبریز ہے

اسی طرح نزاکت خیال اور لطافت ادا دیکھیے، حسن کا شیریں نغمہ محبوب کی تعریف میں گاتا ہے۔

(۲) آغوش میں آنے کی کہاں تاب ہے اسکو — کرتی ہے نگہ جس تن نازک پہ گرانی
مت دور ہو اک آن ولی پاس سے ہرگز — اے باعث جمعیت ایام جوانی

ایسے دور میں جبکہ آواز انسانی سینوں کے اندر دفن اور گوش ذوق نغمے سے خالی تھے ہمارے شاعر نے ایک مکمل نغمہ سنایا۔ ایک "زندگی کا راگ" سناتا ہوں اور یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ ہمارے کان جدید طرز شعرگوئی سے واقف ہیں میں آپ کو اس قدیم نغمے کی صفائی اور ترنم کی طرف متوجہ کرتا ہوں۔

اسکو حاصل جگ میں ہو کیونکر فراغ زندگی — گردش افلاک ہے جسکو ایاغ زندگی
بے عزیزاں سیر گلشن ہے گل داغ الم — جنت احباب ہے معنی میں باغ زندگی
آسماں میری نظر میں کلبۂ تاریک ہے — گر نہ دیکھوں تجھکو اے چشم و چراغ زندگی

کیوں نہ ہووے اے ولی روشن شبِ قدرِ حیات — ہے نگاہِ گرم گل رویاں چراغِ زندگی

غالب اور ولی | مرزا[1] غالب دہلی کے وہ بڑے شاعر ہیں جنہوں نے قدیم طرزِ غزل گوئی کے قالب کو بدل ہی دیا۔ ہاں جس کمال سے بدلا وہ ہم میں سے ہر ایک صاحب ذوق جانتا ہے۔ آپ نے غور فرمایا ہوگا کہ ہر زمانہ میں سیکڑوں شاعر پیدا ہوا کرتے ہیں اور اُن میں سے اکثر اسی معمارِ سخن کی معنی آفرینی اور طرزِ ادا کی پیروی کرنی چاہتے ہیں مگر انھیں قدم قدم پر ناکامی ہوتی ہے۔ ہمارے شعر یا تو مہمل الفاظ کا مجموعہ ہوتے ہیں یا خشکی اور بے کیفی کی تصویر۔ یہ حال اُردو کے ایک ترقی پذیر دور کا ہے۔ ولی۔ غالب کی طرح اُردو کا اولین معمار ہے۔ ہم اس نقطۂ نظر سے جب اسکے کلام کو دیکھتے ہیں تو نہ صرف اسمیں بے عیبی کا جوہر پاتے ہیں بلکہ دورِ غالب کی پختگی اور ارتقا کے بھی عمدہ نمونے دیکھتے ہیں۔ زبان، تشبیہات، استعارے، تراکیب لفظی اور معنوی نہایت شستہ، رفتہ، پُرلطف اور دلکش ہیں جنھیں دیکھکر بار بار نظر کا استعجاب پیدا ہوتا ہے۔

قدرتِ سخن | قادر الکلامی ولی کی خاص صفت ہے۔ کہیں بندش میں کوئی جھول یا ادائے خیالات میں ڈھیلی تنگی نہیں پائی جاتی۔ الفاظ نہ سقیم ہیں اور نہ زائد۔ مشکل سے مشکل بحروں میں بھی اپنا مضمون اتنی خوبی اور پاکیزگی سے ادا کر جاتا ہے جس طرح بلبل شاخِ گل پر بغیر کسی تکلف کے نغمہ سرا ہوتا ہے۔ زبان پر قدرت مسلّم استادی کی دلیل ہے۔ اسی قدرت کی جولانیوں نے ولی کے سامنے اصنافِ سخن کے بہت سے میدان کھولدئے۔ قصیدہ، رباعی، مثنوی، قطعہ، مستزاد، مخمس، اور چند دیگر اصناف اور صنعتوں میں اس نے حیرت انگیز طریقے سے شعر اور کمال شعر لکھے ہیں۔

کمالِ شعر | شعر کی صفت یہ ہے کہ وہ جس طرح اچھے خیال کا حامل ہو اسی طرح اچھے الفاظ کا قالب بھی اختیار کرے۔ ولی کے اولین نغموں میں متاخرین کا کمال اور پختگی پائی جاتی ہے۔ دیوان ان خوبیوں سے بھرا پڑا ہے۔ چند مختصر زمزمے آپ بھی سماعت فرمائیے۔

(۱) صبح و آفتاب شرف سے ہوا ہے آج — نقشِ پا اس زینت روئے زمین ہوا

(۲) ہر ایک بلبلِ مسکیں کا صید ہے باقی — عقیدہ ہے چمن حسن میں بہار ہنوز

(۳) جو دیکھیا وہ صاحب اختیار ہنوز — بجائے خود ہے قیباں کا اعتبار ہنوز

---

[1] (۱) دیوان ولی مطبوعہ انجمن ترقی اردو، صفحہ ۲۰۳
(۲) ایضاً صفحہ ۲۳۳
(۳) ایضاً صفحہ ۲۲۵

ولی جہاں کے گلستاں میں ہے تلف بہ خزاں　　ولے بحال ہے وہ سرو گلعذار ہنوز

---

(۳) بے شک کریگا خاطر عشاق باغ باغ　　آیا ہے التفات پہ وہ نوبہار آج
اطراف آسماں کے ہجوم شفق نہیں　　تجھ رنگ نے ہوا کو کیا لالہ زار آج

روانی | شعر کی دوسری خوبی اسکی روانی اور سلاست ہے۔ ایسے دور میں جبکہ "گیسوئے اردو" ابھی منت پذیر شانہ" تھا، رواں شعر لکھنا گویا ایک معجزہ دکھانا ہے۔

(۴) پھر میری خبر لینے وہ صیاد نہ آیا　　شاید کہ "مرا حال" اسے یاد نہ آیا

---

(۵) معشوق کو منہ نہیں عاشق کی آہ سے　　بجھتا نہیں ہے باد صبا سوں چراغ گل

زبان کی شائستگی | [۱] ہر بڑے شاعر کی طرح ولی ایک معمار زبان و سخن بھی ہے۔ شعر کہنا خود ایک بڑی تعمیر ہے، اور کامل شعر کہنا مستقبل کی پیغمبری ہے۔ ولی کے کلام میں بعض ایسی خوبصورت ترکیبیں ملتی ہیں جنکی جدید شاعری کو سخت ضرورت ہے مگر ڈھونڈے نہیں ملتی۔ مثلاً

پردہ شناسان دعا، سامان طغرائے نیاز، آتش سوار، ابر دریا بار، رشتہ سیماب، نور کا فانوس، گوہر کان حیا، آئینہ معنی نما، پریشانی فروش، نقش مراد آئینہ۔ آخری ترکیب کا مصرع ہے ع نقش مراد آئینہ تیرا خیال ہے

ترکیبوں کا حسن استعمال | ترکیبوں کی خوبصورتی اسوقت اور بھی نمایاں ہوتی ہے جبکہ یہ شعر میں اس طرح بٹھائی جائیں جیسے انگوٹھی میں نگینہ۔ ولی کے اشعار اسی طرح قیمتی نگینوں کی انگوٹھیاں معلوم ہوتے ہیں جنکی قیمت آج بازار میں بھی انمول ہے۔

ولی کا شعر جدید لباس میں | اسی طرح زبان کی روانی کا یہ حال ہے کہ دیوان کے سرسری مطالعہ ہی سے ولی کے ذوق شعر کا اثر دل پر جادو کی طرح ہونے لگتا ہے۔ سیکڑوں اشعار ایسے ہیں جن میں سے اگر سوں، سنے، بولیا،

سلہ (۱) ایضاً صفحہ ۴۶
(۲) ،، صفحہ ۱۰۶
(۳) ،، ،، ۵۸
(۴) ایضاً صفحہ ۸۰ یہ غزل کی غزل ایسی ہی صاف اور رواں ہے
(۵) ،، ،، ۱۳۶

دیا ہے۔ آب وہوا کی تعریف میں شاعر کے دو شعر مجھ سے بھی سماعت فرمایئے۔

(۳) صبح سن آب اسکی جگت میں کانپا — سمندر موج زن رگ رگ میں کانپا
کہ آب خضر کی ہے اس میں تاثیر — ہوا دیتی ہے اس کی یاد کشمیر

شیلے نے اپنی نازک ساعتوں میں کہا تھا۔

That Light whose smile kindles the universe.

آہ، شاعر کا یہ خیال کائنات کو تبسم ربانی کا اب نور بنا دیتا ہے حسن کے ذریعے وَلی نے بھی یہ رفعت ایک رُباعی میں حاصل کی ہے۔ کہتا ہے۔

* تجھ مکھ کا ہے یہ پھول چمن کی زینت — تجھ شمع کا شعلہ ہے چمن کی زینت
فردوس میں نرگس نے اشارے سے کہا — یہ نور ہے عالم کے نین کی زینت

تین مثالیں | شاعر کی نگاہ ایک شعلہ ہوتی ہے۔ شاعر کا دل کائنات کا سمندر ہوتا ہے۔ شاعر کی زبان زندگی کا پیام ہے۔ یہ شاعر اپنی زبان، اپنی روح کی حرارت اپنے شعلے، اپنا سمندر اور اپنا پیام بنا لیتا ہے تین مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

شعلہ نگاہ۔ (۱) آفتاب آتا ہے محو ہونے تجھ لوپ طرف — صبح صادق اس کے بر میں جامۂ احرام ہے
(۲) اس کے مشتاق ہیں سب اہل زمیں اہل سما — شوق کا جس نے لیا چرخ پہ خورشید علم

دل کا سمندر (۳) ہوئے غواص میں دریا میں دل کے دیکھا — صدف دل ہے حقیقت سے گہر کی محرم
دل کے دریا کو ترقی کے اُپر نت ہے نظر — اصلی نسبت ہے سمندر سے ہر اک آن میں کم

زندگی کا پیام (۴) بدخصلتی کے گل میں نہیں بوئے عافیت — اے عافیت کے ملک کی خواہش ہے سلطنت
خوش قسمتی کے ملک میں سے خوش خصال چل

از نقطہ جہان میں دنیا کی جستجو — اے بیخبر اگر ہے بزرگی کی آرزو
دنیا کی رہگزر میں بزرگوں کی چال چل

---

* دیوان ولی ایضاً صفحہ ۳۶۲ (۱) دیوان ولی صفحہ ۲۸۱ (۳) دیوان ولی صفحہ ۳۶۰
ایضاً ۱۹۱ (۲) ″ ۳۶۷ (۴) ″ ۳۲۵

کہتے ہیں کھُول پردہ شناسان مدعا　　　جو اوج میں ہوا کے اُڑے شاہباز ہے

زبان کی مشاطہ گری ولی نے لی۔ اور اس نے ... جو جو سامان آرائش اس نے استعمال کئے، وہی غازہ وہی رنگ، دیگر سخن آرایان ہند نے اندا... سے کام میں لائے۔ ولی کے مختصر گیتوں میں میر کی سخن آرائی کے لئے اس قسم کا سوز، چستی، گداز، اور اختصار پایا جاتا ہے۔ کہیں ذوق کے لئے قصیدہ گوئی کے نمونے ہیں، کہیں غالب کیلئے اسکی خاص بندش اور معنی آفرینی کے نقوش، اور کہیں خود جدید نظم نگاروں کے لئے نظم لکھنے کے خوبصورت مرقعے!

میر کے لئے　مجھکو تجھ بن کسی سے کام نہیں　　ننگ ناموس و ننگ و نام نہیں
زندگی جام عشق ہے لیکن　　فائدہ کیا اگر مدام نہیں
عشق اس کا ہے ناتمام بجسے　　پی کی خاطر کا اہتمام نہیں

غالب کیلئے (۱) درد مندوں کو سدا ہے قول طرب النغما　　گرمی افسردہ طبعاں شعلہ آواز ہے
بزم کو رونق دیا ہے جب سے وہ عالی مقام　　رشتہ آہ دل بے تاب، تار ساز ہے
(۲) غیر حیرت نہ خبر اس آئینہ رو کی کسے　　راز کے پردے میں جس کی خامشی آواز ہے
دیکھنا آئینہ رو کا امر مشکل نئیں ولی　　سد راہ سینہ صافاں، طالع ناساز ہے

خاتمہ | حضرات! مضمون طویل ہوتا جا رہا ہے۔ بہت کچھ کہنا ہے، بہت کچھ سُنانا ہے، کلام ولی ایسا نہیں کہ ایک مختصر مضمون میں اسکی ساری خوبیاں اُجاگر ہو جائیں۔ اسکے لئے مکمل ریسرچ اور ایک مبسوط تصنیف کی ضرورت ہے، کاش کسی کو توفیق ہو۔ آخر میں اتنا عرض کرونگا کہ ولی کی پختہ کاری ہمارے لئے بار بار نہ صرف حیرت کا باعث ہوتی ہے بلکہ اس کی اُستادی کا ڈنکا بجاتی ہے۔ ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں۔ نقش اول اور اتنا کامل! پہلا نغمہ اور اتنا بے نظیر! خصوصاً جبکہ ولی کی زبان ایسے دور سے متعلق ہو جس میں اُردو ہنوز عہد طفولیت میں تھی اور کسی کو شان گمان تک نہ تھا کہ یہ شوخ ایام جوانی میں شمالی ہندوستان جاکر زیور حُسن و خوبی سے آراستہ ہوگی۔ مگر اپنے قدیم عہد عافیت کو بُھلا دیگی۔ مبارک ہیں وہ ہاتھ جنہوں نے پہلے پہل اس دُلہن کو سجایا، اُسے پری پیکر بنایا اور ہندوستان کی سیر کے لئے سراپا شوق بنا کر دوسری طرف

(۱) ایضاً صفحہ ۲۷۰　(۲) ایضاً صفحہ ۲۶۹

بھیجی یا۔ وَلی نے اپنے ایک قصیدے میں غلط نہیں کہا تھا۔

"یقیں ہے مجھکو کہ گر یہ قصیدۂ رنگیں
سُنیں تو وجد کریں، انوری و خاقانی"

میں قصیدے کی تخصیص نکال کر کسی قدر تبدیل کے ساتھ یہ عرض کرونگا۔

یقین ہے مجھکو کہ یہ خوش ادا کلام وَلی
سُنیں تو وجد کریں، انوری و خاقانی!

ولیؔ دکھنی

از

مولوی بدرالدین صاحب شکیب بی۔ اے ال ال بی (عثمانیہ)

جہاں میں زندۂ جاوید تیری دُرفشانی ہے
ترے اشعار سے رنگین اُردو کی جوانی ہے

دکن کے نام سے روشن جہاں میں نام ہے تیرا
زبانِ ریختہ کا عہدِ نو پیغام ہے تیرا

تیری طبع رواں پر شوخیٔ گفتار قرباں ہے
ترے طرزِ بیاں پر نطقِ گوہر بار قرباں ہے

تیری آواز اک بانگِ دراتھی کاروانوں کو
سخن آموز تھی تیری زباں سب بے زبانوں کو

تیری ہر سعی و کاوش میں تھا رازِ زندگی پنہاں
نقوشِ اولیں میں تیری سازِ زندگی پنہاں

ولیؔ! آدیکھ تیری ابتدا کی انتہا کیا ہے
ولیؔ! آدیکھ تیری داستاں کا ماجرا کیا ہے

ولیؔ! گہوارۂ علم و ادب ہے پھر دکن اپنا
ولیؔ! فردوس برروئے زمیں ہے یہ چمن اپنا

۳۔ سلطان ابراہیم قطب شاہ سنہ ۹۵۷ھ سنہ ۹۸۸ھ

۴۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ سنہ ۹۸۸ھ سنہ ۱۰۲۰ھ

گارساں دتاسی

مترجمہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب ریڈر تاریخ کلیہ جامعہ عثمانیہ۔

ہر قوم میں شاعر نثر لکھنے والوں سے پہلے پیدا ہوتے ہیں۔ خیالات کی شوخی نظم ہی کے ذریعہ سے ظاہر کیجا سکتی ہے ردیف و قافیہ کی موزونی ان لوگوں کے لیے جو کم تعلیم یافتہ ہیں۔ یا جنھیں دماغ کاوی کی مشق نہیں ہے، باعثِ دلکشی ہوتی ہے۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ دنیا کی ہر قوم میں اعلیٰ درجہ کے شعرا کی تعداد اسی قوم کے مورخوں یا فلسفیوں کی نسبت زیادہ ہوتی ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ اول الذکر کے کلام سے ہر کس و ناکس محظوظ ہو سکتا ہے۔ اور آخر الذکر کی تصانیف کو صرف وہی پڑھتے ہیں جنھیں مطالعہ کا شوق ہے۔

ہندوستان میں قدیم زمانے میں نیز عہد وسطیٰ و جدید میں یہ بات دیکھی گئی ہے کہ عوام الناس کو خطاب کرنیکا بہترین ذریعہ شاعری ہی ہے۔ اسی سے ان میں اعلیٰ جذبات پیدا کیے جا سکتے ہیں۔ اور اسی کے ذریعہ مذہب و تمدن کے خیالات قانون و اخلاقیات اور غرضکہ ہر وہ چیز جس کا علم حاصل کرنا مفید ہو سکتا ہے، عوام کے سامنے پیش کیے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ قدیم ہند کی تمام تر سنسکرت کتب نظم میں ہیں۔ ہندوی (ہندوستانی) کی تمام کتب بھی نظم میں پائی جاتی ہیں۔ یہ زبان ہندوستان کی مشترک زبان ہے اور اس زبان میں آپ کو ہندوستان کی بہترین ادبیات ملیگی۔

مسلمانوں نے خاص طور سے اس زبان کی ترقی و اشاعت کے لئے بہت کچھ کیا ہے۔ انھوں نے اس زبان کی نظم ہی کے ذریعہ فلسفہ و حکمت کے مسائل عوام کے سامنے پیش کئے۔ انھوں نے اس زبان میں خدا کی حمد و ثنا کے گیت گائے۔ یہ حمد و ثنا اپنا ایک مخصوص انداز رکھتی ہے جو وید مقدس اور قرآن مجید کے انداز سے مختلف ہے۔ چنانچہ سودا نے کہا ہے:

زاہد و پیر مغاں برہمن و شیخ اے یار　　دل میں کہتے ہیں ترے ہاتھ سے ہم چاروں الگ

یا جیسے ولی نے کہا ہے:

ہوا تجھ غم سوں جاری شوق کا طومار ہر جانب ہوا ہے گرم تیرے عشق کا بازار ہر جانب
تماشا دیکھ اے لیلیٰ کہ تیرے غم کی گردش میں بگولے کی نمط پھرتا ہے مجنوں خوار ہر جانب

ولی جمعیت ساماں نہیں درکار عاشق کوں جو طالب راہ کا ہے اسے مسکن سوں کیا مطلب

ہو کے غواص نیں دریا میں بدن کے دیکھا صدف دل نے حقیقت سوں گہر کی موم

اس شاعری کا مقصد انسان کو روحانی کیف سے آشنا کرنا ہے اور اسکو ذات حقیقی سے وابستہ کرنا ہے جو تنہا باقی ہے اور سب کچھ فانی ہے۔ جیسا کہ ولی نے کہا ہے:-

جز اسکی ذات کسی کو نہیں ثبات ہے قابل نجات یہ حقیقی شے کائنات

ان حقایق کے ثبوت کیلئے علم ریاضی سے مدد نہیں مل سکتی بلکہ ان پر یقین حاصل کرنے کے دوسرے ذرائع ہیں۔ چنانچہ ولی نے کیا خوب کہا ہے:-

حکمت عشق بوعلی سوں نہ پوچھ نیں وہ قانون شناس اس فن کا

حکمتاں کی سب کتاباں دھو سٹے یکبارگی گر فلاطوں تجھ دبستاں میں سبق خوانی کرے

عالماں سوں پوچھیا ہوں میں اکثر عقدۂ دل کوں نہیں کیا سب حل

یہ شعرا ہمیں مجاز کے راستہ سے حقیقت کی طرف لیجاتے ہیں۔ حسن مجازی کی جو تصویریں وہ ہماری آنکھوں کے سامنے لاتے ہیں وہ استعاروں کے رنگ روغن سے بنی ہوئی ہوتی ہے۔ حسن ازل کبھی عورت کی صورت میں یا کبھی نوجوان لڑکے کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے جس پر جذبات کو ابھی غلبہ حاصل نہیں ہوا۔ جو سادہ اور معصوم ہے اور اسکی جبلت فطرت کی آغوش میں تربیت پائے ہوئے ہوتی ہے۔ اس نوخیزی کے زمانے میں اسکا جسم تندرست اور پاک ہوتا ہے۔ اس کی چہرے

ولی نے اور دوسرے شعرا کی طرح بہت زیادہ نہیں لکھا اور اس نے اصلی وجہ حسن انداز سے بتائی ہے جسمیں خود نمائی کی جھلک ہے، جو عام طور پر ہندوستانی شعرا میں پائی جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے :۔

ولی دیوان میں میرے تو وہ دفتر کی حاجت نہیں ۔۔۔ کہ مجھ دیوان میں ہر یک شعر سو دفتر برابر ہے

کلکتہ میں ابھی قسم کے تین دیوان شایع ہوئے ہیں۔ کلیات میر تقی، انتخاب سودا، اور دیوان سوز۔ اگرچہ ان کتابوں میں نہ تمہید ہے اور نہ حواشی ہیں۔ لیکن بایں ہمہ انکی خوب قدر ہو رہی ہے۔ مجھے پوری توقع ہے کہ ولی کے دیوان کو بھی ہندوستانی ادبیات کے شایقین ہاتھوں ہاتھ لینگے۔ جنکی کثیر تعداد فرانس اور انگلستان میں موجود ہے۔ اسکے ذریعہ سے اسلامی ہند کے ایک بڑے شاعر کے طرز نگارش سے لوگوں کو واقفیت حاصل کرنیکا موقع بہم پہنچے گا۔

ولی کا نام شاہ ولی اللہ تھا اور ولی تخلص۔ اسکے ہمعصر اسے ایک اعلیٰ درجہ کا شاعر مانتے ہیں اور اسے ہندوستانی شاعری کا آدم خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ "بابائے ریختہ" کے لقب سے مشہور ہے۔ چنانچہ اس نے خود کہا ہے :۔

ہوا جوں خادم شاہ ولایت ۔۔۔ ولی ہی والیٔ ملک سخن ہے

فوقیت لے گیا بوں بلبل سوں ۔۔۔ گرچہ منصب میں وہ ہزاری ہے

ولی غالباً سورت میں پیدا ہوا ہے جسے ہندوستان کے مسلمان باب المکہ کہتے ہیں۔ میں نے یہ قیاس اسواسطے قایم کیا کہ وہ شہر سورت کا محبت کے ساتھ ذکر کرتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی مثنوی میں اس شہر کی بہت تعریف کرتا ہے۔

اس کے کلام کا بیشتر حصہ سترھویں صدی کے وسط میں لکھا گیا۔ اس کا قیام کبھی سورت میں، کبھی گجرات کے دوسرے شہروں میں اور کبھی دکن میں رہا۔ چنانچہ اس نے اسکی نسبت یوں ذکر کیا ہے :۔

ولی ایران و توران میں ہے مشہور ۔۔۔ اگرچہ شاعر ملک دکن ہے

یو کھ کی شمع سوں روشن ہے ہفت اقلیم کی مجلس ۔۔۔ ولی پروانگی کرتا تری ملک دکن بہتر

شہر سورت کا وہ اس طرح ذکر کرتا ہے :۔

لیا ہے گھیر تجھ زلفاں نے تیرے کان کا موتی　　گر یہ ہند کا لشکر گیا ہے جا ستارے کوں

معلوم ہوتا ہے کہ ولی بنگال میں کچھ دنوں رہے۔ بنگال کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

ہوا ہے رنگ بنگالہ تیرے نرگس کے جادو سوں　　معطر ہے سواد ہند تیری زلف کی بو سوں

ان انکھیاں ہور زلف کا دیکھیا ہے از بس جو طلسم　　شعر تیرا اے ولی یو سحر بنگالا ہے (۱)

غالباً ولی نے کچھ زمانہ دہلی میں بھی گذارا۔ اپنے بعض اشعار میں وہ جمنا کا ذکر کرتے ہیں اور دوسرے دریاؤں پر اسکو ترجیح دیتے ہیں۔

زلف تیری ہے موج جمنا کی　　تل نزک اس کی جوں سناسی ہے

اپنے وطن گجرات سے دوری کا اس طرح شکوہ کیا ہے۔

گجرات کے فراق سوں ہے خار خار دل　　بیتاب ہے سینے میں آتش بہار دل

مرہم نہیں ہے اسکی زخم کا جہاں مینن　　شمشیر ہجر سوں جو ہوا ہے نگار دل

لیکن ہزار شکر ولی حق کے فیض سوں　　پھر اسکے دیکھنے کا ہے امیدوار دل

علی ابراہیم خاں نے اپنے تذکرہ گلزار ابراہیم میں ولی کی نسبت صرف چند سطریں لکھی ہیں۔ وہ لکھتا ہے: "شمس ولی اللہ گجرات کا باشندہ ہے اور دکن کے شعرا میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ عالمگیر کے عہد میں ہندوستان (شمالی ہند) آیا تھا اور عالمگیر نے اسکو نوازا تھا۔ ولی ہندوستانی زبان کا مشہور استاد ہے۔ وہ پہلا شخص ہے جسنے دکھنی زبان میں شعر کہا اور ایک دیوان چھوڑا جو قابل ذکر ہے۔" اس مختصر ذکر کے بعد علی ابراہیم خاں نے ولی کے اشعار کے نمونے پیش کئے ہیں جو تین صفحات پر مشتمل ہیں (۲)۔ مصحفی نے اپنے "تذکرۂ شعرائے ہندی" میں "ولی کا ذکر نہیں کیا۔ اور بینی نرائن نے اپنی کتاب "دیوان جہاں" میں ولی دکھن کو اسکے ہم نام مرزا محمد ولی دہلوی سے گڈمڈ کر دیا ہے۔ اور ولی دکھن کے اشعار کو ثانی الذکر کی طرف منسوب کیا ہے۔

جیسا کہ میں پہلے بھی کہیں ذکر کر چکا ہوں ولی نے عقاید کے اعتبار سے امامیوں اور سنت جماعتوں کے درمیان کی راہ اختیار کی تھی۔ وہ خلفائے راشدین کے متعلق جہاں ذکر کرتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ سنت جماعت سے تعلق رکھتا ہے

---

(۱) بظاہر یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ ولی بنگال میں رہے تھے۔ بنگال کے بادشاہ اور شعرا کے ان ذکر ملتا ہے۔ (مترجم)

(۲) میرے متعلق کتب خانہ میں ولی کے کلام کے دو نسخے موجود ہیں۔ ان میں سے ایک مسٹر فریزر دکنی کا ہے جنہوں نے شاہنامہ شائع کیا ہے اور دوسرا میرے عزیز دوست کپتان ٹرائیر نے میرے لئے نقل کروایا ہے۔

لیکن حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا جب کبھی وہ تذکرہ کرتا ہے تو اس کا انداز شیعوں یا امیوں کی طرح ہوتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ ولی نے اہل علم کی طرح اپنی خود داری کو قایم رکھا اور اپنے اشعار کو والیان ملک کی تعریف سے ملوث نہیں کیا۔ اس باب میں وہ میر تقی، میر حسن اور سودا سے بالکل مختلف ہے۔ یہ تینوں شاعر ولی کے بعد بہت مشہور ہوئے انھوں نے شاہان دہلی، نوابان اودھ و بنگال کی تعریف میں جو قصیدہ خوانی کی ہے وہ مبالغہ سے مملو ہے۔

معلوم ہوتا ہے ولی کو اہل یورپ کی فن کاری کے متعلق علم تھا۔ چنانچہ ایک موقع پر اس نے اس کا ذکر کیا ہے۔

تری صورت کہ یو رشک چمن ہے ہوے ہیں رنگ تصویر فرنگ دیکھ

ولی کے شاگردوں کا علی ابراہیم نے ذکر کیا ہے۔ انہیں سے ایک معز خاں تھے جن کا تخلص قمر تھا۔ موصوف دکن میں کسی اہم عہدہ پر ممتاز تھے اور اپنے ہمعصروں میں شاعر کی حیثیت سے بھی امتیاز رکھتے تھے۔

ولی کی شاعری میں تصوف کا رنگ پایا جاتا ہے۔ ہم اسے حافظ شیرازی سے مشابہ قرار دیسکتے ہیں۔ اسمیں حافظ کی خوبیاں اور نقائص دونوں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اسلامی صوفیائے کے انداز میں شاہد و شراب کے ذکر میں وہ بڑے بڑے مسائل بیان کرجاتا ہے۔ مثلاً۔

رکھ دھیان کوں ہر آن تو معبود طرف رکھ سیس کوں ہر حال میں مسجود طرف
معدوم کوں مسجود سوں کیا نسبت ہے اولی ہے کہ مائل ہو توں موجود طرف

پایا ہے جو کوئی دولت فقر؛ مشتاق نہیں سکندری کا
پھیکی لگے اس کوں شان دولت چاکھیا جو مزا قلندری کا

بالخصوص نعت میں وہ تصوف کی باتیں بیان کرتا ہے:-

عشق میں لازم ہے اول ذات کو فانی کرے ہو فنافی اللہ دایم یاد یزدانی کرے؛
مرتبہ خُلّت پناہی کا وہ پاویگا جو کوئی؛ مثل اسمٰعیل اول جیو کی قربانی کرے؛
وہ چہ پاوے مطلب راضیۃً مرضیۃ محض اللہ جگ میں جو اعمال پنہانی کرے

اپنے اشعار کی نسبت خود اس کا یہ خیال ہے:-

پڑھتے ہیں ولی شعر ترا عرش پہ قدسی   باہر ہے تری فکر رسا حد بشر سوں

ولی کی مذہبیت اسکی پاک باطنی کی آئینہ دار ہے اس میں ریاکاری کو دخل نہیں۔ ولی کے کلام کا تین چوتھائی حصہ غزلیات پر مشتمل ہے۔ چند مستزاد، ترجیع بند، مثنویاں اور قصیدے بھی ہیں۔ اس نے مخمس اور رباعیاں بھی لکھی ہیں۔ الگ الگ ابیات بھی ملتے ہیں۔ ولی کا انداز تحریر سلجھا ہوا ہے۔ اسکے کلام میں صفائی اور روانی پائی جاتی ہے۔ دراصل اسکے بعد کے آنیوالے ہندوستانی شعرا نے بڑی حد تک اس کا تتبع کیا ہے۔ ولی کو اپنے کلام کی صفائی اور فصاحت کا ہمیشہ خیال رہتا تھا۔ چنانچہ ایک جگہ اشارۃً اس نے کہا ہے:-

اے سخن ور نہ ڈھونڈ آب حیات   چشمۂ خضر خوش بیانی ہے

شروع میں میرا خیال تھا کہ ولی کے کلام پر لسانیاتی نقطۂ نظر سے حواشی لکھوں، اور ساتھ ہی ساتھ مشکل اشعار کی تشریح بھی کر دوں۔ لیکن ولی کے کلام کا مسودہ ایک سال سے مطبع میں پڑا ہوا ہے۔ اب اگر اپنے ارادہ کی تکمیل کروں تو اور زیادہ تاخیر ہوگی۔ اسلئے فی الحال "دیوان ولی" کو شائع کرتا ہوں۔ باقی کام پھر دیکھا جائیگا۔ میرا خیال ہے اسکے کلام کی تشریح اور لسانیاتی حواشی کو علحدہ جلد میں اسی تقطیع پر بعد میں شائع کروں۔ تقطیع اور کاغذ وہی رہیگا جو دیوان ولی کا ہے تاکہ بعد میں جو کوئی چاہے ان دونوں جلدوں کو ایک ساتھ ملالے۔ ان حواشی میں یہ خیال ہے کہ ان غیر مانوس الفاظ کی تشریح کر دی جائے جو خالص دکنی ہیں اور جو ہندوستانی کی عام لغتوں میں نہیں ملتے۔ ساتھ ساتھ مشکل تشبیہوں اور استعاروں کی تشریح کر دیگئی ہے۔ جہاں میں نے ضرورت سمجھی وہاں قلمی نسخوں کے حوالے بھی دیئے ہیں اور متن کے اختلافات بتلائے ہیں۔ میں نے ولی کے کلام میں سے صرف ان حصوں کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ پیش کیا ہے جنکے متعلق میں نے سمجھا کہ وہ ہمارے اہل ملک کی دلچسپی کا باعث ہوں گے۔ مکمل ترجمہ اسلئے غیر ضروری تھا کہ ولی کے ہاں الفاظ کو بہ نسبت خیالات کے زیادہ اہمیت ہے۔ کسی یورپین زبان میں پورے کلام کا ترجمہ بیکار ہوگا اسلئے کہ پڑھنے والا اس سے اکتا جائیگا اور بجائے لطف اندوز ہونے کے پریشان ہو جائیگا۔ اسلئے کہ مشرقی شعرا ایک ہی خیال کو مختلف اندازوں سے الفاظ الٹ پھیر کے بیان کرتے ہیں۔

میں نے حتی الامکان صحیح متن پیش کرنیکی کوشش کی ہے۔ صرف ان حصوں کو مقابلہ کرکے اس جگہ شائع کیا ہے جو مختلف قلمی نسخوں میں موجود تھے۔ اس کام میں میرے پیش نظر چھ مختلف قلمی نسخے تھے۔

ان چھ نسخوں کے علاوہ ایسٹ انڈیا ہاوس لندن کے دو نسخے بھی میرے پیش نظر ہیں۔ بعض صورتوں میں مشر

شیکسپیر کے مشورہ سے بھی ہیں اسی ضمن میں مستفید ہوا۔

اس تمہید کو ختم کرنے سے قبل ہندوستانی ادب کے اُن شایقوں کی خدمت میں یہ عرض ہے کہ چونکہ انھوں نے ابتک شمالی ہند کے مصنفین کی کتابیں پڑھی ہیں۔ اسواسطے ممکن ہے کہ ولی کے کلام کے دکھنی اور ہندی الفاظ انھیں غیر مانوس معلوم ہوں۔ ولی کی زبان خاص ادبی نقطۂ نظر سے شمالی ہند کی زبان سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اگرچہ ہندوستانی ادب کے یورپین شایقین نے اسکی طرف ابھی توجہ کم کی ہے (مقدمہ دیوان ولی مرتبہ دی تاسی)۔

سلطان ابو الحسن تانا شاہ سنہ ۱۰۸۳ھ تا سنہ ۱۰۹۸ھ

[illegible]

ولی میر

(از)

مولوی ابو ظفر عبد الواحد صاحب ایم۔ اے لکچرار اردو عثمانیہ کالج

[اس نظم کے مطلع میں ایک ایسے واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو جدید تحقیقات کے رو سے اب معتبر نہیں رہا۔ لیکن ایک زمانے تک یہ مشہور تھا کہ میر تقی کا مزار ادھر روہیلکھنڈ ریلوے کی نذر ہو گیا ہے۔ جامعہ ملیہ دہلی کے مطبوعہ "انتخاب میر" میں نورالرحمٰن صاحب نے بھی اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اکبر الہ آبادی (مرحوم) کے ایک شعر میں بھی اسی روایت کی جانب تلمیح ہے؎

کہتے ہیں قبر میری ریل میں آجائیگی　　مر رہا ہوں جو اسی راہ میں مدفن بھی ہے

میری شاعرانہ مصلحت نے اسی روایت کو مفید مطلب سمجھ کر داخل مطلع کیا ہے۔]

ریل کی پٹڑی کے نیچے میر گڑ کر رہ گیا　　اور ولی بیچارہ کھڑکی (احمد آباد) سے بچھڑ کر رہ گیا

اک دکن سے جا کے دہلی میں جگت استاد تھا　　لکھنؤ میں ایک دہلی چھوڑ کر آباد تھا

ہے وہ لا یعقل جو منکر ہے دکن کے پیر کا　　آپ بے بہرہ ہے جو قائل نہیں ہے میر کا

یہ ولایت اور میری سب کو یاں ملتی نہیں　　لاکھ سودا ہو پہ مرزائی یہاں چلتی نہیں

جو قلم کا ہے دھنی اس کا جہاں میں راج ہے　　خالی دلی کی ولایت کل نہیں گر آج ہے

ہے زباں اردو کی جب تک یہ رہیں گے سربلند　　گردش ایام انہیں پہنچا نہیں سکتی گزند

میر جو تھا ہے "ولی" اور جو ولی ہے "میر" ہے
میری نظروں میں برابر دونوں کی توقیر ہے

ہمارا قومی شاعر

(۱)

جناب مانک گرودھن سنگھ سہانی صاحب بی۔ اے ایم بی ایس ایس ایف آر ایس اے

مترجمہ مولوی میر حسن حسام ایم اے۔ مددگار سٹی کالج

اُردو زبان کے شاعر وَلی کا کلام پہلی دفعہ جرمنی میں شائع ہوا۔ اب کئی سال قبل ڈاکٹر نکولائی پیر نامی ایک ممتاز جرمن فلسفی کراچی میں مجھ سے ملنے کے لئے تشریف لائے تھے۔ ہم نے اسلامی فلسفہ، ہندوستان کے مسائل اور آجکل کی زندگی میں مذہب کے موقف پر گفتگو کی جس کا سلسلہ رات گئے تک جاری رہا۔ اس جرمن فلسفی نے کھڑکی میں سے چاند کی طرف نظر ڈالی اور پھر میری طرف پلٹ کر کہا:۔

”میری جیب میں ایک ایسے پرستار محبت کی چھوٹی سی کتاب ہر وقت رہتی ہے جسے ہماری قوم پوجتی ہے۔ میں جہاں جاتا ہوں یہ میرے ساتھ رہتی ہے۔“

وہ کتاب ایک دیوان تھا اور وہ پرستار محبت گوئٹے تھا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا کیا ہمارے ہندوستان میں کوئی ایسا پرستار محبت نہیں پیدا ہوا، جس نے با عظمت ترانے گائے ہوں؟ لیکن کتنے افراد ایسے ہیں جن کے دلوں میں اُن کی یاد محفوظ ہے۔ اہل اطالیہ کو بھی اپنے ایک پرستار محبت پر ناز ہے۔ ڈانٹے اطالیہ کا قومی شاعر ہے۔ انگلستان میں براؤننگ، ہیمابی اور شیلی انجمنیں قائم ہیں، لیکن ہمارے تعلیم یافتہ افراد میں سے کتنے ایسے ہیں جو ہمارے اردو شاعر وَلی سے واقف ہیں۔

سطح مرتفع دکن کے ایک گوشہ میں جو آفتاب کی حدت کی وجہ سے ہمیشہ تپتا رہتا ہے، ہمارا یہ اردو شاعر پیدا ہوا۔ جس کی حیات اور نغموں نے اُس کے نام کو مقدس بنا دیا ہے۔ لیکن کتنے اردو بولنے والے سندھی نہیں بلکہ ہندوستانی اُس سے واقف ہیں؟ یہاں کے کالجوں میں متعدد مضامین کی تعلیم ہوتی ہے لیکن نہیں ہوتی تو اردو ادب کی۔ ایران کے برگزیدہ صوفی شاعر حافظ شیرازی اور مولانا روم کے کلام کا مطالعہ کیا جاتا ہے، لیکن وَلی کا کلیات نہیں پڑھا جاتا۔ جامعوں میں متعدد مضامین کے لئے جدا جدا مستقل پروفیسر مقرر ہیں، لیکن اردو شاعری کا کوئی پروفیسر نہیں ہے (میری مراد جامعۂ بمبئی سے ہے) اس کے باوجود وہ ہمارے دلوں کا بادشاہ ہے۔

اندھیری رات میں ایک گہرے اور تاریک دریا کو عبور کرنا پڑتا ہے۔ ولی کا عشق صوفیوں کے عشق کی طرح گہرا ہوتا ہے۔ اپنے محبوب کی تلاش میں وہ خدا کو اپنا راہبر سمجھتا ہے، اور اس اعتقاد کی بنا پر کہ رنج و ملال بھی ایک آسمانی عطیہ ہے، اس کو رنج و مصیبت میں بھی ایک لطف آتا ہے۔ اس کی سرگردانیوں میں ایک ایسی کیفیت ہے کہ جو سچ پوچھئے تو مجھے یولے سس کی سرگردانیوں کی باعظمت داستان میں بھی نظر نہیں آتی۔ اس اردو شاعر نے اپنے افسانوں میں ایک ایسی محبت کے خواب بیان کئے ہیں جنکی تعبیر دنیا سے قطعی کنارہ کشی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے ولی کے حزنیوں میں سکون آفرینی پیدا ہو گئی ہے۔

اس کے کلام کی سب سے نمایاں خصوصیت توحید کے ایک اعلیٰ تصور کا الہام ہے۔ ولی ایک حقیقی صوفی ہے۔ وہ زندگی کے حزن و ملال، حسن و دلکشی، اور کشمکش اور ناکامیوں کو سمجھتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ ان تمام میں ایک روحانی قوت کارفرما ہے۔ ولی کی شاعری میں ایک صحیح روحانی تصور کی تجلی ہے۔ یہ ویدانت اور اعلیٰ اسلام کا تصور ہے۔ یہ ہندستان کا تصور ہے، ایشیائی دنیا کا تصور ہے۔ یہ ہمہ اوست کا مسلک ہے۔ مشرق کو وحدانیت کے اس باعظمت علمبردار کے کلام کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ وہ سمجھتا ہے کہ مذہب دینی پیشواؤں کے حرص و آز اور فرقہ بندی سے بلند و بالا ہے۔ وہ محبت کے اعلیٰ تر مذہب کا حسن دیکھتا ہے جو تمام مذاہب کی تہ تک پہونچ جاتا ہے۔ میرے نزدیک ہندستان کا یہ مسلم شاعر ایک رشی کی طرح محترم ہے۔ اس کی آنکھیں غیب کے جلوے دیکھتی ہیں، اس لئے وہ ہمارا "بادشاہ" ہے۔ ہمارا خسرو بے تاج۔ کیا غیب داں ہمارے حقیقی بادشاہ نہیں ہیں؟ سلطنتیں دنیا کی دوسری چیزوں کی طرح فنا ہو جائینگی لیکن حضرت ولی کا اقتدار قائم و دائم رہیگا۔ اس کی تعمیر مغلسوں کے دلوں میں تصور کی تخلیقی قوت سے ہوئی ہے۔ اس اردو شاعر کے ان الفاظ میں ہندو مسلم اتحاد کا فلسفہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ فرقہ بندی کو ترک کر دو اور عجز و انکسار سیکھو۔ میرے خیال میں اتحاد اور ترقی کے لئے ہندستان کو آج ایسی ہی تعلیم کی ضرورت ہے۔

یہی وہ تعلیم ہے جو ولی کے کلام میں نغمہ کے روپ میں جلوہ گر ہوئی ہے۔ سندھ، پنجاب، اور دوسرے صوبوں کے متعدد علاقوں میں جہاں مروجہ تعلیم نے چالاکی اور ہوسناکی کی وبا نہیں پہونچائی ہے، ولی کی نظموں نے ہندو مسلم اختلافات دور کر دیئے ہیں۔ ہزارہا ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے یہ "شاعر صحرا" فی الواقع ایک مسیحا ہے۔ اور وہ اس کے گیت گانے کے لئے میلوں اور تیوہاروں میں یکجا ہوتے ہیں۔ ولی کے کلام میں میرے اکثر ہم وطنوں کو ایک ایسی دولت ملتی ہے جس کے مقابلہ میں دنیوی دولت بے حقیقت ہے۔ ایک حسن، دریا کنارے رنگ برنگ کے پھولوں کے مماثل۔ ایک مذہب جو بیسیوں سال سے مسلمانوں اور ہندوؤں کو ہمدموں کی طرح مل جل کر رہنے کی تعلیم دیتا رہا ہے۔ حضرت ولی کی نظموں میں نسلی، قومی اور ملکی اتحاد

کے ہزار جلوے ہیں۔

میرے لئے یہ امر باعث تعجب نہیں ہے کہ ہم دن بدن پستی، بربادی اور ابتری کی طرف جا رہے ہیں۔ ناقص تعلیم و سیاسیات کے غلط مطالعے نے نوجوانوں کے دلوں پر تقلید کے نقوش مرتسم کر دیے ہیں، اور تقلید اپنے نفس پر ظلم کرنے کے مماثل ہے۔ تم نے خود اپنی روایات اور تمدن کے تصور کو بے رحمی کے ساتھ روند ڈالا۔ اور اب بھٹک رہے ہو۔ تم اپنی روح کی تربیت سے منہ موڑ کر ایک سیاست زدہ تمدن کی طرف متوجہ ہو گئے ہو۔ بس ناتمامی تقلید میں شامل ہی۔ "تعلیم" ممکن ہے تمہیں "چالاک" بنا دے لیکن تمہیں خودداری کی دولت اور ذہن سے سرفراز نہیں کر سکتی

اے نوجوانو! میں تم سے ولی کے کلام کے مطالعہ کی درخواست کرتا ہوں تمام سندھی اور ایرانی اور اردو شعرا نے جس حسن، اخلاق و محبت میں اپنے گیت اور افسانے بنائے ہیں میں ان کے محاسن کے ایک بڑے معیار سے معانی کی تیل کرتا ہوں۔ میرا ایقان ہے کہ ان کا کلام تمام قوموں کے لئے اپنے اندر ایک بشارت رکھتا ہے، وہ مذہب اور حسن کو باہم دوسرے میں سمونے میں مدد دینگے جس سے ہندستان کے لئے ایک نئی تمدنی تہذیب کی ساخت وجود میں آ سکے گی۔ اور وہ قوم کے نونہالوں کو سمجھائیں گے کہ تعلیم صحافی ہوئی پتیوں کو جھاڑنے کا نام نہیں، بلکہ علم کے درخت کی پرداخت کا نام ہے جس کا ثمر محبت ہے۔

ولیؔ

از

صاحبزادہ میر محمد علی خاں صاحب تمکین (عثمانیہ)

اے دکن کی سرزمیں، اے قبلۂ ہندوستاں
تیرے ذرّے مہ ہیں، تیری زمیں ہے آسماں

عظمت ماضی کا دل افروز نظارہ ہے تو
مشرقی تہذیب کا پاکیزہ گہوارہ ہے تو

تیرے ہر پہلو میں ہیں احساس کی بیداریاں
تیرے ہر منظر میں ہیں جذبات کی سرشاریاں

ہے خزاں ناآشنا تیرے گلستاں کی بہار
تجھ پہ ہے سایہ فگن، آمرزشِ پروردگار

تیرا دریائے کرم کرتا ہے گوہر بیزیاں
تیرے خطّے سے ہوا کرتی ہیں مردم خیزیاں

جو، جواہر تو نے چمکائے ہیں اپنی خاک سے
ان کا سینہ بھر دیا ہے جلوۂ ادراک سے

وہ ولیؔ، تیرا ہی اک فرزند ہے خاک وطن
جس کے ہونٹوں نے کیا اُردو میں آغازِ سخن

روح مے جس نے بھری اُردو کے خالی جام میں
اک حدیث کیف ہے جس کے ہر اک پیغام میں

دامنِ اُردو کو جس نے کر دیا گلشن بدوش
جس کے اعجاز بیاں سے جاگ اٹھے ارباب ہوش

اک حیاتِ نو عطا کی جس نے موجودات کو
اک نئی روحِ طرب دی جس نے محسوسات کو

اس فضائے آب وگِل کو نور جس نے کر دیا
ذرّہ ذرّہ کو جوابِ طور جس نے کر دیا

سوز کی رنگینیاں برسائیں جس نے ساز سے
جگمگا اٹھے ستارے جس کی ہر پرواز سے

جس کے نقشِ پا کا ہر ذرّہ منور ہو گیا
جس کے ہر آنسو کا قطرہ رشکِ گوہر ہو گیا

نقطۂ انجام جس کا مرکز آغاز تھا
جس پہ تجھ کو ناز ہے اور تجھ پہ جس کو ناز تھا

معاشرت اور تمدن کے گوناگوں شعبوں پر نظر ڈالنا ہمارے موضوع بحث سے خارج ہے۔ ہمارا مبحث شاعری ہے۔
اس دور میں گجرات اور دکن کے بڑے شہروں کی زبان اور شمالی ہند کی زبان میں کیا ایک فرق تھا اس کو اس مختصر مضمون میں واضح طور پر دکھانا دشوار ہے لیکن اس زمانہ کی شمال وجنوب کی تصانیف کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قواعد زبان محاورات اور روزمرہ و لب لہجہ کا جہاں تک تعلق ہے دونوں علاقوں کی زبانوں میں کوئی فرق نہیں۔

برہان پور کا علاقہ اب بہت قبل قلمروئے مغلیہ میں داخل ہو چکا تھا۔ سیاحتے وہاں شمالی ہند کی آبادی حکمرانی وجہانبانی کے سلسلے میں منتقل ہو چکی تھی اور اسی لئے وہاں کی زبان پر دہلی کے بین اثرات پڑ چکے تھے۔ گجرات بھی بہت قبل مفتوح ہو چکا تھا اور وہاں کے بڑے شہروں خصوصاً احمد آباد اور سورت میں یہ اثرات نمایاں تھے۔ دکن بعد کو فتح ہوا لیکن چونکہ اورنگ زیب نے بعہد شہزادگی اورنگ آباد کو اپنا صدر مقام ۱۰۶۹ھ میں قرار دیا تھا اور بیجاپور و گولکنڈہ کی تسخیر کے عزم سے تقریباً تمام مدت حکومت اورنگ آباد کو پورے ہندوستان کا پایۂ تخت قرار دے رکھا تھا اسلئے اسکے ساتھ ہندوستان کی کثیر آبادی اورنگ آباد اور اسکے قرب و جوار میں بس گئی تھی بمعتبر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ لشکر سمیت دس لاکھ کی آبادی اورنگ زیب کے ساتھ آئی تھی۔ اس کثیر آبادی نے اورنگ آباد کی قدیم دکھنی زبان کو مٹا دیا۔ اور اس پر تسلط پا کر شمالی ہند کی زبان کو عام کر دیا۔ نہ صرف زبان بدل گئی بلکہ تہذیب و معاشرت کے تمام شعبے متاثر ہو گئے۔ اس وقت یہ کہنا دشوار تھا کہ اورنگ آباد دکھن کا شہر ہے بلکہ شمالی ہند کی بستی معلوم ہوتا تھا۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ شمالی ہند کی منتقل شدہ زبان میں شاعری کا آغاز دکن میں کیونکر ہوا؟ دکن میں مدتوں قبل قدیم اردو میں شعر و شاعری کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس زبان میں کیفیت و کمیت کے لحاظ سے اتنا ادب اب بھی دستیاب ہوا ہے کہ اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور بعض اعتبارات سے اس کا درجہ تمام ادبیات اردو میں نہایت بلند ہے۔ دکھنی سلطنتوں کے تاجداروں اور اہل دل صوفیوں اور بزرگوں نے اس میں طبع آزمائی کر کے اسکو مقبول عام بنا دیا تھا۔ جب دکھنی سلطنتیں مفتوح ہوئیں تو اس کے چرچے عام تھے۔ صاحب کمال شاعروں نے اس میں مغلوں کے ابتدائی عہد میں طبع آزمائی کی۔ چنانچہ اس دور کے بعض شاعروں کے کلام اب بھی دستیاب ہوتے ہیں مثلاً قادر وغیرہم۔ لیکن ان کی شاعری کو زیادہ فروغ اور شہرت نہ ہوئی۔ البتہ ولی کے کلام نے غیر معمولی شہرت و مقبولیت حاصل کی اور وہ کرامت دکھائی کہ اس کو مقبول خاص و عام کر کے انتہائی وسعت کے ساتھ رواج دیا۔

اردو ادبیات میں اہمیت ولی کو اردو ادبیات کی تاریخ میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ جب جنوب میں دکھنی شاعری کی شمع ٹمٹمانے لگی تو اور دکھنی زبان کی جگہ ایک دوسری زبان نے لی تو اس نئی زبان میں بعض شاعروں نے قدیم

دکھنی شاعروں کے چرچوں سے متاثر ہو کر طبع آزمائی شروع کی۔ ان میں ولی کو ممتاز درجہ حاصل ہے۔ ان کی شاعری کی مقبولیت دکن و گجرات تک محدود نہ تھی بلکہ اس نے شمالی ہند اور خصوصاً دہلی میں ہل چل ڈال دی۔ چنانچہ وہ مستند اساتذہ جنھیں اپنی زبان میں طبع آزمائی کرنے کا کبھی بھولے سے خیال بھی نہ آیا تھا اور جو فارسی گوئی کو کمال جانتے تھے۔ اور اس زبان میں استادانہ مہارت اور عام شہرت رکھتے تھے وہ بھی ولی کے کلام سے متاثر ہوئے اور انھوں نے اس زبان میں طبع آزمائی شروع کی۔ حضرت بیدل اپنے وقت کے کامل فن اور مجتہد سخن تھے۔ دہلی کے نامی شعراء ان کی شاگردی کا دم بھرتے تھے۔ ان کے دل میں بھی ولی کے کلام نے تڑپ پیدا کر دی۔ چنانچہ بقول قائم نہ صرف وہ بلکہ اس وقت کے اساتذہ اس طرف مائل ہو گئے۔ قائم کی اصل عبارت یہ ہے:-

"ولی کے دیوان کی برکت سے مطلع آفتاب سے زیادہ روشن ہو گئی۔ وہ ریختہ کو اس قسم کی فصاحت و بلاغت کے ساتھ کہتا تھا کہ اس وقت کے اکثر اساتذہ از راہ ہوش ریختہ موزوں کرنے لگے تھے۔ چنانچہ قدوۃ السالکین و زبدۃ العارفین مرزا عبدالقادر بیدل رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ایک غزل اس زبان میں کہی ہے جس کا مطلع اور مقطع یہ ہے:

مت پوچھ دل کی باتیں یہ دل کہاں ہے ہم میں — اس جنس بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم میں
جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا — پردے سے یار بولا بیدل کہاں ہے ہم میں"

ولی کا کلام زبان و بیان اور عروض و قواعد کے اعتبار سے اس قدر مکمل ہے کہ اس پایہ تک کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی۔ اور اصل زبان شمالی ہند کی زبان سے اس قدر ملتی جلتی تھی کہ قائم نے بیدل سے متعلق لکھا ہے کہ "اس زبان" میں ایک غزل کہی ہے اس سے ظاہر ہے۔ زبان کا فرق نہ تھا اگر یہ فرق ہوتا تو شمالی ہند کے شعراء بھی ولی کے کلام کو اس قدر قدر کی نگاہ سے نہ دیکھتے۔ اس کی تقلید میں شعر لکھنا تو بہت دور تھا۔ ہم پہلے حصے میں جو بیان کر چکے ہیں کہ اورنگ آباد اور شمالی ہند اور خصوصاً دہلی کی زبان میں کوئی نمایاں فرق نہ تھا اس کی تائید اوپر کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔

شمالی ہند اور خصوصاً دہلی میں اردو شاعری کے آغاز کی تاریخ جلد ۲۳ ۔ ۴۴ ۔ حاتم کا ایک شعر ہے

حاتم یہ فن شعر میں کچھ تو بھی کم نہیں — ولی ولی ہے جہاں میں سخن کے بیچ

آبرو کا ایک شعر ہے:-

آبرو شعر ہے ترا اعجاز — گو ولی کا سخن کرامت ہے

ان تمام بیانات پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ولی نے شمالی ہند میں اردو شاعری کو روشناس کرایا اور وہاں کے شعراء میں ہل چل ڈال دی۔ اپنے کلام کے اثر سے ان کو ریختہ گوئی کی طرف مائل کیا اور اس طرح بنا ڈالی۔ اس لحاظ سے اس کو ریختہ کا باوا آدم اور بانیٔ ریختہ کہا جاتا ہے جو حقیقت و صداقت پر مبنی ہے۔

عہد ولی کی سیاسی اور تمدنی حالت

از

مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی ایم اے ال ال بی (عثمانیہ)

اگرچہ ابتک دکن کے شاعر ولی کی پیدائش اور موت کی قطعی تاریخیں نہیں معلوم ہوسکیں لیکن اس کی ادبی زندگی کے عام بہاو سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دکن کے ایک بہت ہی مضطرب زمانہ کی پیداوار ہے اس قدر یقینی ہے کہ وہ سترہویں اور اٹھارہویں صدی کے آخری اور ابتدائی عشرات میں شعروسخن کی خدمت کرتا تھا۔ غور سے دیکھا جائے تو یہ دکن کا عہد اضطراب ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ مغلوں کے سیلاب سے دکنی سلطنتوں کی تمام دیواریں منہدم اور تمدن کی تمام شمعیں خاموش ہو رہی تھیں۔ وہ علمی صحبتیں جن کے پرکیف نغمے تمام ہندوستان کو گرویدہ کئے ہوئے تھے سونی تھیں۔ شاہزادہ اکبر کے الفاظ میں جس نے ہندوستان کو خیرباد کہتے ہوئے اپنے باپ کو ایک باغیانہ خط میں لکھا تھا "افسوس دکن کی وہ شاداب وسیع وادیاں جو ایک زمانہ میں فردوس بریں معلوم ہوتی تھیں اب خشک اور بے چراغ پڑی ہوئی ہیں"۔[1] غالباً ان سلطنتوں کے خاتمہ سے مغل فاتح کا مقصد بھی پورا نہیں ہوا۔ یہ سلطنتیں اپنی تمام شگفتہ روایات کے ساتھ فنا تو ہوگئیں لیکن مغلوں کے اصل دشمن اپنی جگہ برقرار رہے اور مغل حکومت کا چراغ ٹمٹماتا رہا۔

گولکنڈہ اور بیجاپور کا خاتمہ تو کوئی خلاف قیاس چیز نہ تھی۔ اس کے آثار اس وقت سے پیدا ہو چلے تھے جبکہ دکن کے سرپرست ملک عنبر، ابراہیم عادل شاہ ثانی اور سلطان محمد قطب شاہ دنیا سے رخصت ہوگئے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ یہ تین شخصیتیں جو دکن کی تینوں سلطنتوں کی رہنمائی کرتی تھیں ایک ساتھ راہی عدم ہوگئیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ تین شخصیتیں قدرت کی طرف سے دکن کی حفاظت کے لیے ودیعت کیگئی تھیں۔ ان کے مرنے سے دکن کا کوئی سرپرست باقی نہ تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغلوں نے احمد نگر کا خاتمہ کر کے بیجاپور اور گولکنڈہ کو اپنے زیر نگین کرلیا۔ اگرچہ بیجاپور اور گولکنڈہ کی سلطنتیں سترہویں صدی کے آخری عشرہ تک باقی تھیں اور سلطنت بہمنی کی یاد تازہ کرتی تھیں لیکن مغلوں کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھیں۔

---

[1] سفر نامہ منوچی جلد چہارم ص۳۵۔

ان کا دم گھٹا جاتا تھا۔ ان کی سیاست خشک اور تدبر رائگاں ہو رہا تھا۔ ایک طرف ان سلطنتوں کی دولت نقد و جواہر کی شکل میں مغلوں کے ہاتھ میں کھنچی جا رہی تھی۔ دوسری طرف ان کی ترقی کے تمام راستے مسدود تھے۔ چنانچہ گولکنڈہ کا ذکر کرتے ہوئے فرانسیسی سیاح برنیر کہتا ہے کہ "گولکنڈہ میں اورنگ زیب کا [illegible] جب احکام جاری کرتا ہے۔ پروانے دیتا ہے۔ عوام کے ساتھ بدسلوکی کرتا ہے اور ان کو دھمکیاں دیتا ہے۔ مختصر یہ کہ اس کے افعال اور اقوال خود مختارانہ ہوتے ہیں جیسے ایک مطلق حکمراں کے"[1]۔ ان حالات میں کسی علمی اور تمدنی ترقی کی کیا توقع کی جا سکتی ہے لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ ان سلطنتوں نے اپنے آخری دم تک علمی اور تمدنی خدمت کی۔ سچ تو یہ ہے کہ مغل سیادت کی مجبوریوں کے باوجود ان سلطنتوں کا علمی اور تمدنی خدمت کرنا دکن کا ایک معجزہ ہے۔ غالباً ان سلطنتوں میں پچھلی روایتوں کا اثر تھا۔ ایک طرف بیجاپور کے جگت گرو کی قوت عمل کام کر رہی تھی تو دوسری طرف گولکنڈہ کے والی محمد قلی قطب شاہ اور سلطان محمد کے پاکیزہ ذوق اور خدمات اپنا عکس ڈال رہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس فرسودہ ماحول میں بھی تمدنی ترقیاں ہوئیں اور اچھے شاعر پیدا ہوئے۔ اگر تھوڑی دیر کے لیے ان سلطنتوں کی قوت مدافعت، علمی پیداوار اور عام تمدنی ترقیوں کا مطالعہ کیا جائے تو اس کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان سلطنتوں نے اپنی آخری سانس تک خاطر خواہ عمرانی خدمات انجام دیں۔ اگرچہ سیاسی اعتبار سے یہ بے دست و پا تھیں لیکن تمدنی اعتبار سے یہ اپنے پورے عروج پر تھیں۔

اگر بیجاپور پر سرسری نظر ڈالی جائے تو مغلوں کے سیلاب کے مقابلہ میں اس جنوبی سلطنت کی کشمکش حیات اپنے اندر بڑی دلچسپی رکھتی ہے۔ ان حالات میں جبکہ ہر طرف زوال چھا رہا تھا اور ہر گوشہ میں کمزوری نمودار تھی اس کا پرجوش مقابلہ اس سلطنت کا بڑا سرمایہ حیات ہے۔ سب جانتے ہیں کہ ۱۶۶۵ء میں اورنگ زیب کے مشہور جنرل جے سنگھ کو بیجاپور کی دیواروں کے سامنے ایسی شکست ہوئی تھی کہ وہ [illegible] ہو گیا۔ اس کے چند سال کے بعد بہادر خاں کوکلتاش اور دلیر خاں نے کوشش کی لیکن وہ بھی بری طرح شکست کھا گئے اور پھر حملہ کرنے کی جرأت نہیں کی اور جب بیجاپور کا آخری محاصرہ ہوا تو بیجاپور کے [illegible] شرزہ خاں اور عبدالرؤف خاں نے مغل فوجوں کا اس قدر دل کھول کر مقابلہ کیا کہ مغل عاجز آ گئے تھے اور [illegible] رسد کا سوال پیدا ہو گیا تھا۔ کہ شہنشاہ نے غازی الدین خاں فیروز جنگ کو مدد کے لیے بلا بھیجا اور وہ [illegible] ہو گئے تو شہنشاہ نے کہا تھا کہ حق سبحانہ تعالیٰ [illegible] خان فیروز جنگ شرم اولاد تیموریہ نگاہ داشت"[2]۔ لیکن جب تک شہنشاہ بذات خود

---

[1] سفرنامہ برنیر ص ۱۹۵ [2] خافی خاں جلد دوم ص ۳۱۴، ۳۱۵

محاصرہ کے لیے نہیں آئے بیجاپور کی تسخیر ناممکن معلوم ہوتی تھی۔ بالآخر شہنشاہ اپنی تمام طاقت کے ساتھ بیجاپور کی دیواروں کے پاس آگئے یعنے بیجاپور کے ایک مورخ کے الفاظ میں " سلطنت تمامی ہندوستان بہ آں سروسامان برسر کاوش وکاہش یک شہر غریب تا یکسال کہ عبارت از بیجاپور است شد"[1] اس کے باوجود بھی محاصرہ نے طول کھینچا اور پیہم شورشوں کے بعد اس وقت فتح ہوا جب کہ اہل بیجاپور نے اپنی حمیت وخود داری کا تمام سرمایہ ختم کرلیا۔ اگرچہ بیجاپور فتح ہوگیا لیکن اس کی حمیت اور خود داری کے افسانے اپنی تمام دلسوزیوں کے ساتھ اب بھی تازہ ہیں۔ اہل بیجاپور کو اب تک وہ المناک نظارہ یاد ہے جبکہ سکندر عادل شاہ کی بہن شہر بانو جو اپنی رعایا میں بادشاہ بی بی کے ہر دلعزیز لقب سے یاد کیجاتی تھی عادل شاہی خاندان کی عزت وناموس کے لیے اپنے وطن مالوف کو خیرباد کہہ رہی تھی۔ یہ دکن کی دوسری چاند بی بی تھی اور بیجاپور کا مورخ زبیری لکھتا ہے کہ گو اس کی عمر ۹ سال تھی لیکن " معاملات ملک رانی خوب فہمید۔ مہات را بر وجہ شایستگی سرانجام میداد"[2] مغل اس کو جانتے تھے اور مصالحت کی یہ شرط قرار دی کہ اس کو مغل سلطنت کے حوالہ کیا جائے۔ بیجاپور کے ارباب سیاست مجبور ہوگئے۔ اور ملک میں بڑا سماں برپا ہوگیا جب شاہزادی نے دیکھا کہ ملک کا بچاو اس کی قربانی پر موقوف ہے تو وہ فوراً وطن کو خیرباد کہنے کے لیے تیار ہوگئی جس وقت یہ شاہزادی بیجاپور سے جا رہی تھی اہل بیجاپور اس کے آخری وداع کے لیے راستوں پر کھچا کھچ جمع ہوگئے اور اکثر دردمند دل ڈھاڑیں مار کر رو رہے تھے۔

اس زمانہ کی علمی پیداوار بھی کچھ کم نہیں ہے۔ ان تمام اہل علم کی جن میں ادیب شاعر شامل ہیں ایک بڑی فہرست تیار ہوسکتی ہے۔ مثال کے لیے علی عادل شاہ ثانی کے عہد کا ملک الشعرا ملا نصرتی اپنے تمام ادبی سرمایہ کیساتھ تنہا اس رو بہ زوال زمانہ کی نمایندگی کرسکتا ہے۔ اس کے کلام کی ادبی لطافت اور معنی آفرینی کے علاوہ اس میں ایک اور جاذبیت ہے اس کی شاعری میں حسن وعشق یا گل وبلبل کے مزخرفات تو بہت کم ہیں لیکن وہ ان کی بجائے جنگ وجدل کی ولولہ انگیز تصویریں کھینچتا ہے۔ اہل بیجاپور کو مغلوں کی حرص وآز اور دست درازیوں سے شرما کر جنگ آزادی کا سبق دیتا ہے۔ علی نامہ اور خاور نامہ اصل میں دکن کے رزم نامے ہیں جو بیجاپوریوں کی صحیح زندگی اور قومیت کا پتہ دیتے ہیں[3] اور زوال کے زمانہ میں ان کا لکھا جانا حیرت انگیز ہے۔

بیجاپور کی عام تمدنی حالت کا اندازہ اس کی عمارتوں سے ہوسکتا ہے۔ ان عمارتوں کی تو بہت بڑی تعداد ہے

---

[1] خافی جلد دوم صفحہ ۱۷۔ [2] بساتین السلاطین صفحہ ۵۳۹۔ [3] بساتین السلاطین صفحہ ۴۴۳۔

جو اس سلطنت کے دو سو سالہ دور میں تیار ہوئی ہیں لیکن آخری زمانہ کی عمارتوں کو دیکھا جائے جبکہ یہ سلطنت روبہ زوال تھی تو وہ اپنی عظمت میں بہت بڑھی ہوئی معلوم ہوتی ہیں محمد عادل شاہ کے عہد کی بنی ہوئی عمارتیں آثار محل اور آنند محل مع اپنی شان و شوکت اور گلکاریوں کے غایت درجہ جاذب نظر ہیں۔ اور گول گنبد تو آج دنیا کی عجائبات میں شمار کیا جاتا ہے۔ اور تعجب ہوتا ہے کہ یہ چیزیں اس زمانہ میں کس طرح تیار ہوئیں جبکہ اس ملک کے توائے ذہنی اور جسمانی مضمحل ہو چکے تھے اور سلطنت کا سفینۂ حیات ڈوبنے کو تھا۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی کے عہد کے متعلق ایک شاعر کا یہ راگ گانا تو سمجھ میں آتا ہے کہ

گرا کسیر سرور و سوز سازند　　　ز خاک پاک بیجاپور سازند

لیکن اس آخری زمانہ کے متعلق شاہزادہ اکبر کا یہ کہنا کہ "بیجاپور ہندوستان کا ایک ہیرا تھا"[1] بہت حیرت انگیز ہے۔

جہاں تک گولکنڈہ کا تعلق ہے عبد اللہ قطب شاہ اور ابوالحسن قطب شاہ کا عہد سیاسی اعتبار سے بہت ہی شکن معلوم ہوتا ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو اس میں مغلوں کی استبدادبازی کو زیادہ دخل تھا۔ واقعات بتاتے ہیں کہ خود گولکنڈہ کے ارباب سیاست نے اپنے سیاسی فرائض میں کوئی کوتاہی نہیں کی اور ان کی کارکردگی میں کوئی نقص نہ تھا اور جو کچھ کام خراب ہوا اس کے باعث خود مغل تھے جو جا و بیجا مداخلت کرتے تھے۔ اگر عبد اللہ قطب شاہ میں حکومت کی اہلیت نہیں تھی تو اس کی ماں حیات بخشی بیگم اس کی تلافی کر رہی تھی۔ سلطان محمد کے انتقال کے بعد اسی خاتون نے ۴۵ سال تک گولکنڈہ کی سیاسی خدمت کی اور گرتی ہوئی سلطنت کو بچا لیا۔ جب ۱۶۵۶ء میں اورنگ زیب کی فوجوں نے گولکنڈہ کا محاصرہ کر لیا اور تمام ارباب سیاست بے دست و پا ہو گئے تو گولکنڈہ کی بیگم اورنگ زیب کے کیمپ میں آگئی اور محاصرین سے مردانہ وار گفتگو کر کے بچا لیا۔ گولکنڈہ کی قوت مدافعت یہیں پر ختم نہیں ہوئی۔ چنانچہ جب ۱۶۸۷ء میں گولکنڈہ کا آخری محاصرہ ہوا تو قطب شاہی سلطنت نے نہ صرف خاطر خواہ مدافعت کی بلکہ اپنی روایتی خودداری اور اولوالعزمی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ مغل افواج کے مقابلہ میں اہل قلعہ نے اس قدر دل کھول کر مدافعت کی کہ شہنشاہی طاقت کے باوجود قلعہ کی تسخیر کیلئے آٹھ مہینوں سے زیادہ لگ گئے اور تسخیر بھی اس طرح ہوئی تھی کہ چند بیوفاؤں نے قلعہ کے دروازے کھول دیے تھے۔ لیکن اس حوصلہ فرسا ماحول میں بھی گولکنڈہ میں اکثر ہستیاں ایسی بھی تھیں جنہوں نے کبھی وفاداری کا ثبوت دیا اور جان سے بھی دریغ نہیں کیا۔ گولکنڈہ کے محاصرہ کیساتھ دکن کے سید عبد الرزاق لاری کا نام ہمیشہ یادگار رہیگا جس نے اپنے بادشاہ کیلئے ہر قسم کی قربانی کی بات کی۔ آخر میں جب دشمن قلعہ میں گھس آئے تو عبد الرزاق دیوانہ وار دشمن کی تلواروں پر گر گیا۔ جب تک اس کے ہوش و حواس برجا تھے "تا جان دارم نثار ابوالحسن خواہم نمود" کی صدا دینے والی آواز تقدہ

---

[1] سفرنامہ منوچی جلد چہارم ص۱۱

تک سنائی دیتی تھی اور سب سے زیادہ حیرت انگیز چیز یہ ہے کہ اس اثنا میں جبکہ قلعہ کے اندر سخت بدحواسی طاری ہوگئی ابوالحسن قطب شاہ کا اطمینان قلب ایک حیرت انگیز واقعہ ہے۔ جب شہنشاہی افسر روح اللہ خاں اور اعتبار خاں اس کو گرفتار کرنے کے لیے شاہ نشین کے پاس آگئے تو انہوں نے حیرت سے دیکھا کہ ابوالحسن اپنی شاہی نشست پر اطمینان سے بیٹھا ہوا ہے اور اس سے ذرہ برابر پریشانی ظاہر نہیں ہوتی تھی۔ پوری خوشی کے ساتھ گفتگو کی۔ اپنے تمام معمولات پورے کیے اور اتفاق یہ ہے کہ اس اثنا میں جب کھانے کا وقت آگیا تو حسب عادت [illegible] شرکت کی گئی اور دستر خوان پر دوست و دشمن سب بٹھائے گئے۔ گفتگو کے دوران میں ان مغل افسروں نے پوچھا کیا بات ہے کہ آپ اس قدر خاطر جمع معلوم ہوتے ہیں۔ ابوالحسن نے کہا کہ پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ خدا نے مجھے یہ عزت دی تھی اب وہ اس کو واپس لینا چاہتا ہے۔ قدرت کے اس فیصلہ کے مقابلہ میں ہر شخص کو سر تسلیم خم کرنا چاہیے۔ اگرچہ ان مغل افسروں نے ہندوستان میں ایسے بے شمار بدقسمت تاجداروں کو گرفتار کیا تھا لیکن یہ بلند کردار سوائے گولکنڈہ کی دیواروں کے کسی جگہ نہیں پائے گئے۔ جس طرح سلطنت گولکنڈہ کی تاسیس بلند پایہ اخلاق کی روشنی میں ہوئی تھی اسی طرح اس کا خاتمہ بھی خودداری اور اولوالعزمی کا سچا مظاہرہ تھا۔

گولکنڈہ کی علمی پیداوار بھی اپنی جگہ بڑی تفصیل کی طالب ہیں۔ محمد قلی قطب شاہ اور سلطان محمد قطب شاہ کی علمیت اور علمی سرپرستی تو ایسے واقعات ہیں کہ ان پر گولکنڈہ کو ناز کرنا چاہیے۔ ان کے عہد ہائے حکومت میں تاریخیں لکھی گئیں۔ شاعروں نے دواوین مرتب کیے۔ مدرسے قائم ہوئے اور حکومت سے ان کی ہمت افزائی ہوئی لیکن اس سلطنت کا آخری دور بھی علم و فن کا حقیقی مرکز تھا۔ عبداللہ قطب شاہ خود عالم اور شاعر تھا۔ اپنے بزرگوں کی طرح اس نے فارسی اور دکھنی دونوں زبانوں میں دیوان چھوڑے ہیں۔ اس کے عہد کا مورخ نظام الدین احمد لکھتا ہے کہ عبداللہ کے عہد میں فارسی اور اردو شاعری کی خوب گرم بازاری تھی۔ کبھی رات رات بھر شعر و سخن کی محفلیں گرم رہتی تھیں۔ اب بھی گولکنڈہ کی در و دیوار میں غواصی، قطبی، جنیدی اور ابن نشاطی کی نغمہ سرائیاں سنائی دیتی ہیں۔ غواصی عبداللہ کے دربار کا ملک الشعرا تھا۔ طوطی نامہ اور سیف الملوک نظم کے کئی مجموعے اس وقت موجود ہیں۔ اگرچہ ابوالحسن قطب شاہ کو صرف پندرہ سال حکمرانی کے ملے تھے لیکن اس قلیل مدت میں بھی علم و فن کی بہت کچھ سرپرستی کی گئی۔ یہ خود بھی شاعر تھا۔ فائز، لطیف، نوری اور غلام علی اس عہد کے شاعر ہیں جنہوں نے اردو ادب میں بڑا ذخیرہ چھوڑا ہے۔[1]

قطب شاہوں کے عام تمدن کا اندازہ ان کے بنائے ہوئے شہر و عمارات سے ہو سکتا ہے۔ حیدرآباد زمانہ وسطی کا عظیم الشان شہر تھا۔ جس وقت اس شہر کی تعمیر ہو رہی تھی اور اس میں تمام عمرانی ضروریات بہم پہنچائی گئی تھیں تو مورخ فرشتہ

---

[1] ماخوذ از اردو شہ پارے ڈاکٹر زور

نے لکھا تھا "شہرے کہ تمامی ہندوستان شرقاً غرباً، جنوباً و شمالاً مثل آن لطافت و صفا ہرگز یافت نمی شود"[۱] حالانکہ یہ اکبر و جہانگیر کا عہد ہے جبکہ آگرہ اور لاہور جیسے شہنشاہی شہر اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود تھے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ نوخیز شہر جہانگیر ان سے کہیں بڑھا ہوا تھا۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ زمانہ انحطاط میں بھی اس شہر کا تمدن بڑھتا گیا اور اپنے آخری زمانہ میں اتنا بڑھا کہ باہر کے لوگ حیران رہ جاتے تھے۔ خافی خاں جو عہد عالمگیری کا بڑا مورخ ہے کہتا ہے کہ "خوبہائے آن شہر از لطافت آب و ہوا آن سرزمین چشمہائے نمکین آن سبز فام و سیر حاصلی آن مزروعہ ہر چہ در مدح و ستائش نوشتہ شود بازمی ماند"[۲] شہنشاہ اورنگ زیب کا خاص مورخ محمد ساقی جو گولکنڈہ کی تسخیر کے وقت یہاں موجود تھا حیدرآباد کی ان الفاظ میں تعریف کرتا ہے "آرامگاہے است بر قطعہ زمین بہشت، راحت جسم و آرام جان آبادی وسیع تر از حوصلہ خیال، عمارات وسیع تر از پایہ اندیشہ، لطافت ہوا، عذوبت و روانی چشمہ سارہائی سبزہ بہ مرتبہ کہ پنداری گل و سبزہ این سرزمین، آب و رنگ از روضہ رضوان یافتہ است"[۳] حالانکہ عالمگیری عہد میں ہندوستان کے شہنشاہی شہروں کی جو حالت تھی وہ سب جانتے ہیں۔ آگرہ اور لاہور کے علاوہ شاہجہاں آباد (دلی) بھی اپنی شہرت رکھتی تھی۔ ان مورخوں کا جو شاہجہاں آباد میں رہ چکے تھے حیدرآباد کو سراہنا اس شہر کی عظمت کا سچا ثبوت ہے اور واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ خود اہل حیدرآباد بھی اپنے شہر کے مقابلہ میں شہنشاہی شہروں کو قابل وقعت نہیں سمجھتے تھے اور حیدرآباد کی تعریف میں بجائے دلی کو پیش کرنے کے ایرانی شہروں کی مثال دیتے تھے۔ چنانچہ سلطان محمد قطب شاہ کی تخت نشینی کے وقت حضرت مومن استرآبادی نے جو سلطنت کے پیشوا تھے اپنے قصیدہ تہنیت میں لکھا ہے ؎

چو صفاہان نو شد از شاہ جہان عباس شاہ — حیدرآباد از تو شد شاہا صفاہان نوی

قطب شاہی عمارتوں کی بہت بڑی تفصیل ہے۔ ان عمارتوں کے علاوہ جو گولکنڈہ میں بنائے گئے تھے حیدرآباد میں علحدہ قصر بنائے گئے۔ داد محل کی شان و شوکت تو اب بھی بہت لوگوں کو یاد ہے اور باہر کے سیاح بڑے لطف کے ساتھ اس کا ذکر کرتے ہیں۔ حیا محل، ندی محل، گوشہ محل آخری زمانہ کی یادگاریں ہیں لیکن زمانہ کی ستم ظریفی اور مفلس حاکموں کی بے دردی سے ان کا خاتمہ ہو گیا جس وقت یہ موجود تھے، قطب شاہی عظمت کو ظاہر کرتے تھے۔ خود مغل بھی جو شاہجہانی عمارتیں دیکھ کر آئے تھے ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے گولکنڈہ کی تسخیر کے بعد جب شاہنشاہ اورنگ زیب حیدرآباد میں داخل ہوئے تو قطب شاہی محلات کی رفعت اور ذوق تعمیر کو دیکھ کر بڑی حیرت کا اظہار کیا تھا۔ نعمت خاں عالی نے جو شہنشاہ کے ہمراہ رکاب تھا، "چہ پست ہمت مردم بودند کہ بعد از چندیں عمارت ہائے بلند ساختند" شہنشاہ کی حیرت اور نعمت خاں کا جواب قطب شاہی عظمت کو ظاہر کرنے

---

[۱] تاریخ فرشتہ۔ وضمیمہ ص ۱۰۱ [۲] خافی خاں جلد دوم [۳] مآثر عالمگیری ص ۲۸۲

کے لیے کافی ہے۔ جب شہنشاہ اورنگ زیب کا چھوٹا بیٹا کام بخش حیدر آباد کا گورنر بنایا گیا تو اس نے قطب شاہی محلات کو چھوڑ کر اپنے لیے علٰحدہ محل کی تعمیر کر لی تھی جس کو شہنشاہ اسراف سمجھتے تھے۔ لیکن شاہزادہ نے جواب دیا تھا کہ قطب شاہی محلات میں رہنا اس سے زیادہ اسراف ہے۔ قطب شاہی محلات اس قدر وسیع اور پرعظمت ہیں کہ ان کی پوری دیکھ بھال تو کجا ان میں چراغ جلانا مشکل ہے۔ یہ اسی شاہزادے کے الفاظ ہیں جو شاہجہانی محلات کا رہنے والا تھا۔

ولی سے پہلے دکن کی اُردو شاعری

از

جناب مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی

جامعۂ عثمانیہ اُردو زبان کی ترقی کی وہ جدید منزل ہے جہاں یہ کاروان صدیوں کے مراحل طے کرنے کے بعد پہونچا ہے اگر ہم گزشتہ منزلوں کے رہرووں کی سعی و کاوش کی قدر و منزلت کے اعتراف میں اپنی عقیدت اور احسان مندی کا کوئی ہدیہ پیش کریں تو درحقیقت یہ ایک سعادت ہے۔

خواجہ الطاف حسین حالیؔ نے اپنی سحر آفرینی سے اب اردو دنیا کا باوا آدم ولی کو بنا دیا۔ اس کے متعلق حال میں ملک نے اپنی عقیدت کا نذرانہ پیش کردیا ہے۔ اس کے بعد یہ امر واقعی بجا ہے کہ ہم دکن کی سرزمین میں ولی کی یاد تازہ کریں ابھی حالیؔ کے جادو کا چلنے تک سو سال کا دور گزرا تھا کہ کتنے پتھر دل مرزبوم میں دو دو سو سال تک ایک گل سرسبز نے وہ مہک پھیلائی کہ آج سو سال تک اس کی خوشبو مہکتی رہی۔

دکن میں جب بہمنی سلطنت قائم ہوئی (۷۴۸ھ مطابق ۱۳۴۷ء) تو اس وقت تک فارسی شاعری کافی ترقی کر چکی تھی۔ فارسی شاعری کے بڑے بڑے اساتذہ پیدا ہو چکے تھے۔ اس لئے یہی حیثیت سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب اسلامی سوسائٹی نے ہندوستان اور دکن میں نشوونما پایا تو اس کا اصلی سرچشمہ ہندوستان سے باہر وسط ایشیا اور ایران میں واقع تھا۔ بہمنی عادل شاہی اور قطب شاہی زمانہ کی تاریخ ادبیات کے اکثر حصے ایران و وسط ایشیا کی تاریخ ادبیات سے مربوط ہیں۔ اس لحاظ سے جب دکنی زبان نے فکر و تخیل کو الفاظ کا جامہ پہنانا چاہا تو ان کے سامنے فارسی شاعری کا بہترین نمونہ موجود تھا۔ دکنی شاعروں نے بھی فارسی مثنوی، فارسی قصیدہ اور فارسی غزل کا چربہ اتارنا شروع کردیا۔

ہمارے عدم توجہی، انتشار اور پراگندگی کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ ہماری قومی زبان کی تاریخ بے پروائی اور گمنامی کے پردوں میں اوجھل ہوگئی ہے۔ ہماری زبان کے ایسے شاہکار جن پر ہر زبان ناز کرسکتی ہے خود ہمارے ملک میں موجود نہیں یہ کتنی بدقسمتی ہے کہ آج ہم اپنی زبان کی تاریخ یا عہد بہ عہد ترقی کی کوئی مسلسل روئداد مرتب نہیں کرسکتے۔

بہرحال جب ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ دکن میں ولی سے پہلے اردو نظم کی ابتدا کب ہوئی اور کن حالات میں ہوئی تو ہمیں اس کا کوئی

ان تمام مثنویوں پر تفصیلی تبصرہ کافی وقت کا محتاج ہے، ان کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کے لئے صرف اس قدر بیان کر دینا کافی ہوگا کہ قطب مشتری میں خود بادشاہ وقت سلطان قلی قطب شاہ کی رودادِ محبت کو شاعری کے قالب میں ڈھالا گیا ہے جو بھاگ نگر کی ایک حسین رقاصہ بھاگ متی کے عشق کا نتیجہ تھا۔

غواصی کی مثنویاں سیف الملوک و بدیع الجمال اور طوطی نامہ کو ایک کامیاب ترجمہ قرار دینے میں کوئی امر مانع نہیں ہے۔ غواصی نے ہندی الفاظ کو بڑی عمدگی سے دکنی زبان میں آمیز کیا ہے۔ کلام بہت سادہ اور تصنع و آورد کی قیود و بند سے آزاد ہے

غواصی سے گزر کر ابن نشاطی کی پھول بن پر نظر ڈالیں تو پچیس تیس سال کے اندر ایک بڑا انقلاب نظر آتا ہے۔ جذبات کی حقیقی تصویر لفظی اور معنوی صنائع بدائع کے پردوں میں چھپ جاتی ہے پوری مثنوی مرصع ہے، لیکن واقعی یہ اعجاز سخن ہے کہ سلاست اور روانی بڑی کوشش سے برقرار رکھی ہے۔

اسی زمانہ کی ایک دوسری مثنوی گلشن عشق نصرتی کے سحر نگار قلم کی ایک دائمی یادگار ہے۔ اس مثنوی میں انسان کے حقیقی جذبات کو جس خوبی سے قلم بند کیا ہے اس کی کہیں اور نظیر نہیں ملتی کلام کی رنگینی اور تشبیہ و استعارات کی ندرت واقعی قابل داد ہے۔

عاشقانہ جذبات کا اظہار صرف مثنوی کی حد تک ہی نہیں رہا بلکہ اس کا اثر غزل کی لطیف تر زمین پر بھی بہت جلد پڑ گیا۔

سعدی اور حافظ کی فارسی غزل گوئی کے بعد ہندوستان میں غزل نگاری نے جو رنگ اختیار کیا خسرو، حسن، ظہوری اور فہیم نے جو زمزمہ خوانی کی اس کی آواز بازگشت میں دکنی شعرا نے بھی اپنا زور قلم صرف کیا اور داد سخنوری دی ہے، جو مواد ہمارے پیش نظر ہے اس سے بظاہر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ولی سے پہلے اس میدان میں دکنی شعرا نے اپنی یادگاریں بہت کم چھوڑی ہیں۔ دکنی شاعری کے سلسلے میں جو عظیم الشان ذخیرہ مثنوی اور مرثیہ کی صورت میں دستیاب ہوا ہے اس کے مقابل غزلوں کی مقدار بہت کم ہے، سلاطین گولکنڈہ و بیجاپور کے سوا دوسرے نامور شعرا وجہی، غواصی، نصرتی، شوقی، ہاشمی وغیرہ کی جو غزلیں ہمیں معلوم ہیں ان کی تعداد نہایت قلیل ہے۔ اس امر کے ثابت کرنے کے لئے نہایت قوی ثبوت ہے کہ رستمی، نصرتی، غواصی وغیرہ جیسے قادر الکلام شعرا نے اس صنعت میں بھی کافی ذخیرہ چھوڑا تھا۔ مگر افسوس اب ناپید ہے، صرف سلاطین گولکنڈہ اور علی عادل شاہ شاہی اور ہاشمی وہ خوش نصیب شعرا ہیں جن کی سینکڑوں غزلیں ان کے کلیات میں موجود ہیں

غزل گوئی کا اصل موضوع محبوب ہے، لیکن فارسی شاعری میں اور اس کے بعد خود اردو شاعری میں محبوب کی جو درگت بنی وہ ہمارے ادب کا ایک افسوسناک پہلو ہے مگر دکنی غزل نگاروں نے عربی اور ہندی شعرا کی طرح واقعیت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا، سلاطین کا بالخصوص محل سراؤں اور شاہی کوشکوں میں خوبی اور رعنائی کے مجسم پیکروں کے دیکھنے میں سارا وقت صرف ہوتا تھا اور رخساروں کی گل گونی اور کرشمہ و ادا کی سحر آفرینی سے آنکھوں پر لطف اندوز ہونے کا پورا سامان مہیا تھا، اور پھر چونکہ سلطان قطب شاہ بجائے اس کے کہ خود ایک عاشق مزاج اور سوختہ دل شاعر کی حیثیت رکھتا تھا، اور بھاگ نگر کی پری صفت اور حور وش معشوق کے زلف گرہ گیر کا اسیر تھا

اس نے جو غزلیں لکھی ہیں وہ حقیقت بردار ہیں۔

ان غزلوں میں رنگین خیالی، عاشقانہ مضمون آفرینی، تخیل کی بلند پروازی، خیالات کی جدت، تشبیہ و استعارات کی لطافت کی کوئی کمی نہیں ہے۔

رزمیہ شاعری

دکنی شاعروں نے جہاں عشق کی حکایات لذیذ کو صفائی اور ندرت سے بیان کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے، وہاں جنگ و پیکار کی داروگیر کو بھی نہایت سلیقہ اور ہنرمندی سے مرتب کیا ہے۔ اس قسم کی مثنویوں میں رستمی کا خاور نامہ (۱۰۵۹ھ)، شوقی کا فتح نامۂ نظام شاہ (؟ھ)، سیوک کا جنگ نامہ (۱۰۹۲ھ)، لطیف کا ظفر نامہ (۱۰۹۵ھ) بہت سرآمد ہیں۔

رستمی کے خاور نامہ کو دکنی ادب کا سرسبد گل کہنا بجا ہے، چوبیس ہزار شعر کی ضخیم مثنوی صرف اٹھارہ ماہ کی قلیل مدت میں لکھ ڈالنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے، گو یہ مثنوی ابن حسام کی تالیف کردہ ایک فرضی داستان خاور نامہ کا دکنی ترجمہ ہے لیکن اس کی وجہ سے رستمی کا پایہ کچھ کم نہیں ہو جاتا۔ اسی طرح ظفر نامہ اور جنگ نامہ دونوں نایاب ترجمے ہیں۔ البتہ شوقی کا فتح نامۂ نظام شاہ خود اس کی ذاتی محنت کا ثمرہ ہے اس مثنوی میں اُس یادگار معرکہ کی روداد قلم بند کی گئی ہے جو تلی کوٹہ کے میدان میں مہاراجہ بیجانگر کے مقابل اسلامی سلطنتوں کی صف آرائی کی بنا پر وقوع پذیر ہوا تھا۔

نصرتی کے قصیدے بھی رزمیہ شاعری کا بہترین نمونہ ہیں نصرتی نے جس خوبی و عمدگی سے واقعہ نگاری کا حق ادا کیا ہے وہ تعریف سے مستغنی ہے۔ واقعات جنگ، صف آرائی کی تفصیل، لڑائی کا سماں، باجوں کی آواز، توپوں کی گرج، ہتھیاروں کی جھنکار، دشمن کی فراری وغیرہ امور کی جو کامیاب مرقع نگاری کی ہے وہ اپنی آپ نظیر ہے۔ اس کے ساتھ شوکت لفظی، خیالات کی جدت، تسلسل بیان قابل قدر ہے۔

تاریخی شاعری

تاریخ و سوانح کے لئے نثر ہی موزوں ہے، لیکن موزوں طبعی اس کو بھی نظم میں پڑھ کر مسرت گیر ہوتی ہے، دکنی شاعروں کی ایسی مثنویاں بھی مقررہ معیار پر کامیاب اتر سکتی ہیں۔

نصرتی کا علی نامہ ([illegible]ھ)، اور تاریخ اسکندری ([illegible]ھ)، اور مومن کی "اسرار عشق" ([illegible]ھ) اس نوع کی امتیازی یادگاریں ہیں۔

علی نامہ در اصل علی عادل شاہ ثانی کے عہد کی تاریخ ہے، ضمناً بادشاہ کی مدح میں جو قصائد کہے تھے وہ شامل کر دیئے ہیں۔ ادب اور تاریخ دونوں کو اس کتاب میں جس طرح آمیزش دی گئی ہے وہ نصرتی کے موئے قلم کا حق ہے۔

اخلاقی شاعری

اخلاق اور موعظت کا میدان شعر و سخن کی مشق کے لئے بہت کار آمد ثابت ہوا ہے۔ گلستان، بوستان، حدیقہ سنائی وغیرہ جیسے شاہکار دکنی شعرا کے لئے ایک اچھا ماڈل ثابت ہوئے۔ اس خصوص میں [illegible] کی تصنیف تحفۃ النصائح ([illegible]ھ) اخلاقی مثنوی کا گراں بہا، حال معلوم شدہ پہلا نمونہ ہے۔ اسی زمانہ کی ایک دوسری تالیف پند نامۂ شغلی بھی قابل قدر ہے۔

معاشرتی شاعری

معاشرتی موضوعات کسی خوش فکر شاعر کے لئے بہت ترغیب دہ میدان ثابت ہوتے ہیں۔ روزمرہ کے حالات اور گزرنے والے واقعات کو شاعری کا لباس پہنا کر لطیف اور پاکیزہ جذبات کا مرقع بنا دینا کوئی معمولی کام نہیں ہے۔

سنترے فروخت کرنے والیوں کی آوازوں کو جہاں ایک دکنی عصری شاعر نے ایک انگریزی شعر کا ایک لطیف موضوع بنا ڈالا، وہاں قدیم دکنی شاعروں نے عید، نوروز، شب قدر، ولادت، سالگرہ، شادی بیاہ، ضیافت، محرم وغیرہ جیسے پامال موضوعات میں حسن و زیبائی پیدا کردی۔ قطب شاہ، ظل اللہ، عبداللہ، شاہی، نصرتی، شوقی، وغیرہ کی زادش فکر و نزاکت اور لطافت کو پوری طرح نمایاں کرتی ہے۔ نیز اس وقت کے رسم و رواج، طور و طریق، عادات و اطوار کو کافی طور سے واضح کرتی ہے غرض معاشرت کا ہر پہلو صاف طور سے پیش نظر ہو جاتا ہے۔

نیچرل شاعری

شمالی ہند میں غزل گوئی کی زمین جس طرح پامال ہوئی اور وہاں کے شعرا کی فکر زلف دگیسو میں جس طرح الجھ گئی اس کی بنا پر عام طور پر یہ خیال ہے کہ اردو شاعری نیچرل شاعری کے بازار میں تہی مایہ ہے، اور اب عام خیال یہ ہے کہ جدید اردو شعرا نے اس موضوع میں جو ساز چھیڑا ہے وہ دراصل مغربی مضراب کا ہی ایک ثمر ہے۔

لیکن یہ قصہ بھی اب ایک تقویم پارینہ کا مصداق ہے۔ دکنی شعرا کی مشق سخن اس موضوع میں بھی کسی طرح شرمندہ نہیں ہے مناظر قدرت سے طبیعت میں جو سرور پیدا ہوتا ہے وہ اگر کسی اچھے نظم نگار کی نظم میں منعکس نہ ہو تو تعجب کا مقام ہوگا۔

سلاطین گولکنڈہ اور بیجاپور کے کلیات میں پھول پھل، ترکاری، باغ، حوض محل، چاندنی رات وغیرہ جیسے حالیہ موضوعات پر کئی مثنویاں اور قطعے موجود ہیں، اور یہ کسی طرح پست معیار کے نہیں ہیں۔ نصرتی کا قصیدہ جو موسم سرما پر لکھا گیا ہے۔ ہر طرح قابل ستائش ہے اسی طرح دھوپ کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ نصرتی کی قادر الکلامی کا شاہد ہے

صوفیانہ شاعری

کسی اسلامی قوم کی زبان میں شعر لکھے جائیں تو اس میں تصوف و سلوک کو بھی ایک خاص موضوع قرار پانا ہی تو پہلے بہت ضروری تھا، دکنی زبان کے ادب کی ایک خصوصیت امتیازی یہ ہے کہ نفرادِ مشائخ طریقت نے بھی اس کی غور و پرداخت میں اپنا وقت صرف کیا ہے، لا محالہ خود دکنی شاعری میں تصوف و سلوک بھی ایک خاص موضوع قرار پا گیا۔ خواجہ بندہ نواز، میراں جی شمس العشاق شاہ برہان الدین جانم، امین الدین اعلیٰ، قادر، شاہ من عرف وغیرہ جیسے صاحبان طریقت نے اپنے کلام میں سلوک اور تصوف کے کئی دقیق مسائل حل کئے ہیں۔

قصائد

انسان کے جذبہ شکر گزاری نے شاعری کی زبان میں اپنی جو روداد بیان کی ہے، وہ ہر زبان کے ادب کا ایک زیور ہے دکنی قصائد بھی دکنی ادب کا ایک قابل قدر سرمایہ ہیں۔ اس بات کا کافی ثبوت موجود ہے کہ کئی شعرا نے قصائد لکھ کر اپنا زور بیان دکھایا۔ مگر افسوس ہے کہ جس ذخیرہ کا ہم کو اب تک پتہ چلا ہے اس میں صرف چند ہی ایسے خوش نصیب شعرا قطب شاہ، ظل اللہ، عبداللہ شاہی اور نصرتی ہیں۔ ان میں سے پہلے اول تین شعرا کے قصیدے عام طور سے دستیاب نہیں ہو سکتے۔ البتہ علی عادل شاہ شاہی اور

نصرتی کے قصیدے قابلِ ذکر ہیں۔

یہ قصائد فارسی قصیدوں کی طرز پر لکھے گئے ہیں۔ وہی تشبیب، وہی گریز، وہی مبالغہ آمیز مدحِ ممدوح اور وہی دُعا لیکن ہر شاعر نے دکنی ماحول کے لحاظ سے کچھ نہ کچھ جدت ضرور پیدا کی ہے۔ شاہی کے قصائد کا زورِ بیان، الفاظ کی شوکت، شاہانہ طمطراق داد کے قابل ہے نصرتی نے جس خوبی اور عمدگی سے قصیدہ کے پیرایہ میں واقعہ نگاری کا حق ادا کیا ہے وہ تعریف سے مستغنی ہے، اور پھر جوشِ خیالات کی جدتِ تشبیہ اور استعارات کی ندرت یہ سب حق یہ ہے کہ زندگیِ جاوید کے مستحق ہیں۔

مرثیہ | شاعروں کے جذباتِ شکرگزاری نے جس طرح قصیدہ کی صورت اختیار کی اسی طرح حسرت اور غم نے مرثیہ کا ڈھنگ اختیار کیا، دکنی مراثی آج بھی رُلا سکتے ہیں۔ افسوس ہے کہ چند مرثیوں کے زیادہ اس صنفِ ادب پر بھی اب تک تاریکی چھائی ہوئی ہے۔

قدیم سے قدیم جو مرثیہ ہم کو دستیاب ہوا ہے وہ وجہی کا ہے۔ شعرائے گولکنڈہ کے منجملہ قطب شاہ ظلّ اللہ، عبداللہ، وجہی، غواصی، لطیف، سیوا، مرزا وغیرہ کے مرثیے دستیاب ہو چکے ہیں، اور شعرائے بیجاپور کے منجملہ شاہی، نصرتی، ہاشمی اور مرزا وغیرہ کا نام مرثیہ نگاری کی حیثیت سے قابلِ تذکرہ ہے، ہم نے کئی مضامین کے ذریعہ اس صنفِ ادب پر بحث کی ہے، اب یہاں اس کا اعادہ غیر ضروری ہے

دکنی شاعری کے خصوصیات

اس سارے مباحث کے بعد دکنی شاعری کی بعض خصوصیتوں پر سرسری طور سے نظر کرنا ضروری ہے۔

یہ سب کو معلوم ہے کہ بارھویں اور تیرھویں صدی ہجری میں شمالی ہند کی شاعری کا موضوع زیادہ تر صرف حسن و عشق، شاہد و ساقی گل و بلبل کے محدود دائرے میں محصور کر دیا گیا لیکن ہماری دکنی شاعری نے صرف حسن و عشق کی داستان نہیں بیان کی بلکہ جہاں اس نے حسن و عشق کے بہترین جذبات اور خیالات کے موتی پروئے وہیں اخلاق اور تصوف کا گراں بہا سرمایہ بھی دیا گیا اگر ایک طرف رزمیہ شاعری اور تاریخی واقعہ نگاری کا ذخیرہ موجود ہے تو دوسری طرف مرثیہ گوئی اور مناظر نویسی کا وافر مواد موجود ہے، معاشرت اور تمدن کے متعلق بھی میدان خالی نہیں ہے مضامین کی یہ گوناگونی دکنی شاعری کی اولین خصوصیت ہے

دوسری خصوصیت زبان کی سادگی اور عام فہمی ہے، دکنی شاعری کو شروع سے آخر تک دیکھ جائیے مشکل اور ثقیل لغات اس میں نہیں دیئے گئے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ہمارے لفظی خزانہ کو ایک گنجِ نامحدود کی صورت حاصل تھی۔

قدیم دکنی شاعری کی تیسری خصوصیت اس کے مصرعہ تشبیہات اور لطیف استعارات ہیں، بڑی بات یہ ہے کہ تشبیہ و استعارے سب زیادہ تر اپنے ماحول سے ماخوذ ہیں۔

خاتمہ | یہ خصوصیات اہم اور قابلِ ذکر ہیں، ان کے علاوہ دیگر خصوصیات بھی ہیں جن کا اظہار طوالت کا موجب ہوگا مگر یہ صحیح ہے کہ اس زمانہ میں ہمارے اسلامی علوم اور آداب میں انحطاط شروع ہو چکا تھا، اصابتِ فکر و رائے کا توڑ پڑ چکا تھا

درحاشیہ کی گردش میں ارباب علم و فن سرگرداں تھے۔ قومیت یا اخلاق کے بلند اور اعلیٰ جذبات کی نشوونما اس زمانہ کی شاعری کی دسترس سے قطعیہ باہر تھی، اس لیے اس وقت کی شاعری میں اس امر کی تلاش کہ انھوں نے زندگی کی سدھار اور اخلاق عامہ کی بہتری اور زندگی کے لئے کوئی اعلیٰ نصب العین مقرر کرنے میں کیا نقطۂ نظر قایم کیا تھا تو محض فضول ہے۔

اس زمانہ میں کسی شاعر کو بلند پایہ قرار دینے کا معیار فقط صرف یہ ہو سکتا ہے کہ اس نے اپنی محدود چار دیواری میں کس حد تک کامیابی حاصل کی اور فن کے پرکھنے کے جو ظاہری اور رسمی قواعد مقرر ہو گئے تھے۔ ان پر اس کا کلام کس حد تک پورا اُترتا ہے۔

اس اصول کے تحت اگر ہم قدیم دکنی شاعری کا جائزہ لیں تو ہم کو ناکامی نہیں ہوتی۔ بیسیوں شاعروں کا کلام بلاشبہہ اقران و امثال میں بہت بلندی پر نظر آتا ہے۔ فقط۔

یادِ ایامِ ولی

(از)

محمد عبد العزیز صاحب غوثی متعلم سال سوم جامعہ عثمانیہ

یکایک کشتیٔ ملکِ دکن منجدھار میں آئی
سپاہ فوجِ "عالمگیر" جب رفتار میں آئی

غلامی آگئی حصے میں آزادی ہوئی رخصت
تجمل ہی رہا باقی نہ حریت نہ شعریت

پرندے اڑ گئے باغِ ادب کی ڈالی ڈالی کے
مسرت سو گئی اور بھاگ جاگے بے کمالی کے

دکن کی شش جہت میں "فاتحوں" کا بول بالا تھا
گلا اردو کا مغلوں کی چھری سے کٹنے والا تھا

زبان فارسی اترا رہی تھی کامرانی پر
لگائے آنکھ، بیٹھی تھی، دکن کی حکمرانی پر

تری ہستی سے اردو نے ولی پھر زندگی پائی
زبان فارسی کے راج نے شرمندگی پائی

اسیرِ دامِ پیری ہو گیا تھا شعر کا پیکر
رگوں میں تو نے دوڑایا جوانی کا لہو یکسر

سخن تھا منہ چھپائے زیرِ دامانِ گرانخوابی
ہٹائی نیند کی تاریکیوں میں تو نے مہتابی

ہویدا تو نے کر دی حسن کے چہرے کی رنگینی
دہانِ شاہدِ الفت میں بھر دی تو نے شیرینی

بچاری تھا دلِ بیتاب تیرا حسنِ فطرت کا
ہوس نا آشنا تھا فلسفہ تیری محبت کا

ترے نغموں میں ہے عریاں ترنم موجِ کوثر کا
ترا ہر لفظ اک ترشا ہوا ٹکڑا ہے جوہر کا

تری غزلوں میں ٹھنڈک چاندنی کی محسوس ہوتی ہے
ہر اک آواز تیری حسن میں ملبوس ہوتی ہے

ترا ہر شعر ہے تشریحِ رازِ فطرتِ انساں
جھلکتا ہے تری میٹھی زباں میں چشمۂ حیواں

ترا دیوان ہے یا قسمتِ عاشق کی تفسیریں
تری غزلیں نہیں، خوابِ محبت کی ہیں تعبیریں

ولیؔ کے تلامذہ کا دور

(۱)

مولوی عبدالقادر صاحب سروری ایم اے ال ال بی لکچرار اردو جامعۂ عثمانیہ

دکن کی اردو شاعری کا وہ دور، جسے "ولیؔ کے تلامذہ کے دور" سے موسوم کیا گیا ہے، کئی حیثیتوں سے دلچسپ اور اہم ہے۔ دوسرے ادوار کے مقابلے میں اسکی چند نمایاں خصوصیات ہیں اور کچھ نئے اثرات، جو عہد آفریں ثابت ہوئے۔ یہ دور، ولیؔ کے انتقال کے زمانے سے لیکر کم و بیش نصف صدی کی شعری پیداوار پر حاوی ہے۔ اسکو درحقیقت "قدیم دکھنی شاعری" کا دور آخر سمجھنا چاہیئے' کیونکہ' تاریخی اعتبار سے یہ ایسے زمانہ پر حاوی ہے، جسمیں دو مختلف شایستگیوں کا تصادم واقع ہوتا ہے۔ وہ دکنی معاشرت اور ادبی شایستگی جو دو سال کے طویل عرصہ تک، بیجاپور اور گولکنڈے کے علم دوست حکمرانوں کی سرپرستی میں نشو و نما پاتی رہی تھی، اب اسکے تار و پود بکھرنے کا وقت آگیا تھا، اور اسکے اجزا سے ایک نیا عہد تعمیر پانے کو تھا، جسمیں اردو شاعری کے، دو دور افتادہ دبستانوں کا ملاپ ہوتا ہے۔ اس زمانے کے شعری مذاق اور روایات کو بنانے اور ترقی دینے میں زیادہ تر ایسے شعرا کا حصہ ہے، جنھوں نے ریختہ کو، ولیؔ سے سیکھا تھا، اور اسی کے قائم کئے ہوئے نہج پر چلتے تھے۔ انمیں سے بعض تو ایسے تھے، جو ولیؔ کی شہرت کو عروج پاتے دیکھ چکے تھے، اور اسکے وجد آفریں نغموں سے متاثر تھے چند کو اس استاد عصر سے تلمذ کا شرف بھی حاصل ہوچکا تھا۔ لیکن ایک بڑی تعداد ایسی تھی، جو معناً اس سے مستفید تھی۔

مغلوں کی فتح دکن، اور بیجاپور اور گولکنڈے کی سلطنتوں کی تباہی کے بعد سے دکن کی قدیم اردو شاعری کی ترقی مسدود ہوگئی۔ جنگ کی تباہ کاریوں نے، عوام اور خواص سب کو حیران و پریشان کر رکھا تھا، بیچارے شاعروں اور انشا پردازوں کی کیا حقیقت تھی وہ اپنی بساط علم و ہنر سمیٹے، ادھر ادھر مارے مارے پھر رہے تھے۔ اس دور تباہی کا ایک خاص واقعہ قابل ذکر ہے۔ قاضی محمود بحری، جو بیجاپور کے مشہور شاعر اور "من لگن"، "عروس عرفان" اور "بنگاب نامہ" وغیرہ کے مصنف ہیں، بیجاپور کی تباہی کے بعد، قدر دان اور سرپرست کی تلاش، اور یاران ہم مذاق کی صحبت کی جستجو میں اپنی اجڑی نگری کو ہمیشہ کیلئے خیرباد کہکر نکلے۔ گولکنڈے پر ابھی برے دن نہیں آئے تھے۔ اسکی ادب نواز فضا میں، دل کی حسرتیں پوری کرنے کا خیال ذہن میں لیکر اس طرف کو راہی ہوئے۔ لیکن رستے میں قزاقوں نے انھیں لوٹ لیا، اور مال و اسباب کے

کے ساتھ شعر و سخن کا بہت سا سرمایہ بھی دستبرد میں آ گیا۔ خود بہ ہزار خرابی، گولکنڈہ پہنچے۔ اور سمجھتے تھے کہ اب ساری کلفتیں ختم ہو گئیں۔ لیکن، ابھی مشکل سے سال ڈیڑھ سال اطمینان سے بسر کرنے پائے ہونگے، کہ وہی آسمان یہاں بھی پیدا تھا۔

گولکنڈے پر جب تباہی نازل ہوئی، دکھنی شعرا کے لئے دنیا تنگ تھی۔ بیسیوں باکمال شاعر خانماں برباد ہو گئے۔ جن میں کچھ سکت رہ گئی تھی، وہ کرنول، سدھوٹ اور ارکاٹ کی طرف کوچ کر گئے۔ سنہ ۱۱۷۱ھ میں جب دہلی تباہ ہوئی، تو یہاں کے باکمالوں کا بے خانماں ہو جانا، اور تلاش روزگار میں فیض آباد اور لکھنؤ پہنچنا، اس طرح کے سانحہ کا ایک دوسرا، مگر، کم دردناک نمونہ ہے۔ کیونکہ دہلی کے شعرا کیلئے اب بھی توقعات باقی تھیں۔ لیکن دکھنی شعرا کا روزگار اب ختم ہو چکا تھا۔ اورنگ زیب، اور ان کے ہمراہ شمال سے جو لوگ دکن آئے تھے، وہ، انکو غنیم کے ملک کے افراد سمجھتے تھے۔ اور یہ لوگ انھیں، اپنا اور اپنے بہی خواہوں کا دشمن، اور ان کی طرف رخ کرنا نمک حرامی تصور کرتے تھے۔ پھر وہ لوگ جو شمال سے، یہاں پہلے پہل وارد ہوئے تھے۔ زیادہ تر فارسی کے دلدادہ تھے، دکھنی ادب اور شاعری کا انھیں شغف نہیں تھا۔ خود عالمگیر، طبیعتاً اور ضرورتاً، کاروباری وضع کے انسان تھے۔ انھیں شعر و سخن سے زیادہ واسطہ نہیں تھا۔ یہ ایسے واقعات تھے، جنہوں نے مل جل کر دکھنی شعرا کی تباہی کا سامان فراہم کر دیا تھا۔ ولی کے، اپنے وطن سے دل برداشتہ ہونے میں بھی، ان واقعات کو دخل تھا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شعر و سخن کا وہ ذوق، جو سالہا سال کے عرصہ سے، دکن کے مختلف مرکزوں میں نشو و نما پا رہا تھا، یک لخت مردہ تو نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ وہ باقی رہا۔ مگر شعرا کے مطمح نظر بدل گئے۔ اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ اس زمانے کے شعرا کی ایک بڑی تعداد ایسی تھی، جو اپنے ذوق کی تشفی کے لئے مذہب اور تصوف کی پناہ ڈھونڈنے لگی تھی۔ بغداد کی اسلامی سلطنت کی تباہی کا بھی، فارسی شعرا پر یہی اثر ہوا تھا۔ دکھنی شعرا کے رجحانات میں یہ تبدیلی، ولی کے آخری ایام ہی سے شروع ہو چکی تھی۔

گولکنڈے کی شکست و ریخت کے بعد، جو شاعر بچ رہے تھے، ان میں اکثر ایسے تھے جو ایک جیوڑ، دو دو سلطنتوں کے چراغ، اپنی نظروں کے سامنے گل ہوتے دیکھ چکے تھے۔ ان کے دوست احباب اور عزیز و اقارب، ان کے روبرو تہ تیغ کئے گئے۔ اور ان کے سرپرست اسیر کر لئے گئے۔ اس طرح کے دردناک واقعات دیکھنے کے بعد، دنیا اور اسکے جاہ و مرتبہ کی ناپائداری کا اثر انسان کے دل پر جس قدر بھی گہرا ہو، کم ہے۔ ایسی حالت میں اسکے لئے صرف ایک سہارا باقی رہ جاتا ہے، اور وہ، مذہب اور تصوف ہے۔

یہ غور کرنے کا واقعہ ہے کہ وہی سرزمین، جہاں اس سے پہلے، عبداللہ، حسن شوقی، رستمی، نصرتی، وجہی، محمد قلی، غواصی اور ابن نشاطی، جیسے حیثیت ادبی مذاق رکھنے والے شاعر پیدا ہو چکے تھے، اس زمانہ میں بحری، وجدی

ولی ویلوری، محمد علی عاجز، ضعیفی، اور ذوقی جیسے مذہب پرست شعرا کو نشوونما دیتی ہے۔ یہ سب کے سب مذہبی موضوعات یا تصوف پہ لکھنے والے شاعر تھے۔ اور اردو کی بڑی بڑی متصوفانہ مثنویاں، جیسے "من لگن" "پنچھی باچھا" "روضۃ الشہدا"، "چت لگن" وغیرہ اسی زمانے میں لکھی گئیں۔ اس زمانہ کے جو کارنامے، ادبی معلوم ہوتے ہیں، ان میں بھی مذہبی پہلو غالب ہے۔ مثلاً محمد علی عاجز نے جو قصے لکھے وہ درحقیقت مسائل فقہ کی توضیحات ہیں۔

مذہبی شاعری کی ایک دوسری صنف، مرثیہ ہے، جسکو اس زمانے میں خاص عروج ہوا۔ شہدائے کربلا کے المناک واقعات لکھنے کے لئے، اس زمانے کے شاعر خاص طور پر موزوں تھے۔ اور اسی لئے انکی مرثیہ نگاری کی شہرت اطراف و اکناف میں پھیل چکی تھی۔ چنانچہ گجرات کے ایک مشہور مرثیہ نگار ہاشم علی نے اس کا تذکرہ اپنے مرثیوں میں کیا ہے۔

مرثیہ نگاروں میں عشرتی، مرزا، قادر، سیدن، امامی، قابل ذکر ہیں۔ ان کے مرثیے اس میں شک نہیں کہ انیس اور دبیر کے بسیط اور ادبی مرثیوں سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے، لیکن "مرثیت" جو ان کا اصل اصول تھا، اُس کے پیدا کرنے میں انھیں خاصی مہارت تھی۔ بعض موقعوں پر، خصوصاً، جہاں حضرت علی اصغر کی شہادت، یا امام قاسم اور حضرت فاطمہ زہرا کی شادی کے حالات بیان کئے گئے ہیں، جذبات کی فراوانی نے، ان مرثیوں میں ادبی خوبیاں پیدا کر دی ہیں۔
روحی اور سیدن کے مرثیوں میں کچھ جدتیں بھی نظر آتی ہیں، مثلاً روحی نے غزل کے انداز میں ایک مرثیہ لکھا ہے، جس کے چند شعر یہ ہیں:-

آج غمناک ہیں چمن کے گل — بلکہ دل چاک ہیں سمن کے گل
غم زدہ، سینہ داغ، حیراں ہیں — نرگس و لالہ و یاسمن کے گل
یوں تو لالے شفق کے دستے ہیں — لہو میں ڈوبے ہیں سب گگن کے گل
نقش پا دیکھ، دل ہوس رکھتا — سر پہ رکھنے کو تجھ چرن کے گل

سیدن نے اپنے بعض مرثیوں میں عجیب جدت دکھائی ہے۔ ایک مرثیہ میں انھوں نے حضرت فاطمہ کبریٰ کی شادی کا واقعہ بیان کیا ہے، اور اس کے لئے استعارے اور کنائے سب حزنیہ استعمال کئے ہیں۔ اسکے صرف دو شعر یہاں نمونتہً پیش کئے جاتے ہیں:-

ماہ محرم میں دیکھو، چندا، ہو مالی آئیا — تارے گگن کے گوندہ کر سہرا جو شہ کن لائیا
کنگنا ستم کا باندہ کر، دکھ کے ابٹنا کوں لگا — حیرت کی چوکی کے اوپر، انجھواں سیں تن نہلائیا

اس حصہ کا ایک تیسرا حلقہ "مکتبِ ولی" کے شعرا کا ہے۔ اس میں وہ تمام سخن ور شامل ہیں، جو ولی کے انداز پر شعر کہتے تھے۔ خواہ انھوں نے براہ راست استفادہ کیا ہو یا بالواسطہ۔ ولی کے تلامذۂ خاص کا پتہ چلانا، آسان کام نہیں ہے کیونکہ اول تو ولی کے زمانہ میں تذکرہ نگاری کا شوق پیدا نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ ولی کے زمانے کے بعض شعرا کا حال تذکرہ نگاروں کو جو ولی کے علاوہ سے معلوم ہوا، دوسری بات یہ کہ ولی کسی مقام پر جم کر نہیں رہے۔ ان کی حالت ایک آوارہ سیارے کی سی تھی، جس کا راستہ تو معین کیا جا سکتا ہے، لیکن جس کا قیام ہر وقت بدلتا رہتا ہو۔ کبھی وہ اورنگ آباد میں طلوع ہوئے تو کبھی احمد آباد اور سورت میں چمکے۔ کبھی دہلی کی محفلوں کو گرمایا، تو کسی وقت پھر اورنگ آباد لوٹ آئے اور یہاں کے حلقہ شعرا کے لئے رونقِ بزم بنے۔ اس طبیعت کے انسان سے یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ کسی مقام پر وہ بیٹھے اور نوجوان شعرا کی تربیت کے لئے وقف ہو جائے۔ چونکہ ان کی زندگی کا آخری زمانہ زیادہ تر گجرات میں بسر ہوا، اس لئے یہ بات قرین قیاس ہے کہ ان کے دوست، سید ابو المعالی جیسے کئی نوجوان شاعر، ان کے اطراف جمع رہتے ہوں گے، اور ان میں سے کچھ مشقِ سخن بھی کرتے ہوں گے چنانچہ خواجہ حمید اورنگ آبادی نے اپنے تذکرے گلشن گفتار میں ایسے دو شعرا کا حال لکھا ہے جو ولی کے شاگرد سمجھے جاتے تھے۔ یہ اشرف اور رضی ہیں۔ خواجہ حمید اشرف کو "بلاواسطہ شاگرد ولی" بتلاتے ہیں۔ خود ولی نے بھی اپنے کلام میں ان کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

اشرف کا ہو مصرع، ولی مجلس شہ حبیب ‏ ‏ ‏ ‏ الفت سے دل و جاں کوں کرے تسخیر یو سوں

رضی کے متعلق حمید لکھتے ہیں۔ "متوطن احمد آباد، شاگرد ان سید ولی محمد۔" ان کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اشرف میں اور ان میں مقابلہ رہا کرتے تھے۔ یہ ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر رہنا چاہتا تھا۔ اشرف نے کسی زمین میں ایک غزل حسب ذیل کہی تھی:-

ہوا ہوں بستۂ زلف شکن شکن کی قسم ‏ ‏ ‏ ‏ ہوا ہوں صید ... ان کی قسم
پتنگ وار ہے دل جب سے شمع رو پہ فدا ‏ ‏ ‏ ‏ لگن میں شوق کے جلتا ہے تن، لگن کی قسم
پیا، دیکھا جو ترے جام چشم کی گردش ‏ ‏ ‏ ‏ ہوا ہوں شوق کی مے سے ملن، نین کی قسم
پڑا ہے خاک نمن، جو برہ کے کوچے میں ‏ ‏ ‏ ‏ ہے پائمال ترا اے سجن، چرن کی قسم
یہ شعر سن کے کہے ہیں صد آفریں اشرف ‏ ‏ ‏ ‏ تمام شاہ ملک دہن، سخن کی قسم

رضی نے بھی اس کے جواب میں ذیل کی غزل کہی اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ وہ کسی طرح اشرف سے کم نہیں ہیں:-

خراب نرگس مستانہ ہوا، نین کی قسم ‏ ‏ ‏ ‏ بر لب بلبل دیوانہ ہوں، چمن کی قسم

جمال انجمن آ لے شمع رخ پہ تیرے ست
شب وصال میں پروانہ ہوں لگن کی قسم

عذاب روزِ قیامت سیں کچھ نہیں پروا
شہیدِ خنجرِ جانانہ ہوں کفن کی قسم

پیا کی چشم کی وحشت کوں دیکھ جیوں مجنوں
شکارِ دامنِ ویرانہ ہوں، ہرن کی قسم

دیکھا ہے جب سیں رضی پیچ و تابِ طرۂ یار
مزارِ خاک سیں جیوں شانہ ہوں، شکن کی قسم

ایک اور شاگرد، شیخ ثناء اللہ ثنا کا ذکر، فائق نے اپنے تذکرہ میں کیا ہے۔ جو احمد آباد کے رہنے والے اور مولانا نور الدین حسین صدیقی سہروردی کے مریدتھے۔ فائق کے قول کے مطابق ثنا، ولی کے "اجلّ تلامذہ" میں شمار ہوتے تھے۔

مذکورۂ بالا، بلا واسطہ شاگردانِ رشید کے علاوہ، کچھ شاعر ایسے بھی ہیں، جن کے متعلق، صاف طور پر یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ ولی سے حقیقی تلمذ رکھتے تھے یا معنوی۔ شفیق اورنگ آبادی نے "چمنستان شعرا" میں آزاد اور داؤد کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ وہ ولی کے شاگرد معلوم ہوتے ہیں۔ آزاد کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ، اپنے آپ کو ولی کا شاگرد سمجھتے تھے۔ خود ولی نے بھی آزاد کے ایک مصرع کی تضمین اس طرح کی ہے:۔

آزاد سے سُنیا ہوں یو مصرعِ مناسب
جس سے کہ یار ملتا ایسا ہنر نہ آیا

آزاد کا پورا شعر یہ ہے:۔

آئیں، جہاں کی ساری، آزاد، صنعتیں پر
جس سے کہ یار ملتا ایسا ہنر نہ آیا

آزاد، دکن کے رہنے والے تھے اور ان کا نام محمد فاضل تھا۔

داؤد، اورنگ آباد کے قابلِ اعتبار شعرا میں شمار ہوتے تھے۔ اور صاحب دیوان تھے۔ ان کے فرزند، جمال اللہ عشق، بھی اچھے شاعر گذرے ہیں۔ شفیق نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ "در ریختہ اکثر تتبع ولی می نماید"۔ اور اسکے ثبوت میں خود ان کے یہ دو شعر پیش کئے ہیں:۔

سند یو بس ہے تجھے مصرعِ ولی داؤد
کہ تجکوں شورِ قیامت سیں بے نیاز کیا

کہتے ہیں سب اہلِ سخن اس شعر کوں سُن کر
تجھ طبع میں داؤد، ولی کا اثر آیا

آزاد اور اُنکی طرح بہت سے ایسے شعرا کے متعلق جو ولی کی تقلید کرتے تھے، یہ تصفیہ کرنا دشوار ہے کہ ان میں سے کتنوں نے ولی کے سامنے زانوئے شاگردی طے کیا اور سعودہ سخن حاصل کیا۔ لیکن یہ پوشیدہ بات نہیں ہے کہ بڑے بڑے شاعر، اپنے آپ کو اس خدائے سخن کے ساتھ، کسی نہ کسی طرح، وابستہ کرنے اور اسکی تقلید کرنے کو، باعث عزت سمجھتے تھے۔ میر تقی میر کے بعد کے شعرا نے بھی، اُن کی تقلید کو فخر سمجھا۔ تقریباً ہر اُستاد حصہ اور عظیم المرتبت شاعر کا یہی حال ہے۔ متاخرین اُن کے اتباع کو، سند تصور کرتے ہیں۔ ولی کی اُستادی کے آگے، اُن کے زمانے سے لے کر اس وقت تک تمام شاعر، سر تسلیم خم کرتے آئے ہیں۔

ولی کے بعد، قدیم دکنی شاعری کے سب سے بڑے استاد سید شاہ سراج الدین، سراج اورنگ آبادی مانے گئے ہیں۔ تقریباً تمام تذکرہ نویسوں نے انھیں ولی کا جانشین تسلیم کیا ہے۔ شفیق نے لکھا ہے کہ ولی کے بعد، دکن میں، ریختہ کی گرم بازاری، اور رونق، انھیں کے دم سے قائم ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ اورنگ آباد میں، نہ صرف دکن کے بڑے بڑے شاعر جمع تھے، بلکہ شمالی ہند کے شعرا اور علما کی بھی، کافی تعداد موجود تھی۔ جن میں شاہ غلام تالا، یکتا، ہمامی، عبدالقادر مہربان، میر غلام علی آزاد، اور عبدالولی عزلت خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ سب اساتذہ کا رتبہ رکھتے تھے۔ اور ان کے ارد گرد شعر و سخن کا ذوق رکھنے والے نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد جمع رہتی تھی۔ شفیق، آزاد کے شاگرد رشید اور معتقد تھے۔ اور اپنے استاد کے علم و فضل نے غالباً یہ مشکل ہی سے کسی اور کا ذکر بھی گوارا نہیں کرسکتے تھے۔ جب ہم ان کی زبان سے، سراج کے متعلق مذکورہ بالا الفاظ سنتے ہیں، تو سراج کا پایہ ہماری نظر میں اور بھی بلند ہو جاتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ ولی کے بعد، قدیم دکنی شاعری میں سراج کے رتبہ کا کوئی دوسرا شاعر پیدا نہ ہوسکا۔ اس حقیقت کا اظہار سراج نے بھی اپنے ایک شعر میں کیا ہے۔

تجھ مثل اے سراج بعد ولی   کوئی صاحب سخن نہیں دیکھا

سراج کی شاعری، سوز و گداز اور لطافت اور سادگی کا دلنواز مجموعہ ہے۔ اُن کی یادگار سے ایک ضخیم دیوان، اور ایک نفیس مثنوی، "بوستان خیال" باقی ہے۔ دیوان کے چند شعر اقتباس کر کے یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔ جن سے اُن کی اور اُن کے زمانہ کی شاعری کا تھوڑا بہت اندازہ ہوسکیگا۔ ایک غزل کے چند شعر ہیں۔

گر آرزو ہے تجھکوں، تالاب کا تماشا   کشتی میں چشم کی آ، دیکھو آب کا تماشا

ہر قطرہ اشک میں ہے ظاہر جمال مہ رو   پانی میں جیوں عیاں ہے حباب کا تماشا

اے قبلۂ دل وجاں! تری بھنووں کے دیکھے زاہد کوں خوش نہ آوے محراب کا تماشا

حیات انسانی کی سبک روی اور ناپائداری کو ان دو شعروں میں ظاہر کیا ہے:-

آبِ رواں ہے حاصلِ عمرِ شتاب رو لوحِ فنا میں نقش نہیں ہے ثبات کا

روشن ہے اے سراج کہ فانی ہے سب جہاں مطرب غلط ہے، جام غلط، انجمن غلط

ایک جگہ معشوق کی زلف کی تعریف کرتے ہیں:-

کہتے ہیں تری زلف کوں دیکھ اہلِ شریعت قربان ہے اس کفر پر ایمان ہمارا

سراپا کی تعریف میں یہ شعر ملاحظہ ہو:-

ناز کے دیوان میں اے مطلعِ حُسن وجمال قد ترا ہے مصرعہ، وابرو ہے فرد انتخاب

ایک عام خیال کو کس عمدہ پیرایہ میں ادا کیا ہے:-

یا تو گلزار آپ ہو جانا یا کسی گُلبدن سے کے ہو رہنا

اپنے زمانہ کی حالت ایک غزل میں یوں بیان کی ہے:-

عالم کے دوستوں میں مروت نہیں رہی شرم وحیا و مہر وشفقت نہیں رہی
ظاہر میں کیا رفیق کہاتے ہیں آپ کوں لیکن انھوں کے دل میں محبت نہیں رہی
ملتے ہیں راستی سیں، جو کوئی کچھ نظر لے خوبوں میں پاکباز کی حرمت نہیں رہی
نالایقوں میں عمر کوں کرنا عبث تلف ہم صحبتی کی اُن میں لیاقت نہیں رہی
بھولے ہیں ہر صنم کے کرشمے پہ ہوش کوں ان زاہدوں میں کشف وکرامت نہیں رہی
سفلے ہوئے عزیز، عزیز اب ہوئے خراب بے جوہروں میں قدرِ شرافت نہیں رہی

مت ہو بہارِ گلشنِ دنیا کا عندلیب　　　اس پھول بن میں بوئے رفاقت نہیں رہی

سراج کی شاعری کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ان کی اکثر غزلیں شمالی ہند تک پہنچ گئی تھیں، اور لوگوں کی وردِ زبان تھیں۔ بعض تذکرہ نگار ان کے اشعار کو کسی دوسرے شاعر سے بھی منسوب کر دیا کرتے تھے۔

سراج جو ولی کے خلیفہ اول تھے، وہی خلیفہ آخر بھی ثابت ہوئے۔ انھیں پر دبستانِ قدیم کے عظیم المرتبت شعرا کا خاتمہ ہو گیا۔ کیونکہ ایک طرف تو وہ فضا اب سونی ہو چکی تھی، جس میں دکنی شعر و سخن کی پرورش ہوئی تھی، دوسرے اورنگ آباد میں جو اب دکن کا پایۂ تخت تھا، شمالی ہند کے شعرا خاصی تعداد میں آنے لگے تھے۔ ان مختلف دبستانوں کے میل جول اور اختلاط سے ایک نئے اسلوب کا فروغ پانا ضروری تھا۔ یہ نیا اسلوب جو پیدا ہوا، شمال اور دکن کے روزمرے اور محاورے پر مشتمل تھا۔ چنانچہ سراج کے بعد جو شاعر پیدا ہوئے وہ اسی جدید اسلوب اور زبان کے شاعر تھے۔ درگاہ، شاہ تجلی و [illegible] اسی مخلوط زبان میں شعر کہتے رہے۔ [illegible] جدیدہ کا سلسلہ نواب میر نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے آخر عہد میں انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ یغما، تجلی کے شاگرد رشید شیخ محمد خاں ایمان، جو اپنے زمانہ میں شمالی ہند اور دکن دونوں جگہ کے شاعروں کے ہاں استاد کا درجہ رکھتے تھے۔ انھی زمانہ میں [illegible] انجام کرتے تھے جس میں دہلی کا کوئی استاد شعر کہتا تھا۔

شاعرِ اعظم

از

مرزا باقر علی صاحب زاہدؔ، متعلم سٹی کالج

اے ولیؔ باکرامت شاعرِ شیریں بیاں
مانتا ہے شاعرِ اعظم تجھے ہندوستاں

تجھ سے پہلے بھی کئی شاعر دکن میں تھے ولے
جو ذہانت تجھ میں تھی اوروں نے وہ پائی کہاں

تو اگر دعویٰ کرے اپنی زباں کا ہے بجا
وہ سلاست، وہ لطافت، اور وہ تیری زباں!

آج بھی اردو تری شرمندہ احسان ہے
تو دکن میں شاعری کا مدتوں تھا پاسباں

مثنوی اور مرثیئے کا رنگ پھیکا پڑ گیا
دیکھ کر صنفِ غزل میں تیرا سحرِ آگیں بیاں

دو صدی کے بعد بھی بھولے نہیں اہلِ دکن
تو نے بعدِ مرگ پائی ہے حیاتِ جاوداں

تھا سٹی کالج میں برپا جشن تیری یاد میں
نام تیرا تھا ولیؔ ہر اک کی وردِ زباں

اُردو شاعری میں ولی کا رُتبہ

از

جناب محمد عبد الحکیم صاحب متعلم ایم۔ اے ابتدائی شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

عنوان بالا پر جامعات ہند کے پوسٹ گریجویٹ اور انڈر گریجویٹ طلبہ سے مسابقتی مضامین لکھائے گئے تھے۔ ممتحنین نے ذیل کے مضمون اور زین العابدین صاحب کے مضمون کو علی الترتیب پوسٹ گریجویٹ اور انڈر گریجویٹ کے حصۂ انعامات اول اور دوم کا مستحق قرار دیا۔

نیرنگی دہر کی مجموعہ کاریوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آج جو چیزیں سب سے زیادہ مشہور و معلوم، روشن اور واضح ہیں، انھیں کے آغاز تاریکی و پنہانی و تاریکی کے اتنے تہ در تہ پردے پڑے ہوئے ہیں کہ ایک کے بعد دوسرا اٹھتا جاتا ہے لیکن تصور کی جھلک بھی نظر نہیں آتی۔ ہاں، دہلی، دکن اور ضحاک جو سے تیر کو فہمیوں، ادیبوں، تبصرہ و جام جم دنیائے ادب کے مسلمات سے ہیں لیکن جہاں تک ان کی پیدائش کے زمانہ کا تعلق ہے ہماری معلومات کا دامن خالی ہے اور تاریخ تو سرے سے ان کے وجود ہی کا انکار کرتی ہے۔ انسانی زندگی سے عموماً تین دور منسوب ہیں طفلی، شباب اور پیری لیکن کوئی ہے کون ہے جو اس کے لئے تعین کر سکے جب وہ عہد طفلی ختم کر چکا اور جس کے بعد اس نے دور شباب میں قدم رکھا یا اس دن کا جب کہ مرحلے طے ہوئے جس پر اس کے عہد شباب کا خاتمہ ہوا تھا۔ پیری اپنی ساری نو نشانیوں کے ساتھ آ جاتی ہے اور شام کا جلوہ غروب کی جانب ہماری آنکھوں سے نہیں گذرتا۔ لیکن ہے کوئی جو اس ساعت کو متعین کر دے جس سے صبح کا آغاز یا شام کی ابتدا ہوتی ہے۔ ٹھیک یہی حال زبان اردو کا ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس کا آغاز کب سے ہوا ہے۔ علمائے لسانیات آج تک جو کچھ کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ ابتدائی دور کے بعض بعض فقرے پیش کر دیتے ہیں اور یہی زبان اردو کے پہلے فقرے کے نام سے آج تک کوئی چیز پیش کی جا سکی اور نہ آئندہ اس کا امکان نظر آتا ہے لیکن جب روشنی کا غلبہ ہو جاتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ صبح ہو گئی ہے اور جب تاریکی روشنی پر غالب ہو جاتی ہے تو ہم کہتے ہیں کہ شام ہو گئی ہے۔ ٹھیک اسی طرح جب ولی کا

کلام شہادت دیتی ہے، اور دکن کو اپنا گہوارہ اور وطن بنا لیتا ہے تو اردو کی ادبی داستان حقیقۃً مکمل ہو جاتی ہے بالکل ویسے ہی جیسے صبح کی نور افشانی شام کی ظلمت خیزی اور شفق کی خونابہ فشانی معلوم و مسلم ہے اور دلیل و ثبوت سے قطعاً بے نیاز۔

ولی سے قبل دکنی لٹریچر پر ایک نظر

مولانا آزاد کے مشہور تذکرہ آب حیات کی سند پر مدت سے یہ خیال چلا آتا تھا کہ ولی اردو زبان کا پہلا شاعر ہے لیکن اب کی تحقیقات سے اس خیال کی غلطی ظاہر ہو گئی اور اب ہمارے سامنے ولی سے قبل کے شعراء کی ایک بڑی صف موجود ہے۔ دکن میں قطب شاہی سلطنت کا مشہور فرمانروا محمد قلی قطب شاہ (انتقال ۱۰۲۰ھ ۱۶۱۱ء) ایک صاحب دیوان شاعر گزرا ہے جس نے ولی سے مدتوں پہلے اپنے دیوان کی ترتیب و تدوین کی تھی۔ صاحب تاریخ ادب اردو کے بقول "سادگی شیرینی ان کے کلام کا جوہر ہے، تصوف اور عاشقانہ رنگ بھی ان کے کلام میں پایا جاتا ہے" مگر ان کی بعض خصوصیات ایسی ہیں جن کے سبب اردو شعر و شاعری کے نقطۂ نظر سے ان کے کلام کو صاف اور شیریں نہیں کہا جا سکتا۔ محمد قلی قطب شاہ کا زمانہ ایسا زمانہ تھا جب دکنی زبان پر ہندی، سنسکرت اور فارسی کا اثر بہت زیادہ پڑ رہا تھا اس لیے کبھی تو ان کے کلام میں ہندی الفاظ، ترکیبوں اور بندشوں کی ایسی بھرمار ہو جاتی ہے کہ اشعار اردو زبان کی بجائے بھاشا کے اشعار معلوم ہونے لگتے ہیں مثلاً

بسے خندنی میں جب تک پیو ہمارا — اتن بکس دیتی چندر تھی اتارا

بسے جن ہیا میں پرت ہم سجن کی — میں اس کی پرت تج نہیں اوٹھ پیارا

چھبیلی سوں لگیا ہے من ہمارا — لدن میں نہیں ... من کا ادھارا (ماخوذ از شعر الہند)

ایسے اشعار ہیں جن کی زبان کو اردو کے بجائے ہندی کہنا زیادہ موزوں ہے۔ قطب شاہ کے اکثر اشعار ایسے ہیں جو ہندی بحور و اوزان میں کہے گئے ہیں جنھیں ہم کسی طرح اردو کا نام نہیں دے سکتے۔ بعض جگہ جہاں انھوں نے فارسی کا تتبع کیا ہے وہاں فارسی الفاظ کی ایسی کثرت ہے کہ اشعار تقریباً فارسی ہی کے معلوم ہوتے ہیں مثلاً

اے روضہا کہ گل جو کیا تازہ اے صنم — او غمزہ تازہ تازہ ترا عارفانہ کر

ہاتف ندا کرے کہ دلے زمزم صبوح — میرے دلم میانہ رمز نشانہ کر

بیدار کیم تن سوں ہمارے کہاتی ہے — او چشم عارفانہ ترا فتنہ بانہ کر

پیوستہ با تو بادہ معانی خود عیش — قلقل کی صوت بجتی ہے صوبت بہانہ کر (شعر الہند ص ۴۵)

غرض یہ ہے کہ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلام میں بھاشا اور فارسی کا گوارا، لطیف اور معتدل امتزاج کم ملتا ہے وہ فارسی کی طرف جب جھکتے ہیں تو ایک دم فارسی ہی کہنے لگتے ہیں اور جب بھاشا کی طرف توجہ کرتے ہیں تو کبت، دوہے اور گیت کہنے لگتے ہیں لیکن بعض بعض جگہ ان کا کلام ضرور صاف ہو گیا ہے جیسے:-

دل اگر مَے خدا کن کہ خدا کام دے گا   سخن کو [illegible]

گولکنڈہ اور بیجاپور کے بادشاہ خود اہلِ ذوق تھے اور شعراء اور نیز دوسرے اہلِ فن کی قدر کرتے تھے۔ سلاطین کی سرپرستی اور قدردانی کی وجہ سے دکن میں اردو شعر و شاعری کی تربیت و ترقی شمالی ہند سے بہت پہلے ہوئی۔ ان شعرا کی ایک طویل فہرست ہے جو سخن شناس اور علم پرور بادشاہوں کے دامنِ دولت سے وابستہ تھے۔ ان میں سے ہر ایک کا نام لینا نہ تو ممکن ہے اور نہ ضروری۔ چند مشہور شعرا جن کا تعلق دربار گولکنڈہ سے تھا یہ ہیں: غواصی، ملا قطبی، ابن نشاطی، جنیدی، جبنی، نوری، افضل، شاہی، مرزا، شوقی۔ بیجاپور، و عاقب وغیرہ۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے بعد اس کا بھتیجا سلطان محمد قطب شاہ سریر آرائے سلطنت ہوا۔ یہ دونوں بادشاہ چونکہ مذہباً شیعہ تھے اس لئے ان کے عہد میں دکنی شاعری میں مرثیہ اور تصوف کا اضافہ ہوا۔ بہت سے مرثیے اور قصائد اہلبیت اور ائمۂ عظام کی شان میں لکھے گئے اور دکنی شاعری کا ذخیرہ بڑھتا گیا۔ لیکن ابھی ان کی نظموں کی بول چال اور تخیل بہت صفائی اور شیرینی ابھی تک پیدا نہ ہوئی تھی۔ غزل لکھنے کا رواج بھی اس عہد میں ہو چلا تھا لیکن غزل میں عموماً ہندی کے تتبع میں عشق کا اظہار عورت کی جانب سے کیا جاتا تھا۔ اس عہد کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ فارسی اور عربی کے الفاظ جو دکنی روزمرہ میں غلط بولے جاتے تھے شعرا اپنے کلام میں بھی ویسے ہی لاتے ہیں عام اس سے کہ لغت کے لحاظ سے وہ صحیح ہوں یا غلط۔

یہ امر حیرت انگیز ہے کہ قطب شاہی سلاطین کے دور میں دیگر اصناف سخن کی نسبت مثنوی کو بہت ترقی ہوئی۔ دربار گولکنڈہ کے شعرا میں سے بہتوں کا نام تاریخ ادب میں صرف اس لئے زندہ ہے کہ چند مثنویاں ان کی یادگار ہیں۔ مثنوی کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کا سبب یہ ہے کہ دوسرے اقسام نظم کے مقابلہ میں اس میں وسعت زیادہ ہے۔ مثنوی میں یہ ضروری نہیں ہے کہ ابیات باہم قافیہ و مردف ہوں۔ ہر بیت قافیہ اور ردیف کے اعتبار سے اپنے سابق و لاحق ابیات سے بالکل جداگانہ ہوتی ہے۔ قافیہ اور ردیف کی وہ پابندیاں جن سے غزل، قصیدہ اور رباعی کا میدان نہایت تنگ ہو جاتا ہے مثنوی کی رو سے علحدہ ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شاعر کو مثنوی کے اندر اپنے تخیل کی نمائش اور جولانی طبع کے لئے نہایت وسیع میدان ہاتھ آتا ہے۔ مثنوی کی وسعت اور ہمہ گیری کے سبب سے اس میں ہر قسم کے مضامین فلسفہ، پند و نصیحت، اخلاق، عشق و محبت، بزم و رزم، مناظر قدرت، تاریخ وغیرہ بڑی آسانی اور زور و جوش کے ساتھ بیان کئے جا سکتے ہیں۔ قطب شاہی دور میں مثنوی کی اس درجہ مقبولیت کا سبب اس کی ہمہ گیری اور وسعت ہی کو کہہ سکتے ہیں۔ غواصی جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے دربار گولکنڈہ کا شاعر تھا۔ مشہور مثنوی سیف ملوک اسی کی یادگار ہے۔ اس مثنوی میں اس نے سیف ملوک شہزادہ مصر اور بدیع الجمال شہزادی چین کی محبت کا قصہ نظم کیا ہے۔ [illegible] خوب ہے۔ غواصی نے خود بھی اس کا اعتراف کیا ہے۔ مثنوی پھول بن ابن نشاطی کی تصنیف ہے۔ [illegible] پھول بن کا نام رکھا ہے۔ اس مثنوی میں طلسماتی دنیا کے عجائب و غرائب دکھائے گئے ہیں جہاں انسان [illegible] اور جہاں لقمان و سکندر جیسے ذوق الفطرت اشخاص کے پند و نصائح سے استفادہ کا [illegible] مثنوی کا [illegible] مصنف تحسین الدین کا خاص طور پر ذکر کرنا ہے۔ یہ وہ مثنوی ہے جسے مشہور جرمن شاعر گوئٹے نے ترجمہ کر کے [illegible]

دادا کا بیٹا ہے اور کلا قصہ کی بیرونِ لنکا کے بادشاہ کی بیٹی ہے دونوں خواب میں ایک دوسرے پر عاشق ہو جاتے ہیں۔ یہ مثنوی ۱۰۳۶ھ
میں کامساں دی ہاشمی کے اہتمام سے شائع ہوئی ہے۔ دربار گولکنڈہ کے آخری شعرا جنیدی، جیبی اور فائز ہیں جنیدی نے اپنی مثنوی ماہ پیکر ۱۰۶۴ھ
تصنیف کی تھی اور فائز دونوں گولکنڈہ کے رہنے والے تھے۔ جیبی نے ایک مثنوی تیرہ ہزار اشعار کی جلوہ نگر نامہ کے نام سے لکھی
ہے قصہ نظامی کی مثنوی ماہ پیکر سے لیا ہے اس کا سنِ تصنیف ۱۰۸۱ھ ہے۔ فائز نے ۱۰۹۴ھ میں فارسی قصہ رضوان شاہ و روح افزا کا ترجمہ
نظم دکنی میں کیا۔

بیجاپور کے مشہور شعرا رستمی، نصرتی، شاہ ملک، امین، ہاشمی، مومن، شوقی اور ... نصرتی علی عادل شاہ ثانی ۱۰۶۵ھ ۱۶۵۶ء تا ۱۶۷۲ء
الٰہی بیجاپور کے عہد میں کرناٹک سے بیجاپور آیا۔ بادشاہ کے دربار میں رفتہ رفتہ دکنی ... صاحب ... درجہ ملک الشعرا کا خطاب عطا فرمایا
صاحب تاریخ ادب اردو لکھتے ہیں کہ ابراہیم زبیری نے نصرتی کے کلام کی بہت تعریف کی ہے اس کی مضمون آفرینی، زورِ طبع اور اوجِ تخیل
کو خاقانی کے ہم پایہ قرار دیا ہے۔ ممکن ہے کہ زبیری نے اپنے بیان میں کچھ مبالغہ سے کام لیا ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ نصرتی نہایت پرگو اور
بلند پایہ شاعر تھا تین مثنویاں اس کی یادگار ہیں پہلی مثنوی علی نامہ ہے اسی کے صلے میں اسے ملک الشعرا کا خطاب ملا۔ اس میں علی عادل شاہ کے
سوانح زندگی، فتوحات، داستان عیش و طرب بیان کی گئی ہیں درمیان میں کہیں کہیں مدحیہ قصائد بھی آگئے ہیں۔ یہ پہلی مثنوی ہے جس میں ایک
بادشاہ کی مدح کی گئی ہے۔ اس کے قبل ہمیں کسی بادشاہ کی تعریف میں کوئی مثنوی نہیں ملتی۔ نصرتی کی دوسری مثنوی گلشنِ عشق ہے لیکن اس میں بھی
وہی عیب ہے جو سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلام میں پایا جاتا ہے بعض اشعار تو صاف ہیں لیکن بیشتر نہایت دقیق، مشکل اور پیچیدہ ہیں کہیں
عربی و فارسی الفاظ و تراکیب کی کثرت ہے تو کہیں بھاشا و سنسکرت کی۔ نصرتی کی تیسری مثنوی گلدستۂ عشق ہے اس نے قصیدے اور غزلیات کے
دو مجموعے بھی چھوڑے ہیں دکنی لٹریچر میں نصرتی کی حیثیت ... پانچ ہزار ابیات کی ایک مثنوی یوسف زلیخا نام کی ہے اس کا مصنف
مشہور نابینا شاعر ہاشمی ہے اس نے اپنا دیوان بھی مرتب کیا تھا جس میں قصائد، غزلیں، مرثیے تھے اور رباعیاں سب ہی تھیں اس کے کلام
کی چند خصوصیات ہیں۔ غزلوں کا حصہ ریختہ کی بجائے ریختی میں کہا گیا ہے قدیم بھاشا کا رنگ پورے مجموعہ کلام پر چھایا ہوا ہے ایہام کی بھی
کثرت ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہندی شاعری کی تقلید میں ان کے یہاں بھی عشق کی ابتدا عورت ہی کی طرف سے ہوتی ہے۔ ایک
اور مشہور شاعر کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے یہ قاضی محمود متخلص بہ بحری ہیں کہا جاتا ہے کہ ان کے اشعار کی تعداد پچاس ہزار تھی ان کی ایک
مثنوی "من لگن" نام کی تصوف میں ہے یہ ۱۱۱۲ھ میں تمام ہوئی۔ زبان اس کی مشکل اور ادق ہے۔

ولی کے قبل دکنی لٹریچر کا یہ ایک مختصر خاکہ ہے اس کی زبان، خصوصیت، معنویت اور اس کے عام میلان کا ذکر جستہ جستہ پہلی
تحریر میں کر دیا گیا ہے لیکن یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مجموعی حیثیت سے بھی ایک نظر اس لٹریچر پر ڈالی جائے سب سے پہلی بات تو یہ
ہے کہ اب اس کی زبان یکسر مہجور و متروک ہے شمالی ہند کے اہلِ زبان کا تو کیا ذکر خود اہلِ دکن بھی بہ دقت تمام اردو کی شعر و شاعری کو

ولی کے مختصر حالات

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ولی جیسے بلند پایہ شاعر کے حالات زندگی تفصیل سے تو کیا اجمال کے ساتھ بھی نہیں معلوم ہو سکے ہیں۔ یہ شخص اگر یورپ میں پیدا ہوتا تو اس کی زندگی کے تمام شعبوں پر اس کثرت سے کتابیں لکھی جاتیں کہ ایک پوری لائبریری ان سے تیار ہو سکتی اور واقعات و سوانح کا ہر باب ولی کی تصویر کے خد و خال تک کو روشن اور اجاگر کر دیتا۔ لیکن ہماری غفلتوں اور بے نیازیوں کا یہ حال ہے کہ آج ہم ولی کا صحیح نام بھی تحقیق نہ کر سکے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ ولی محمد، ولی الدین، حاجی ولی، شمس الدین اور شمس الحق میں سے کون سا ان کا حقیقی نام تھا۔ اکثر شعراء اپنے نام پر تخلص بھی اختیار کرتے ہیں اس سے خیال ہوتا ہے کہ ولی محمد، ولی الدین، یا حاجی ولی میں کوئی ان کا نام ہوگا لیکن یہ بھی قیاس ہے۔ بہرحال اس بحث کو طے کرنے کا یہ موقع نہیں۔ ولی ۱۰۷۵ھ بمطابق ۱۶۶۵ء اورنگ آباد میں پیدا ہوئے بعض تذکرہ نویسوں نے غلطی سے انہیں احمد آبادی اور گجراتی بتلایا ہے لیکن یہ صحیح نہیں ولی کا اورنگ آبادی ہونا ہر اعتبار سے پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے۔ البتہ وہ عرصہ تک طالب علمی کے سلسلے میں احمد آباد میں مقیم رہے اور ۱۱۵۵ھ بمطابق ۱۷۴۲ء وہیں ان کا انتقال بھی ہوا اور دریا خاں کے گنبد کے سامنے دفن ہوئے۔ سورت میں بھی عرصہ تک ان کا قیام رہا ایک مثنوی سورت کی تعریف میں لکھی ہے۔ احمد آباد میں انہیں شاہ وجیہ الدین قدس سرہٗ سے بیعت تھی۔ ولی نے دلی کا سفر بھی دو مرتبہ کیا اور کچھ عرصہ وہاں بھی مقیم رہے۔ شاہ سعد اللہ گلشن دہلوی سے ولی کو ایک خاص عقیدت تھی شاہ صاحب نے ہی ولی کو مشورہ دیا تھا کہ "این ہمہ مضامین فارسی کہ بے کار افتادہ اند در ریختہ خود بکار ببر از تو کہ محاسبہ خواہد گرفت" اور تذکرہ قدرت میں ہے کہ انہوں نے یہ الفاظ کہے "شا زبان دکنی را گذاشتہ ریختہ را موافق اردوئے معلّٰی شاہجہان آباد موزوں بکنید کہ تا موجب شہرت و رواج قبول خاطر صاحب طبعان عالی مزاج گردد"۔ غرض شاہ صاحب کے مشورے کے موافق زبان اور مضامین ہر لحاظ سے ولی نے اپنی شاعری میں اصلاح کی اور فارسی خیالات و مضامین کی گنجائش کے لئے ریختہ میں تغیر و تبدل کئے، یہاں تک کہ ریختہ کی وہ قدیم ناہمواری اور شترگربگی کا خاتمہ ہو گیا اور ایک فصیح، سلیس اور رواں زبان تیار ہو گئی۔ اب ہم یہاں ولی کی شاعری پر ایک تفصیلی نظر ڈالنا چاہتے ہیں اور پھر ولی کے کلام کی خصوصیات سے بحث کریں گے۔

ہمیں مولانا احسن مارہروی کا ممنون ہونا چاہئے کہ انہوں نے دو سال کی پیہم جستجو اور جگر کاوی کے بعد "کلیات ولی" کا نہایت صحیح ایڈیشن ایک فاضلانہ تبصرہ کے ساتھ شائع فرمایا۔ اس ایڈیشن میں مولانا کے بیان کے مطابق چار سو بائیس غزلیں، سات مستزاد، بارہ مخمس، دو ترجیع بند، چھ قصائد، دو مثنویاں، چھبیس رباعیاں، چھ قطعات اور چالیس مفردات شامل ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ ولی کو ہر صنف کلام پر کیسی حیرت انگیز قدرت حاصل تھی اور وہ کیسے پرگو شاعر تھے۔

ولی کی غزلیں

غزل ابتداء میں حسن اور داستان محبت کے لئے مخصوص تھی لیکن فارسی شعراء نے اس کی وسعتیں بے پایاں کر دیں کیفیات محبت کے علاوہ جو غزل کا حقیقی عنوان تھا۔ فلسفہ، اخلاق، تصوف، تاریخ، معاشرت ہر قسم کے مضامین غزل ہی میں لکھے گئے لیکن یہ بات البتہ تعجب انگیز ہے کہ باوجود غزل کی وسعت ہمہ گیری اور ہمہ آمیزی کے اپنے اصلی مرکز سے غزل بہت کم ہٹی ہے۔ یعنی اس

---

[1] تذکرہ شعرائے دکن جلد بجار خان

کے اجزائے ترکیبی میں عناصر محبت کا اب بھی غلبہ ہے۔ ولی نے غزل کی حقیقی خصوصیات کو اپنے سامنے رکھا اور واردات عشق، درد و الم، کیف سرور، یاس و حرمان، لذت و مسرت، رنج و حسرت پر تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ انھوں نے غزل کے میدان کو محدود کر دیا ہے۔ ان کے یہاں تنوع بھی ہے جیسا کہ مولانا حسن ندوی نے فرمایا ہے ولی کو امیر و داغ کا ہمعصر نہ سمجھنا چاہیے بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ ولی عہد عالمگیر کا ایک شاعر تھا۔ اگر یہ خیال ذہن میں رہے تو ہم ولی کے مرتبہ کا صحیح اندازہ لگا سکیں گے۔

آلام محبت ۔ ولی فرماتے ہیں

لالہ خونیں کفن کے حال سوں ظاہر ہوا   بستگی ہے خال سوں خوباں کے داغ زندگی

آسماں میری نظر میں کلبۂ تاریک ہے   گر نہ دیکھوں تجھ کوں اے چشم و چراغ زندگی

دنیائے عشق میں یہ بات مسلم ہے کہ محبت کی ابتدا ہی آلام و مصائب سے ہوتی ہے

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا   آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

یا مثلاً ہمارے جگر صاحب فرماتے ہیں ؎

شروع راہ محبت ارے معاذ اللہ   یہ حال ہے کہ قدم ڈگمگائے جاتے ہیں

ولی بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ محبوب سے وابستگی ایک داغ ہے اور یہ داغ کہ زندگی میں تو معلوم نہیں اس نے کیا کیا غضب ڈھائے مرنے کے بعد بھی لالے کو خونیں کفن بنا رکھا ہے۔ لالے کی رنگت سرخ ہوتی ہے اس لیے خونیں کفن کہنا مناسب ہے اور چونکہ اس کی پنکھڑیوں میں سیاہ داغ بھی ہوتے ہیں لہذا اسے کا خال محبوب سے دل بستگی رکھنا کیا ہی خوبی ہے جو خود ہی اپنا ثبوت بھی ہے

دوسرا شعر موسیقیت و ترنم کے لحاظ سے تحسین و آفرین سے بے نیاز ہے فرماتے ہیں کہ اے محبوب! اے میری زندگی کے چشم و چراغ! اگر میں تجھے نہ دیکھوں تو دنیا اور دنیا کی مسرتیں تو ایک طرف یہ گنبد نیلگوں جو آفتاب کی ضیا پاشیوں سے منور اور مہتاب کی سیم افشانیوں سے جگمگاتا رہتا ہے میری نظروں میں تاریک ہے۔ ایک ہجر ہے اس شعر سے ایک طرف تو عاشق کو اپنے محبوب سے انتہائی تعلق کا ثبوت ہوتا ہے اور دوسری طرف ایک لطیف اشارہ اس حقیقت کی طرف ہے کہ آپ کسی وقت میں بھی اپنی تجلیات سے محروم نہ کریں اس لیے کہ یہ یک گھڑی ہی ہجر کا مصیبت ہوگی اور دنیا میری نظروں میں اندھیری ہو جائے گی ؎

لگ جاں سے ہو جدا خوں جاری   یاد تیری پلک کی نشتر ہے

سادگی اور صفائی اس شعر کا جوہر ہے کون کہہ سکتا ہے کہ یہ شعر اس شخص کا ہے جس کے عہد میں زبان کا ابتدائی دور تھا۔

اگر ملک ہونا تو لشکر رکھو   سب ایک سوں یک جہت رکھو

تمن سب کو یو بات کا کام ہو   تمہارے اتنگ یو نیا کام ہے

وصیت کئے تک اُسے گیان تھا — اسے ملکا فرزند کا دھیان تھا
اجل آئی تو چھوڑا سسا ر آگیا — اجل کا نہیں کوئی چیتا را کیا

(تاریخ از مثنوی رضواں شاہ)

محبوب کی تعریف۔

کیوں نہ ہر ذرہ و قص میں آئے — جلوہ گر آفتاب سیما ہے

محبوب کی تعریف مشرقی شاعری کا ایک غیر فانی باب ہے جو شاعر عشوہ و ترکانہ اور غمزہ بے باک کی داستان غارت گری فرماتا ہے زلف چلیپا، گلاب افشاں جبیں، نرگس بیمار، عارض روشن، لب لعلیں، رخ سیمیں، سنگ گہر، سینہ شفاف، کمر، ہیں، سرو قد، یہ سب کے مستقل عنوانات ہیں اور مجھے یقین ہے کہ اگر ہم اردو کے دواوین کا مطالعہ کیا جائے تو ان میں سے ہر عنوان کے تحت ایک اچھا خاصا لٹریچر جمع کیا جا سکتا ہے لیکن فی الحال ہمیں اس جمع کشی کی ضرورت نہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ ولی نے اپنے محبوب کی کیا تعریف کی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

کیوں نہ ہر ذرہ و قص میں آئے — جلوہ گر آفتاب سیما ہے

اس شعر کی ساری خوبی اس کی سادگی اور بے تکلفی میں پنہاں ہے جس زمانہ کی زبان کا نمونہ اوپر دیا جا چکا ہے اس عہد میں ایسے صاف اشعار کہنا بجائے خود ایک بڑا کمال ہے لیکن ولی نے اس اجمالی تعریف پر اکتفا نہیں کی ہے آگے فرماتے ہیں ؎

سواد خط خوباں دلکشی میں — بہار گلشن بنگال ہوا ہے
ترا قد ہائے بہار گلشن ناز — مثال سرو زیب صد چمن ہے
ترے لب پر جو خط عنبریں ہے — خط یاقوت سوں نقش نگیں ہے
چمن آرائے باغ نقش ادائی — نہال قد سرو گل جبیں ہے

ان اشعار میں ولی نے اپنے مطالب کو روانی و سلاست سے نہایت سادے انداز میں پیش کیا ہے باریکی، پیچیدگی اور نازک خیالی کا شائبہ تک نہیں ملتا ہے۔ اصل وجہ یہ ہے کہ تکلف و تصنع، باریک بینی اور دقت نظری کسی زبان کے ابتدائی دور میں پیدا نہیں ہو سکتیں۔ بے تکلفی اور بے ساختگی ابتدائے زبان کی خصوصیات ہوتی ہیں۔ جو خیال جس صورت سے ذہن میں وارد ہوتا ہے شاعر ٹھیک اسی طرح الفاظ کے جامے میں اسے جلوہ گر کر دیتا ہے عام طور پر نکتہ آفرینی اور دقیقہ سنجی ایسے موقعہ پر ناممکن ہے کیونکہ زبان ابھی ان چیزوں کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ تاہم ولی چونکہ آپ اپنی دنیا کا پروردگار ہے وہ شعرا کی عام صفوف سے ممتاز ہے اس کے یہاں امتیاز و استغنا کی حیرت انگیز مثالیں ملتی ہیں اور وہ مضامین جو میر و سودا کے زمانے میں شعرا کے طرب میں الہام ہوئے ولی کے معمولی اور پیش پا افتادہ مضامین ہیں۔ ولی فرماتے ہیں ؎

کیا ہو سکے جہاں میں ترا ہمسر آفتاب — تجھ حسن کی اگن کا ہے یک انگرا آفتاب

ساری توجہ کام کرنگھی، چوٹی، انگیا، کرتی کو بنا دیا تھا۔ اے کاش اردو نظم کے اولا بادلی کی جذباتی شاعری جس کی دلاویزی، شیرینی، بے تکلفی اور لطافت آج بھی ہمارے لیے سبق آموز ہے، شعرائے لکھنؤ کے سامنے ہوتی۔ کیفیت محبت کی کتنی سادہ اور معصوم تفسیر ہے جو ولی کا یہ شعر پیش کر رہا ہے۔

ہر اک وقت مجھ عاشق زار کوں　　پیارے تری بات پیاری لگے

وقت اور زمانے کا کوئی تعین نہیں تم خوش ہو، خفا ہو، ناراض ہو، تیوری پر بل ہوں، یا لبوں پر مسکراہٹ، ہر حال میں تمہاری باتیں دل کو بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ نہ کوئی تشبیہ ہے نہ استعارہ۔ الفاظ صاف، سلیس، شستہ، موتی کی طرح ڈھلے ہوئے ہیں۔ شعر کی قدر کرنا چاہو تو نہیں ہو سکتی۔ ولی کا یہ شعر میر تقی میر کے مشہور شعر

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا　　دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

سے ٹکر کھاتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

بے کسی کے حال میں یک آن تنہا نہیں　　غم ترا سینے میں میرے ہمدم جانی ہوا

دنیا میری بدحالی و بیکسی کو دیکھ کر سمجھتی ہے کہ میں یکہ و تنہا ہوں۔ وہ اکیلا ہوں لیکن اسے کون سمجھائے کہ تیری یاد، تیری محبت میرے سینے میں مصروف غمگساری و دلنوازی ہے اور میں اپنی ساری بدحالیوں اور شکستہ سامانیوں کے باوجود ایک لمحے کے لیے بھی تنہائی و مجبوری کا خوف محسوس نہ کر سکا۔

مندرجہ ذیل اشعار ولی کی سادہ جذباتی مصوری کا انداز پیش کرتے ہیں

شراب شوق سے سرشار ہیں ہم　　کبھی بے خود کبھی ہشیار ہیں ہم

بے منت شراب ہوں سرشار انبساط　　تجھ نین کا خیال مجھے جام جم ہوا

اے صنم تیرے دہن کے شوق میں　　ہر کلی میں نعرۂ ناقوس ہے

عشق مجازی اور ولی

ولی کے سوانح زندگی کی اکثر و بیشتر حقیقتیں ہماری نگاہوں کے سامنے نہیں ہیں۔ ہم یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ ولی عشق مجاز کے لذت آشنا تھے یا نہیں تھے لیکن اتنا تو بہرحال مسلم ہے کہ ان کے کلام میں چند ایسی غزلیں ملتی ہیں جو کسی طرح روحانیت کے دائرے میں نہیں آسکتیں اور وہ شدید تعلق خاطر اور اس کی نوعیت جو ان غزلوں کے حرف حرف سے ظاہر ہے بتلاتی ہے کہ ولی کا محبوب اسی دنیا کا بسنے والا ہے۔ ایک غزل ملاحظہ ہو ؎

مت غصے کے شعلے سوں جلتے کو جلاتی جا　　ٹک مہر کے پانی سوں یہ آگ بجھاتی جا

تجھ چال کی قیمت سوں نہیں دل ہے مرا واقف　　اے ناز بھری چنچل ٹک بھاؤ بتاتی جا

اس رین اندھیری میں مت بھول پڑوں تس سوں　　ٹک پاؤں کے بچھوؤں کی آواز سناتی جا

مجھ دل کے کبوتر کوں پکڑا ہے تری لٹ نے　　یہ کام دھرم کا ہے ٹک اس کو چھڑاتی جا

تجھ مکھ کی پرستش میں گئی عمر مری ساری — اے بت کی بھجن ہاری اس بت کو پجاتی جا
تجھ عشق میں جل جل کر سب تن کو کیا کاجل — یہ روشنی افزا ہے انکھوں کو لگاتی جا
تجھ عشق میں دل جل کر جوگی کی لیا صورت — یکبار ارے موہن چھاتی سے لگاتی جا

تجھ گھر کی طرف سندر آتا ہے ولی دائم
مشتاق ہے درشن کا ٹک درس دکھاتی جا

اس غزل کے ہر شعر میں جو درد، تڑپ، التجا اور آرزو پنہاں ہے وہ صاف طور پر ولی کی دل باختگی کا اعلان کر رہی ہے۔ ممکن ہے بعض لوگوں کو اعتراض ہو کہ اس قسم کی غزلیں مخرب اخلاق اور حیا سوز ہوتی ہیں ان کا ذکر ہی نہ کرنا بہتر ہے لیکن میں عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ نفس شاعری کو اخلاقی مسائل سے بہت کم تعلق ہے اور ایک شاعر کے کلام پر تنقید کرنے کا صحیح معیار شاعرانہ نقطۂ نگاہ ہے نہ کہ اخلاقی زاویۂ نگاہ۔

تصوف

ولی کے کلام میں تصوف کے مضامین کی کثرت ہے۔ ولی بسلسلۂ طالب علمی مدت تک احمد آباد رہے اور حضرت شاہ وجیہ الدین قدس سرہ سے دست بیعت ہونے کی وجہ سے حضرت شاہ صاحب سے خاص اخلاص و عقیدت رکھتے تھے۔ ولی کے متصوفانہ میلان خاطر نے حقیقت سے بھی کافی روشنی پائی ہے کہ جب وہ دلی میں آئے تو اگرچہ انہیں یہاں بہت لوگوں سے ملنے جلنے کا سابقہ پڑا لیکن ولی سب سے زیادہ متاثر حضرت سعد اللہ شاہ گلشن سے ہوئے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ تصوف، فقر و قناعت ان کی طبیعت میں داخل تھے۔ فرماتے ہیں ؎

ہر ایک سوں متواضع ہو سروری یہ ہے — سنبھال کشتی دل کو قلندری یہ ہے
نکال نقش فنا تہ سوں جام جم کا خیال — صفا کر آئینۂ دل سکندری یہ ہے
خیال یار کو رکھ اپنے دل میں محکم کر — کہ عاشقاں کے نزک شیشہ پری یہ ہے
بساط نیز ہیں تجھ مکھ کے آفتاب پرست — تو جلوہ گر ہو کہ اب ذرہ پروری یہ ہے

اشعار صاف اور سلجھے ہوئے ہیں مطلب بیان کرنے کی حاجت نہیں البتہ کشتی دل کی داد دینا ضروری ہے حق یہ ہے کہ نیکی کی زندگی بسر کرنا جادۂ اعتدال سے قدم نہ ہٹانا اور دنیوی آلائشات سے دامن بچانے کی کوشش اور وضع تدبیر جس خوبی کے ساتھ کشتی دل کے سنبھالنے کی گئی ہے وہ اور طرح ممکن نہیں آگے فرماتے ہیں۔

پایا ہوں ولی سلطنت ملک قناعت — اب تخت و چتر حق میں مرے ارض و سما ہے

منازل تصوف چار ہیں۔ شریعت۔ طریقت۔ معرفت اور حقیقت منزل شریعت میں سالک خود کو عبادات و ریاضت کے لئے وقف کر دیتا ہے یہاں تک کہ وہ طریقت کی منزل تک پہنچ جاتا ہے اور عبادات جسمانی سے نجات حاصل کر لیتا ہے لیکن تصور حضرت باری تعالیٰ کا ہر وقت اور ہر گھڑی دل میں رکھتا ہے گویا زندگی کا ہر لمحہ عبادت و ریاضت ہی میں بسر کرتا ہے۔ اب اس کے دل پر ذات الٰہی کی تجلیات منعکس ہونی شروع

ہوتی ہیں۔ یہی منزل معرفت کی منزل ہے اس کے بعد حقیقت کی منزل آتی ہے جہاں پہنچ کر سالک ہمہ تن نظارۂ انوارِ خدا میں محو ہو جاتا ہے یہاں تک کہ خود اپنی حقیقت بھی فراموش کر دیتا ہے لیکن اس منزل پر پہنچ کر سالک کی حیرت انتہا تک بڑھ جاتی ہے اور نہیں جانتا کہ کن الفاظ میں اپنے محبوب کی ثنا بیان کرے۔ ولی اسی منزل پر پہنچ کر فرماتے ہیں۔

اے ولی تعریف اس کی کیا کروں ہر طرح مستغنی از اوصاف ہے

یوں تو خداوند تعالیٰ کی حمد و ثنا میں بہت سے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں جو اس کی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں لیکن واقعہ یوں ہے کہ وہ ہر طرح تعریف و توصیف سے بالاتر اور ہر حمد و ثنا سے بے نیاز و مستغنی ہے۔ یہ نکتہ ہر شخص پر نہیں ظاہر ہوتا۔ اس نکتے کو وہی خوب جانتا ہے جو شاہد و جمال میں ہمہ تن مصروف ہے۔ ولی کے اس شعر میں لفظوں نے ایک خاص زور اور مناسبت پیدا کر دی ہے۔

دو چار شعر اور ملاحظہ ہوں۔

جس کوں تجھ حسن کی نہیں ہے خبر بے گماں وہ جہاں میں غافل ہے

خودی سے اولاً خالی ہوے اے دل اگر اس شمع روشن کی لگن ہے

شاعرانہ تعلّی

شعرا کا عام دستور ہے کہ اپنے کلام میں خود کہیں کہیں فخر و تعلّی سے کام لیتے ہیں اور اپنے کلام کے حسن و خوبی کی طرف خود ہی اشارہ کرتے ہیں۔ یہ دستور برا نہیں ہے بشرطیکہ واقعی اور صحیح خوبیاں گنائی جائیں البتہ جب مبالغہ جھوٹ اور بے سر و پا باتوں سے کام لیا جائے تو یہ شاعرانہ تعلّی خود شاعر کی ہجو بن جاتی ہے۔ فارسی شعرا میں جس نے فخر و تعلّی کے مضامین کو ایک مستقل صورت بخشی وہ عرفی ہے۔ عرفی نے پوری پوری غزلیں اور قصیدے اسی مضمون کے تحت لکھ ڈالے ہیں اور اس کی حد سے بڑھی ہوئی خود داری، مردم گریزی اور رفعت تخیل نے ان قصیدوں اور غزلوں میں ایک خاص شکوہ اور تمکنت پیدا کر دی ہے۔ حق یہ ہے کہ عرفی کے محاسن شاعری کے لحاظ سے یہ تعلیاں اس پر پھبتی بھی ہیں۔ ولی نے ریختے میں صفائی، چستی، متانت اور وسعت پیدا کی اور لفظی و معنوی ہر لحاظ سے مستقل اضافے کئے ہیں۔ ان خدمات کا انھیں پورا احساس تھا چنانچہ انھوں نے بھی فارسی شعرا کی طرح فخر و ناز کے مضامین باندھے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

ولی ایران و توراں میں ہے مشہور گرچہ شاعر ملک دکن ہے

بسا دل سوں اس کے تر یاد خاقانی ولی کو دیکھ کر اب رشک انوری ہے

اے ولی لگتا ہے ہر دل کو عزیز شعر تیرا بسکہ شوق انگیز ہے

تھوڑے سے تفحص و جستجو سے کلیات ولی میں سے فخریہ اشعار نکالے جا سکتے ہیں لیکن اس کی ضرورت نہیں ہے مقصود صرف اتنا تھا کہ ولی کے کلام سے اس قسم کے چند اشعار پیش کر کے یہ بتلا دیا جائے کہ ولی کو خود اپنی خوبی و کمال کا پورا احساس تھا اور اس قسم کے جو اشارے ان کے کلام میں ملتے ہیں وہ واقعیت اور حقیقت پر مبنی ہیں۔

آسماں اوپر نہ پوچھو چادر ابر سفید　　　جانماز زاہد عزلت نشیں برباد ہے

آسمان پر چھپے ہوئے ابر کے ٹکڑوں کو زاہد کی بچھی ہوئی جانماز کی دھجیاں کہنا ایک ایسا مضمون ہے جس میں جدت خیال اور شوخی تشبیہ کی اعلیٰ شانیں موجود ہیں۔ یہ حقیقت یاد رکھنے کی ہے کہ ولی کی پند و وعظ محض تمسخر و استہزا کی چوٹ نہیں ہے بلکہ اس میں بہت سی کام کی باتیں بھی ملتی ہیں اور اخلاق پند و نصائح کی طرف مخصوص اشارات پائے جاتے ہیں۔

قصیدہ

ولی نے قصائد کم لکھے ہیں اس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ ان کی طبیعت فقر و قناعت، عزلت و گوشہ نشینی، صبر و شکر اور تسلیم و رضا کی جانب زیادہ مائل تھی۔ انہیں دنیاداری، خوشامد پسندی، شوکت و حشمت، نام و نمود سے جتنا نفرت تھی اسی قدر وہ زیادہ قصیدے نہ لکھ سکے۔ ایران میں اور خود ہندوستان میں قصیدہ گوئی کو ترقی اس وقت زیادہ ہوئی جب درباداری کی دھوم تھی۔ درشہوار اور دولت انعام و اکرام کی چاٹ میں بادشاہ وقت کی مدح میں قصائد لکھ لکھ کر لے جاتے اور شاد کام و فیض یاب ہو کر واپس آتے۔ عرفی نے اکبر کی مدح میں نہایت زوردار قصیدہ لکھا ہے جس میں نرگس ردیف قرار دی ہے۔ یہ قصیدہ عرفی کے تخیل کی حیرت کاری کی ایک نادر مثال ہے۔ نظیری نے جہانگیر کی مدح میں جب یہ شعر لکھا۔

اے خاک درت صندل سر گشتہ سراں را　　　باد و فرہ جاروب رہت تاجوراں را

تو جہانگیر نے نظیری کو تین ہزار بیگھہ زمین انعام میں دی۔ اسی طرح شاہ جہاں نے ایک شاعر کو سونے میں تلوایا تھا۔ مسلمان سلاطین کی شعر نوازی اور ان کے انعام و اکرام داد و دہش کے اس امڈتے ہوئے دریا نے چمنستان شاعری کو سرسبز و شاداب بنا رکھا تھا اور خصوصیت کے ساتھ قصیدہ گوئی کو جو ترقی اس زمانے میں ہوئی وہ آج تک نصیب نہ ہو سکی۔

ولی کے دور میں اورنگ زیب فرمانروائے حکومت تھا وہ شعر و شاعری اور موسیقی کو ایک بیکار مشغلہ سمجھتا تھا اس لئے دربار میں شعرا کی قدر نہ ہوتی تھی اور اس کے بعد سلطنت مغلیہ کے اچھے دن ختم ہو گئے چنانچہ ولی نے جتنے قصیدے کہے ہیں ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے جو سلاطین امرا یا روسا کی مدح میں کہا گیا ہو کچھ تو خوشامد و تملق سے ان کی طبعی نفرت اور کچھ ماحول کے اثر نے انہیں موقع ہی نہیں دیا کہ وہ کسی امیر یا رئیس کی شان میں قصیدہ کہیں ان کے تمام قصیدے نعت، منقبت یا اپنے مرشدوں کی تعریف و توصیف میں ہیں لیکن ایک سرسری مطالعہ سے معلوم ہو جاتا ہے کہ قصیدہ گوئی میں ولی کو خصوصیت سے کمال حاصل تھا۔ ہم جب مولانا احسن مارہروی کی یہ رائے "ولی غزل کی طرح قصیدے میں کوئی خاص امتیازی حیثیت نہیں رکھتے" پڑھتے ہیں تو سخت تعجب ہوتا ہے اور نہیں سمجھتے کہ جس کے دیوان میں یہ قصیدہ ؎

ہوا ہے خلق ابر پھر کے فضل سبحانی　　　کیا ہے ابر نے رحمت سے گوہر افشانی

موجود ہو اس کی قصیدہ گوئی اور علو خیالی سے کون انکار کر سکتا ہے۔ ولی نے یہ قصیدہ وجیہ الدین علوی گجراتی کی مدح میں لکھا ہے۔ اس کے بعض بعض شعر درج کئے جاتے ہیں۔

THE OSMANIA MAGAZINE

Vol. I. No 1. Feb. 1927

Subscription Price :

Six Rupees per annum (post free)

Single copy Two Rupees

Can be had from

MUHAMMAD ABDUL JALEEL, B.A.

MANAGER, OSMANIA UNIVERSITY COLLEGE MAGAZINE

Hyderabad, Deccan

The Osmania Magazine

Being the Journal of the Students
of
The Osmania University College
Hyderabad, Deccan

Editor

SYED FAZLE HAQ, B.A.

Vol I. February 1927 No. 1.

GOVERNMENT CENTRAL PRESS
HYDERABAD
DECCAN
1927

تمام پات تسبیح بحمدہ تک بہ حکم — زبان حال سے کرتے ہیں ذکر سبحانی
قطار قطرۂ شبنم سے آج سبزۂ خضر — لے ہاتھ میں کرتا ہے سبحہ خوانی
اس آب روح فزا کے کمال لطف کو دیکھ — چھپا ہے پردۂ ظلمت میں آب حیوانی
چمن میں اس کے کرنے دیا ہے حکمت سے — ہر ایک پھول کی پنکھڑی کو رنگ کمانی

پھر شاہ صاحب کے روضے کے چراغوں کے متعلق فرماتے ہیں

چراغ یاں کے ستارے نمن ہیں گرداں نت — دیے ہیں چرخ کو تعلیم سب گردانی
نے قلم ہے مرا شکر سے شیریں تر — کیا ہوں سب کو حلاوت سے شکر افشانی

قصیدے میں چار عناصر ہوتے ہیں تشبیب، گریز، مدعا اور دعا۔ ابتدائی حصے کو تشبیب کہتے ہیں اس حصے میں عشق و محبت، بہار، آشوب زمانہ، جفائے فلک یا اسی قسم کے اور مضامین نظم کئے جاتے ہیں۔ گریز میں شاعر ایک نہایت لطیف پیرایہ اور حسن انداز کے ساتھ عرض مدعا یعنی ممدوح کی مدح و ثنا کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ گریز کا مقام بہت نازک ہوتا ہے یہ دو مختلف مضامین کو ایک ایسے مرکز پر لاتا ہے کہ دونوں میں بظاہر ہو جائے اور کہیں ناہمواری یا بے ربطی نہ معلوم ہو۔ ولی نے مندرجہ بالا قصیدے کی ابتدا بہاریہ سے کی ہے اور بہار کا ذکر اس انداز سے کرتے جاتے ہیں کہ ذہن آہستہ آہستہ خود ان کے مدعا کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور گریز کا کمال یہی ہے کہ اس میں آورد نہ ہو بلکہ یہ بھی نہ معلوم ہو کہ تشبیب کہاں ختم ہوئی اور گریز کہاں سے کیا اور مطلب کس جگہ سے شروع ہوا ہم یہاں گریز کے موقع کے دو تین شعر درج کرتے ہیں جس سے ولی کی استادی کا حال معلوم ہوگا

تمام ملک ہوا حق کے فضل سے آباد — یہاں نہیں ہے کہیں بھی نشان ویرانی
زہے بہار حلاوت زہے بہار طرب — کہ بلبلاں نے لیا شیوۂ غزل خوانی
چراغ گھر یہ روضے کے جو ہوئے روشن — ہر اک چراغ ہے جیوں آفتاب نورانی

بہار کا ذکر اس انداز سے کرتے ہیں کہ بزم عیش و نشاط، موسم بہار کی طرب افشانی، عنادل کی نغمہ پردازی، پھولوں کی عنبر بیزی اور جلسہ ہائے طرب کی رونق و منور راتیں سرور چراغاں کے مناظر ایک ایک کر کے ذہن کے سامنے آتے جاتے ہیں اور اسی کے ساتھ روضے کے چراغوں کی زر افشانی کی بھی تصویر کھینچ دیتے ہیں۔ پورا قصیدہ پڑھ جایئے کہیں ناہمواری بے ربطی یا غلو کا نام و نشان نہ ملے گا گریز کی اس خوبی سے ورنہ مثالیں ملتی ہیں

مثنوی | مثنوی کی وسعت و ہمہ گیری، مقبولیت و ہر دلعزیزی سے متعلق ایک اجمالی بحث اسی تحریر میں کسی جگہ کی جا چکی ہے اس کے اعادے کی ضرورت نہیں۔ مثنوی میں ولی کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ افسانوی عشق و محبت، جن و پری کے قصے اور مافوق الفطرت داستانوں سے پرہیز کرتے ہیں مثنوی دہ مجلس جو ان سے غلط منسوب کی جاتی ہے وہ ان کی نہیں ہے بلکہ ولی ویلوری کی ہے

ولی کی مشہور مثنوی وہ ہے جو انھوں نے سورت کی تعریف میں لکھی ہے یہ مثنوی اپنی مختلف خصوصیات کے باعث اس قابل ہے کہ دو ذرا

کی جدید مثنویوں کے مقابلے میں بلا تامل پیش کی جا سکتی ہے۔ ولی سے قبل دہمہ شعرا کا یہ حال ہے کہ محبت و الفت سے بھرپور اور ناممکن الوقوع افسانے جن میں مبالغہ کا عنصر مضحکہ انگیز حد تک بڑھ گیا ہے بہت لطف اور مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں ان کے مقابلے میں جب ہم ولی کی مثنوی سورت پر نظر ڈالتے ہیں تو ولی کا ان کے تجربہ اور امتیاز کا قائل ہونا پڑتا ہے اور یہ جو کہا گیا ہے کہ شعرا تلامیذ الرحمٰن ہیں تو اس کی تصدیق ولی کے کلام سے پوری طرح ہوتی ہے انھوں نے ہر موقع پر اپنی ایک جدید راہ پیدا کی اور اردو شاعری میں زندگی اور شگفتگی کے سارے خصائص جمع کر دئے یہ حقیقت ہے کہ اردو شعرا اس جدت کی نکالی ہوئی راہوں پر اگر چلتے تو لکھنؤ اور دلی کے دو اسکول نہ پیدا ہوتے اور اردو شاعری میں جو تنزل میں عامیانہ ابتذال اور سطحیت آ گئی تھی اس کی نوبت نہ آتی اور اب تک ہماری شاعری ترقی کی دو ایک منزلیں اور طے کر چکی ہوتی۔ بہر حال یہ ہونی بات تھی جو ہو کر رہی ہمیں اس موقع پر مثنوی میں ولی کے امتیاز پر گفتگو کرنی ہے مثنوی سورت کے چند ابیات درج ذیل ہیں

عجب شہروں میں ہے پر نور اک شہر — بلا شک ہے وہ جگ میں مقصد دہر

اسے مشہور اس کا نام سورت — کہ جاوے جس کے دیکھے سب کدورت

کنارے اس کے اک دریائے تپتی — کہ دنیا دیکھنے کو اس کے تپتی

عجب قلعہ ہے واں ایک با قرینہ — انگوٹھی میں دنیا کی جیوں نگینہ

نزک قلعے کے باغ اک خاص ہے واں — کہ دام گلرخاں کی ہاٹ ہے واں

رہے اس حاشیے پر جائے آرام — طلسمی باغ واں ہوتا ہے ہر شام

کہ اس بھیتر کئے ایسے ہیں تجار — کہ قاروں کو نزک ان کے نہیں بار

ان اشعار میں ولی نے سورت کی تجارت دولت اور حسن کا ذکر کیا ہے کم و بیش یہ چیزیں آج بھی سورت کی خصوصیات ہیں۔ سورت کے تاجر دولت میں مشہور ہیں حسن و جمال کے لحاظ سے بھی سورت کے مرتبہ کا کوئی انکار نہیں کر سکتا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ولی اپنی مثنویوں میں واقعیت اور حقیقت پر زور دیتے تھے اور انہیں کو موضوع شاعری قرار دے کر ان میں شاعرانہ لطافتیں، زیبائش اور حسن پیدا کرتے تھے۔ حقیقت شاعری حقائق، واقعات اور تخیل کے ایک شیریں، موزوں اور دلاویز امتزاج کا نام ہے۔ تنہا خیال پردازی اور مبالغہ بے مزہ، بے معنی اور شاعری کے لئے رسوا کن چیزیں ہیں جن سے ولی کا کلام بڑی حد تک پاک ہے ہم کو حیرت ہوتی ہے کہ جدیدیت کا رنگ کیسی ہمہ گیری کے ساتھ ہمارے اس قدیم شاعر پر چھایا ہوا تھا۔

رباعی

ولی نے رباعیاں بھی کہی ہیں اور فارسی شعرا کی مکمل پیروی کی ہے۔ رباعی چونکہ صرف چار مصرعوں کی ہوتی ہے اس لئے اس میں متعدد اور الجھے ہوئے خیالات کی گنجائش نہیں ہوتی۔ عموماً رباعی میں کوئی ایک خیال لے لیا جاتا ہے اور چوتھے مصرعے پر ایک خاص جدت اور ندرت کے ساتھ اس کی تکمیل کر دی جاتی ہے۔ ولی کے کمال کی سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ انھوں نے ہر صنف سخن پر اظہار خیال کیا۔

تیرا جو مثلِ نقشِ قدم پائمال ہے ۔۔۔ رُخِ زمیں کا خال ہو زینت میں اے صنم

محبوب کے نقشِ قدم کو رُخِ زمین کے خال سے تشبیہ دینا ندرتِ خیال کی نہایت اعلیٰ مثال ہے۔ ولی کے یہاں عام اور پامال تشبیہیں نہیں ہیں ان کی تشبیہوں میں کیف، حسن اور دلآویزی پائی جاتی ہے۔ تھوڑی سی جستجو سے اس قسم کی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں۔

صنائع و بدائع

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم فرماتے ہیں "قابلِ عزت ہیں وہ تمام فضلا جنھوں نے علمِ صنائع اور بدائع کو فروغ دیا ہے لیکن اگر ان کی تمام کتابیں جلا دی جائیں تو شعرا کا ذرا بھی نقصان نہیں" اور مہدی الافادی کا قول ہے "کسی نازنین کی زلفِ عنبریں جو شانوں پر بکھری ہوئی حسنِ انتشار کے ساتھ کمر سے نیچے جا پڑی ہو کیفیت سے خالی نہیں ہوتی لیکن گرہ شب یعنی جوڑے کی بندش اس سے زیادہ دلکش اور خوش ترکیب ہوتی ہے۔" ڈاکٹر مرحوم جس چیز کے خلاف ہیں بار ارشاد دراز اُسے سرمایہ دلکشی تصور کرتا ہے اور ہمارا بھی یہی خیال ہے کہ صنعتوں میں اگر شائبہ تکلف نہ پایا جائے۔ بے ساختگی اور آمد ہو تو زلف دوگرہ شب سے کم دلکش نہیں۔ صنائع وبدائع کو اصل مقصود سمجھ لینا اور ان کی خاطر مضامین کا خون کر دینا ایسا ہی ہے جیسے دلہن کو زیورات کی کثرت سے اس طرح ڈھک دینا کہ حسنِ فطری روپوش ہو جائے لیکن یہی چیز اگر سلیقے سے استعمال ہوتی ہوتی تو فطری دلآویزی و دلکشی جو اصل مقصود ہے کہیں بڑھ جاتی۔ ولی نے صنعتوں سے ضرور کام لیا ہے لیکن آورد اور بدسلیقگی کے ساتھ نہیں ایہام کا ان کے ہمعصر شعرا کے کلام میں زور ہے اور عجیب تر یہ کہ شعرا مابعد بھی صنعت ایہام کے فریفتہ تھے درانحالیکہ وہ خود کو ولی کا متبع و مقلد بتلاتے تھے اور ولی کے یہاں یہ چیز ان کے ماحول کو دیکھتے ہوئے حیرت انگیز طور پر کم ہے۔ ولی نے چند گنی چنی صنعتیں استعمال کی ہیں اور اس طرح استعمال کی ہیں کہ ان سے مضمون کی وضاحت اور حسنِ کلام میں اضافہ ہو جاتا ہے

حسنِ تعلیل ؎

اس آبِ روح فزا کے کمالِ لطف کو دیکھ ۔۔۔ چھپا ہے پردۂ ظلمت میں آبِ حیوانی

آبِ حیواں، زندگیِ جاوید بخشتا ہے اس وصفِ خاص میں اُس کا ہمسر کوئی نہیں لیکن بارانِ رحمت نے دنیا کے ذرے ذرے کو اس طرح سیراب و شاداب کر دیا ہے کہ آبِ حیوان نادم ہو کر رہ گیا اس لئے کہ فیوض و برکات میں وہ بارانِ رحمت کا حریف نہیں بن سکا۔ چنانچہ احساسِ ندامت سے وہ پردۂ ظلمت میں روپوش ہے۔ ولی نے اس تعلیل میں واقعیت اور خیال آفرینی دونوں کو بکمال اُستادی برقرار رکھا ہے۔

تعلیل کی دوسری مثال ؎

آج تیری نگہ نے مسجد میں ۔۔۔ ہوش کھویا ہے ہر نمازی کا

نماز جب خشیت اور حضوریِ قلب کے ساتھ ادا کی جائے تو نمازی پر کیف و محویت کی حالت طاری ہو جاتی ہے اور وہ دنیا کی ہر چیز سے بے خبر ہو جاتا ہے اس کے تصورات کا مرکز صرف ایک ذات ہوتی ہے۔ اکثر ایسا ہوا کہ صحابہ کرام نماز میں اس درجہ محو ہو گئے کہ ہوا کے پرندے انہیں بے ضرر اور بے جان سمجھ کر اُن پر بیٹھ گئے ولی اس محویت کو ہوش کھو جانے سے تعبیر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ اس لئے کہ آج تو مسجد سے گزرا

اور تیر نظر کی کرشمہ سازیوں نے سارے نمازیوں کو بے خود و بیہوش بنا دیا۔ یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ اگر ہم یہاں نگاہ سے محبوب حقیقی کی نگاہ سے مراد لیں تو پھر کوئی تعلیل حسن نہیں رہتی لیکن ہمیں غور کرنا چاہئے کہ اس صورت میں آج کا ٹکڑا بے کار ہوا جاتا ہے لہذا وہی پہلا مطلب درست ہوا محبوب حقیقی کے لئے آج کی یہ خصوصیت ہے اس کے جلوے تو ہر آن عارفوں کو مدہوش و بے خبر رکھتے ہیں۔

ایہام کی مقبولیت ولی کے زمانہ میں بہت بڑھی ہوئی تھی لیکن ولی نے اپنے کلام میں اس کا استعمال کم کیا ہے اور جہاں بھی کیا ہے سلیقے اور خوبی کے ساتھ۔ فرماتے ہیں

خودی سے اولاً خالی ہو اے دل　　اگر اس شمع روشن کی لگن ہے

لگن میں ایہام ہے لیکن یہ ایہام خوبصورت اور گوارا ہے صنعتوں کا اس طرح کا استعمال نہ صرف جائز ہے بلکہ تحسن اور پسندیدہ بھی ہے

مراعاۃ النظیر۔

محراب تجھ بھواں کی عجب ہے مقام خاص　　پنجگانہ اس میں دلوں کی نماز ہے

اس شعر میں محراب، پنجگانہ، و نماز میں رعایت لفظی ہے۔

حسن سے خضر نے کیا لبریز　　آب حیواں سے جام تجھ لب کا

یہاں خضر و آب حیواں میں رعایت لفظی ہے۔ مراعاۃ النظیر کی یہ مثالیں مستحسن تو نہیں کہی جا سکتیں ہاں گوارا ہیں۔

صنعت تجنیس۔

سویدا کی نمط جاوے نہ ہرگز　　خیال اس خال کا جو دل نشیں ہے

خیال اور خال میں تجنیس ہے

صنعت رد الصدر علی العجز کی چند مثالیں کلیات ولی سے لے کر یہاں درج کی جاتی ہیں۔

بے وفا گر تجھ کو بولوں ہو بجا سے نہیں　　نازنیں عالم میں ہوتے ہیں اکثر بے وفا

کم نما ہے نوجواں میرا برنگ ماہ نو　　ماہ نو ہوتا ہے اکثر اے عزیزو کم نما

مدعا سے عاشقاں ہے ترا دیدار دید　　دید کے دیدار بن دوجا نہیں ہے مدعا

فارسی اشعار کے ترجمے

یہ حقیقت سب کو معلوم ہے کہ کسی زبان سے ترجمہ کرنے کا کام نہایت دشوار ہے اور شعر کا ترجمہ نظم میں اور بھی دشوار سمجھا جاتا ہے لیکن ولی نے اس خارزار میں بھی قدم رکھا ہے اور کامیابی و کامرانی کے ساتھ اس دشوار گھاٹی کو طے کیا ہے۔ جہاں اردو زبان نے ترجمے کی ساری خصوصیات قبول کرنے کے لئے عذر تنگ دامانی کیا ہے ولی نے وہاں جدید راہیں پیدا کی ہیں۔

ولی نے نظیری کے اس شعر کا

چناں گرفتہ جا میان جان شیریں من — نتواں ترا و جاں را ز ہم امتیاز کردن

جوں کا توں ترجمہ اردو میں کر دیا ہے۔

ایسا بسا ہے آکر تیرا خیال جیو میں — مشکل ہے جیو سوں تجھ کو اب امتیاز کرنا

اس ترجمے کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ اس وقت لگایا جا سکتا ہے جب ولی سے قبل کے شعرا کے ترجمے پیش نظر ہوں اور باہم موازنہ و مقابلہ کیا جائے۔ حافظؒ کا مشہور شعر ہے ؎

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو — کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معما را

سلطان محمد قلی قطب شاہ نے اس کا ترجمہ کیا ہے لیکن اس طرح کہ صورت و سیرت ہر لحاظ سے شعر مسخ ہو کے رہ گیا ہے فرماتے ہیں۔

دنیا کا حکمت نہ بوجھیں ہرگز حکیماں علم سوں — کاڑ تیرا عیش کا انس دن پیالے کام پر

ولی کے ترجمے میں اصل شعر کی موسیقیت اور روح پوری طرح جلوہ گر ہے اس سے قطع نظر زبان بھی انھوں نے وہ اختیار کی جو ان کی تربیت، اضافہ اور اصلاح کے بعد سارے ہندوستان کی ادبی زبان ہونے والی تھی ترجمے کی یہ خصوصیات سلطان محمد قلی کے ترجمے میں نہیں ہیں بلکہ بحر اور طرز ادا کے لحاظ سے بھاکا ایک شعر ہو کے رہ گیا ہے۔

نظیری کی غزل سامنے رکھ کر ولی نے یہ شعر کہا ہے ؎

ہے ناز میں صنم کو مژگاں دراز کرنا — فتنے کا عاشقاں پر دروازہ باز کرنا

لیکن اسلوب بیان اور مضمون ہر دو نقطۂ نظر سے اردو میں مستقل اضافہ تھا۔

امیر خسرو کا مشہور شعر ہے۔

جاں زتن بردی و در جانی ہنوز — درد ہا دادی و درمانی ہنوز

ولی نے بھی انھیں بحر و قوافی میں شعر کہے ہیں اور فارسی کے انداز و خیال کا چربہ اردو میں اتارا ہے۔

تو ہے رشک ماہ کنعانی ہنوز — تجھ کو ہے خوباں میں سلطانی ہنوز

اردو زبان کی وسعت و ترقی کے سلسلے میں ولی کی یہ خدمات ہمیشہ وقعت کی نگاہوں سے دیکھی جائیں گی۔

خاتمہ | اب جب کہ ولی کی شاعری کے تقریباً تمام پہلو سامنے آگئے یہ آسان ہے کہ ہم مجموعی حیثیت سے ان کے متعلق کوئی رائے قائم کریں ولی سے قبل کے دکنی ادب پر ایک نگاہ ڈالی جا چکی ہے اس کی نوعیت اور حیثیت سے بھی بحث ہو چکی ہے۔ اس کے مطالعہ کے بعد ہر شخص ولی کے شرف و امتیاز، خصوصیت و انفرادیت کا اندازہ بآسانی کر سکتا ہے لیکن گذشتہ صفحات پر جو مباحث پھیلے ہوئے ہیں انھیں سمیٹنے کے لئے ضروری ہے کہ یہاں چند باتوں کی طرف اشارہ کر دیا جائے۔ پہلی بات اس سلسلے میں یہ کہنی ہے کہ جہاں تک زبان کی پاکیزگی، لطافت اور وسعت کا تعلق ہے ولی کی خدمات تمام

پتہ چلتا ہے اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ باوجود اس کے کہ اردو شعر و شاعری پر مختلف دور گزر چکے ہیں اور ہر دور میں اردو شاعری برابر اپنا قالب بدلتی رہی ہے۔ پھر بھی مندرجہ بالا عنوانات کی اہمیت جوں کی توں قایم ہے تو ہمیں بے اختیار دلی کو اردو شاعری کا باوا آدم تسلیم کر لینا ہوتا ہے۔ قصیدہ اور مثنوی پر تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے ان اصناف میں بھی دلی نے اپنا رتبہ قایم رکھا ہے۔

تیرہ برس کی عمر میں تحصیل علوم کے شوق نے ابھارا۔ اس زمانہ میں احمد آباد دار العلوم تھا خصوصاً مولانا وجیہ الدین علوی گجراتی المتوفی ۹۹۸ھ کا مدرسہ مشہور تھا یہاں ولی نے سات برس علوم ظاہری و باطنی کی تحصیل میں مشغول رہے۔ پھر علوی خاندان کے سجادہ نشین سے طریقہ قادریہ شطاریہ کے مطابق بیعت کی اور اپنے اصل وطن اورنگ آباد واپس آئے۔ پیدائش ۱۶۹۶ء وفات ۱۷۴۴ء

(بحوالہ کلیات ولی۔ مرتبہ احسن مارہروی)

مندرجہ بالا حالات سے ہم یہ استنباط کرسکتے ہیں کہ ولی کی شخصیت تصوف میں رنگی تھی۔ اس زمانہ میں تصوف کا چرچا بھی عام تھا شعرا و مصنفین میں اس کی خاص قدر تھی۔ اس کے علاوہ ولی کی نشو و نما ایسے ماحول میں ہوئی جبکہ بادشاہان وقت علم و ہنر کے بڑے قدردان تھے قطب شاہی اور عادل شاہی خاندان کے حکمران اپنی ادب نوازی کے لئے اردو میں ہمیشہ مستحسن رہیں گے۔ ان کی قدر دانی نے ابتدائی دور اردو کو مختلف اصناف سخن سے مالا مال کر دیا یہ مسلمہ ہے کہ ہر شاعر اپنے متقدمین او ہمعصر شعراء سے ضرور متاثر ہوتا ہے۔ ان کی طرز نگارش جملوں کی ساخت یا خاص خاص محاورات و تراکیب کا تتبع قابل فخر ہوتا ہے لیکن قوت فیصلہ کی پختگی کے ساتھ با کمال اس روش کو ترک کرکے اپنی شاہراہ الگ بناتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ولی اپنے متقدمین اور ہمعصر شعراء کے کہاں تک ممنون ہیں۔ اس کے لئے ہمیں ان کے کلام کا مختصر جائزہ لینا ہے

ولی سے قبل دکنی شاعری

قدیم دکنی ادب میں زیادہ حصہ مثنوی کا ہے۔ اس زمانے میں یہ صنف اس لئے مرغوب تھی کہ شعراء عام طور پر عشقیہ مضامین زیادہ باندھتے تھے اس کے علاوہ ہر ادب کے ابتدائی دور میں کہانی و قصہ کو زیادہ پسند کیا جاتا ہے اس لئے دکنی میں مثنوی کو فروغ ہوا جو مسلسل داستان کے لیے بہترین صنف ہے۔

اس زمانہ کی دکنی اس قدر پیچیدہ اور غیر مانوس ترکیبوں سے بھری ہے کہ موجودہ زمانہ کے دکنی بھی اس کو نہیں سمجھ سکتے تغزل میں جو اسلوب اختیار کیا وہ بے صداقت اور ناقابل ذم ہے خصوصاً شمالی ہندوالوں کے لیے یہ حصہ کوئی دلچسپی نہیں رکھتا۔ البتہ اسی سے اردو کے ابتدائی مدارج کا اندازہ ہوجاتا ہے شعراء کا قاعدہ تھا کہ اشعار میں ہندی الفاظ و تراکیب کا استعمال بہت زیادہ کرتے تھے بعض جگہ کلام میں دلکشی پیدا کرنے کے لئے فارسی کا جوڑ لگاتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک مصرع ہندی کا اور ایک فارسی کا۔

ہندی کے اس قدر استعمال سے ظاہر ہے کہ یہ لوگ دیسی زبان کے دلدادہ ہوچکے تھے۔ ان کی از حد کوشش یہ تھی کہ فارسی سے قطع تعلق کرکے دیسی زبان کو اظہار خیال کا ذریعہ بنایا جائے۔ غرض اس زمانہ کی دکنی اردو زبان کے زمانہ طفلی کی تصویر کے علاوہ کچھ نہیں اور تصویر بھی ایسی کہ اس سے استفادے کی اجازت بمشکل ملتی ہے مثلاً محمد قلی قطب شاہ المتوفی ۱۰۲۰ھ کا یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

سکھی تو ہر گھڑی مجھ پر نہ کر غیظ . محبت پر نظر رکھ کر بسر غیظ

محمد قطب شاہ کا بیٹا عبداللہ قطب شاہ المتوفی ۱۰۸۳ھ جو فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتا تھا اس کا دیوان بھی موجود ہے

نظمیں بھرتی کے لئے لکھے گئے ہیں۔ یقیناً ولی کا کلام اس عیب سے پاک ہے۔ ان کی ہر غزل شروع سے آخر تک مرصع اور دلپذیر ہے۔ کہیں قاری کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ چند شعر پڑھنے کے بعد جی چھوڑ دے بلکہ قاری آخر ختم کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

۳۔ مبالغہ: مبالغہ آمیزی سے ان کو نفرت تھی۔ ان کے کلام میں تصنع یا بناوٹ کا شائبہ بھی نہیں۔ البتہ باکمال شعرا کی طرح شاعرانہ مبالغہ کہیں کہیں موجود ہے جس سے شعر کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے جو بجائے خود عیب بھی نہیں۔

ولی کی شاعری | کسی شاعر کی نسبت رائے قائم کرنے کے لیے اس کے کلام میں دو چیزیں خاص طور پر دیکھنی چاہییں۔ اول یہ کہ شعر کی ساخت کیسی ہے یعنی الفاظ کی موزونی، ان کا برمحل استعمال، فصیح محاورے اور مرغوب تراکیب، تشبیہات، استعارات استعمال کیے ہوں، نحوی، عروضی اور بیانی خصوصیات کا بھی خیال رکھیں۔ سننے یا پڑھنے میں ترنم ریز ہو، اس کی شکل کو دیکھ کر وجدانی کیفیت پیدا ہو۔ اگر شعر میں یہ خصوصیات ہوں تو اس کی ساخت اعلیٰ درجہ کی ہے۔ لیکن اگر شعر کی ظاہری صورت ایسی ہے کہ اس کے مطالعہ سے طبیعت منغض ہو تو ایسے شعر کو بلند مرتبہ حاصل نہیں ہوگا۔ اس کے بعد شعر کے معنوی محاسن کو پرکھا جائے۔ خیالات کی نوعیت اور ان کا ماحول سے تعلق۔ اگر فلسفہ یا حکمت نظم ہوا ہو تو وہ شاعر کے ذاتی تجربات و مشاہدات کا نتیجہ ہے یا دوسروں کے نظریوں کو نظم کر دیا ہے؟ اس کا فلسفہ کہاں تک زندگی سے قریب تر ہے۔ اس کے مطالعہ سے قاری زندگی سے تعلق کیا اسے قائم کرتا ہے؟ شعر کا تعلق شاعر کی ذات سے کیا ہے؟ اور اس کی ذات کہاں تک شعر میں جلوہ گر ہے۔

بہت کم شاعر ایسے ہوتے ہیں جو غیر ملکی ادبیات سے واقف نہ ہوں اس لئے ہر شاعر کم و بیش غیر ملکی اسالیب بیان و خیالات کو اپنی زبان کے سانچے میں ڈھالنا چاہتا ہے لہذا یہ معلوم کرنا چاہئے کہ وہ غیر ملکی ادبیات کا کہاں تک ممنون ہے۔ ولی کی شاعری تمام تر اسی قسم کی ہے۔ عربی، فارسی، ہندی اور انگریزی اس کے زیادہ تر ماخذ ہیں۔ اب ہم ولی کے کلام پر اسی معیار سے تنقید کریں گے

ظاہری ساخت

صفائی و سادگی | جہاں تک ظاہری شکل کا تعلق ہے ولی کا کلام متقدمین اور ہمعصروں پر فوقیت رکھتا ہے۔ انھوں نے خیالات کا جامہ ایسے فصیح اور مترنم الفاظ میں کیا کہ ہر مسلم الثبوت اُستاد نے اُن کا لوہا مانا۔ فارسی تراکیب اور ہندی الفاظ کی برمحل دروبست سے کلام حسن کاری کا بہترین نمونہ ہو گیا۔ جس طرح ان کے خیالات میں رنگینی اور شگفتگی ہے اسی طرح اشعار کا ہر ہر لفظ مسرت بخش ہے۔ ان کے بعض شعر ایسے ہیں کہ ان پر موجودہ زمانے کے کلام کا دھوکا ہوتا ہے ؎

گر ہوا ہے طالب آزادگی　　بند مت ہو سبحہ و زنار کا
مسند گل منزل شبنم ہوئی　　دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا

تشبیہات | ولی کو تشبیہات کا بلا مبالغہ بادشاہ کہا جا سکتا ہے۔ انھوں نے ایسی اچھوتی اور نادر تشبیہیں استعمال کی ہیں کہ قارئین ان کی ندرت اور لطافت سے بے حد لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ان کے ذہن کی رسائی پر تعجب ہوتا ہے کہ انھوں نے ایک چیز کے لیے ہر موقع پر نئی تشبیہیں استعمال کی ہیں وہ بھی ایسی نادر گویا ہر بار آسمان سے تارے توڑ کر جڑ دیئے ہیں بعض تو عدیم النظیر ہیں۔ یہی حال استعاروں کا ہے تشبیہ اور استعارے کی یہ فراوانی یقین دلاتی ہے کہ ان کا دماغ حسین الفاظ کا ایک بے پایاں ذخیرہ تھا۔ یہاں اتنی گنجائش نہیں کہ ہر چیز کی تشبیہہ کی مثال پیش کی جائے اس لئے صرف زلف اور خال کے لئے جو تشبیہات استعمال کی ہیں وہ پیش کی جائینگی۔

زلف

زلف تیری ہے موج دریا کی — پاس تل اس کے جوں سناسی ہے

یہ سیاہ زلف تجھ زنخداں پر — ناگنی جیوں کنوئیں پہ پیاسی ہے

ہے ستم کی زلف پیچ درپیچ مجھ سواد ہند — اس راہ مار پیچ میں اے دل سنبھال چل

کفار فرنگ کوں دیا ہے — تجھ زلف نے درس کافری کا

دیکھا ہوں قد و زلف و دہن جب سے پیو کا — کرتا ہوں تب سے ورد الف لام میم کا

کرتا ہے اس کی زلف کی تعریف اے ولی — جو ہے مرید سلسلۂ مستقیم کا

یہاں یہ ممکن نہیں کہ تمام تشبیہات کی مثال کے لئے اشعار پیش کئے جائیں اس لئے اختصار کی غرض سے ان تشبیہوں کو لکھا جاتا ہے جو ولی نے مختلف مواقع میں زلف کے لئے استعمال کی ہیں۔

دیکھو۔ کالا ناگ۔ سنبل۔ مشک۔ (سانپوں کا بادشاہ) دود چراغ گل۔ کالا ناگ۔ کالے بھجنگ۔ تسلسل۔ ایک جگہ زلف کے دائرے کو اسلام کے "ل" پر فوقیت دی ہے۔ فتنہ، شب کا سفر، ظلمات، ایک جگہ زلف کے خیال کو رشک مشک کہا ہے، دوسری جگہ زلف اور خال کو دانا دینے میں یک رنگ کہا ہے، زنجیر عاشقی ہند (کے جیسے ہند کے بہتر گیس دیوے دیوالی میں) برہمن، سلاسل، موج چشمۂ خورشید، ظل ہما، سحر بنگال، ایک جگہ لٹکتی ہوئی زلف کو رغبت صیاد کہہ کر یاد کیا ہے، موج جمنا، پیاسی ناگن، پٹا، نستعلیق کا لام، ہمدوش مصرع قد وغیرہ۔

زلف کو پیاسی ناگن تصور کرنا، یا مشک قرار دینا، یا دود چراغ گل سمجھنا ایسی لطیف تشبیہات ہیں کہ لکھنؤ جہاں سراپا لکھنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگائے گئے وہاں بھی اس قسم کی تشبیہات نہیں ملیں گی۔ وجہ یہ ہے کہ اس میں سے بہت سے الفاظ مثلاً کالے بھجنگ، مشک دیکھو، کالا ناگ وغیرہ ولی کے ساتھ ہی ختم ہوگئے اس لئے یہ امتیاز ہمیشہ کے لئے ولی سے مخصوص ہوگیا۔

دہلی والوں نے جب دکنی زبان کی ادبی حیثیت دیکھی تو رشک کرنے لگے اور فارسی گوئی کو خیر باد کہہ کر اپنی بول چال کی۔ ان میں

شاعری کو فروغ دیا لیکن اپنی خودداری کو قائم رکھنے کے لیے دکنی زبان میں بہت سی کانٹ چھانٹ کی اور اس زبان کو خس و خاشاک سے صاف کر دیا۔ انھوں نے یہ بھی گوارا نہ کیا کہ ہندی الفاظ کا زیادہ استعمال کیا جائے حالانکہ ولی کے کلام سے ظاہر ہے کہ دکنی زبان میں ٹھیٹ ہندی الفاظ زیادہ مستعمل تھے۔ دہلی والوں نے فارسی الفاظ سے رنگینی پیدا کی اس لئے اردو زبان ہندی کی نازک اور نادر تشبیہات سے محروم رہ گئی۔

اب خال کے لئے جو تشبیہات استعمال کی ہیں وہ ملاحظہ ہوں ؎

وہ دل کہ تھا جو سوختۂ آتش فراق — پیدا ہوا ہے رخ پہ صنم کے برنگ خال

لب پہ دلبر کے جلوہ گر ہے جو خال — حوض کوثر پہ جیوں کھڑا ہے بلال

یک نقطہ ترے صفحۂ رخ پر نہیں بیجا — اس مکھ کو ترے صفحۂ قرآں سے کہوں گا

ترے لب میں بظاہر حوض کوثر مخزن خوبی — یہ خال عنبریں پر بلال آ سا کھڑا دستا

نقطہ پہ ترے خال کے باندھا ہے جن دل — وہ دائرۂ عشق میں ثابت قدم ہوا

زلف تیری ہے موج دریا کی — پاس تل اس کے جوں سناسی ہے

ان کے علاوہ تل کو سپند، جیم کا نقطہ، زنگی، بیت انتخابی کا نقطہ وغیرہ تشبیہوں سے یاد کیا ہے۔ دور حاضرہ کے ایک بلند پایہ شاعر نے خال کے مضمون کو نظم کیا ہے۔ اس مثال سے موازنہ مقصود نہیں کیونکہ آج زبان اور خیالات میں بہ نسبت اس زمانے کے بہت وسعت ہو گئی ہے ؎

ازل کے روز تری شکل جب بنائی تھی — بنانے والے کو اتنی پسند آئی تھی

کہ دیر تک اسے دیکھا کیا تھا حسرت سے — نظر جمائی تھی رخسار پر محبت سے

نظر نے پا لیا آرام ایک مرکز پر — سیاہ نشان بنا یہ نگاہ نے جم کر

خبر بھی ہے تجھے یہ نقش نہاں ہو رہی
سمجھ رہا ہے جسے خال یہ نشاں ہے وہی

(جوش)

نظم میں بہ نسبت غزل کے ایک خیال کو بہ آسانی ادا کیا جا سکتا ہے کیونکہ غزل میں ہر خیال کو دو مصرعوں میں ادا کرنا پڑتا ہے۔ نظم میں شاعر جس طرح چاہے خیال کی وضاحت کر دے۔

ولی نے غزلیات میں غزل کی جو دلپذیر اور سحر انگیز تشبیہات استعمال کی ہیں وہ آج تک قابل رشک ہیں۔ ان کی بعض تشبیہیں

پامال ہی ہیں لیکن ان میں بھی ایسا لطف بیان ہے کہ قدامت پر تازگی اور جدت کا رنگ جھلکتا ہے۔ دراصل اس قسم کی آسانی اور وجدآور تشبیہات ہر شخص کے ذہن میں نہیں آسکتیں یہ صرف ان کا حصہ ہوتا ہے جن کو قدرت نے بزم شاعری کی صدارت دینا چاہتی ہے اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس میدان میں ولی کی یکتائی مسلم ہے۔

ولی نے استعارات اور کنایے بھی ایسے بلیغ استعمال کئے ہیں کہ ان کی زبان دانی پر تعجب ہوتا ہے گاہ وہ کسی چیز کا بیان کرتے ہیں اس کے لئے اگر ضرورت ہو تو استعارات تلمیح خواص تحریر کیا ہے۔ ایسے جواہر نکال کر مصرعوں میں جڑ دیتے ہیں کہ قاری کے سامنے اس چیز کا بے عیب حسین نقشہ کھنچ جاتا ہے۔ ولی کی زبان بلاغت اور استعارے کا یہ عالم ہے کہ قارئین کے تخیل بالکل ان کے قابو میں ہوجاتے ہیں ناممکن ہے کہ قاری اس کیفیت کے علاوہ جو وہ محسوس کرانی چاہتے ہیں دوسری کا ذرا بھی خیال کرے۔ کسی شاعر کی عظمت قائم کرنے میں تشبیہ اور استعارے کی تنقید خاص طور پر کرنی چاہئے، ایک معمولی شاعر میں اتنی قدرت نہیں ہوتی کہ وہ قارئین کے تخیل و محاکات کے ذریعہ اپنے بس میں کرلے لیکن بلند پایہ شاعر میں یہ خوبی فطری ہوتی ہے۔ ولی نے اس میدان میں بھی غیر فانی گل افشانی کی۔

"معنوی محاسن"

تصوف | تصوف ہماری ادبیات کے علاوہ زندگی کے ہر شعبہ میں داخل ہوگیا ہے جس کی ایسی گت بنائی کہ مسلمانوں کو غیر معلوم طریقہ پر بڑا نقصان پہنچا۔ عشق مجازی سے عشق حقیقی کا حصول صوفیائے کرام کا متبرک اصول تھا، صوفی شعراء نے اس کو سراہا لیکن عوام پر اس کا ایسا مضر اثر پڑا کہ آج تک اس کے صدمے سہنے پڑتے ہیں۔ امرد پرستی کو فروغ ایسی ہی شاعری سے ہوا۔ لازمی بات ہے کہ جب شعر پڑھتے وقت کسی فتنہ خیز برہمن یا ترکی لڑکے کا تخیل دماغ میں ارتعاش پیدا کرے تو خواہش انسانی اس کو عملی جامہ پہنانے کی ضرور کوشش کرے گی چنانچہ یہی ہوا ہے لیکن جو لوگ حقیقی معنی میں صوفی تھے ان کی شاعری سے اردو زبان کی بڑی خدمت ہوئی، ولی کی شاعری بھی اسی قبیل کی ہے۔ انھوں نے کئی جگہ اعتراف کیا ہے کہ عشق حقیقی عشق مجازی کی بدولت حاصل ہوتا ہے۔ ہم آگے بیان کرچکے ہیں کہ ولی نے علوی خاندان میں بیعت کرلی تھی، اس کے علاوہ راہ حقیقت میں حصول کمال کے لئے عشق مجازی بھی کیا اس سلسلے میں ایک گجراتی سید زادہ ابوالمعالی کا نام لیا جاتا ہے، ولی کو اس سے بے انتہا محبت تھی ہر وقت سایہ کی طرح ساتھ رہتا تھا۔ ابوالمعالی کے علاوہ بعض اور لوگوں سے محبت تھی۔ جن کے ذکر میں انھوں نے باقاعدہ نظمیں لکھی ہیں لیکن یہ واضح رہے کہ ولی کوئی مرتاض صوفی نہیں تھا اس لئے ان کی امرد پرستی قابل اعتراض نہیں پھر بھی ہم اتنا ضرور کہیں گے کہ مسلمانوں کی مجموعی قوت کو جو نقصان پہونچا اس میں ولی کی شاعری کا بھی حصہ ہے

ولی فقیر دوست اور توکل پسند تھا۔ جب دہلی آئے تو سعداللہ گلشن تخلص مشائخ نقشبندیہ میں ایک بڑے بزرگ تھے۔ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فیض باطنی حاصل کیا۔ انھی کے فرمانے سے ولی نے اپنے کلام کو روزمرہ کی بول چال کے مطابق کیا اور بہت سے

فارسی خیالات کو اردو میں منتقل کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ولی کے قلمی نسخوں میں متعدد جگہ اختلاف ہے۔

ولی کے صوفی المشرب ہونے کی بڑی دلیل ایک یہ بھی ہے کہ جب اُس کا ردیف وار مرتب دیوان دہلی پہنچا تو دہلی والوں نے اس کو کرامت سمجھا۔ اب ہم اس کے کلام سے چند صوفیانہ اشعار پیش کرتے ہیں۔

پایا ہے جو کوئی دولت فقر — مشتاق نہیں سکندری کا

زلیخا نے مجھے بولیا کہ توں واقف نہیں عشق حقیقی سوں — تو بہتر یوں ہے جو دامن پکڑ عشق مجازی کا

سنیا ہوں جب سے یو نکتہ ولی شیریں سخن سیتی — گیا ہے تب سوں شیوہ وتیرہ میرے عشق بازی کا

عیاں ہے ہر طرف عالم میں حسن بے حجاب اس کا — بغیر از دیدۂ حیراں نہیں جگ میں نقاب اس کا

نہ پاوے دین کی لذت جسے دنیا کی خواہش ہے — قفل ہے لذت دنیا حقیقت کے خزانے کا

ہیں صلح کل کے جوہراں میرے سخن ہوں جلوہ گر — از بسکہ وسعت مشربی سوں دل میرا دریا ہوا

دیکھا ہے یک نگہ میں حقیقت کے ملک کوں — جب بے خودی کی راہ میں دل نے سفر کیا

غفلت میں وقت اپنا نہ کھو ہوشیار ہو، ہوشیار ہو — کب لگ رہے گا خواب میں بیدار ہو بیدار ہو

نقش دنیا کا نہ کھینچ مت دل پر — دشمن ہوش ہے محبت زر

عشق کی راہ میں قدم کوں دھر — دل سوں اپنے نکال وہم و خطر

راہ سیدھی ہے رہنما کی قسم

یہ تسلیم شدہ ہے کہ لٹریچر مصنف کی شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے۔ ولی کی شاعری داخلی ہونے کے باعث اُن کی شخصیت کا نقش ثانی بن گئی ہے۔ اگر ہمیں ولی کے متعلق مطلق علم نہ ہو تب بھی ان اشعار سے ہم اُس کی زندگی کی ایک صحیح تصویر دیکھ سکتے ہیں۔ مندرجہ بالا اشعار سے ظاہر ہے کہ ولی قناعت پسند، دولت دنیا سے متنفر اور صوفی المشرب تھے۔ کائنات کے ہر ذرہ میں خدا کا وجود دیکھتے تھے۔ اپنے اس شعر سے واضح ہے کہ وہ صلح کل کے حامی تھے۔ اُن کی نظر میں ہر مذہب و ملت کی یکساں وقعت تھی۔ تعصب سے قطعی بری اور ہر انسان کو ہم نوع تصور کر کے مساوات پر عامل تھے۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ دنیا میں انسان کی پیدائش کا مقصد حرکت و عمل ہے۔ اُن کو یقین تھا کہ یہاں جمود و سکوت آفرینش انسانی کے منافی ہے۔

ولی کی صوفیانہ فطرت کا ثبوت جس کی شاعری میں اکثر جگہ ملتا ہے۔ قدوۃ العارفین شاہ وجیہ الدین کی مدح میں ترجیع بند اور حضرت میراں محی الدین قدس سرہ کی مدح میں قصیدہ، دونوں اُن کی عقیدتمندی ثابت کرتے ہیں۔ بعض جگہ ولی کے کلام کی رنگینی سے بھی نظر

والوں کو عام عشق کی جھلک دکھائی دیتی ہو لیکن ایک صاحب نظر کو اس مجازی پردے میں حقایق و معارف نظر آتے ہیں۔ تضحیک واعظ و محتسب، کیفیات حسن و عشق وغیرہ کا بیان کسی دنیاوی رغبت کے باعث نہیں بلکہ یہاں بھی مجازی الفاظ میں حقیقی معنی کا لطف مضمر ہے ملاحظہ ہو ؎

چھپا ہوں میں صدائے بانسلی میں — کہ تا جاؤں پری رو کی گلی میں

عاشقاں عاشقی کے دعوے پر — آہ و زاری کوں دو گواہ کرو

بالی میں نازنین کی رہتا ہے رات اودن — مت ستی ولی کا ہو کر پران موتی

میں اپنی آنکھوں کو واللہ فرش خاک کروں — گذر جو میری طرف کوں وہ شہسوار کرے

خدا نے کہہ یہ تیرے باب حسن ناز کیا — قد بلند کوں تیرے تمام ناز کیا

ان اشعار کی رنگینی سے لکھنوی رنگ کا دھوکا ہرگز نہیں ہو سکتا بلکہ بہ امعان نظر دیکھنے سے زمین و آسمان کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ لکھنو کی رنگینی میں ابتذال کا عنصر غالب تھا، وہاں کا معشوق ہرجائی، بیوفا، سنگدل، عربدہ جو اور اس پر ذلیل ترین اتہام لگانا طرۂ امتیاز تھا۔ بخلاف اس کے ولی نے جہاں بھی معشوق کا ذکر کیا ہے اس کے ہر لفظ سے محبت آمیز احترام اور پاس ادب ٹپکتا ہے۔ ابتذال درکنار تو کجا وہ یہ بھی گوارا نہیں کر سکتے کہ ان کے معشوق کو دوسرے دیکھ سکیں ؎

کیا ہوں ترک نرگس کا تماشا — طلب گار نگاہ باحیا ہوں

ظاہر ہے کہ جو شخص نرگس کے نظارے سے اس لئے پرہیز کرے کہ اس کی آنکھ ہر وقت کھلی رہتی ہے اور وہ ہر راہرو کو دیکھتی ہے کیونکر برداشت کرے گا کہ اس کے محبوب کا نظارہ عام ہو، اسی خودداری نے ولی کو عمومیت سے ممتاز کر کے دنیا کے خواص میں جگہ دی۔

کلام کی صفائی شاعر کی عظمت کے لیے لابدی ہے لیکن تنہا حسن الفاظ کبھی بقائے دوام کا ذمہ دار نہیں ہو سکتا۔ ظفر کی محاورہ بندی اور داغ کی صفائی کا کون قائل نہیں لیکن ان کے کلام میں باطنی محاسن کا شائبہ بھی نہیں۔ اس میں ہر چیز سطحی نظر آئے گی۔ حسن خیال کی ان لوگوں نے کبھی پروا نہیں کی۔ برخلاف ان کے ہر باکمال شاعر ظاہری محاسن پر باطنی حسن کو ترجیح دیتا ہے۔ مرزا غالب کی مثال لیجئے۔ معترضین نے کیا کچھ نہ کہا یہاں تک کہ شہنشاہ سخن میر تقی کو بھی نہ چھوڑا ؎

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے — مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے

زبان میر سمجھے یا کلام میرزا سمجھے — مگر اپنا کہا آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

یا رام پور میں مرزا کو "دم عمل اور بھینس کے انڈے" والا شعر سنایا گیا تھا۔ لیکن ان لوگوں نے کبھی مخالفین کی پروا نہیں کی بلکہ غالب تو تنگ آ کر چلا اٹھا ؎

"گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی"

اس سے ثابت ہوا کہ معنوی حسن، حسن الفاظ سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اب ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ ولی بھی میر اور غالب ہی کی سی طبیعت رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے زمانہ کی عام فضا کی بھی پروا نہیں کی بلکہ اقلیم سخن کی اس چوٹی پر اپنی نشست بنائی جہاں ہمعصروں کی بھی رسائی نہیں ہوتی۔ انھوں نے یک عالی داش شاعر کی طرح محسوس کر لیا کہ شعر کی جان معنوی خوبی ہوتی ہے۔ چنانچہ انھوں نے کئی جگہ اس کا اعتراف کیا ہے ؎

منطق و حکمت و معانی پر — مشتمل ہے کلام تجھ لب کا
گرچہ پابند لفظ ہوں لیکن — دل میرا عاشق معانی ہے
لذت معنی نہیں کچھ لذت ظاہر سے کم — حرف با معنی ہے جیسے بوسۂ خوباں لذیذ

غالب عاجز ہو کر چیخ اٹھا تھا ؎

گویم مشکل و گرنہ گویم مشکل

ولی بھی یہی شکوہ کرتے ہیں ؎

ولی تیرے سخن یاقوت سو رنگیں ہوئے لیکن — خریداران جہاں بہتر کہاں ہیں آج جوہر کے

ان چند مثالوں سے ولی کی زبردست عظمت تسلیم کرنے میں پس و پیش نہیں رہتا۔ معنوی حسن کے اس احساس نے اُن کو اردو شاعری کی اولین صف میں جگہ دلا دی۔ انگریزی ادب میں شیکسپیر کی غیر فانی عظمت معنوی محاسن کے باعث ہمیشہ کے لئے مسلم ہو گئی۔ اب ہم چند مثالوں کے ذریعہ ولی نے طرفگی خیال سے جو لطافت معنوی پیدا کی ہے دکھائیں گے ؎

حسن تخیل:

منہ گل منزل شبنم ہوئی — دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا
ہر زماں میں زلف کے میں تری سیر جا کروں — باد صبا کوں سو تجھ لیا ہوں چمن میں جا
ابرو کی کشتی مت چھپا اُس وقت لے دریائے حسن — تجھ نین کی گردش ستی عالم منے طوفاں ہوا
عجب نہیں جو فلک پہ خط شعاعی کھیچ — اگر ورق پہ سورج کے تیری لکھیں تعریف
اے شمع رو روشن کیا جب انجمن گل — اپنے گل مقصود کوں پایا چمن گل
تیرے وصل میں اس قدر ہے نشاط — کہ مجھ کوں راحت سوں اُٹھ گیا خواب
عیاں ہے ہر طرف عالم میں حسن بے حجاب اس کا — بغیر از دیدۂ حیراں نہیں جگ میں نقاب اس کا

تخیل انسانی قوتوں کی مجبوریوں کا کفارہ ہے۔ اس کی مدد سے انسان فضائے بسیط کے ان حصوں کی سیر کرتا ہے جہاں قوتیں اس کو نہیں پہنچا سکتے۔ اس عطیہ کا استعمال شاعر کی فطرت پر منحصر ہے۔ اگر فطرت جذباتی محبت پر مائل ہے تو کلام میں موجود ہو۔ جز

کی سی رنگینی ہو گی، اگر ذہنی محبت کی پرستاریت تو ولی، درد، میر اور غالب کی سی شگفتگی ہو گی حسن تخیل کی تنقید میں یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ شاعر کا تخیل اس کی قوت ممیزہ کے بس میں ہے یا نہیں، اگر قوت ممیزہ کا محکوم ہے تو حسن استدلال قایم رہے گا ورنہ نہیں، اب ولی کے پہلے شعر کو لیجئے۔ اس میں نزاکت تخیل کے ساتھ زبردست فلسفہ بھی ہے، آگے عرض کیا جا چکا ہے کہ ولی جمود و سکوت کو انسانی زندگی کے لیے سم قاتل تصور کرتے ہیں، اس فلسفہ کو ولی نے ندرت تخیل سے اس قدر دلکش بنا دیا ہے کہ اردو شاعری اس شعر پر ہمیشہ ناز کرے گی، اس میں ایسا فلسفہ نظم ہے جو انسانی زندگی پر منطبق ہو سکتا ہے۔ دوسرے شعر میں معشوق کی زلفوں کی سیر کرنے کے لیے ایک اچھوتی ترکیب سوچی ہے، رسائی کا بہترین ذریعہ ہوا ہو سکتی ہے کوئی معشوق اتنا بدگمان نہیں ہوگا کہ ہوا سے گریز کرے اس لئے شاعر کے دماغ میں یہ بات پیدا ہوئی کہ معشوق کی زلفوں کی سیر کرنے کے لیے ہوا کو ساتھی بنانا چاہیے۔ نزاکت تخیل اس سے اور بھی بڑھ گئی کہ ہوا کے چلنے سے زلف کا بہتر اثر انگ ہوگا، اسی طرح آخری شعر معرکۃ الآرا چیز ہے اس میں تخیل کی مدد سے ایک حقیقت نظم کی ہے، غرض ولی نے تخیل کی مدد سے اپنے کلام میں وہ نزاکتیں پیدا کی ہیں جو اپنی نظیر آپ ہی ہیں اور لطف یہ کہ ان کا تخیل کبھی ابتذال کی طرف مائل نہیں ہوا۔ پورے کلیات میں ایک ایسا شعر نہیں ملے گا جس سے ذوق سلیم مجروح ہو۔

اختراع و ایجاد | جدت پسند طبائع کا خاصہ ہے کہ وہ اپنے خیالات کی مکمل ادائی کے لئے نئے الفاظ اور تراکیب فرو ڈھالتی ہیں۔ ان کے زمانہ کی زبان میں اتنی وسعت نہیں ہوتی کہ حسب منشا ادائے خیال ہو سکے، اردو میں مومن، غالب وغیرہ نے نئی تراکیب ایجاد کیں، ولی کی طبیعت بھی جدت پسندی میں رنگی ہوئی تھی، اس پر فکر ایسی گہری کہ فلسفہ کی گہرائیوں کی سیر ان کو خاص طور پر مرغوب تھی اس لئے یہ کیونکر ممکن ہو سکتا تھا کہ اپنے زمانہ کی بے بضاعت زبان پر اکتفا کرتا۔ لہذا اصول مقررہ کے مطابق ادائی خیالات کے لئے نئی تراکیب ایجاد کیں ان میں سے چند ہم یہاں پیش کرتے ہیں

".. رحم بے جا، موج بے تابی دل، حرف دانا پسند، دیدہ حیراں، جنت احباب، وفا دشمن، سکوت بے معنی، منزل شبنم، کوہسار خاموشی، برگ یاقوت، دل بے دل وغیرہ۔

ولی کی یہ تراکیب ان کے بعد رائج نہیں رہیں۔ یہی حال ہر شاعر کی تراکیب کا ہوا، انگریزی میں ورڈسورتھ ([illegible]) کی مثال دیکھئے اردو میں مومن کی،

ولی کے متعلق بعض اعتراضات | ولی کے متعلق اکثر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ انھوں نے بہت سے متحرک الفاظ کو ساکن اور ساکن کو متحرک کر دیا ہے۔ مثلاً کوئی کو (کئی) زمین کو (زمیں) فکر کو (فکر) رین کو (ریَن) زلف کو (زلَف)

وہ وزن شعر میں بعض حروف کو گرا دیتے ہیں مثلاً گئی کی جگہ (گی)، ہوئی کی جگہ (ئی)، اے کی جگہ (آ)، انکھیاں کی جگہ (اکھاں) صفحہ کی جگہ (صفا)، اس طرح کی چیزوں کو سمجھنے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ ولی کے زمانے میں یہ جس طرح بولے جاتے تھے، انھیں اسی طرح لکھا ہے زبان کی ترقی کے ساتھ بعض الفاظ کے بولنے اور لکھنے کا طرز بدلتا گیا۔

اس قسم کی چیزیں ان کے بعد تک کے زمانہ میں عام تھیں چنانچہ سراج الدین علی خاں آرزو جن کی علمی قابلیت کا ہر شخص قائل تھا ان کے یہاں بھی اس قسم کی اغلاط موجود ہیں ؎

وعدے تھے سب خلاف جو اس آپ ہم نے — کیا سچ قیمتی دکھو جھوٹا نکل گیا

شاہ حاتم جن کی استادی کا سکہ بیٹھا تھا جنھوں نے اردو زبان کی فصاحت کو دلپذیر بنانا چاہا ان کا شعر ملاحظہ ہو ؎

گلن میں تجھ ستمگر کی محب مجلس میں غم گزرا — شمع رو رو کے ساری رات سرتا پا کھڑی جلیاں

مومن اور آتش کا زمانہ دیکھئے اور یہ مصرع ملاحظہ ہو ؏

"محب حسین کا اور دل رکھے شمر کا سا"

بعض لوگوں کا یہ خیال کہ ولی کی عروضی معلومات کم تھیں ان کے اشعار کی نازکی خیال، ان کے مضامین اور لطافت تخیل کو دیکھ کر خود بخود دور ہو جاتا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ایک معمولی بساط کا شاعر ایسی لطیف تشبیہات، نادر استعارے اور بلیغ کنایے اپنے سخن میں رکھتا ہوگا؟ کیا جذبات کی ایسی موثر نقاشی کوئی معمولی استعداد کا آدمی کر سکتا ہے؟ زندگی اور کائنات کے ایسے باریک نکات کسی معمولی شاعر کی زبان سے نکل سکتے ہیں؟ غرض ولی کی یہ اغلاط ثابت کرتی ہیں کہ ولی دنیا کے ان معزز مصنفین میں سے ہیں جن کی اغلاط زبان کی کم مائیگی یا لطافت معنوی کے خیال سے ہو جاتی ہیں۔

شاعرانہ تعلی

شاعرانہ اظہار تفاخر اردو شعرا کا عام وتیرہ رہا ہے، بہت سے تو مسلم الثبوت استادوں کو بھی نظر میں نہیں لاتے بعض اپنے درجے کو پہچانتے ہوئے مشاہیر کی عظمت کا بھی اعتراف کرتے ہیں۔ اول الذکر میں مومن کو لیجئے جو حمدی کے نام پر ناک بھوں چڑھاتے تھے۔ انشا کی تعلی دیکھئے جو افلاطون اور ارسطو کو کچھ نہیں سمجھتے ؎

ایک طفل دبستاں ہے فلاطوں مرے آگے — کیا منہ ہے ارسطو جو کرے چوں مرے آگے

مستی سے ہوں میں سرخوش صہبائے شاعری — ناداں ہے جس کو مجھ سے ہے دعوائے شاعری

موخر الذکر گروہ میں سنجیدہ لوگ ہیں جنھوں نے دوسروں کے کمال کو سراہا، غالب کی تعلی دیکھئے ؎

ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب — کہتے ہیں اگلے زمانہ میں کوئی میر بھی تھا

طرز بیدل میں ریختہ لکھنا — اسد اللہ خاں قیامت ہے

مرزا نے اپنے رقیبوں تک کے کمال کو سراہا، ذوق اور مومن کے اس شعر پر سر دھنتے تھے ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے — مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

اثر کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

تم ہی نہیں ہو میر اثر اس دیار کے — آخر کبھی تو یہ وقت کبھی تھے بہار کے

ولی بھی اس میدان میں کسی سے پیچھے نہ رہے انکی جگہ اپنے موجد ہونے کے احساس اور شاعرانہ عظمت کو فخریہ ظاہر کیا ہے۔

یو شعر تیرے اسے ولی مشہور ہیں آفاق میں — مشہور ہے جیوں کر سخن اس بلبل تبریز کا

یہ ریختہ ولی کا جا کر اسے سناؤ — رکھتا ہے فکر روشن جو انوری کی مانند

ہم پاس بات آ کے نظیری کی مت کہو — بکتے نہیں نظیر اپس کے سخن کی ہم

تیرے اشعار ایسے نہیں فسر آتی — کہ جس پہ شک آوے گا ولی کوں

ولی ایران و توران میں ہے مشہور — اگرچہ شاعر ملک دکن ہے

ان اشعار کے علاوہ کلیات ولی صفحہ ۲۹۳ کی غزل میں ولی نے انوری، جامی، فردوسی، غزالی، صائب، بیدل وغیرہ کی تمام صفات کو خود میں بتایا ہے، مندرجہ بالا اشعار کے پہلے دو اشعار میں انھوں نے متقدمین کا اعتراف کیا ہے لیکن تیسرے اور چوتھے اشعار میں عامیانہ تعلی ہے۔

ولی کا سفر ہم بیان کر چکے ہیں کہ بیس برس کی عمر میں جب ولی کو اعلیٰ تعلیمی مدارج طے کرنے کا شوق ہوا تو احمد آباد آئے۔ جہاں مولانا وجیہہ الدین کا مدرسہ تمام ہندوستان میں مشہور تھا۔ یہاں چند سال ولی ظاہری و باطنی فیض حاصل کرنے کے بعد اورنگ آباد آگئے دوسری مرتبہ پھر احمد آباد اور سورت گئے، اس مرتبہ اپنا ترتیب وار دیوان بھی ہمراہ لائے۔ لوگ اس دیوان کو دیکھ کر بہت محظوظ ہوئے اور ولی کو باکمال شاعر تسلیم کر لیا، چونکہ ولی صوفی المشرب تھے اس لئے بعض تو اس ترتیب کو کرامت سمجھنے لگے، اس دفعہ دہلی کا بھی رخ کیا جہاں اردو شاعری کا اس قدر چرچا نہ تھا۔ فارسی گو شعرا محض تفنن طبع کے لئے اردو شعر کہا کرتے تھے، ولی نے دہلی، سورت، اور احمد آباد کی تعریف میں جو شعر موزوں کئے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک صاحب نظر شاعر تھے۔ دوسرے شہروں کی معاشرت اور ماحول نے انھیں متاثر کیا چنانچہ انھوں نے ان کے خوب نقشے دکھائے ہیں۔

اس سفر کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ خود ولی اور شمالی ہندوستان پر ایک دوسرے کا اثر ضرور پڑا ہوگا، دوسرے شہروں کی معاشرت جدا، وہاں کی مجلسیں مختلف، آداب و اطوار دوسرے علمی مذاق میں بھی تفریق تھی، شاعر چونکہ سب سے زیادہ فعال اور زود حس ہوتا ہے اس لئے ولی کے کلام پر بھی اس سفر کا اثر پڑنا لابدی تھا، ولی کو دہلی اس قدر پسند آئی کہ تین دفعہ سفر کیا لیکن طبیعت نہ بھری، بالآخر شاعرانہ شکوہ کر کے دل بہلایا ہے

دل ولی کا لے لیا دلی نے چھین — جا کہو کوئی محمد شاہ سوں[۱]

---

[۱] یہ طرز مضمون کا ہے نہ کہ دلی کا دیکھو گلشن گفتار مرتبہ سید محمد

ولی کے کلام میں دہلی کی اس آمد و رفت سے بڑی تبدیلیاں ہوئیں۔ سید سعد اللہ شاہ گلشن مشائخ نقشبندیہ میں سے ایک بڑے بزرگ تھے۔ ولی کو جب ان کی حضوری میں شرف باریابی حاصل ہوا تو انھوں نے ولی سے کہا کہ اپنے کلام کو روزمرہ کی بول چال میں نظم کرو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ولی صوفی المشرب تھے۔ اس لیے سید صاحب نے اس تبدیلی کی فرمائش کی تھی کیونکہ صوفی شعرا اپنے خیالات کو روزمرہ کی زبان میں ادا کرتے تھے اس لیے ولی کو بھی یہی چاہیے کہ وہ بھی سادہ اور آسان زبان میں اظہار خیال کرے۔

یہ قاعدہ ہے کہ اگر ہم کسی غیر قوم کے دوست سے ملتے ہیں تو اس کی زبان اور آداب کی نقل کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ دوستی کی قربت کا باعث ہو۔ اسی طرح دہلی کی مجلسوں میں ولی کی جو صورت تھی انھیں ضرور اس طرف مائل کیا ہوگا کہ وہ کچھ نہ کچھ دہلی والوں کے مذاق کو مدنظر رکھیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ... بھی استعمال کریں۔ اس پر شخصی حکومت کا زمانہ جہاں بادشاہ کی مرضی رسم و رواج ... عوام کا مذاق تو کجا ... روایت یہ بھی مناسب سمجھی جاتی ہے اس لیے اس کے زمانے میں دہلی کے شعرا نے ان کے کلام پر ضرور دہلی کا رنگ چڑھایا ہوگا۔ اب مناسب یہ ہے کہ دہلی میں اردو شاعری کی جو حالت تھی اس پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے تاکہ ولی کے کلام کی عظمت اور فصاحت کی اہمیت ظاہر ہو جائے۔

عہد ولی اور دہلی میں اردو شاعری

شمالی ہندوستان میں اورنگ زیب کے زمانے سے گو اردو شاعری کا رواج ہو گیا تھا لیکن دراصل یہاں کے شعرا فارسی گوئی ہی کو معراج کمال سمجھتے تھے۔ اردو میں جو کچھ اشعار اس زمانہ میں کہے گئے ہیں وہ محض تفریح طبع کا نتیجہ ہیں۔ خود غالب و مومن کے زمانے تک فارسی میں جوہر طبع دکھلانا باعث فخر تھا۔ غالب و مومن دونوں کا فارسی دیوان بھی موجود ہے۔ غالب نے کہہ دیا تھا ؎

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ ‏ ‏ ‏ بگزر از مجموعۂ ہندی کہ بے رنگ من است

ایسی صورت میں یہ کیونکر ممکن تھا کہ اردو شاعری یہاں جلد فروغ پاتی۔ اورنگ زیب کے زمانے میں چند ایسے شعرا ضرور ہیں جنھوں نے اردو میں شعر کہے۔ ان میں سے بعض اس قدر مغلق و پیچیدہ ہیں کہ تذکرہ نویس انھیں شاعری میں شمار نہیں کرتے۔ ذیل کی مثالیں اس زمانہ کی اردو شاعری پر کافی روشنی ڈالیں گی ؎

دامن کی بیٹھی آج مری آنکھ ہوں کی ‏ ‏ ‏ غصہ کیا دگالی دیا دگر لڑی ‏ ‏ ‏ (از مباش جان امید)

از زلف سیاہ تو بدل دوم پڑی ہے ‏ ‏ ‏ در خانۂ آئینہ گتا جوم پڑی ہے ‏ ‏ ‏ (از موسی خان [illegible])

یہ شعرا فارسی گو تھے۔ اردو صرف تفریح کا مشغلہ تھا۔ جعفر زٹلی کے بابت کون واقف نہیں۔ یہ اورنگ زیب ہی کے زمانے میں ہوئے لیکن ان کا کلام زیادہ تر فحش ہے پھر بھی بعض اشعار ایسے مل جاتے ہیں جو مثالاً پیش کیے جا سکتے ہیں۔ اورنگ زیب کی مدح میں لکھا ہے ؎

زہے دھاک اورنگ شاہ ولی — در اقلیم دکھن پڑی کھل بلی
دریں پیر سالی و ضعف بدن — مچادی دہا چوکڑای دردکھن
نہے شاہ شاہاں کہ گاہ وغا — نہ بلد نہ ٹلد نہ جنبد زجائے
ہما سو ئے جو دھا بلی بے بدل — چو البرز قائم چو پربت اٹل

اورنگ زیب کی وفات کا مرثیہ ؎

اکل بے کل ہوا سنسار سارا — بخوں تیار شد مریخ آرا
کہاں اب پایئے ایسا شہنشاہ — مکمل اکمل و کامل دل آگاہ
صدائے توپ بندق است ہر سو — چھما چھٹ دھما پھٹ است ہر سو
بہر سو مار مار و دہاڑ است — اجل چال و تیر خنجر گذار است

(از رسالہ اردو اپریل ۱۹۲۹ء)

شمالی ہند میں اردو شاعری کا یہ حال تھا دکن اس کے مقابلہ میں کہیں آگے تھا۔ اب ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ ولی کی شاعری کا شمالی ہند کے شعرا پر کیا اثر پڑا۔

ولی کا اثر شمالی ہند پر

اس اثر کا پتہ لگانے سے قبل شمالی ہند میں جو ادبی فضا تھی اس کا ایک مختصر خاکہ پیش کرنا یہاں از حد ضروری ہے، یہ واضح ہو گیا کہ فارسی گوئی یہاں طرۂ امتیاز تھا لیکن اورنگ زیب کا زمانہ شمالی ہند میں فارسی کے خلاف بغاوت کا زمانہ کہا جا سکتا ہے جس کے اسباب حسب ذیل ہیں۔

شعرانے محسوس کیا کہ خیالات کا ہو بہو اظہار بول چال ہی کی زبان میں ہو سکتا ہے۔ فارسی غیر ملکی زبان تھی جس پر قدرت حاصل کرنا آسان نہیں تھا، اس پر دوسری مشکل یہ تھی کہ اہل ایران ہندوستانیوں کی فارسی دانی کے قائل نہیں تھے۔ سوائے چند کے یہاں کا کوئی باکمال ان کی نظر میں نہیں سماتا تھا۔ حقیقت بھی یہ ہے کہ ہر زبان کا مخزن اس کا ملک ہوتا ہے ادب پر ماحول اور روایات کا بہت اثر پڑتا ہے انگریزی میں اگر ہم ایڑی اور چوٹی کا بھی زور لگائیں تب بھی زبان کی اصلی نزاکتوں سے مکمل واقفیت حاصل نہیں کر سکتے۔ غرض شمالی ہندوؤں کو ایرانیوں کا یہ رویہ ناگوار گذرا انھوں نے روزمرہ کی زبان کی طرف رغبت کی اور خصوصاً جب یہ دیکھا کہ اہل دکن نے اس کم مایہ زبان میں اپنے گلہائے شگفتہ کھلائے ہیں تو ان کی آتش رشک بھڑکی اور اس زبان کو جو بازاروں میں ماری ماری پھرتی تھی سر آنکھوں پر رکھا اور اپنے دماغی جواہر سے اس کو آراستہ و پیراستہ کیا۔

اورنگ زیب کے بعد کوئی ایسا طاقتور حکمراں نہیں ہوا جو عنان حکومت کو سختی سے قابو میں رکھتا۔ ملک میں بدامنی اور بغاوت کا دور

... ہوا۔ اس نے علمی مجالس سے [illegible] بہت پہلے شاہان وقت نے فارسی کی قدردانی کم کردی۔ اورنگ زیب خود صوفی المشرب انسان تھے۔ نجوم، فنونِ لطیفہ خصوصاً شاعری سے زیادہ لگاؤ نہ تھا اس لیے ان کی سرپرستی ... دکن نے بھی فارسی کے تسلط کی بنیاد کمزور کردی۔ امرا اور روسا کا بھی یہی حال ہوا۔

اورنگ زیب کی فتح دکن سے شمال اور دکن میں آمد و رفت کا سلسلہ بڑھ گیا ہر فن کے اہل کمال ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوئے۔ شمالی ہند کے شعرا نے جب یہ دیکھا کہ دکنی شعرا بول چال کی زبان میں کس خوبی سے خیال ادا کرتے ہیں تو ان کی غیرت کو جوش آیا اور فارسی جس سے پہلے ہی سے بد دلی شروع ہو چکی تھی اس کو ترک کرنے پر آمادہ ہو گئے یہاں تک کہ ریختہ [illegible] ہو گئے۔ زمانہ میں ریختہ گوئی باعث کمال سمجھی جانے لگی۔ دکنی شعرا کی اس آمد و رفت کا ذکر تذکرہ سرخوش، دیوان زادہ اور تذکرۂ شفیق میں ہے۔ انھوں نے جو تعداد شعرا کی لکھی ہے وہ قابل اعتبار نہیں لیکن پھر بھی لوگوں کی نقل و حرکت کا ثبوت ضرور ملتا ہے۔

دکنی زبان کی بہت سی کتابیں دہلی آئیں جہاں ان کی نقل ہوئی لوگوں نے جب کتابوں کو پڑھا تو روزمرہ کی وقعت معلوم ہوئی فارسی کی معزولی اور دکنی کی مقبولیت کے اسباب ظاہر ہو گئے۔

ولی کے دہلی آنے سے قبل شمالی ہند میں یہ فضا تیار ہو چکی تھی لیکن ولی کی آمد اس شوق پر تازیانہ ہوئی دہلی کی مجالس ان کے نغموں سے گونج گئیں۔ ہر جگہ قدر و منزلت کے فرش بچھے یہاں تک کہ ان کے واپس جانے کے بعد مشاعروں میں شعرا ولی کی غزل کا مصرع طرح کے لیے مقرر کرتے اور اس پر غزل کہنا باعث فخر سمجھتے۔ گو اس زمانہ کے شعرا کا کلام زیادہ تر ضائع ہو گیا لیکن دیوان زادہ حاتم اب تک اس زمانہ کی تنہا یادگار ہے اور جس کا ایک نفیس اور اصلی نسخہ (انڈیا آفس میں محفوظ ہے) اس کی شہادت ملتی ہے۔ خود دیباچہ میں حاتم نے ولی کی استادی کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ میں انھی کی طرز پر لکھتا ہوں بعض اشعار میں وہ ولی سے مخاطب بھی ہیں جس سے ظاہر ہے کہ وہ ولی کی موجودگی ہی میں لکھے گئے۔

تذکرہ مجموعہ نغز مولفہ میر قاسم میں ولی کی تعریف کرنے کے بعد اس زمانہ کے ایک شاعر کا مصرع اپنے خیالات کی شہادت کے طور پر نقل کیا گیا ہے۔ کہا ہے۔

پیر فغاں کمترین کہ مدلش [illegible] بہ موقع و بجا گفتہ کہ ۔۔ ولی پر جو سخن لاوے اُسے شیطان کہتے ہیں

اس زمانے کے تذکرہ بے جگر جس کا مخطوطہ انڈیا آفس میں ہے ولی کی نسبت لکھا ہے

در حقیقت کسے کہ اسپ در میدان ہندی دوانیدہ آں بود ولی است تخلص آب زندہ ... اول ... زبان ہندی را ساختہ ... بیاں بود چوں در سنہ [illegible] جلوس محمد شاہی دیوان او بہ دہلی رسید ... فرد معانی مانند شاکر حاتم و آبرو و فغاں وغیرہ بتتبع ... ایشاں شدند۔

مصحفی نے اپنے تذکرے میں خود حاتم کا قول نقل کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ولی کا کلام دہلی میں بے حد مقبول ہو چکا تھا۔ وہ کہتے ہیں

روزے پیش فقیر نقل می کرد کہ در سنہ دوم فردوس آرامگاہ دیوان ولی در شاہجہان آباد آمدہ و
اشعارش بر زبان خرد و بزرگ جاری گشتہ با دو سہ کس کہ مراد از ناجی و مضمون و آبرو باشد بنائے شعر
ہندی را بایہام نہادہ داد معنی یابی و تلاش مضمون تازہ می دادیم۔

(رسالہ اردو، اپریل سنہ ۲۹ء)

ان اقتباسات سے ولی کا اثر شعرائے شمالی ہند پر ظاہر ہو گیا۔ مضامین، طرز بیان، زبان وغیرہ میں ولی کا تتبع فخر سمجھا جاتا تھا۔ گویا شمالی ہند کی ابتدائی شاعری کی تشکیل ولی ہی کے ہاتھوں ہوئی۔ زبان اردو اور خصوصاً شمالی ہند کی شاعری پر ان کا جو احسان ہے وہ قیامت تک نہیں اتر سکتا۔ یہ ولی ہی کی ذات ہے جس نے شمالی ہند کے شعرا کی فارسی شاعری کے خلاف بغاوت میں رہنمائی کی لیکن دکنی زبان کی بھی جلد ہی مخالفت شروع ہو گئی کیونکہ یہ بھی ادائے خیال کے لئے مغلق اور پیچیدہ معلوم ہوئی اس لئے جلد کاٹ چھانٹ کا سلسلہ شروع ہو گیا جس کی ابتدا مظہر سے ہوئی، میر، سودا اور ناسخ وغیرہ کے زمانہ میں ریختہ کی صورت عام ہو گئی تھی دکنی کو غیر فصیح سمجھنے لگے تھے ۔

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ — ایک بات لچر سی بزبان دکنی تھی

وہ جو کہے کہ ریختہ کیونکر ہو رشک فارسی — گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

ولی کی عظمت کا راز

ولی کے متعلق تذکرہ نویسوں کی آراء سے ثابت ہو چکا کہ وہ ایک مسلم الثبوت استاد تھے۔ ان کے تخیل نے اردو جیسی زبان کو کہیں سے کہیں پہونچا دیا، اب ہم یہ معلوم کریں گے کہ اس عظمت کا راز کیا ہے:

میر، غالب اور اقبال اردو شاعری میں محض نفس شعر کے لحاظ سے وقیع نہیں بلکہ وہ بلند شخصیت کے مالک بھی ہیں۔ ان کا کلام ان کی شخصیت کا پرتو ہے، ولی کے کلام میں بھی یہ خوبی بدرجہ اتم موجود ہے، ہر شعر ان کی فطرت اور ظاہری شخصیت کا آئینہ ہے۔ شخصیت سے مراد جذبات و احساسات اور خیالات و ادراک وغیرہ ہیں جو شاعر زیادہ سے زیادہ اپنے جذبات کی ترجمانی کرے گا اتنی ہی اس کی شخصیت نمایاں ہوگی ذوق، آتش اور ناسخ وغیرہ نے اپنی شخصیت کی تصویر کشی نہیں کی بلکہ خارجی اثرات دکھانے میں کمال حاصل کرنا چاہا اس لئے ان کے کلام سے نوع انسان کو کوئی فائدہ نہیں پہونچا۔ برخلاف ان کے ولی نے غالب وغیرہ کی طرح اپنے ذاتی مشاہدات کو شاعرانہ پیرایہ میں نہایت خوش اسلوبی سے پیش کیا چونکہ ان کی شاعری وہبی تھی اس لئے تخیل کی بلند آفرینیوں نے تمام شعری محاسن کو قائم رکھا غرض ولی کا درجہ مقرر کرنے میں ان کی شخصیت کے مطالعہ سے بہت مدد ملتی ہے۔

صوفی المشرب، آزاد منش، اور قانع ہونے کے باعث ان کی شخصیت سے نفس شعر میں بڑی ترقی ہوئی۔ ولی پہلے شاعر تھے جنہوں نے رنگین مضامین باندھے لیکن اس پردے میں انہوں نے اصلی روحانی واردات کو قلمبند کیا ہے، فلسفہ زندگی سے ان کو خاص لگاؤ تھا

غالب کا شعر ملاحظہ ہو ۔

واقف نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا   یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

ہیں صلح کل کے جو براں میرے سخن جلوہ گر   از بسکہ وسعت مشربی سوں دل میرا دریا ہوا

اس شعر سے اگلے صوفیا کی راست بازی کا پتہ چلتا ہے ، ان کی خواہش تھی کہ ہندوستان کے ہندو اور مسلمانوں میں اتفاق ہونا چاہئے ۔ اسی مسلک کا شعر غالب نے بھی کہا ہے ۔

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم   ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

یہ بات عارفاں کی سنو دل سے سالکاں   دنیا کی زندگی ہے یہ وہم و گماں محض

غالب کا شعر سنئے ۔

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد   عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

ہو بہو یہی خیال ملٹن (Milton) کا ہے ۔

"Life is a dream, World is a delusion

عمر جو یاد میں گذرے سو غنیمت سمجھو   سو گیا عیش میں پھر اس کا جگانا مشکل

حسن تھا پردۂ تجرید میں سب سوں آزاد   طالب عشق ہوا صورت انسان میں آ

ولی زندگی کو شوپنہار یا میر کی طرح منفیت کا ستم نہیں سمجھتے بلکہ اُن کے خیال میں ایک جام عیش ہے جس کی مختصر مدتی بھی حکمت سے خالی نہیں ۔

زندگی جام عیش ہے لیکن   فائدہ کیا اگر مدام نہیں

ولی گوئٹے (Goethe) کی طرح دنیا کا صرف تماشا ہی نہیں دیکھتے بلکہ وہ اس کے آلام کا علاج بھی تجویز کرتے ہیں ۔

کر مختصر جہان میں دنیا کی آرزو   اے بے خبر اگر ہے بزرگی کی آرزو

ولی نظیر اکبرآبادی کی طرح روز مرہ کے معمولی واقعات میں ہمہ تن کر ایک حقیقی شاعر کی طرح جو کچھ دل پر گذرتی ہے اس کو نظم کرتے ہیں جس طرح نظیر خواص و عوام کے شاعر ہیں اسی طرح ولی بھی ۔ سورت اور احمد آباد کی مثنویوں کے علاوہ یہ شعر ملاحظہ ہوں ۔

باعث رسوائی عالم ولی — مفلسی ہے مفلسی ہے مفلسی
مرد کا اعتبار کھوتی ہے — مفلسی سب بہار کھوتی ہے

نظیر نے پیسہ اور مفلسی پر باقاعدہ نظمیں لکھی ہیں ؎

پیسہ ہی رنگ روپ ہے پیسہ ہی مال ہے — پیسہ نہ ہو تو آدمی چرخے کی مال ہے

تمام حقیقت کا بیان اور اس قدر سادگی سے معمولی شعرا کا حصہ نہیں۔

مندرجہ بالا اشعار سے ظاہر ہے کہ ولی نے میر، نظیر، غالب اور اقبال کی طرح فلسفہ جیسی خشک چیز کو نہایت شاعرانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ اب یہ دیکھنا چاہئے کہ اس کا فلسفہ کس نوعیت کا ہے۔ اگر اس میں خامیاں ہیں تو شاعر کا درجہ بلند نہیں۔ اوپر کے اشعار سے عیاں ہے کہ ولی کی شاعری میں ایسے مضامین ہیں جو عقل کے دائرے سے خارج نہیں بلکہ انسانی فطرت سے گہرا تعلق رکھتے ہیں اس لئے وہ انسانی زندگی کے لئے ہمیشہ مستحسن رہیں گے۔

ولی کے فلسفہ اور تصوف سے معلوم ہو گیا کہ وہ دنیا کو کس نظر سے دیکھتے تھے۔ ہر باکمال شاعر کا کوئی نقطہ نظر ضرور ہوتا ہے۔ میر، غالب، جوش اور اقبال کو لیجیے۔ ان میں سے ہر ایک دنیا کو کسی نہ کسی نقطہ نظر سے ضرور دیکھتا ہے۔ ولی کا نقطہ نظر یہاں بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ جو اشعار مثال کے لئے پیش کئے گئے ہیں ان سے صاف ظاہر ہے۔

زبان — ولی نے اپنے خیالات کے اظہار میں تمثیلی Symbolic زبان استعمال کی ہے جن کے ذریعہ قاری پر وہی کیفیت ہوتی ہے جو شاعر پر شعر موزوں کرتے وقت گذری ہے۔ انھوں نے اپنے احساسات و تخیل کو زبان جیسی محدود چیز میں اس لطافت سے بیان کیا ہے کہ ان کی قدرت زبان پر تعجب ہوتا ہے۔

شاعرانہ صداقت — ولی کی شاعرانہ صداقت ان کی عظمت میں خاص طور پر معاون ہے۔ انھوں نے کہیں زبان قلم کو غیر ضروری مبالغہ یا جھوٹ سے آلودہ نہیں کیا۔ Lewis کہتا ہے۔ لٹریچر کی قدر اس کی صداقت پر ہے۔ اس نظریہ کے مطابق ولی کے کلام کا درجہ واقعی ادب کی اعلیٰ صف میں ہونا چاہیے۔ ولی نے جو حقائق بیان کئے ہیں ان کو مبالغہ آمیزی سے دور کا بھی لگاؤ نہیں۔ ان تمام محاسن کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ولی اقلیم سخن میں ایسے قابل فخر ہستی ہیں جن کے دم سے اردو میں فلسفہ اور ادب کی بے مثال گل افشانیاں ہوئیں۔ ان کی جگہ میر، غالب اور نظیر کی صف میں ہے۔

اُردو شاعری میں وُلی کا رُتبہ

از

جناب سید کوثر رضا صاحب متعلم بی اے فائنل ہندو کالج دہلی

حضرت ولی اللہ عارف باللہ کا رتبہ اُن کے نام کی طرح ہنوز ایک راز ہے، ذمہ داری کے خیال نے مؤرخین کے لبوں پر مہر سکوت لگا دی ہے اور شعرا کی تحقیق زیادہ تر جتنی تعلیل کے نمونے پیش کر رہی ہے۔ جناب حسن مارہروی کی تحقیقات اس سلسلے میں مستحسن سمجھی گئی ہیں۔ اور حقیقت میں بھی کم و بیش سات نام لکھ کر فرماتے ہیں کہ "یہ سب نام ایک مسلمان کے ہو سکتے ہیں اور چونکہ شعرا عام طور پر اپنے نام اور اُس کی مناسبت سے تخلص کا استخراج کیا کرتے ہیں۔ اس لئے یہ زیادہ قرین قیاس ہے کہ ان کے نام میں لفظ ولی شامل ہو اور ولی الدین، ولی محمد اور ولی اللہ زیادہ قرین قیاس ہے"۔

مگر ہمیں ان کے نام سے کام نہیں البتہ کام سے بحث ہے۔ ولی اُردو کے اولین صاحب دیوان شاعر کہلاتے ہیں اور اردو کی دنیائے شاعری کے باوا آدم سمجھے جاتے ہیں۔ ابتدائے دنیا اور حضرت آدم کے متعلق بحث الہیات کا وظیفہ ہے اور ابتدائے شاعری، بزم الشعرا کی تحقیق اُردو ادبیات کا جزو لاینفک۔ ہماری شاعری کی ابتدا کے متعلق مختلف روایات ہیں۔ اگر تمام روایات کو درخور اعتنا سمجھ لیا جائے تو اردو شاعری کی ابتدا اُس زمانے میں ہوئی جب اورنگ زیب نے دکن پر فوج کشی کی اور افواج عالمگیر نے دکن میں قیام کیا۔ اسی وقت میں اس لشکر (اردو) کی بہترین صنعت (یعنی شاعری) نے بھی پہلے پہل مظاہرہ کیا اور ولی اس کے جلوس میں نظر آئے۔

مولوی محمد حسین آزاد جو سرسید، نذیر احمد، حالی و شبلی کی طرح اُردو ادبیات کے عناصر خمسہ میں سے ہیں، ان کے نزدیک اُردو کی ابتدا ہی شاعری سے ہوئی اور دلیل اس کی یہ ہے کہ اُس زمانے کی نثر کا کوئی نشان نہیں ملتا اور نظم موجود ہے۔ آب حیات میں ولی کو نہ صرف جام غزل کا تعریض ہوا ہے بلکہ ان کو پہلا ساقی سمجھا گیا ہے حالانکہ تذکروں میں احمد گجراتی، سعدی دکنی، خسرو، بیجا، اور نواز کا ذکر بھی موجود ہے جو ولی پر تقدم زمانی رکھتے ہیں مگر آزاد کا معیار تقدم بالشرف تھا۔ اس لئے انہوں نے ان شعرا کے کلام غنیمت طرز و ترتیب سے معرا دیکھا

تو تاریخ اردو آہنگ سمجھا، اور ولی ہی کو پہلا شاعر مانا۔ جیسا کہ آب حیات میں لکھا ہے کہ ولی کو ہندوستان کی نظم میں وہی رتبہ ہے جو انگریزی کی نظم میں چاسر کو اور فارسی میں رودکی کو اور عربی میں مہلہل کو۔

مگر محققین کے نزدیک اردو شاعری کی ابتدا ولی سے ایک مدت پہلے ہو چکی تھی اور متعدد شعرا گزر چکے تھے اور یہ ولی کا محض تفوق تھا جس نے انھیں ممتاز کیا اور اردو شاعری کا موجد مشہور کر دیا۔ چنانچہ نواب مصطفیٰ خاں اپنی کتاب "گلشن بے خار" میں لکھتے ہیں:

اختلاف است درین کہ اول کسیکہ در ریختہ سخن کردہ است یعنی ولی، یا پیشتر ہم ذکر درین زبان شائع بود بتحقیق تقدیم ولی باولیت است تا تقدیم آنست کہ زمانش دیگرے برتبہ او نرسیدہ و مرتبہ گفتنش است ہمین باشد۔

صاحب جلوۂ خضر یعنی صفیر بلگرامی بھی اس خصوص میں نواب مصطفیٰ خاں کے ہمنوا ہیں۔ صفیر صاحب کی رائے ہے اور یقینی امر ہے کہ اردو زبان مدت سے دکن میں موجود تھی اس لیے لازمی امر ہے کہ پیشتر شعرا نے جلوہ دکھایا ہوگا۔ پھر نظم کو نمبر آیا ہوگا۔ ان کے قول کے مطابق پیشتر دکنی شعرا ہندی غزلوں کی نسبت نقل ہوئی ہوگی اور ریختہ نے پہلے پہل بہت اوٹ پٹانگ بدنما دیا ہوگا اور چونکہ ولی کا کلام صاف و شستہ بھی ہے اس لیے ہرگز ابتدائی نہیں بلکہ ترقی یافتہ ہے۔ صفیر صاحب کے بیان کی تصدیق ان دکنی شعرا کے کلام سے ہو جاتی ہے جن میں ولی کی سی صفائی و شستگی نہیں بلکہ امیر خسرو کی تقلید معلوم ہوتی ہے۔

صاحب جلوۂ خضر کی یہ تحقیق شاعرانہ منطق کی ایک دلیل کا مصداق ثابت ہوئی یعنی ان مردم حالات میں جب اردو شاعری کے اصل موجد کا سراغ نہ لگا تو انھوں نے ایجاد و اولیت کی دستار سعدی دکنی کے سر پر رکھ دی اور اس شرف زمانی میں سعدی دکنی ہی کے ایک شعر کو اس کے اول اردو شاعر ہونے کی سند تصور کیا۔ وہ شعر یہ ہے ؎

سعدی غزل انگیختہ شیر و شکر آمیختہ ۔۔۔ در ریختہ در ریختہ ہم شعر ہے ہم گیت ہے

صفیر صاحب نے اس شعر سے یہ معنی پیدا کیے ہیں کہ یہ شعر دکنی زبان میں ہونے کی وجہ سے گیت کہا گیا اور غزل ہونے کے سبب شعر "شیر و شکر آمیختہ" دکنی اور ایرانی زبان کے ملنے اور یکجا ہونے یعنی زبان کا ریختہ کہلانے پر دلالت کرتا ہے اور "سعدی غزل انگیختہ" سعدی کے موجد غزل ہونے کا اظہار کرتا ہے۔

مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ شعر کن معنی آفات ارضی و سماوی سے اس طرح منقلب ہو گیا۔ حالانکہ اکثر کتب میں اس کی صورت یہ دیکھنے میں آتی ہے ؎

سعدی کہ گفتا ریختہ در ریختہ در ریختہ ۔۔۔ شیر و شکر آمیختہ ہم ریختہ ہم گیت ہے

اور گر فی الامر محال اس شعر کو دکنی سعدی کی غزل تسلیم کر لیا جائے تو کون وثوق سے کہہ سکتا ہے کہ اس میں شاعرانہ تعلی کا احتمال نہیں ہے

اور پھر شاعرانہ تعلق نہ بھی ہو تو اس سے صرف غزل کے موجد کا کچھ سراغ ملتا ہے باقی اصناف سخن کی ایجاد پھر بھی سردرگم رہے گی۔

صبیر صاحب نے اپنی تحقیق سے مذہبی اور عاشقانہ ہر دو اصناف شعر کی ابتدا قطب شاہیوں کے عہد حکومت میں ثابت کی ہے۔ اور اس کے بعد میر کی کتاب "نکات الشعراء" کے حوالے سے اس دور کا آغاز دکھایا ہے جس میں فراقی۔ احمد گجراتی۔ سراج۔ ضیائی وغیرہ ولی کے معاصرین ہوتے ہیں۔ اب اگرچہ یہ حوالہ بھی پادر ہوا ہے تاہم یہ امر مسلمہ ہے کہ ولی کے زمانے میں شاعروں کا ایک گروہ موجود تھا۔ صاحب شعر الہند نے بھی اس کی تصدیق کی ہے اور سب سے بڑا ثبوت ولی کے وہ اشعار ہیں جن میں انھوں نے اس عہد کے شاعروں پر چوٹیں کی ہیں۔ کہتے ہیں ؎

ترے اشعار ایسے نہیں فراقی   کہ جس پہ رشک آوے گا ولی کو

لگتے ہیں حاسدوں کے یوں دل میں بیت میرے   سینے میں دشمناں کے جیوں ذوالفقار آوے

ایسے اشعار بھی ہیں جو فخریہ کہے گئے ہیں۔ اور ارباب نظر سے یہ امر پوشیدہ نہیں ہے کہ ایسے مضامین صرف نوک جھونک کی غرض سے باندھے جاتے ہیں۔ اور نوک جھونک ہمیشہ معاصرین ہی سے ہوا کرتی ہے۔ ولی کے ہاں فخریہ شعر موجود ہیں مثلاً

پڑھتے ہیں ولی شعر ترا عرش پہ قدسی   باہر ہے تیری فکر رسا حد بشر سے

ہے سخن جگ منے عدیم المثال   جز سخن نہیں دوجا جواب سخن

عرفی و انوری و خاقانی   مجھ کو دیتے ہیں سب حساب سخن

مندرجہ بالا بیانات، اقتباسات و دلائل سے ولی کے دکنی ہمعصر شعرا کا وجود ثابت ہے پھر دہلی میں بھی ان کے ورود سے قبل شعر کا پایا جانا ایک ناقابل انکار حقیقت ہے چنانچہ میر حسن نے بھی ایک ایسے شاعر کا ذکر کیا ہے جو ولی سے پہلے دہلی میں تھا اور اس کا تخلص خاکی تھا۔ میر حسن لکھتے ہیں۔

"مردے بود درویش از شاہجہاں آباد در عہد جہانگیر احوالش معلوم نیست از یک مرد پیرے یک شعرش بگوش خوردہ ؎

ٹھانی ہے اپنے من میں اب تجھ ہی سے سجن   تجھ پیم کی گلی میں خاکی کو خاک ہونا

اس نقطۂ نظر سے تو ولی یقیناً نہ اول شاعر ہیں اور نہ اول صاحب دیوان۔ مگر اس روکھی پھیکی بے معنی ولایتی یعنی صرف نام کی اردو شاعری سے قطع نظر جو نہ پڑھی جائے اور نہ سمجھ میں آئے۔ اصل اردو (وہ اردو جو آج ہم بولتے ہیں) اس کی ولایت تمام تر ولی ہی کے زیر نگین نظر آتی ہے اور وہی اس کے موجد معلوم ہوتے ہیں۔ دہلی میں بھی صرف انہیں کے دم سے یہ گہما گہمی ہوئی اور دکن میں بھی سربرآرائے شعر و سخن رہے جیسا کہ خود فرماتے ہیں ؎

کیونکہ سیری ہو حسن سے تیرے دھوپ کھانے سے پیٹ بھرتا نہیں

سن تو دل کیوں تو پڑا اس بت عیار کے ہاتھ کوئی دیتا ہے بھلا اپنے ٹھگا کے ہاتھ

پھر میری خبر لینے وہ صیاد نہ آیا شاید کہ مرا حال اُسے یاد نہ آیا

لام نستعلیق کا ہے اُس بت خوشخط کی زلف ہم تو کافر ہیں اگر بندے نہ ہوں اسلام کے

ظاہر ہے کہ یہ زبان نہایت فصیح ہے۔

ولی کا علم۔ تبحر سمجھنے کے لئے اس مقام پر ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ آب حیات اور دیگر کتب میں ولی کو اعلیٰ علم اور فن عروض سے نابلد کہا گیا ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ معترضین ولی کے اشعار کی تقطیع کرتے وقت موجودہ تلفظ کرتے ہیں اور شعر بحر سے گر جاتے ہیں مگر یہ بڑی غلطی ہے۔ ولی کی نہیں بلکہ معترضین کی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس زمانہ اور اس زمانہ کے تلفظ میں زمین آسمان کا فرق ہے مثلاً اُس وقت نہیں کا تلفظ ،،نیں،، تھا۔ ولی نے جہاں کہیں "نہیں" باندھا ہے اکثر ،،نیں،، ہی تلفظ کیا ہے۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل اشعار کی تقطیع سے ثابت ہوتا ہے۔

چار دن کے	حسن پر مت	کر غرور	
حسن کو دا	ئم بقا نہیں[1]	الغیاث	
فاعلاتن	فاعلاتن	فاعلات	(یہ بحر رمل مسدس مقصور ہے اور شعر بالکل درست)

اسی طرح اس شعر میں نہیں کا تلفظ ،،نیں،، ہی ہے۔ "نہیں" پڑھنا شعر کو ناموزوں کر دے گا۔

جو کہ تجھ پر نگاہ کرتا نہیں وہ اپس کی خودی بسرتا نہیں

علم کے متعلق یہ ہے کہ ولی کا کلام تو یہی بتاتا ہے کہ وہ اعلیٰ قابلیت کے مالک تھے۔ مندرجہ ذیل اشعار کے تیور دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں

زلف و رخ ہے ترا جو لیل و نہار مجکو واللیل والضحیٰ کی قسم

مضطرب عشق سے ہوں مجکو ملامت مت کرو تپش دل نے دیا رشتہ سیاب مجھے

جس نے پکڑا اگوشہ آزادگی اس کو موج بوریا شمشیر ہے

تمام پات تسبیح بحمدہ کے بہ حکم زبان حال سے کرتے ہیں ذکر سبحانی

حسن تھا پردۂ تجرید میں سب سوں آزاد طالب عشق ہوا صورت انسان میں آ

---

[1] اس نہیں کو ،،نیں،، پڑھئے جب ،،تن،، کے موافق ہوگا۔ اور یہی سمجھ کر ولی نے باندھا ہے۔

وحدۃ الوجود صوفیہ کے عقائد میں سے ہے اور اسی سے واقفیت ولی کی اعلیٰ قابلیت پر دال ہے۔

ولی کا رتبہ دکھانے کے لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے کلام کی خصوصیات، اصنافِ سخن کے نمونے اور محاسنِ کلام کی توضیح کی جائے۔

اصنافِ سخن اور ولی

ولی نے تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ غزل، قصیدہ، مستزاد، مثنوی، رباعیات، قطعات، مخمس، ترجیع بند اور مفردات غرض سب قسم کے نمونے موجود ہیں۔ یہاں ایک ایک صنف کا تفصیل وار ذکر کیا جاتا ہے تاکہ کلام کی نوعیت سمجھ کر کلام کا درجہ اور محاسنِ کلام سے مراد وہ افکار ہیں جو شاعر کے ذہن میں آئے اور کسی نہ کسی صورت میں سلسلۂ نظم سے منسلک ہو گئے۔

غزل

شروع شروع کی غزلیں نہایت سادہ ہیں اور شاید افہام و تفہیم کی سہولت کے خیال سے ردیف کا التزام نہیں کیا۔ اور اگرچہ غزل میں عاشقانہ مضامین ہی بیان کرتے ہیں اور ولی نے زیادہ تر ایسا ہی کیا بھی ہے لیکن بعض غزلوں میں متفرق مضامین پر مشتمل اشعار بھی ہیں اور یہی تنوع اور رنگارنگی شعرائے دورِ حاضرہ کی غزلوں میں بھی کارفرما ہے۔ اس ضمن میں یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ مسلسل غزل زمانۂ موجودہ کی ایجاد سمجھی جاتی ہے اور حسرت، بیتاب اکبر آبادی، ڈاکٹر اقبال اور خصوصاً جوش ملیح آبادی بہت زور دیتے ہیں۔ ولی کے دیوان میں بھی موجود ہے۔ مسلسل غزل کے تمام اشعار ایک ہی مضمون کی کڑیاں ہوتے ہیں کہ اگر ایک شعر بھی نکال دیں تو غزل کا مضمون خبط ہو جاتا ہے حالانکہ عام غزلوں میں یہ نہیں ہوتا کیونکہ ان کا ہر شعر بجائے خود ایک پورا مفہوم رکھتا ہے۔ ذیل میں ایک غزل، ایک مسلسل غزل اور محاسنِ کلام پر روشنی ڈالنے کے لئے غزلوں کے مختلف اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

غزل

پڑی جو نظر چشمِ دلبر طرف — ہوا ہوش یکبارگی برطرف

اگر آبرو تجھ دو ابرو کا ہے — نہ جا خوبرویاں کے گیسو طرف

گئے دیکھ تجھ لب کوں آبِ حیات — کرے یک نظر گر تو شکر طرف

زبس تجھ ملاحت کا مشتاق ہوں — پڑا شور تجھ حسن کا ہر طرف

ولی کو نہیں مال کی آرزو — خدا دوست نہیں دیکھتے زر طرف

مسلسل غزل

امکاں پہ بنا احمد جو بسا خدائی — تب ملک نے دیکھ صلوا علیہ کہا یا

حور و غلماں نے جانے سوں دو نغمے گائے — قاب قوسین کا زینہ ہو تو سب کو بھایا

تھے جو بہتی وہاں آدم سوں لگا تا عیسیٰ — اور جبرئیل امین گوندھ کے سہرا لایا

حق نے لولاک لما حق میں محمد کے کہا　　اُن سوا کون سے مرسل نے یہ رتبہ پایا

مغفرت تیری وؔلی سہل بلا ریب ہے کیوں
نام احمد کا جو ہر دم ترے لب پہ آیا

یہاں کیوں کی ترکیب بھی غور طلب ہے یہ چیزیں غالب کا حصہ سمجھی جاتی ہیں اور ہیں بھی۔

کہتے ہیں ؎　　کیوں اندھیری ہے شب غم ہے بلاؤں کا نزول　　آج اُدھر ہی کو رہے گا دیدۂ اختر کھلا

یا یہ شعر ؎

لوکا ہے اُٹھا شہ بیکس کے گلے پر　　یہ ظلم تو دیکھو
مشکل سے ہوئی ہوگی سر تن میں جدائی　　کیوں ہ کند تھا خنجر

مگر ولی کا کلام دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ وہ زمانہ اور یہ اسالیب نگارش!

متفرق اشعار و بحث کلام

جسے عشق کا تیر کاری لگے　　اُسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے　(زندگی)

ہم پاس آ کے بات نظیری کی مت کہو　　رکھتے نہیں نظیر اپس کی سخن میں ہم　(فخریہ)

موج دریا کی دیکھنے مت جا　　دیکھ اُس زلف عنبری کی ادا　(عاشقانہ)

وؔلی رکھتا ہوں سینے میں ہزاروں گوہر معنی　　دکھاؤں اپنے جوہر کو اگر کوئی جوہری ہووے

(شکوہ ناقدری ابنائے زماں)

عجب نہیں جو حقیقت پہ آفریں بولے　　وؔلی جو کوئی نے اِس وضع کی تصنیف　(موجد ہونے کا احساس)

بات کہنے کا کبھی جب وقت پاتا ہے غریب　　بھول جاتا ہے وہ سب کچھ دیکھ صورت یار کی　(عاشقانہ)

یہ وہی رعب حسن کا مضمون ہے جو طرح طرح سے بندھتا چلا آتا ہے۔ غالب کہتے ہیں ؎

آج ہم اپنی پریشانیٔ خاطر اُن سے　　کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھیے کیا کہتے ہیں

معشوق کو ضرر نہیں عاشق کی آہ سے　　بجھتا نہیں ہے بادِ صبا سے چراغِ گل　(تخیل)

کیا بات ہے۔ ایسے مضامین تو آجکل بھی کم سننے میں آتے ہیں۔

دیکھ بھلا عین رقیب کو گتا　　ایک پاپوش خوب گتی ہے　(رندانہ)

سینہ ولی نے جا خبر میں دنیائے فانی سوں | سینہ نامہ کو دھوئے بے خبر انجو اں کے پانی سوں
مصحف مکھ ترا ہے سورت فجر | جلوں النجم اور ہوا کی قسم

مصحف مکھ کی مناسبت پر نہ ہنسنا چاہیے یہ آج سے دو سو سال قبل کی زبان ہے مضمون کو دیکھئے اور شاعر کے مذاق اور بلند پروازی کی داد دیجئے۔

اے سیدات دلدار میرا سلام کہنا | ہوں یاد میں تمہاری میں صبح و شام کہنا
اور مجھ پاس کیا ہے اپنے دل | دیکھ کر تجھ کو دے دیتا ہوں

اس شعر پر جا غالب یاد آ جاتے ہیں ان کے شعر بھی ملاحظہ ہوں صاحبان نظر دو جواہر کو آنک لیں گے دونوں کا خیال ہے۔ ولی دو سو سال پہلے کے شاعر تھے۔

غالب کہتے ہیں ؎

ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے | بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں
زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ستمگر ورنہ | کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

ولی، کیا سحر ہے آفات قیامت تری انکھیاں —— کھایا ہے جو کوئی تیر تجھ ابرو کی کماں کا — عشق حقیقی۔
دل کو گر مرتبہ ہے درپن کا | مفت ہے دیکھنا سجن کا — اصلاح نفس،

اشارہ ہے من عرف نفسہ فقد عرف ربہ کی طرف

مت آ ولی کو میاں اتنا تو کہا کر | پھر نہ ترا جگ میں اٹھا لون سکے گا — مجاز اور مانعتانہ،
شیخ یاں بات تری پیش نہ جاوے گی بھی | ہر کو چھوڑ کے مت مجلس رنداں میں آ
نہ کر سکوں ترے اک تار زلف کی تعریف | کروں ہزار کتب تجھ ثنا میں گر تصنیف — ہجو،
قسمت تری ہو حق پہ نہ ہو نا امید یہاں | نہیں اس فضل کوں غیر توکل ہیچ یہاں — رنج و توکلت علی اللہ،
طمع مال کی سر بسر عیب ہے | خیانت گنج جہاں سرے تال — امو غفور،

مستزاد مستزاد دو قسم کے ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ غزل کے ہر مصرع پر ایک فقرۂ نثر بڑھایا جائے جس کا مفہوم مصرع سے چسپاں ہو جائے۔ اور دو لفظ نہ معلوم ہو۔ ایسے مستزاد فارسی میں اکثر دیکھنے میں آتے ہیں اردو میں نہیں۔ دوسری قسم کے مستزاد ایسے ہوتے ہیں کہ بجائے فقرۂ نثر کے دو رکن ہر مصرع پر بڑھا دیے جاتے ہیں۔ اس طرح کہ مضمون مصرع سے مل جائے اور یہ رکن پھر الگ کے الگ رہیں یعنی غزل کے مصرع اور بڑھائے ہوئے ٹکڑے میں وہی تعلق ہو جو دو متصل مصرعوں میں ہوتا ہے

انشا، مصحفی کے مستزاد مشہور ہیں۔ ولی کے مستزاد کا نمونہ لکھا جاتا ہے۔

بے تاب کیا شوق نے مجھ دل کو بدن میں — گل پیرہناں کا
جیوں غنچہ کیا بند محبت کے چمن میں — رنگیں دہناں کا

اگی ہے لگن تم سوں بچھڑا کون سکے گا — ہے کس میں یہ قدرت
اب مجکوں وطن اپنے لجا کون سکے گا — کر دل سوں رفاقت
مت مار ولی کوں میں یہ کہتا ہوں پکار کر — سن بات ہماری
اس ہجر کے طومار کو پا کون سکے گا — بن غمزہ ظرافت

قصیدہ | ولی نے اپنی عمر میں کسی بادشاہ یا امیر کی مدح نہیں کی اس لئے قدرتی طور پر قصائد جو درباروں اور سرکاروں کی زینت ہیں ولی کے یہاں نہ ہونے چاہئے تھے۔ مگر ولی اپنے نام کے ولی تھے۔ حمد خداوندی، نعت رسول مقبول و مدح بزرگان دین میں قصیدے لکھے اور خوب لکھے۔ یہ قصیدے ہر طرح مکمل ہیں تشبیب و گریز و خاتمہ سب کچھ ہے مگر خیالات زیادہ تر دکنی ہیں۔ بہر طور شوکت الفاظ و رفعت تخیل جس میں قصیدہ کی برتری کا راز مضمر ہے۔ ولی کے ہاں موجود ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار لکھے جاتے ہیں۔

ہے زباں پر تو اول اول — نام پاک خدائے عزوجل
لائق حمد نہیں ہے اس بن اور — اس اپر متفق ہیں اہل ملل

اس قصیدے میں قطعہ بند بھی ہیں اور درمیان میں غزل بھی شروع ہوتی ہے کہتے ہیں ؎

دیکھ تیری یہ چشم تنگ غزل — مدح تیری میں یہ کہا ہوں غزل
ہے یہ تیرے نین ہیں دو چنچل — دیکھنے جن کو عشق آوے چل

قصیدہ در نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم

عشق میں لازم ہے اول ذات کو فانی کرے — جو فنا فی اللہ دایم یاد یزدانی کرے
یاد کے گلزار پر دو نین کر ابر بہار — ہیچ کھا سینے میں دل کو بوستانی کرے
مرتبہ ظلمت پناہی کا وہ پاوے گا جو کوئی — مثل سہیل اول جی کو قربانی کرے

ترجیع بند | ترجیع بند میں غزل کی طرح ایک مطلع اور چند اشعار رکھ کر ایک بیت کی جس کا قافیہ الگ ہو، پہلے اشعار سے مختلف ہو، گرہ لگائی جاتی ہے۔ یہ بیت بدستور قدیم رہتی ہے اور اس طرح کہ ہر بند کے آخر میں آتی ہے۔ ولی کا ایک ترجیع بند لکھا جاتا ہے۔

بہ رنگ نزاکت بہ طرز ادا صنم گل رخاں کا ہے تو مقتدا
رہا تھا جب تلک بخت سعد نہ رہتا تھا اک آن تجھ سوں جدا
یکایک ترے ہجر نے اے صنم کیا محو سب عشرت ابتدا
کروں تجھ سے کیوں آرزوئے جواب سدا کو تو تمکین ہے بے صدا
ترے غم سوں پھٹتی ہے چھاتی مری ٹپے اشک سوں دو نین زرد را
بجا ہے سنو گر مرا قصہ گزشتہ میں شہ عرض حال گدا
تغافل کرت کام فرما سجن مری بات سن کر برائے خدا

شتابی خبر لے کہ بے تاب ہوں
ترے عشق میں بے خور و خواب ہوں

مخمس | کسی شعر پر تین مصرع لگانا اس طرح کہ یہ تینوں مصرعے شعر کے پہلے مصرعے کے ساتھ ہم قافیہ ہوں اور معنی کے اعتبار سے مربوط، تخمیس یا مخمس کہلاتا ہے۔ مخمس دوسروں کے اشعار پر بھی لکھے جاتے ہیں اور فارسی اشعار پر بھی اردو کے مصرعے لگا لیتے ہیں۔ مگر ولی نے صرف اپنے ہی اشعار پر مخمس کہے ہیں جیسا معلوم ہوتا ہے فارسی اشعار کو اس لیے تخمیس نہیں کیا کیونکہ ان کی توجہ تمام تر اردو کو بنانے اور ترقی دینے میں مصروف تھی اور وہ صرف اسی میں کوشاں تھے۔ اور دوسرے اردو شاعروں کے اشعار پر اس لئے کوئی مخمس نہیں لکھا کیونکہ ولی ہمیں خاطر میں نہ لاتے تھے۔ ان کے کلام کو اردو ہی نہ سمجھتے تھے اور وہ ایسا سمجھنے میں یقیناً حق بجانب تھے۔ ولی کے مخمس کا نمونہ حسب ذیل ہے

(۱) عشق کے درس کا ہوں میں استاد طفل مکتب ہے مجھ آگے فرہاد
بندہ تیرا ہوں گرچہ ہوں آزاد بسکہ رکھتا ہوں تجھ قدم کی یاد

دل ہوا خوں مرا حنا کی قسم

(۲) نیرنگی ترے لب کی مسیحا پہ لکھا ہوں افسوں ہے جنوں کو جو لیلیٰ پہ لکھا ہوں
ہر چند کہ غم کوں دل رسوا پہ لکھا ہوں تصویر تری جان مصفا پہ لکھا ہوں

جوں نقش پری پردۂ مینا پہ لکھا ہوں

قطعہ | غزل یا قصیدے کا ٹکڑا جو کسی پورے اور مسلسل معنی کا حامل ہو قطعہ کہلاتا ہے۔ قطعہ میں کم سے کم دو شعر ہوتے ہیں ایک شعر پر قطعہ کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ اس میں مطلع ضروری نہیں اور اکثر نہیں ہوا کرتا۔ اس میں ولی کا رنگ حسب ذیل ہے۔

قطعہ

حسن دلبر کا خواب میں دیکھا　　نور حق تھا حجاب میں دیکھا

خود فنا ہو کے ذات میں منا　　یہ تماشا جاب میں دیکھا

اس قطعہ سے بھی ولی کا ترفع خیال و مذاق تصوف ظاہر ہوتا ہے۔

رُباعی | مجمع الصنائع میں ہے کہ رباعی منسوب بہ رُباع ہے۔ چونکہ رباعی میں چار مصرع ہوتے ہیں اس لئے اس کو رُباعی کہتے ہیں اور اسی لئے اس کا نام چار مصرعی اور دو بیتی بھی ہے۔ مگر یہ امر مسلمہ ہے کہ صرف چار مصرعوں سے رباعی نہیں ہوتی اس کے اوزان مقرر ہیں جو چوبیس[۲۴] بتائے جاتے ہیں اور رُباعی ہمیشہ بحر ہزج میں آتی ہے۔ رُباعی کا مشہور وزن لاحول ولا قوۃ الا باللہ ہے۔ ولی کی بعض رُباعیاں اس وزن پہ پوری نہیں اُترتیں اس لئے انھیں قطعہ ہی کہا جا سکتا ہے۔ اگر رباعی کے چاروں مصرعوں میں قافیہ ہو تو وہ مُصَرَّع کہلاتی ہے ورنہ خصی، ولی کی تمام رُباعیوں میں تیسرا مصرع بغیر قافیہ ہے۔ اس لئے انھیں خصی کہنا چاہئے لیکن آج کل یہ کوئی عیب نہیں ہے بلکہ عام رواج یہی ہو گیا ہے کہ تین ہی مصرعوں میں قافیہ ہو۔ مثال کے طور پر ولی کی ایک رباعی لکھی جاتی ہے

دیوانِ ازل بیچ خدائے بیچوں　　یہ حکم کیا عام کہ ہاں کُن فیکوں

افرادِ دو عالم کا بندھا شیرازہ　　اِس دفتر کونین پہ فہرست ہی توں

مثنوی | یہ نہایت مفید صنف نظم ہے۔ اس میں اوّل سے آخر تک ابیات ہی ابیات ہوتے ہیں جن کا قافیہ اور اگر کسی بیت میں ردیف ہو تو ردیف بھی، ہر بیت کے بعد تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس میں رزم و بزم دونوں پہلو دکھائے جاتے ہیں۔ ولی نے ایک نہایت مختصر مثنوی شہر سورت کے متعلق کہی ہے جس میں محاکات کی شان جلوہ گر ہے۔ یعنی بالکل تصویر کھینچ دی ہے

اب ولی کے کلام کی خصوصیات پر مختصر تبصرہ کیا جاتا ہے۔

خصوصیات | مزاج میں شوخی ہے جیسا کہ اس شعر سے بھی ظاہر ہے ؎

کچھ بھلا نہیں رقیب کو کہنا　　ایک پاپوش خوب لگتی ہے

مگر استخفاف انبیاء و اولیاء سے پرہیز کرتے ہیں تضحیک واعظ و ناصح میں چند شعر کہے ہیں لیکن ان میں بھی ایسی تذلیل و تحقیر نہیں کی

ولی کے ہر شعر سے ایک مسلمان کا کلام ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ ہر حالت میں مذہب مد نظر رہتا ہے۔ وہ اس کے خلاف کچھ نہیں کہتے اور نہیں کہہ سکتے
ولی نے بادشاہ و وزیر کا قصیدہ نہیں کہتے خود ہی بادشاہ ہیں۔ روپے کی خاطر جھوٹی تعریف پسند نہیں کرتے۔ کہتے ہیں۔

ولی کو نہیں مال کی آرزو خدا دوست نہیں دیکھتے زر طرف

ولی کسی کی ہجو نہیں کرتے حالانکہ آزار دہ لوگ اس معصیت سے ملوث ہو جاتے ہیں۔ مگر ولی مبرا ہیں۔ ان کا کلام ہجو سے پاک ہے۔

ولی کے یہاں حقیقت و مجاز دونوں ہیں۔ اور انھوں نے خود بھی صاف صاف کہہ دیا ہے۔ لکھتے ہیں ؎

در وادیٔ حقیقت جس نے قدم رکھا ہو اوّل قدم ہے اُس کا عشق مجاز کرنا

طریقت صوفیہ کے مطابق جب کسی سے دلی تعلق ہو جاتا ہے تو صاف دل اور پاک باطن ہونے کی وجہ سے نام بھی ظاہر کر دیتے ہیں جو
بھلا معلوم ہوا اسی کی تعریف کر دی۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

مقصود دل ہے اُس کا خیال اے ولی مجھے جیوں نبھ زباں کا ورد محمد مراد ہے

ہے بسکہ آب و رنگ حیا کیم داس میں آتا نہیں کسی کے خیال و قیاس میں

خصوصیات کلام کے بعد صنائع لفظی و معنوی جو ولی کے کلام میں موجود ہیں ان کا نہایت مختصر طور پر ذکر کیا جاتا ہے اور یہ وہ صنعتیں ہیں
جن کا اب تک اس مضمون میں کسی طرح ذکر نہیں آیا۔

تشبیہ | جب دو چیزیں کسی خصوص مشترک کی وجہ سے ایک دوسرے جیسی بتائی جاتی ہیں تو اُسے تشبیہ دینا بولتے ہیں۔ تشبیہ کی ضرورت
تشبیہ کے فوائد۔ تشبیہ کے اقسام پر روشنی ڈالنے کا یہ محل نہیں صرف اُن صنعتوں کی طرف اشارہ کیا جائے گا جو ولی کے کلام میں بدرجۂ
اتم پائی جاتی ہیں۔ ولی کہتے ہیں ؎

لخت دل پہ خط لکھا ہوں یار کو داغ دل مہر سر مکتوب ہے

دل کو خط سے محبت کے مضمون سے دیہ نہایت لطیف کنایہ ہے، اور داغ دل کو اس مہر سے تشبیہ دی ہے جو خانے یا خط کے اوپر لگائی جاتی ہے
نہایت اعلیٰ تشبیہ ہے اور رازداری کی طرف بھی نہایت لطیف اشارہ ہے۔ کہتے ہیں ؎

موج دریا کی دیکھنے مت جا دیکھ اس زلف عنبریں کی ادا

اس تشبیہ کو تشبیہ اضمار کہتے ہیں۔ اس شعر میں زلف کو موج دریا سے تشبیہ دی ہے لیکن ظاہر یہ کیا ہے کہ گویا تشبیہ دینی مقصود نہیں ہے۔
اسی طرح اور بہت سی عمدہ تشبیہات ولی کے کلام میں دکھائی جا سکتی ہیں۔

استعارہ | جب کوئی لفظ اپنے اصلی اور لغوی معنی میں استعمال نہیں ہوتا بلکہ کسی مناسبت کی وجہ سے کسی دوسرے معنی میں یعنی معنی مستعار

میں استعمال کیا جاتا ہے تو اُسے استعارہ کہتے ہیں۔ ولی کے یہاں استعارہ ہے لیکن بہت کم اور نہایت سریع الفہم۔ مثلاً کہتے ہیں ع

کیا ہے ابرِ رحمت نے گوہر افشانی

یہاں بارش کی بجائے گوہر افشانی کہا گیا ہے۔

تجنیس | جب دو لفظ اپنے تلفظ اور حروف میں (یا محض حروف میں یا اکثر حروف میں) ایک دوسرے جیسے ہوں اور باہم اُن کے معنی ایک دوسرے سے مختلف ہوں تو اُن کے درمیان صنعت تجنیس ہوتی ہے۔ تجنیس کی بہت قسمیں ہیں یہاں صرف ایک دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں جو ولی کے کلام میں خاص ہو۔ پر جاذب نظر ہیں۔ کہتے ہیں ؎

اے شگا عاشقوں پر یوں نہ کر جور و ستم
خیر اد شر کی حقیقت میں ہے اک شغال قال

شغال قال میں تجنیس مکرر ہے یعنی ہم جنس الفاظ متصل واقع ہوئے ہیں۔

ترے بن رات دن پھرتا ہوں بن بن کشن کی مانند
اپس کی کھ اپر رکھ کر گنگ کی بانسلی انکھیاں

بِن ۔ بغیر ۔ بَن ۔ جنگل ۔ بِن اور بَن میں تجنیس محرف ہے یعنی حرکت کے سوا جو ایک میں زیر اور دوسرے میں زبر ہے حروف دونوں کے یکساں ہیں اور معنی مختلف۔

تلمیح | تلمیح یعنی لطیف پیرایہ میں کسی واقعہ کی طرف اشارہ کرنا۔ مندرجہ بالا شعر میں اس کی مثال موجود ہے۔

ایہام | جب کلام میں قصداً کوئی ذو معنی لفظ رکھا جاتا ہے۔ اور اس سے بجائے قریب الفہم بعید الفہم معنی مقصود ہوتے ہیں تو اسے صنعت ایہام کہتے ہیں ولی کہتے ہیں ؎

مذہب عشق میں تیری صورت
دیکھنا ہم کو فرض عین ہوا

عین کے معنی آنکھ اور دوسرے معنی بالکل یہاں دوسرے معنی مراد ہیں۔

موسیٰ جو آکے دیکھے تجھ نور کا تماشا
اس کو پہاڑ ہووے پھر طور کا تماشا

یہاں پہاڑ سے کوہ طور کی طرف ذہن منتقل ہو جاتا ہے حالانکہ یہاں پہاڑ سے مراد نہایت مشکل کام ہے

حُسنِ طلب | نہایت خوبصورتی سے سوال کرنا۔ یہ بھی بڑی صنعت ہے۔ ولی کہتے ہیں ؎

لب تمہارے ہیں شفا بخش ولی ہے بیمار
حیف صد حیف جو اس وقت میں درماں نہ کرو

تجاہل عارفانہ | جب کوئی شخص کسی شے کو اچھی طرح جانتے کے باوجود انجان پن ظاہر کرے تو اسے تجاہل عارفانہ کہتے ہیں۔
ولی اپنے محبوب کے متعلق کہتے ہیں ؎

شاخ گل ہے یا نہال راست   سرو قد ہے یا سراپا ناز ہے

عکس | اس صنعت کے لئے یہ اہتمام کیا جاتا ہے کہ بجائے پورے شعر یعنی دو مصرعے بنانے کے ایک مصرع بنایا جائے اور اس کے دو حصے اس طرح مناسب ہوں کہ دوسرا ٹکڑا پہلے اور پہلا ٹکڑا بعد میں کر دینے سے بھی معنی پیدا ہوں اور یہی منقلب مصرع شعر کا مصرع ثانی سمجھا جائے مثلاً حافظ کا یہ شعر ہے

دلبر جانان من برد دل و جان من   برد دل و جان من دلبر جانان من

ولی کہتے ہیں ۔

مجھ کو ہے دار الامن پیو کا نقش چرن   پیو کا نقش چرن مجھ کو ہے دار الامن

رد العجز علی الصدر | جب ایک جملہ کا آخر اور دوسرے جملے کا شروع ایک ہی لفظ کی تکرار سے ہو تو صنعت رد العجز علی الصدر ہوتی ہے اس نام کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ صدر پہلے مصرع کے اول رکن کا نام ہے اور عجز دوسرے مصرع کے آخری رکن کا کسی شعر کے ارکان کے یہ نام ہوتے ہیں

صدر ——— حشو ——— عروض
ابتدا ——— حشو ——— عجز

ولی نے اس صنعت کے ساتھ ایک اور اہتمام بھی کیا ہے اور وہ یہ کہ جہاں پہلے مصرع کا شروع وہی ہے جو دوسرے مصرع کا آخر ہے وہاں دوسرے مصرع کا شروع بھی وہ ہے جو پہلے مصرع کا آخر ہو سکتے ہیں ۔

دلربا آیا نظر میں آج میری خوش ادا   خوش ادا ایسا نہیں دیکھا ہے دوجا دلربا

پوری غزل ایسی ہی ہے ۔

قول بالموجب | جب کہنے والا ایک بات کہتا ہے اور سننے والا اسے سن کر دوسرے معنی میں توڑ مروڑ لیتا ہے تو اسے قول بالموجب کہا جاتا ہے ۔ ولی کہتے ہیں ۔

میں کہا تیرے بدن پر کیا بھلی لگتی ہے راکھ   ہنس کہا جوگی کے سر کو خاک لگتی ہے بھلی

ایراد المثل | اور اسی کو ضرب المثل اور ارسال المثل بھی کہتے ہیں جب کوئی بات کہی جائے اور پھر اس پر کوئی مثل بھی بیان کر دی جائے تو اس کے یقین کرنے میں کچھ تامل نہیں ہوتا اور بات کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے ۔ ولی کہتے ہیں

معشوق کو خبر نہیں عاشق کی آہ سے   بجھتا نہیں ہے باد صبا سے چراغ گل

پہلا مصرع ایک دعویٰ بلا دلیل تھا جسے دوسرے مصرع سے گویا ثابت کر دیا ہے ۔

کیونکر سر ہو ہوس ... تیرے سے   دھوپ کی نے سے ہٹ بہتر نہیں

چاسرِ ہند

(از)

سیّد عباس حسین صاحب نقوی امیدوار متعلم بی اے (عثمانیہ)

ولیؔ جس پہ ہے ناز اہل دکن کو
دکن کیا بلکہ خود ملکِ سخن کو

وہ خاکِ خطۂ اورنگ آباد
دلاتی ہے جو عالمگیر کی یاد

وہ بھومی ہے ولیؔ خوش بیاں کی
بنی تربت شہ ہندوستاں کی

ولیؔ کا ہے وہی اُردو میں رتبہ
جو انگریزی میں چاسرؔ کا ہے درجہ

وہی نسبت ہے انکی شاعری کی
جو کچھ ہے فارسی میں رودکیؔ کی

نہ مانیں کیسے اہل ہند احسانؔ
تن اُردو میں جس نے ڈالدی جانؔ

ولیؔ ہی سے ہے آبِ آبروؔ بھی
انہیں کا خوشہ چین ہے آرزوؔ بھی

کھلا سنؔ سے ولادت کے نیا حال
ہزار اور اسپہ ششتر پہ تھے نو سال

وطن سے علم کے لے کر خزانے
گئے گجرات میں تعلیم پانے

جبھی تو ان کو گجراتی سمجھکر
ہے سب گجراتیوں کو ناز اُن پر

جو پلٹے آپ وہاں سے بن کے کامل
ہوی شعر و سخن پر طبع مائل

ہیں اصنافِ سخن جتنے جہاں میں
کیے سب جمع اردو کی زباں میں

شمالی ہند میں دو بار جا کر
بٹھایا اپنا سکہ سب کے دل پر

جو تھے اشعار ان کے ریختے میں
پڑھے جانے لگے ہر ہر گلی میں

کلام ان کا جو تھا ہر اک کو مرغوب
جہاں میں ان کی شہرت ہوگئی خوب

جو ستھرا تھا مذاقِ طبع اُن کا
بجا ہندوستاں میں اُن کا ڈنکا

جو تھا صحبت کا انکی شوق سب کو
ہوا شعر و سخن کا ذوق سب کو

طبیعت دار جو درد آشنا تھے
وہ دل سے نام پر اُن کے فدا تھے

نہیں دیکھا کہیں ان کو اکیلا
لگا رہتا تھا ان کے ساتھ میلا

ہوئی جب چار جانب انکی شہرت
ہر اک کی خود ہوئی مائل طبیعت

ولی کا جو بجا عالم میں ڈنکا
ہوا شیدا ہر اک شعر و سخن کا

پڑا ہر اک کو چسکہ شاعری کا
ہوا یوں بول بالا شاعری کا

ولی اللہ ان کا نام نامی
غزل گوئی میں تھا انداز جامی

تعصب سے بری تھی ذات انکی
سراپا شعر تھی بات اُنکی

ہیں اردو شاعری کے جتنے اضاف
جھلکتے ہیں ولی کے اُن میں اوصاف

قدامت معترف انکی زباں کی
ہے دلچسپی مقرر حسنِ بیاں کی

ترنم، سادگی، حسنِ سلاست
فصاحت وہ، فدا جس پر بلاغت

تکلف طبع میں ان کے کہاں ہے
ہے آمد یا کوئی دریا رواں ہے

تھے علمی قابلیت میں بھی یکتا
جبھی ہے مستند ہر قول اُن کا

ہیں اہلِ ہند پر احساں ولی کے
مجدد ہیں یہ اردو شاعری کے

ادب کی ہند میں بنیاد یہ ہیں
حقیقت میں "جہاں استاد" یہ ہیں

ہمارے درسگاہوں کی یہ تعمیر
ولی کے خواب کی یکسر ہے تعبیر

لگائی تھی جو شاخ اُس مقتدا نے
کیا سرسبز اس کو جامعہ نے

حقیقت میں ہیں قدرت کے عجب کام
وہ اک آغاز تھا اور یہ ہے انجام

دکھنی شعرا کا سفر شمالی ہند

از

جناب خلیق احمد صاحب نعمانی (عثمانیہ)

شاعر شعر کہنے سے زیادہ سنانے کا شائق ہوتا ہے۔ لکھنے سنانے اور پھر تحسین ہونے میں وہ زندگی کی بے شمار مسرتیں پنہاں سمجھتا ہے۔ اس کو اس کا موقع بادشاہوں، نوابوں اور امیروں کی بارگاہوں میں ملتا ہے۔ شعر و شاعری کی گرم بازاری شخصی حکومت کے سایہ میں ہوئی ہے نہ کہ جمہوریت کے نقار خانہ میں [illegible] شخصی انانیت اور فنی برتری کی احتمامی کے تابع رہتی ہے۔ شخصی حکمرانوں کے لیے شاعری ایک حیثیت سے شغل رہی ہے جس سے خوش ہونے اور ذاتی وقار کا پرچار کرنے کا سامان فراہم ہو جاتا ہے۔ شاعر بقائے نام اور شاہی مفاخرت کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے فتح و کامرانی کے ساتھ باکمال شعرا بھی دربار میں طلب کیے جاتے تھے۔ اور انہیں اعلیٰ رتبہ تک پہنچایا جاتا تھا۔ سلطان محمود نے خوارزم سے جن ارباب علم و فضل کو غزنی میں بلا بھیجا تھا ان میں ابو ریحان بیرونی کے علاوہ عراقی بھی تھے۔ جب ایران میں ہندوستان کے بادشاہوں اور امیروں کی فیاضیوں اور نکتہ سنجیوں کی صدائیں پہنچیں تو وہاں کے باکمال شاعروں نے اس طرف کا رخ کیا۔ اور بڑے بڑے خطابات سے سرفراز اور انعام و اکرام سے نہال ہوئے۔ سلطان محمد تغلق نے بدر چاچی کو "فخر زمان" کا خطاب عطا کیا۔ اکبر نے غزالی مشہدی کو ملک الشعرا کے خطاب سے سرفراز کیا۔ جہانگیر نے طالب آملی اور شاہجہاں نے کلیم ہمدانی کو ملک الشعرا کے خطاب سے نوازا۔ شمالی ہند میں شاہجہانی دور تک فارسی شعر و شاعری کی قدر افزائی میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا لیکن عالمگیر کی تخت نشینی سے فارسی شاعری کو [illegible] دھچکا لگا۔ صوفی سرمد کے قتل اور احکام شریعت کی پابندی اور احتساب نے فارسی شاعری کے بے لگام [illegible] کو روکا۔ بزم شعر و شاعری کی بجائے رزم کی بساط بچھی، زیادہ گردش شروع ہوگئی۔ عالمگیر دکن کی فتح میں محو ہو گیا۔

دکھنی ہندوستانی کی اس قدر افزائی نے عالمگیری امرا کو بھی اس کی طرف متوجہ کیا۔ پھر بھی فارسی شاعری کی شمع عالمگیر کے چند ایک جانشینوں تک جھلملاتی رہی اور بیدل کے ساتھ فارسی شاعر کا جنازہ نکلا۔ بیدل (متوفی ۱۱۳۳ھ)

کی یاد میں تاریخ وفات کے دن چراغاں ہوتے اور تلامذۂ بیدل جمع ہوکر شعر کیا پڑھتے، گرم گرم آنسو بہاتے کہ فارسی شعر کہنے کا زمانہ نہ رہا۔ ناصر علی، شیخ علی حزیں اور مرزا جان جاناں مظہر، سراج الدین علی خان آرزو کی چشمکیں زمانہ کی ناسازگاری کے طعنے تھے۔

جب گجرات سلطنت مغلیہ میں شامل ہوگیا تو وہاں کے ارباب علم وفضل اور شعراء بجائے دہلی جانے کے بیجاپور چلے آئے، جہاں ابراہیم عادل شاہ ثانی نے بے نظیر فیاضی دکھائی۔ ہندوستانی کی سرپرستی اور بادشاہ کی فیاضی کا شہرہ سن کر عبدل بھی اسی کے عہد میں بیجاپور آیا اور "ابراہیم نامہ" تصنیف کیا۔ اگرچہ عالمگیر نے نصرتی کی بڑی قدر افزائی اور خطاب سے سرفراز کیا۔ لیکن اس نے شمالی ہند کا سفر نہ کیا۔ ولی ہی پہلا دکنی شاعر ہے جس نے شمالی ہند کا سفر کیا۔

دورِ اول
۱۰۹۰ تا ۱۱۳۰ھ

"دکنی شعرا کا سفر شمالی ہند" کو تین دوروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا دور ۱۰۹۰ھ ہجری سے ۱۱۳۰ھ ہجری تک ہوگا۔ اس دور کو ۱۰۹۰ھ ہجری سے شروع کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ولی نے دہلی کا سفر اس سنہ کے بعد لیا۔ جب کہ شاہ گلشن دہلی میں موجود تھے اور پھر دوسرا سفر عالمگیر ہی کے زمانہ ۱۱۱۲ھ میں کیا۔ اشرف نے اپنی مثنوی "جنگ نامہ حیدر" میں فرخ سیر کو مخاطب کیا ہے۔ جو ۱۱۳۰ھ ہجری میں تخت دہلی پر متمکن تھا۔ اسی سنہ میں ولی کا مرتبہ دیوان دلی پہنچا۔ اور حاتم نے اس کا تتبع کیا۔ جس سے باقاعدہ اردو شاعری کا آغاز ہوا۔ اس لیے قطعی طور پر ۱۰۹۰ھ و ۱۱۳۰ھ ہجری تک قرار دیا جانا چاہیئے۔

اس دور کا نصف اول عالمگیر کے عہد حکومت سے تعلق رکھتا ہے۔ اس زمانہ میں ولی۔ آزاد فراقی۔ بیجاپوری۔ دہلی گئے۔

یہ زمانہ اُن لوگوں کے لیئے جو گولکنڈہ اور بیجاپور سے تعلق رکھتے تھے۔ نہایت پر آشوب تھا۔ اہل دہلی عیش وعشرت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ جب عادل شاہی اور قطب شاہی خزانوں سے کئی کروڑ نقد اور کروڑوں روپئے کے جواہرات اور طلائی ظروف ہاتھ آئے تو عالمگیر کی سپاہ اور اُمرا پر انعامات واکرامات کی بارش ہوئی۔ مغلوں کے تمول میں اضافہ ہوا۔

ولی اور اُن کے دکنی معاصرین نے دہلی کے خوش حال ماحول میں "مرغ زرین" کی مدح سرائی نہیں کی بلکہ ان شاعروں نے اپنے شاعرانہ کمال کی داد چاہی اگرچہ فارسی کے مشہور شاعر ناصر علی کو ولی نے "اعجاز سخن" کا قائل

ہونا پڑا۔ لیکن اُس نے اپنے تخلص — عزلتؔ — کی مناسبت سے ولی پر اپنی فضیلت جتلائی۔

اِن کا کلام اُن کے دہلی جانے سے قبل ہاتھوں ہاتھ "عزیزوں کی بیاض" کے ذریعہ پہنچ چکا تھا۔ لیکن "جواہر" کو پرکھ کر "معدن" سے مطلب رکھنے والوں کی مسرت کا کیا ٹھکانا۔ جب ولی نے پیہم اصرار پر شاہجہاں آباد کا دوسرا سفر ۱۱۱۲ھ میں اختیار کیا۔ اور دکھنی "شرابِ تازہ" کے رنگین جام لنڈھائے گئے جب آبرو اور فراقی بھی شریکِ کار ہوگئے، تو ساقی گری کا ایک دور قایم ہوگیا۔ ولی کے دہلی جانے سے بڑا فائدہ تو یہ ہوا کہ فارسی گو شعرا نے ولی کی شہرت اور قدر و منزلت سے متاثر ہوکر "دکھنی ہندوستانی" میں شعر کہنا شروع کیا۔ خواہ وہ "بہمن تفنن" ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ موسوی خاں فطرت (متوفی ۱۱۰۱ھ) بیدل (۱۱۳۳ھ) اور عبدالغنی قبول (۱۱۳۹ھ) کے شعر تذکروں میں ملتے ہیں۔ فارسی شاعری سے بیزاری کا یہ احساس "ہندوستانی" کی ترویج کا باعث ہوا۔ تاریخ ادبیات میں اس طرح کی اور بھی مثالیں ملتی ہیں جب کہ ایک ملک کے شعرا نے دوسرے ملک کا سفر کرکے وہاں علم و ادب اور شعر و سخن کا بیج بویا تھا، چنانچہ اس سلسلہ میں یونان قبل مسیح کے واقعات سے اس بات کا کافی ثبوت ملتا ہے کہ ایتھنز کے نامور مصنفین اور شعرا نے سیراکیوز کا سفر معزز و محترم مہمانوں کی حیثیت سے کیا۔ ہیرو اول کے عہدِ حکومت میں سیراکیوز کو اسکیلیس، پنڈار، سائمنڈیس، اور باکلیڈس نے، اور ڈائنی سیس دوم کے دورِ حکمرانی میں افلاطون نے اپنے قدوم سے شرف بخشا۔

اِن کی آمد کے سو سال بعد نہ صرف نادرِ روزگار مہندس اور انجینیر آرشمیدس نے بلکہ تھیوکریٹس جیسے مطربِ خوش نوا، اور دہقانی شاعری کے موجد نے سیراکیوز میں جنم لیا۔

اس دکھنی "خوشۂ پروین" نے جو ولی، آبرو، فراقی، یکرنگ، اور اشرف پر مشتمل تھا، پیہم کے افق پر نمودار ہوکر شعر نور کی بارش کی جس کے سو سال بعد دہلی سے مرزا غالب کی ضوفشانی نے دنیائے اُردو کو خیرہ کردیا۔

اس دور کے نصفِ آخر میں پایۂ تخت پر تباہی و بربادی کی بدلیاں چھانے لگیں۔ جہاندار شاہ کا قتل، فرخ سیر اور سادات بارہہ میں کشیدگی، فرخ سیر کے قتل کے بعد سیدوں کا غلبہ، مرہٹوں کی ستم رانیاں، اور بادشاہ گردی نے اہل دہلی کے امن چین میں خلل ڈال دیا۔ اس دورِ اختلال میں اُردو شاعری کا آغاز کیسے ہوتا؟ مگر اشرف اور طالب اُس وقت دہلی میں موجود تھے۔ ایک نے مثنوی کہی، اور دوسرے نے کئی ایسے دکھنی شعرا کے کلام سے روشناس کرایا جنھوں نے دہلی کا سفر نہیں کیا تھا۔ اِس دور کی ایک دکھنی یادگار "بیاضِ طالب" کا ذکر مخزنِ نکات میں کیا گیا ہے۔

ولی بحیثیت سیاح

ولی کی شخصیت پر اُس کی شاعرانہ شہرت نے پردہ ڈال دیا۔ تذکرہ نویسوں کی بے اعتنائی کہیے، یا کمال شہرت" کی برکت، کہ اُن کی تمام تر زندگی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ پہلے شاعر کے کلام کو محض کلام کی خاطر دیکھا جاتا تھا۔ لیکن اب وہ زمانہ نہ رہا۔ حیات شاعر کی روشنی میں شاعر کے کلام کا مطالعہ کیا جانے لگا ہے۔ یہی وجہ ہے جو ولی کے کلام کی برتری نے ارباب اردو کو ان کی حیات گم شدہ کی تلاش میں سرگرداں کر رکھا ہے۔

میرؔ پہلے تذکرہ نویس ہیں جنھوں نے ولیؔ کو اورنگ آبادی لکھا۔ لیکن گردیزی نے "در دکن چہرۂ ہستی افروختہ" لکھ کر بحث کی طرح ڈالی۔ اگر تذکرہ ریختہ گویاں (گردیزی) اور نکات الشعرا (میر) کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ گردیزی نے ولیؔ کے کلام کا میرؔ کے تذکرے سے انتخاب کیا، لیکن چونکہ اسے میرؔ سے بیر تھا، اس لیے یہ چھپانے کے لیے کہ اُس کے پیش نظر میرؔ کا تذکرہ نہیں تھا، ولی کے حالات میں مذبذب تحقیق کا ایک شاخسانہ لگا دیا۔ اور "در دکن چہرۂ ہستی افروختہ" لکھ کر گریز کیا۔

ولیؔ کے بارے میں قائمؔ کا ایقان "ولی" کے دیوان کے مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے ٹھوکر پر ٹھوکر کھائی۔ شاہ وجیہ الدین سے والہانہ شیفتگی کو پڑھ کر ولیؔ کو اُن کا فرزند لکھ مارا۔ اور پھر حضرت شاہ صاحب کے گجراتی ہونے کی وجہ سے ولیؔ کو بھی گجراتی سمجھا۔ "فراق گجرات" والے قطعہ سے ان کے خیال کو اور بھی تقویت ہوئی۔ مابعد تذکروں کے یہی تین ماخذات ہیں۔ سرور اور قاسم نے گردیزی کے بیان پر اکتفا کر کے ولیؔ کو باشندہ دکن لکھا۔ اور خاموش ہو رہے۔ علی ابراہیم، فائق اور آزاد نے قائمؔ کا اتباع کیا۔ میرؔ صاحب کے پیرو در موئیدین میں شفیقؔ اور عبدالجبار خاں ملکاپوری۔ اصل اختلاف قائمؔ اور میرؔ کے درمیان پایا جاتا ہے۔ قائمؔ کا بیان قیاسی اور صرف دیوان کے مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ اس لیے اُن کے بیان پر کیسے اعتماد کیا جا سکتا ہے؟ اول تو یہ کہ میرؔ صاحب نہایت محتاط تذکرہ نویس تھے۔ اُنہوں نے شک کو اپنے تذکرہ میں بہت کم جگہ دی ہے۔ دوسرے یہ کہ دکھنی شعرا کے بارے میں "بیاض عزلت" میرؔ صاحب کا واحد ماخذ تھا اور عزلت خود سورتی تھے۔ اگر ولی کا مولد گجرات ہوتا تو وہ کیسے خاموش رہتے۔ اگر میرؔ نے غلط بیانی کی ہوتی تو گردیزی کو موقع تھا کہ وہ اسے غلط محض بتاتا۔ کیونکہ اس نے بھی بیاض عزلت سے استفادہ کیا تھا۔ پس عزلت اور میرؔ سے زیادہ ثقہ روایت کس کی ہو سکتی ہے؟ ولیؔ خود کہتے ہیں ؎

دکھنی زبان میں شعر سب لوکاں کہتے ہیں اے ولیؔ ۔ لیکن نہیں بولے کوئی اک شعر خوش تر زیں نمط

علاوہ ازیں جس قطعہ کو سند میں پیش کیا جاتا ہے اُس میں بعض ایسے کھلے اشارے ہیں جن سے اس دعوے کی تکذیب ہوتی ہے ؎

ہجرت سے دوستاں کی ہوا جی مرا گداز　　عشرت کے پیرہن کو کیا تار تار دل

افسوس ہے تمام کہ آخر کو دوستاں　　اس میکدہ سوں اُٹھ کے چلا سُدھ بسار دل

دوستوں کی یاد اور اُن کی مفارقت کو بیان کرنا اور عزیز و اقربا کی طرف اشارہ تک نہ کرنا اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ ان کا وطن گجرات نہیں تھا۔ بلکہ "فراق گجرات" احباب کی یاد سے بیتاب دل کی صدا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ "قطعہ در فراق گجرات" درد بھرے احساسات کا اظہار ہے۔ لیکن یہ آتش بیانی دراصل نتیجہ ہے اپنے مرشد نورالدین صدیقی سہروردی کے دادا پیر حضرت شاہ وجیہہ الدین قدس سرہٗ اور سید ابوالمعالی سے تعلق خاطری کا۔ اسی قطعہ کے ایک شعر ؎

اس سیر کے نشہ سوں اول تر دماغ تھا　　آخر کو اس فراق میں کھینچا خمار دل

سے گجرات میں بطور سیر و سیاحت آنے کی تصدیق ہوتی ہے۔ وطن جائے قیام ہے نہ کہ سیر گاہ، نیز احسن مارہروی صاحب کا قیاس ہے کہ "شہر گجرات کے لئے یہ قطعہ کہا گیا ہے۔ جبکہ وہ سید ابوالمعالی کے ہمراہ صوبہ پنجاب میں سرہند وغیرہ تک گئے ہیں" ہماری رائے اس کے خلاف ہے، ولی نے سید ابوالمعالی کے ہمراہ دہلی کا پہلا سفر جوانی کے زمانہ میں کیا ؎

اول سُوں تھا ضعیف یہ پابستہ سوز میں　　جیوں بال ہے اگن کے اُپر بے قرار دل

اس شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو بڑھاپے کی بات تھی۔ ولی نے زمانہ شیب میں ایک دور دراز سفر حجاز مقدس کا کیا۔ یہ سفر نہ صرف خطرناک تھا بلکہ طویل بھی۔ ولی سے رہا نہ گیا، بے اختیار رو دیئے اور فراق گجرات میں مرثیہ پڑھا۔ لیکن حج کی برکت اور "فیض حق" سے اُنھیں یقین تھا کہ وہ گجرات واپس ہوں گے ؎

لیکن ہزار شکر ولی حق کے فیض سوں　　پھر اس کے دیکھنے کا ہے امیدوار دل

ولی گجرات حصول علم کی خاطر اُس زمانہ میں گئے، جبکہ وہ سن شعور کو پہنچ چکے تھے۔ حُسن گجرات اور اُس کی دلکشی کو دیکھ کر وہیں پڑے رہے۔ ابوالمعالی سے محبت ہوگئی۔ اور اُن ہی کے ہمراہ دہلی کا سفر کیا۔ واپسی پر گجرات آئے، اور پھر اپنے وطن اورنگ آباد لوٹ گئے۔ اور یہیں سے دہلی کا دوسرا سفر کیا۔ اس زمانہ میں اُن کے اشعار قدر و منزلت سے دیکھے جاتے تھے دہلی جانے سے پہلے ولی کا کلام دلی پہنچ چکا تھا ؎

سخن صاحب سخن کا سُن کے ملنے کی ہوس مت کر　　جواہر جب ہوئے حاصل تو پھر معدن سوں کیا مطلب

ولی نے دہلی کا سفر مادی ترغیبات کی خاطر نہیں کیا۔ بلکہ وہ سخن آشناسوں آشنا تھے ؎

گر سخن فہم تجھ کو پاؤں گا　　حال دل کا تجھے سُناؤں گا

کشش عشق

اور اپنے کمال کا پرچار اُن کا مقصدِ زندگی ہے

آیا تری طرف جو ولی[1] تو عجب نہیں آتے ہیں تجھ گلی منیں صاحب کمال چل

اس صاحب کمال کی دہلی میں جو قدر افزائی کیگئی وہ محض لطف سخن کی حد تک تھی۔ ولی کی وارفتہ مزاجی کا کام تو اس قدر تھا کہ

کیوں نہ ہووے عشق سوں آباد سب ہندوستاں؟

ہے سبزہ زارِ حُسن سراپا سوادِ ہند خوبان با نمک سوں بھرا ہے بلادِ ہند

عشاق باصفا کے ہے سینہ میں یادِ ہند ہیتم کی زلف بیچ دسا جمہ سوادِ ہند

اس راہ مار پیچ ہے اے دل سنبھال چل

غرض یہ کہ وہ دہلی میں خاموش نہیں رہے، جبتک رہے شعر و سخن کے چرچوں میں گھرے رہے۔ مگر وطن کی یاد نے انھیں بے چین کردیا۔ اور دہلی کے قدردانوں سے یہ کہتے ہوئے رخصت ہوگئے۔

یُو لمہ کی شمع سوں روشن ہے ہفت اقلیم کی مجلس ولی ... اری ملک دکن بہتر

اس ایقان کے ساتھ کہ

ہے شمع کی نمن تو ہر اک چمن منیں ... ہے بیشک دکن منیں

آزاد | فقیر اللہ نام ہے، لیکن بعض تذکرہ نویس محمد فاضل[2] کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ مولد و منشا حیدرآباد دکن۔ بچپن میں یتیم ہوگئے۔ شروع سے طبیعت لاابالی تھی۔ عاشق مزاج واقع ہوئے تھے۔ انکی یہ افتادِ طبیعت جوانی میں رنگ لائی فراقی سے بہت ربط ضبط تھا۔ دونوں ایک ساتھ دہلی گئے۔

اس زمانہ میں ولی کا طوطی بول رہا تھا، شاہجہاں آباد کی صحبتوں میں جہاں "شرابِ تازہ" (دکھنی کلام) کے رنگین جام لنڈھائے جارہے تھے، آزاد کا وجود شب و شینہ کی سرمستیوں میں اضافہ کا باعث ہوا۔ ولی کو ایک ہمدم ساقی ملا۔ اب تو ساقی گری کا ایک دور ہی قائم ہوگیا۔ غزل کے جواب میں غزل کہی گئی۔ محفلِ مشاعرہ میں طرحی غزلیں پڑھی گئیں، معاصرین کے مصرعوں پر گرہ، اور اشعار پر تضمین کیگئی۔ چنانچہ ولی نے آزاد کے مصرعہ پر ایک گرہ لگائی ہے۔

آزاد سے سنیا ہوں یہ مصرعہ منا سب جس نے لیا ہے ... آیا

یقین نہ کرنیکی کوئی وجہ نہیں کہ یہ گرہ شاہجہاں آباد میں ہی لگائی گئی۔ آزاد "بھاگ نگر" کے رہنے والے اور ولی

---

[1] تیری طرف" سے مراد دہلی ہے جسکا اُنھوں نے ایک مخمس میں ذکر کیا ہے۔ اسی مخمس کے ایک بند کو ہم نے اس مضمون میں درج بھی کیا ہے۔
[2] گردیزی، شفیق، اور کریم الدین یا فیلن۔

"خجستہ بنیاد" کو بیس برس کی عمر میں چھوڑ، احمد آباد میں بس گئے تھے۔ اور وہیں سے دہلی کی راہ لی۔ گئے آئے، اور پھر گئے، آزاد سے وہیں ملاقات ہوئی ہوگی، معاصرانہ چشمک[۵۱] سے بھی اسکی تائید ہوتی ہے۔

تمام تذکرے آزاد کو ولی کا ہمعصر بتلاتے ہیں۔ لیکن شفیق شاگرد سمجھتا ہے اور لکھتا ہے کہ آزاد "خود را ایکے از شاگردان او می پنداشت" غالباً یہ رائے ولی کے اس شعر کی بنا پر قائم کی گئی ہے۔ جس میں آزاد کے "مصرعہ مناسب" کا ذکر ہے۔ حالانکہ اس سے آزاد کا ہمعصر، اور ہم پلہ شاعر ہونا ثابت ہوتا ہے۔ کریم الدین یا فیلن نے انکی ایک مثنوی کا ذکر کیا ہے کہ

"ایک کتاب بنام ظفر نامہ تصنیف کی ہے جس میں بیان کیا ہے اون فتوحات کا جو کہ محمد حنیف ابن حنفیہ نے کئے۔"[۵۲]

اس بیان کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔ نمونہ کلام بھی درج نہیں دیا۔ ظفر نامہ جس کا موضوع "محمد حنیف کی جنگوں کے حالات" ہے غلام علی خاں لطیف کی بھی تصنیف ہے جو عبداللہ قطب شاہ کے زمانہ کا قرلباش امیر تھا۔ یہی موضوع پر ایک اور مثنوی "جنگ نامہ" ملتی ہے۔ اس کا مصنف سیوک ہے۔ یہ بھی اسی عہد میں پیدا ہوا ہے۔ افسوس! آزاد کا یہ ظفر نامہ ابتک دستیاب نہیں ہوا۔

ان کی وہ مشہور غزل تک دستیاب نہیں ہوئی، جس کے ایک مصرعہ پر ولی نے گرہ لگائی ہے۔ قدیم تذکروں میں "مصرعہ مناسب" والا شعر ملتا ہے۔ جدید تحقیقات نے بھی اسوقت تک آزاد کا کلام پیش نہیں کیا۔ چنانچہ "دکن میں اردو" "اردو شہ پارے" اور "یورپ میں دکھنی مخطوطات" اس بارے میں بالکل خاموش ہیں۔ آزاد کی نسبت میر جیسے نقاد سخن نے یہ رائے لکھی ہے "بسیار بصفا حرف می زد" میر حسن بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔ آزاد کا شعر یہ ہے۔

سب صنعتیں جہاں کی آزاد، ہم کو آئیں پر جس سے یار ملتا ایسا ہنر نہ آیا!

فراقی | فراقی کے متعلق شمال و دکن کے تذکرے خاموش ہیں۔ تعجب ہے کہ میر نے آزاد کا ذکر روا رکھا اور نہ یاد کیا تو فراقی کو! حالانکہ اس کے تین چار سال بعد ۱۱۶۸ھ میں قائم اپنے تذکرہ میں آزاد کے ساتھ فراقی کے ذکر کو ضروری سمجھتے ہیں وہ لکھتے ہیں۔

"ہر دو باتفاق برائے دیدن شہ ... [illegible] دار الخلافت آمدند چوں نسبت کاوش بنا بر کثرت صحبت خاطر نشین اینہا گردید تتبع او گشت ... [illegible]"

قائم کے بعد قاسم اور میر حسن نے فراقی کا تذکرہ کیا ہے ... [illegible] فراقی کے اشعار پر بحث بھی کی ہے۔ میر حسن[۵۳] کا بیان ہے کہ "فراقی تخلص از مردم دکھن بود ہمراہ فقیر اللہ آزاد بہ ہند آمدہ بود" اس زمانہ میں محمد یار خاں دہلی کے صوبہ دار تھے۔ شاہجہاں آباد ولی اور آزاد کی دکھنی نغمہ سنجیوں سے گونج رہا تھا۔

فراقی شاعر ہے لیکن ولی کی ٹکر کا نہیں۔ فراقی نے گو اس کا بدیہی ثبوت نہیں ملتا، کوس لمن الملکی بجایا ہوگا تب ہی تو

---

[۵۱] دیکھو ثبوت میں فراقی کا ذکر۔ [۵۲] ... [illegible] ہند ... [illegible] بلوم ہارٹ

ولی کھرا کھرا جواب سناتے ہیں:۔

ترے اشعار ایسے ہیں فراقی ۔۔۔ کہ جس پر رشک آویگا ولی کوں

باوجود اس تحسین کے ولی نے اظہار یگانگت و اعتراف سخن کی بنا پر فراقی کے ایک مصرعہ پر گرہ لگائی ہے کہتا ہے:۔

ولی مصرع فراقی کا پڑہوں تب جبکہ وہ ظالم ۔۔۔ کمر سوں کھینچتا خنجر، چڑھاتا آستیں آوے

فراقی کا شعر یہ ہے:۔

فراقی کشتہ ہوں اس آن کا جس دم کہ وہ ظالم ۔۔۔ کمر سوں کھینچتا خنجر، چڑھاتا آستیں آوے

"مجموعۂ نغز" میں ایک اور غزل کا مقطع بھی درج ہے جسے قاسم نے کسی قدیم بیاض سے نقل کیا ہے:۔

ہمارے دل کو جس دم تم لے چلے پیارے ۔۔۔ سو منہ تکتے رہ گئے یہ ہمدم سبھی بچارے

فراقی خوش قسمت ہے کہ اس کی دو غزلیں جو گمنامی میں غرق ہونے سے محفوظ رہیں جو ہاشمی صاحب کی تلاش سے ان کی تصنیفات میں طبع ہوگئی ہیں۔ ایک غزل وہ ہے جو محمد تقی ولد ابوالمعالی کے مملوکہ اور مکتوبہ دیوان ولی سے نقل کی گئی ہے جسے ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:۔

باغ ہے سب نظارا ہے ۔۔۔ سبزہ ہے لالہ ہے ہزارا ہے

کان میں یار کے دُر بالی ۔۔۔ مہر ہے ماہ ہے ستارا ہے

نگہ شوخ، قاتل خونخوار ۔۔۔ سیف ہے بانک ہے دو دھارا ہے

آ تو آغوش میں حجاب نکار ۔۔۔ گوشہ ہے رات ہے اندھارا ہے

ملک دل کے خراب کرنے کوں ۔۔۔ شاہ ہے فوج ہے نقارا ہے

مجکوں ہر دم فراق میں لذت[1] ۔۔۔ آہ ہے نالہ ہے پکارا ہے

مضمون کی شوخی اور بیان کی صفائی اس غزل کے جوہر ہیں۔

فراقی کے منتشر کلام کو جو اب تک دستیاب ہو سکا یکجا کرنے کے خیال سے ایک اور غزل درج ذیل کیجاتی ہے۔ اس سے شاعر کے کلام، انداز بیان، اور رجحانات کے ارتقاء کا اندازہ ہوتا ہے:۔

مدینے میں اگر پیدا ہوا ہوتا تو کیا ہوتا! ۔۔۔ محمد کی گلی بستر فنا ہوتا تو کیا ہوتا!

جبت خوباں کی گلیوں میں عمر توں صرف کے دل ۔۔۔ مدینے کی زیارت کوں گیا ہوتا تو کیا ہوتا!

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات بحوالہ دیوان دکنی نمبر ۱۰۱۵ آکسفورڈ لائبریری۔

اے مجنوں ہوا بدنام توں لیلیٰ کو دل دیکر ٭ اگر میرے نبیؐ کو دل دیا ہوتا تو کیا ہوتا!
ازل کی دین پایا ب اگر مفلس بھکاری ہوں ٭ نبیؐ کے آستانے کا گدا ہوتا تو کیا ہوتا!
منجہ اس مکتب مجازی میں جو عشق استاد ہوتا ٭ تو میرے دل کی کثرت کا سبق برباد نا ہوتا
نظر ہے علم منطق ہور معانی میں فراقیؔ کوں ٭ اگر علم حدیث مصطفےٰ ہوتا تو کیا ہوتا![۵۱]

بیچارہ | گولکنڈہ کے باشندے تھے۔ ہاشمی صاحب کے بیان کے بموجب دہلی بھی گئے تھے۔ ان کا ایک شعر میر اور میر حسن کے تذکروں میں مندرج ہے۔[۵۲]

پی سے جدا ہونا نہ تھا چاہا خدا یوں تھا ٭ جز صبر اب چارہ نہیں بیچارہ ہور سہنا پڑا

اشرف | سید اشرف نام اور اشرف تخلص سنت الجماعت اور اہل بیت کرام سے خاص عقیدت رکھتے تھے۔ یہ عالمگیر کے زمانہ کے شاعر تھے۔ اندرونی شہادت کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ وہ مقبول شاعر اور استاد فن تھے۔ ولیؔ کے ہمعصر شعراء میں شمار کئے جاتے ہیں اس زمانہ میں ولیؔ دہلی میں موجود تھے جہاں انھوں نے اشرف کے مصرعہ پر آزاد اور فراقی کی طرح گرہ لگائی ہے[۵۳]

اشرف کا یو مصرع ولیؔ مجکوں ہے دلچسپ ٭ "الفت ہے دل و جاں کوں میرے یم نگر سوں"

اس کی تصدیق کہ اشرف دہلی گئے تھے ان ہی کے بیان سے ہوتی ہے جس کی طرف "جنگ نامہ حیدر" میں اشارہ کیا ہے مضمون کی افادیت میں اضافہ ہو جاتا، اگر ہاشمی صاحب ان اشعار کو بجنسہ نقل کر لیتے جن کے مطالعہ کے بعد انھوں نے یہ رائے قائم کی ہے:-

ڈاکٹر زور صاحب کا بیان ہے کہ اس نے اپنی مثنوی میں ہمعصر بادشاہوں، بہادر شاہ، جہاندار شاہ اور فرخ سیر کا ذکر کیا ہے۔ جنگ نامہ حیدر ۱۱۲۵ھ کی تصنیف ہے۔

کیا شعر غریب کری طور میں ٭ سو فرخ سیر کے کیا دور میں[۵۴]

"جنگ نامہ حیدر" آٹھ سو تر سٹھ ابیات پر مشتمل ہے۔ یہ کوئی فارسی جنگ نامہ کا منظوم دکھنی ترجمہ ہے۔ نمونہ درج ذیل کیا جاتا ہے

مدینے تے مغرب طرف یک شہر ٭ کیتے دور ہی بہوت اس کا سفر
برس ایک پر چھ مہینے کی راہ ٭ اتھا روم کے ملک میں بادشاہ
بڑے شہر کتے کہستان میں ٭ نہ ایسا کنیں ملک اسمان میں
عجب نام اس کا حصار کتے ٭ او کافر ملک ہر نگار اس کتے
کہے نام اس بادشاہ کا فضل ٭ اتھی ایک دختر اُسے خوش شکل

---

۵۱ بحوالہ دکن میں اردو ۵۲ نکات الشعراء

اتھا نام اس کا سجل دختری | او شیر خدا کی اتھی استری
عجب خوبصورت تھی وہ خوش نگار | جو قربان تھے اس پو پریاں ہزار[1]

اڈنبرا کی بیاض میں اشرف کے تیرہ مرثیے شامل ہیں جن میں (۱۴۰) اشعار ہیں۔ اشرف کے مرثیوں کا اسلوب بیان نہایت اثر آفریں اور درد انگیز ہے چنانچہ

بانو کہیں اصغر نہیں اب میں جھلاوں کس کے تئیں | سونا ہوا ہے پالنا اب میں سولاوں کس کے تئیں
نہلا کے میں کپڑے پہنا اس کو بناتی گل بدن | وہ پھول کھاں بر میں اب میں تباوں کس کے تئیں
سوتا تھا وہ جب نیند بھر پیتے دودھ کوں | بیدم ہے دیکھو آج وہ اب میں جگاوں کس لے نیں
جب مسکراتا وہ بچا میں شادی ہوتی دل سے | بے جاں پڑا ہے گود میں اب میں ہنساوں کس کے تئیں
جب شہ کو انگلیں دکھتی لیجا کے دیتی گود میں | سو یا کفن وہ اوڑھ کر اب میں لیجاوں کس کے تئیں
جاتے تھے شہ جب رن منے اصغر کو میں بہاتی لگا | دکھ میں بہولاتی اس کہلا اب میں کھلاوں کس کے تئیں[2]

اصغر معصوم کی شہادت جس پر آنسو بہائے گئے ہیں وہ ایک نہ بھولنے والی واردات ہے!

اشرف نے مرثیہ کے صرف ایک پہلو "اصغر کی زندگی" پر آنسو بہا کر اور دوسرے پہلو "ظالموں کی شقاوت" کو پس پردہ رکھ کر اثر و کیف کا ایک درد انگیز عالم بپا کر دیا ... حضرت علی پر جو مرثیہ لکھا گیا نہایت ہی لاجواب ہے[3] ہمیں گو اس کا علم نہیں لیکن اشرف کے ہم آہنگ ہو کر ماننا پڑتا ہے

کیا ہوں بے بدل یوم تیہ جب ہوں ماموں کا | ہو اشتاق ہے یہ شاہ ملک دکھن میرا

اور یہ قبولیت در اصل نتیجہ ہے اس کی اہل بیت کرامؓ سے بے انتہا وفاداری کا!

ہوس گلگشت رضواں کی کرے کیوں عندلیب دل | محبت کی گلی میں شاہ دیں کے ہے وطن میرا

قدیم تذکروں میں اشرف نامی شاعر کے یہ دو شعر ملتے ہیں ممکن ہے کہ یہ اشرف دکھنی ہی ہو!

پیا بن عشق تیرے تئیں یہ آگ بجھایا ہے جو ہونی ہو سو ہو جاوے | بھبوت اب جوگیا کا رنگ لایا ہے جو ہونی ہو سو ہو جاوے

توں شاہ ہے سب خوبوں کا بندے ہیں تیرے سب شاہ | میں بھی اپس کو بندہ تیرا نہ کہوں تو کیا کہوں؟

کچھ دن ہوئے کہ رسالۂ اردو میں شیخ چاند صاحب مرحوم نے اشرف پر ایک مضمون شائع کیا تھا۔ اس میں اشرف کی سات غزلیں

[1] اردو شہ پارے۔

جو اشرف تک [illegible] نسخے تالیفی میں درج ہوئی ہیں۔

شیخ چاند صاحب مرحوم نے ان کے کلام پر جو رائے قائم کی تھی وہ یہ ہے کہ "اشرف کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ریختہ گو شاعر تھا۔ کلام کا عام رنگ بھی وہی ہے جو ولی کے کلام کا ہے۔ اپنے زمانہ میں اس کو اچھی خاصی شہرت حاصل تھی۔"

خواجہ خان حمید نے لکھا ہے "طبع رنگینے داشت شعرش در نواح گجرات شہرت دارد و دیوان لطیف تصنیف نمودہ"[1]

ذیل میں دو غزلوں کے منتخب اشعار درج کئے جاتے ہیں ؎

جب سجن مکھ اوپر نقاب کیا — چشم عاشق کو جوں سحاب کیا
جو پیا ہے پیا کے لب کی شراب — نقل خاطر جگر کباب کیا
تجھ جدائی میں چشم اشرف سوں — جوش دریائے خون آب کیا

اے ہوش ربا سندر مجھ پاس ٹک آتے جا — رشتے کوں محبت کے بازو پہ بندھاتے جا
یوں دل منے ہے خواہش تجھ گھر کی طرف آؤں — ٹک ناؤں بتاتے جا یا ٹھاؤں بتاتے جا
لاگی ہے نظر جن کی اے رشک پری تجھ کوں — دو ہیم کے انکھیر سوں ان پاس چھڑاتے جا
اے کان ادا سندر! اشرف ہے ترا طالب — ٹک پیار ستی اس کوں چھاتی سوں لگاتے جا

طالب | مرزا ابو طالب کا تخلص طالب تھا۔ میر حسن کا بیان ہے کہ وہ گولکنڈہ کے باشندے تھے۔ لیکن قائم جو ان سے ذاتی طور پر واقف تھا کہتا ہے کہ قصبہ بلندہ (؟) نواح اورنگ آباد کے متوطن تھے۔ ۱۱۱۹ھ میں بہادر شاہ اول نے اپنے چھوٹے بھائی کام بخش کی جو دکن کا صوبہ دار تھا۔ سرکوبی کیلئے حیدر آباد پر چڑھائی کی۔ اور ۱۱۲۰ھ میں کامیاب مراجعت عمل میں آئی۔ مرزا رفیع سودا کے چچا سے جو اس لشکر کے ایک سپاہی تھے۔ طالب کی دوستی ہوگئی وہ ان کے ساتھ ستر سال کی عمر میں اپنی جاگیر کے معاملہ کو طے کرنے کے لئے دہلی گئے جبتک رہنا ہوا ان ہی کے مکان پر فروکش رہے۔

سخن گو سے زیادہ "سخن شناس" ہونیکی بنا پر ان کے تذکرے کو اس صحبت میں نہیں بھلایا جا سکتا۔ دکھنی شعراء کے جو نام شمالی ہند کے تذکروں میں پائے جاتے ہیں۔ ایسے ہی بزرگوں کے شعر دوستی کا نتیجہ ہیں۔ عزلت کی بیاض سے میر اور گردیزی نے استفادہ کیا تو قائم نے بیاضِ طالب سے!

---

[1] گلشن گفتار مرتبہ سید محمد صاحب ایم۔ اے۔ عثمانیہ۔

اسی عرصہ میں ۱۱۲۹ھ سے ۱۱۶۹ھ تک ایک ضخیم دیوان مرتب کیا جو ولی کے کلام کے باقاعدہ تتبع کا نتیجہ تھا۔ وہ خود "دیوان زادہ" کے دیباچہ میں ولی کی استادی کا اعتراف کرتا ہے چنانچہ "حاتم در ریختہ ولی را استاد می داند" اس میں اتنی عبارت بہم پہنچائی کہ کہنا پڑا "زبانش بازبان ولی دکنی مناسبت دارد"[1] حاتم، آبرو، مضمون اور ولی کے کلام کا تقابلی مطالعہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ ان دہلوی شاعروں نے اپنے استاد کے طرز کی کہاں تک تقلید کی۔ حاتم نے اپنے اس مختصر سے انتخاب "دیوان زادہ" میں تیرہ غزلوں پر صراحت کر دی ہے کہ یہ ولی کی طرز اور تقلید میں لکھی گئی ہیں[2]۔ غرضکہ ولی کا کلام درجہ استناد حاصل کر چکا تھا۔ اس طرز کے مخالفین کو آبرو نے کہا تھا کہ "بوجھو حرف یہ از رف ہے"۔ ورنہ اس کے ریختہ میں حرف ہے جو اس سے روگرداں ہوگا۔ یہ تھا وہ ماحول جس میں ولی کے کلام نے قبولیت پائی!

اس دور کا نصف آخر نادر گردی کے بعد ۱۱۵۱ھ سے شروع ہوتا اور کم و بیش ۱۱۸۰ھ پر ختم ہوتا ہے۔ نادر شاہ نے شاہجہاں آباد کو قزلباشوں سے لٹوا کر اور نہتے بے بس شہریوں کو قتل و غارت کر کے سلطنت کی تباہی کا سامان بہم پہنچایا۔ اس رستخیز نے اہل دہلی پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ پھر وہ پنپ نہ سکے۔ اردو شاعری میں اس کے اثرات نمایاں ہیں اور خصوصاً میر کی قنوطیت کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے۔

دو دکھنی نوجوان شاعروں نے نادر گردی کو بچشم خود دیکھا۔ درد مند اور درگاہ۔ دونوں کے عنفوان شباب کا زمانہ تھا۔ درد مند کو دہلی میں رہتے ہوئے پندرہ برس ہو چکے تھے اس وقت ان کی عمر بیس برس کی تھی۔ شاہ ولی اللہ اشتیاق اور مظہر جان جاناں انھیں چاہتے تھے۔ نواب درگاہ قلی خان حضرت آصف جاہ بہادر کے ہمراہ ۱۱۵۱ھ میں دہلی گئے۔ جہاں چار سال تک رہنا ہوا۔ اس عرصہ میں وہ شاہجہاں آباد کی رنگین بزموں اور بے تکلف صحبتوں میں شریک رہے اور شاعروں اور مشاعروں میں داد سخن دی۔ ان اثرات و کیفیات کی ایک یادداشت خان دوراں درگاہ نے مرتب کی جو حال ہی میں "مرقع دہلی" کے نام سے شائع ہو گئی ہے۔ اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دہلی میں ریختہ گوئی کا باقاعدہ آغاز ہو چکا تھا۔

مرثیہ گوئی دہلی میں عروج پر تھی۔ یہ ترقی و گیرائی درحقیقت دکھنی مرثیوں کا نتیجہ تھی۔ جسے عالمگیر کے بعد دہلی میں شاہی سرپرستی حاصل ہوئی۔ شاہ قلی خان شاہی کے مرثیوں کو شمال میں ۱۱۲۰ھ کے بعد سے فروغ نصیب ہوا۔ یہ ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے اور مجلسوں میں پڑھے جاتے تھے۔ قادر، روحی، اور مرزا کے مرثیوں سے بھی دہلی والے ناآشنا نہ رہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ نکات الشعرا سے اس صنف کلام پر روشنی نہیں پڑتی۔ گردیزی نے ایک دو مرثیہ گویوں اور قائم (۱۱۶۸ھ) نے پانچ چھ مرثیہ گویوں کا ذکر کیا ہے اس سے مرثیوں کی قبولیت پر کسی قدر روشنی پڑتی ہے۔

---

[1] ایک نامعلوم الاسم قلمی تذکرہ بحوالہ شعرالہند [2] تاریخ لسانیات

دکھنی مرثیوں کی اس قبولیت نے دہلی والوں کو اس طرف متوجہ کیا۔ ندیم، حزیں، مسکین، غمگین اور عاشق نے اس طرف توجہ کی چنانچہ "مسکین، حزین، و غمگین ہر سہ برادر اند و در زبان ریختہ مرثیہ گفتن عیارے تمام دارند، در ہمہ شہر کلام اینہا شہرت دارد و در واقع ہر کس بسیار خوب مرثیہ میگویند و الفاظ الم آور بمضامین حسرت انگیز ایجاد می کنند"[۱۵] اس میں ان لوگوں نے اس قدر کمال حاصل کیا تھا کہ درگاہ نے ندیم کے ذکر میں صراحت کی ہے کہ "مضامینے در ریختہ می آرد کہ فارسیان مضامین فارسی زمین می شوند"[۱۶] اور طرفہ یہ کہ حزین و ندیم کے مرثیوں کو پڑھنے کے لئے میر عبداللہ جیسا مرثیہ خوان نصیب ہوا کہ "استادان موسیقی متفق اللفظ اند کہ بایں خوبی مرثیہ خوانی بعالم ایجاد نگذاشتہ و بایں مواد تشید و بایں سامان آہنگ سرے از کارخانہ تکوین بیرون نکشید"[۱۷] دکھنی مرثیہ گوئی کا زبان و بیان سے سودا کے زمانہ تک تتبع کیا گیا۔ چنانچہ سودا کے مراثی کی زبان "دکھنی آمیز" رہی۔

نادر گردی کے بعد سے اردو شاعری کو بھی فروغ ہوا۔ فارسی کو شاعروں نے اس طرف خاص توجہ کی بقول صاحب نکات الشعراء سراج الدین علیخاں آرزو نے "برائے تفنن طبع دو سہ شعر ریختہ فرمودہ"[۱۸] اور شاہ ولی اللہ اشتیاق "گاہے فکر ریختہ میکرد۔" قزلباش خان امید نے اس پر فخر کیا کہ "من ہم دریں ایام دو شعر ریختہ موزوں کردہ ام"[۱۹] مرزا گرامی جو با وصف مولویت "فارسی شعر کہتے اور اپنے اس کمال کو مشاعرہ میں جتلاتے پھرتے وہ بھی" چوں دید کہ ہنگامہ ریختہ گرم شدہ خود ہم نیز شعر ریختہ گفت"[۲۰]

الغرض اس زمانہ میں دہلی میں شعر و سخن کی گرم بازاری تھی۔ اعلیٰ سے لیکر ادنیٰ، امیر سے لیکر غریب، اور بادشاہ سے لیکر ایک پیشہ ور۔ حجام کو بھی دعوے سخن دانی تھا۔ ہندوؤں نے بھی اسکی سرپرستی کو فخر جانا اور قزلباشوں نے بھی اسے منہ لگایا!

اس زمانہ میں دہلی میں میر، سودا، قائم، درد، اثر، تاباں، سجاد، بقا، سوز، یقین، داد سخنوری دیتے تھے۔

عزلت بھی (سنہ ۱۱۶۱ھ) اس بزم میں شریک ہو گئے یہ دور اخذ و ترک کی بنا پر خاص اہمیت رکھتا ہے۔ میر صاحب کو عزلت کے کمال کا اعتراف کرنا پڑا۔ عزلت کا تعلق گجرات سے تھا لیکن انھیں دکھنی شعراء کی نمایندگی کا فخر حاصل تھا۔ میر صاحب نے بھی انہیں دکھنی شعرائی ذیل میں شمار کیا ہے۔ جب گجرات فتح ہو کر سلطنت مغلیہ میں شامل ہوا تو گجرات کے ارباب علم و شعراء گولکنڈہ اور بیجاپور کی طرف متوجہ ہوئے جسکی وجہ سے گوجری اور دکنی کو ملاپ کا موقع ملا۔ دکنی کی وجہ سے دکنی کو گجرات میں جو فروغ نصیب ہوا وہ کسی مزید توضیح کا محتاج نہیں۔ یہاں میں اردو کے قابل مولف کا بیان ہے کہ "محمد امین نے اپنی مثنوی یوسف زلیخا بعہد عالمگیر سنہ ۱۱۰۹ھ میں نظم کی ہے۔ باوجودیکہ وہ صاف دکنی اردو میں ہے تاہم وہ اس کو گوجری کے نام سے یاد کرتا ہے ع لکھی گوجری میں نے یوسف زلیخا" اس لحاظ سے دکنی اور گوجری سنہ ۱۱۰۹ھ تک بھی دو جداگانہ زبانیں نہیں ہی تھیں۔ ان کی شاعری کا اسلوب بیان بھی اس بات کا شاہد ہے! اور پھر عزلت کی زندگی کا آخری زمانہ دکن ہی

۱۵۔ مرقع دہلی ص ۱۳۶ ... مقالات

میں گئے۔ اور وہیں پیوند خاک ہوئے۔ ان کی اور انکی شاعری کی قدر و منزلت دکن ہی میں ہوئی۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ ہم انہیں دکنی شعرا کے نمائندوں میں شمار نہ کریں؟

نادر گردی کے بعد دہلی کی مرکزیت رفتہ رفتہ ختم ہوگئی۔ طوائف الملوکی کا دور دورہ شروع ہوا اور ایک دربار کی بجائے کئی دربار قائم ہوگئے اور یہی سرپرستوں نے بے سہارا شاعروں کو دامان عاطفت میں لیا۔ فرخ آباد، رامپور، لکھنو، مرشدآباد، عظیم آباد، شاعری کے مرکز قرار پائے۔ "دریں ایام کہ رشتہ سلک انتظام مردم بادشاہی بصدمۂ انقلاب سلطنت از ہم گسیخت و ہر یکے چوں لآلی ابمار برخاک مذلت افتادہ رو بہر سو نہاد۔" فغان (۱۱۶۴ھ سے پہلے) نے "بپاس آبروئے خویش" اور غریب (۱۱۶۴ھ سے پہلے) نے "بسبب پریشانی روزگار" بنگال کی راہ لی۔ دکھنی شعراء عزلت اور درد مند بھی عظیم آباد اور مرشد آباد چلے گئے۔ عبدالوہاب بیکل نے بھی خجستہ بنیاد سے مرشدآباد کی راہ لی۔ چندے قیام کیا۔ پھر عزلت اور وہ دکن آگئے۔ درد مند نے وہیں گذران کی اور وہیں انتقال کیا۔ ۵

(درد مند)   ہزار حیف کہ دہلی سا شہر ویراں کر   کیا ہے یاروں نے آباد ملک پورب کو

اکثر شاعروں نے دکھن کا رخ کیا جہاں پہلے سے شعر و سخن کی گرم بازاری تھی۔ قطب شاہیوں کی تباہی کے بعد حیدرآباد میں شعر و سخن کی رفتار گو دھیمی ہوگئی لیکن اس کا خاتمہ نہیں ہوا اور چند سال تک اورنگ آباد اور برہانپور شاعری کے مرکز بنے رہے۔ اور عاجز جب دہلی سے نکلے تو برہانپور ہی میں ٹھہرے۔ سلطنت آصفیہ کے قیام (۱۱۳۶ھ) کے بعد سے حیدرآباد میں شعر و سخن کی پھر وہی گرم بازاری شروع ہوگئی اور فرخندہ بنیاد شمالی شعراء کا ماویٰ و ملجا قرار پایا۔

دردمند | محمد فقیہ تخلص بہ دردمند۔ اودگیر ضلع بیدر کے نجباء سے تھے۔ ان کی پیدائش ۱۱۳۶ھ میں اودگیر میں ہوئی۔ پانچ سال کی عمر میں (۱۱۴۱ھ) اپنے والد کے ساتھ دہلی گئے۔ شاہ ولی اللہ اشتیاق سرہندی ان پر بہت نظر عنایت رکھتے تھے۔ بعد میں وہ مرزا مظہر جان جاناں کے ظل عاطفت میں چلے گئے۔ ان دونوں بزرگوں کی صحبت کے اثرات دردمند پر مترتب ہوئے۔ شاہ اشتیاق کے فیض صحبت سے دردمند فارسی میں شعر کہنے لگے اور مظہر جان جاناں کی تحریک سے ریختہ گوئی شروع کی۔ چنانچہ دردمند نے "ساقی نامہ" میں مظہر کی محبت اور مہربانی کو اصل وجہ تحریک گردانا ہے ۵

کہاں تھا مجھے ریختہ کا خیال   ہوا واجب ایک امر امتثال
محبت نے مجکوں کیا لاجواب   وگرنہ میں اور ریختہ کیا حساب

اگر آزاد بلگرامی کے اس بیان کو صحیح مان لیا جائے کہ وہ ۱۱۶۶ھ میں بنگالے گئے تو اس حساب سے ان کا قیام دلی میں بیس سال تک رہا۔

---

۵ مخزن نکات۔

جب تک کہ مرزا مظہر کے حلقۂ ارادت سے قدم باہر نہ نکالا۔ مرزا بھی انھیں بہت چاہتے تھے۔ چنانچہ ان کا ایک مشہور شعر دردمند کے بارے میں آزاد نے سروِ آزاد میں لکھا ہے ؎

مظہر مباش غافل از حالِ دردمند   لعلیست ایں کہ در کرۂ روزگار نیست

دہلی کے درباروں میں ان کی خاطر خواہ آؤ بھگت ہوتی تھی۔ اکثر امیروں مثلاً نواب عمدۃ الملک امیر خان انجام اور نواب محمد علی خان احسن کی اپنی مثنوی میں تعریف و توصیف کی ہے، سے دوستانہ تعلقات تھے۔ نادر گردی (۱۱۵۱ھ) کے بعد ۱۱۶۶ھ میں بنگال گئے اور چند مدت عظیم آباد میں بود و باش کی اور رفاقت میں نواب غلام حسین خاں اور نواب اعظم خاں کے بیٹے کی گذران معاش کی۔ بعد اس کے پھر دلی لوٹ آئے اور چند مدت وہاں رہے پھر نوازش محمد خاں شہامت جنگ کے بھتیجے نواب وردی خاں مہابت جنگ کے بلائے ہوئے شاہ جہان آباد سے مرشد آباد میں آئے اور بطور بود و باش کا وہیں ٹھہر گئے۔ رفاقت میں نواب مذکور کی البتہ ایک فارغ حال ہوا۔ آخر ۱۱۷۶ھ میں بلدہ مرشد آباد کے اندر انتقال ہوا۔[۱]

دردمند خوش اختلاط، یار باش انسان تھے۔ علی ابراہیم خاں اور راجہ حسین خاں سے دوستانہ روابط تھے۔ آزاد بلگرامی سے غائبانہ خلوص تھا۔ چنانچہ "فی مابین فقیر و مشار الیہ غائبانہ اخلاص ہاست۔ ہمیشہ طریق مراسلت مسلوک"۔ ان کے کلام کے متعلق آزاد بلگرامی کی رائے ہے کہ "شعر فارسی و ریختہ ہر دو خوب میگوید"۔ اس زمانہ کے اساتذہ نے ان کے فارسی کلام پر بہت عمدہ رائیں دی ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کا فارسی کلام مقبول اور مشہور تھا۔[۲]

دردمند ریختہ کی طرف کم مائل تھے۔ قدیم تذکروں میں چند متفرق اشعار اور ایک دو رباعیاں ملتی ہیں ؎

بے غم سے رقیبوں کے مرا دل ہے شاد   ان [illegible] نے بنائے ہیں جی عیش بباد
پرویز کے شیشہ خانۂ عشرت پر   ناگاہ [illegible] آیا فرہاد

قفس تک بھی نہ پہنچے اور پڑے دور آشیانے سے   عجب ساعت میں چھوٹے تھے ہم اُس آستانے سے

الٰہی مت کسی کو پیش یہ غم وا انتظار آوے   ہمارا دیکھئے کیا حال ہو جب تک بہار آوے

دردمند کا "ساقی نامہ" اردو زبان کی تاریخ میں نہایت اہمیت رکھتا ہے۔ اس لحاظ سے کہ یہ پہلا ساقی نامہ ہے اور اس نے

[۱] گلشن ہند [۲] شیخ چاند مرحوم ایم اے ایل ایل بی عثمانیہ

بحث اور تنقید کے لئے ایک میدان فراہم کر دیا۔ چنانچہ عزلت نے ۱۱۲۱ھ میں "بیان ظہور" کے نام سے ایک ساقی نامہ قیام دکن کے زمانہ میں قدر مند نے جواب میں نظم کیا۔ فتوت نے اس سلسلے میں ایک مثنوی لکھی ہے[1]۔ "ساقی نامہ" کی شہرت کا اندازہ عزلت اور فتوت کے تتبع کے علاوہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ تمام تذکرے متفق اللفظ ہو کر اس کی داد دیتے ہیں۔ آزاد بلگرامی :۔ "ساقی نامہ ریختۂ او شہور است کہ مقبول طبائع گردیدہ"۔ شفیق :۔ "ساقی نامہ ریختۂ او شہور آفاق است"۔ قاسم :۔ "ایں ساقی نامہ خیلے مشہور و برزبان خلق جاری است"۔ ساقی نامہ کے ابیات تقریباً ایک سو نوے ہیں۔

اسیر قفس کے خیالات نمونتاً پیش کئے جاتے ہیں ؎

کہ ایام اسیری کے کیا خوب تھے — خصوصاً مجھے سخت مرغوب تھے
پھنسے تھے سبھی ہم نفس ایک بار — ہمیں داغ لگتا تھا باغ و بہار
عجب تھا مزا درد و اندوہ کا — عجب جشن تھا مرگِ انبوہ کا
توجہ تھی ہم ساتھ صیاد کو — پہونچتا تھا ہر وقت فریاد کو
موافق تھی دام و قفس کی ہوا — سب آپس میں کرتے تھے جی کو فدا
نہ تھے آشنا داد و بیداد کے — کہ تھے سب اسیر ایک صیاد کے
پڑا اب کے سال اس طرح اتفاق — کہ جاتے رہے سب وہ اہل وفاق
چمن کی ہوا مجھ پہ اب تنگ ہے — مری زندگی موت کا رنگ ہے
نہ لگتا ہے جی صحبت غیر میں — نہ کھلتا ہے دل باغ کی سیر میں
نہ کچھ ذوق ہے آب و دانہ ستی — بھڑکتا ہے جی آشیانہ ستی
مجھے گل کی صورت لگے ہے زبوں — چمن ہے نظر میں مری حوض خوں
اکیلے کو کب خوب لگتا ہے باغ — بلا ہے رفیقوں کی دوری کا داغ[2]

سیر شب ماہتاب اور اس کے اثرات ملاحظہ ہوں :۔ ؎

پڑا آج ہے رات یوں اتفاق — کہ سب ہو گئے جمع اہل وفاق
کہ شبخون کر لشکر خواب پر — سبھی جا کے بیٹھے لب آب پر
مرا جی گیا ڈوب مہتاب دیکھ — جیسے مرگی والے کا جی آب دیکھ

---

[1] تفصیل کیلئے دیکھو رسالۂ اردو جولائی ۱۹۳۴ء [2] "ساقی نامہ" رسالۂ اردو جولائی ۱۹۳۴ء میں شائع ہو گیا ہے یہ اشعار اسی سے ماخوذ ہیں۔

عداوت کی کب چاہئے تھی بنا — ولیکن ہوا مجکو معلوم یہ بھید
کہ واقع ہوئے ہم سے از بس گناہ — کئے نامے کی طرح چہرے سیاہ
ہوئے سب طرح مستحق عتاب — تو لازم ہوا اب نزول عذاب
ولیکن خدا بھیجتا تھا سدا — مناسب یہ اک قوم کے اک بلا
نبی کی ہوئی بسکہ ہمت فزو — اس ہمت سے آیا یہ طوفان نور

چند متفرق اشعار نمونتاً درج کئے جاتے ہیں۔ ع

تمنا ہے یہ اس کف خاک کو — کہ چھوٹے نہ اس دامن پاک کو

ستم سے کنارہ کچھ تو انصاف کر — خدا سے بھی ڈر کچھ تو انصاف کر

مت اس طرح پیالے لبالب بھر — مبادا کوئی ناتواں جائے مر

جو کھینچا کبھو مہر سے تو نے ہات — ستمگر کو محشر میں بخشے نجات

وہ کوئی شخص پانی سوا پیتا ہے — یقیں ہے کہ آب اس کا [illegible]

نہ کچھ ذوق ہے آب و دانہ سے تھی — بھڑکتا ہے جی آشیانہ سے تھی

درگاہ: نام درگاہ قلی خاں، درگاہ تخلص مؤتمن الدولہ سالار جنگ خطاب ۲۹ رجب ۱۱۲۲ ہجری کو پیدا ہوئے۔ اپنے والد خاندان قلی خاں کے زیر پرورش رہے۔ مگر ان کی حقیقی تعلیم و تربیت مغفرت مآب آصفجاہ اول نے زیر نگرانی ہوئی۔ چار سال کی عمر میں جاگیر اور منصب سے سرفراز کئے گئے اور سن شعور سے آصف جاہ بہادر کے ساتھ رہنے لگے۔ ۱۱۵۱ھ میں انہی کے ہمراہ دہلی گئے۔ یہ زمانہ دہلی کی تباہی کا تھا۔ نادر گردی نے دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ نواب آصفجاہ بہادر نے نادر شاہ سے مصالحت کرانے اور اہل دہلی کو قتل و غارت سے بچانے کیلئے جو تدبیر کا

ثبوت دیا وہ بھلایا نہیں جاسکتا۔ درگاہ چار سال تک دہلی میں رہے اور یہ زمانہ ان کے عنفوان شباب کا تھا۔ شاہجہاں آباد کی رنگینیوں میں شریک رہے لیکن کتراتے'' ''دامن بچاتے ہوئے دہلی کے ان تاثرات کو ایک یادداشت کے طور پر مرتب کیا تھا جس کو حال ہی میں شائع کیا گیا ہے۔ اسکے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مظہر جان جاناں، حزیں، آرزو، راسم اور مغنیوں کی بے تکلف صحبتوں میں شریک ہوتے تھے۔ مظہر کبھی کبھی ان کے ہاں بھی آیا کرتے تھے۔

۱۱۶۵ھ میں نواب آصف جاہ بہادر کے ہمراہ دکن کو مراجعت کی۔ مدت تک اورنگ آباد کے صوبہ دار رہے۔ جہاں "باغ دلکشا" میں علمی محفل منعقد کرتے شعراء اور علماء مدعو کئے جاتے۔ آزاد بلگرامی اور شفیق اس صحبت میں شریک ہوتے تھے۔ خود بھی شعر کہتے تھے۔ نواب ذوالقدر علاوہ غزل پڑھنے کے اکثر نہایت برجستہ فی البدیہہ شعر بھی کہتے تھے۔

ایک قصیدے کے چند شعر ذیل میں درج کئے جاتے ہیں ؎

اسی تردد و افکار میں لگی تھی نیند — کہ ناگہ خواب میں دیکھا قریب وقت سحر
ظہور اب ہے آکے سرہانے یہ پیر نورانی — لطیف صنعت، خوش منظر و خجستہ سیر
کہا کمال عنایت سے کیا ہے فکر تجھے — ہے تیرے کام کا حامی امام جن و بشر
شہ سریر کرامت امیر کل امیر — ولی حضرت مولیٰ وصی پیغمبر
امام جن و ملک تاجدار ملک و ملک — کہا ہے لحمک لحمی جسے شہ سرور

میر سعادت علی صاحب رضوی ام اے۔ نے درگاہ کے مرثیوں پر "مرقع سخن" میں اپنے ایک مضمون کے ذریعہ تفصیلی روشنی ڈالی اور یہ رائے ظاہر کی ہے کہ "عربی، فارسی یا دکھنی جس کسی زبان میں وہ لکھتے ہیں قلم برداشتہ لکھتے ہیں۔ آمد ہی آمد معلوم ہوتی ہے۔ صفحے کے صفحے پڑھ ڈالئے کہیں تعقید یا ٹھونس ٹھانس نہ ملے گی جس سے انکی غیر معمولی قادرت بیان کا اظہار ہوتا ہے۔ اشعار خود زبان حال سے کہتے ہیں کہ ان کا لکھنے والا ایک کہنہ مشق شاعر تھا۔ شستہ الفاظ اور برجستہ ترکیبیں انہوں نے ایسی استعمال کی ہیں جن میں پڑھتے وقت ایک قسم کی موسیقیت پیدا ہو جاتی ہے۔" بعض مرثیوں میں عربی، فارسی اور ہندی کے برجستہ الفاظ اور اشعار کا ایسا استعمال کیا ہے جس سے ان کی قادر الکلامی کا اظہار ہوتا ہے۔

نمونۂ کلام

ہے آج کربلا کا بیاباں لہو لہو — صحرائے دلفگار کا داماں لہو لہو
سب دشت و کوہ و جنگل و میداں لہو لہو — وہ رزمگاہ شاہ شہیداں لہو لہو

خلق میں پھر ہے جو شور ماتم — سوگ میں پھر جو ہوا ہے عالم

مشتعل آتش غم شعلۂ ہم — [illegible] ماہ محرم ہے ملا
از غم آمد بر خواست فغاں — دیدۂ دل شدہ گریاں بریاں
[illegible]ن فی الخلق بکاءٌ وحزن — لعلیٍ وحسینٍ وحسن

درگاہ اقدس کا طواف ہے منتہائے مدعا — عاصی کوں خاک کربلا ہر دم ہے اس کی التجا
اے صاحب حاجت روا جلدی سیں زائر کوں بلا — اس تعزیئے کوں دو کر صاحب کدھر نوکر کہا
سرسبز سایہ ہے بلی ادہاب تیشیا جان — شاہ تمہارے او میں کوں یہی ہے ارماں
کمینہ بندۂ درگاہ سید الشہدا — برائے خدمت جاروب روز و شب بدعا

درگاہ قلی نے سنہ ۱۱[illegible]ھ میں انتقال کیا اور اورنگ آباد میں دفن کئے گئے۔

عزلت | سید عبد الولی نام اور عزلت تخلص تھا۔ سنہ ۱۱[illegible]ھ میں بمقام سلوان ضلع سورت تولد ہوئے۔ آپ کے والد شاہ سعد اللہ سورتی مشہور روزگار عالم بزرگ تھے۔ کتب فارسی کی تحصیل والد ہی سے کی۔ طبیعت نہایت بے تکلف پائی تھی۔ ہر تماش کے لوگوں سے ملاقات تھی۔ صوفی مشرب تھے۔ داڑھی مونچھ منڈواتے تھے جس کی وجہ سے صاحب تحفۃ الشعرا نے انھیں "ملامتیہ مشرب" کا پیرو گردانا اور صاحب گلزار ابراہیم نے "خالی از بیکی نبود" لکھ دیا۔ مگر تمام تذکرے متفق ہیں کہ "ظاہر و باطن محلی است"۔ فارسی اور عربی زبانیں نہایت اچھی طرح جانتے تھے۔ قرآن کے حافظ اور قاری بھی تھے۔ فارسی میں شعر کہتے تھے۔ دہلی جانے سے پہلے فارسی میں ایک دیوان ترتیب دیا تھا۔ آزاد بلگرامی نے سرو آزاد میں ان اشعار کو درج کیا ہے جو عزلت ہی کے انتخاب کئے ہوئے تھے۔ شفیق ان کا فارسی کلام چار ہزار ابیات کا بتلاتے ہیں۔ آزاد سے پہلی مرتبہ اس وقت ملاقات ہوئی جبکہ وہ حج بیت اللہ سے مشرف ہونیکے بعد بندر سورت پر اترے۔ شفیق اورنگ آبادی ان کا احترام کرتے تھے۔ درد مند، مظہر اور یقین سے ملاقات تھی۔ میر تو ان کے گہرے دوست تھے۔ دوستی بے تکلفی کی حد تک پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں "با فقیر بسیار آشنا است"۔ [illegible] غلام نبیہ نے نواب خواجہ علیخاں کا مصرعہ [illegible]
ایک مصرعہ اس لئے درج کیا ہے کہ [illegible] معتقدان سید صاحب ہست

سید صاحب پہلے تو عزلت مشہور تھے لیکن انھیں جہاں گرد لکھنا چاہیے۔ سورت سے اورنگ آباد گئے اور پھر وہاں سے ۲۰ رجمادی الاول سنہ ۱۱۶۴ھ کو دہلی پہنچے۔ دہلی میں دو سال مقیم رہ کر (۱۱۶۶ھ کے قریبی زمانہ میں) مرشد آباد چلے گئے اور وہاں چندے مقیم رہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب دہلی کے خرمن پر تباہی و بربادی کی بجلیاں گر رہی تھیں۔ مرشد آباد میں ان کی

کافی آؤ بھگت ہوئی۔ علی وردی خاں مہابت جنگ کے مورد عنایت رہے۔ ان کے انتقال کے بعد اورنگ آباد لوٹ آئے یہاں چندے قیام کیا۔ نواب ناصر جنگ شہید کی خدمت میں باریاب ہوئے۔ بلدۂ فرخندہ بنیاد میں ایسے آئے کہ یہیں کے ہو رہے۔ نواب صلابت جنگ بہادر نے بڑی قدر و منزلت کی۔ دو گاؤں مرحمت ہوئے۔

عزلت بڑے شاعر دوست بھی تھے چنانچہ قائم نے اسکی تصریح کی ہے کہ "شاعر دوستی در مزاج او بمرتبہ بود بلکہ برائے مناسبت ایں طائفہ گاہ گاہ خود ہم دو سہ بیت موزوں میکرد۔" خود اپنے مکان پر ماہانہ مشاعرہ منعقد کرتے، شعراء کی ضیافت میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتے تھے خوش صحبت تھے۔ خود خوش ہوتے اور اوروں کو لطف اندوز کرتے۔ انکی شاعر دوستی، رنگین مزاجی اور رندی ان کے کلام میں اپنی جھلکیاں دکھاتی ہیں۔ ولی دور اول کے قافلہ سالار ہیں تو عزلت دور دوم کے۔ انھوں نے شاہجہاں آباد کی شاعرانہ سرزمین پر اپنے کمال کے ناقابل فراموش جوہر دکھائے۔ میر صاحب نے ان کی باکمالی اور وسیع المشربی کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے "باایں ہمہ کمال بیقدر وسعت مشرب بہم رسانیدہ اند کہ بہر رنگ چوں آئینہ اند"۔ دکھنی شعراء کے جو نام قدیم دہلوی تذکروں میں درج ہیں، ان کا ماخذ "بیاض عزلت" ہے۔ اس بیاض سے میر نے دکھنی شعراء کی حد تک فائدہ اٹھایا اور گردیزی نے کو استفادہ کیا لیکن میر کی طرح حوالہ نہیں دیا۔ یہ گمان کیا جاتا ہے کہ قائم نے بھی استفادہ کیا ہوگا۔

عزلت کو مصوری، خطاطی اور موسیقی میں بھی دخل تھا۔ مصوری اور خطاطی کے چند نمونے موجود ہیں۔ عزلت کے ہاتھ کی ایک تصویر آغا حیدر حسن صاحب کے کتب خانے سے جشن یوم ولی کے سلسلہ میں دکھنی مخطوطات اور مرقعوں کی نمایش میں منظر عام پر آچکی ہے۔ ان کی موسیقی سے آزاد بلگرامی بھی لطف اندوز ہوئے تھے اور اس میں فن کارانہ دسترس کا ثبوت ان کی مثنوی "راگ مالا" سے ملتا ہے۔ مثنوی "راگ مالا" میں چھ راگ میں ہر ایک راگ میں پانچ راگنیاں ہیں اور ہر ایک راگنی میں آٹھ حصے ہیں۔ مرحوم عبدالجبار ملکاپوری عزلت کو "طوطی دکن" کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ امیر خسرو علیہ الرحمہ کی طرح عزلت نے کہہ مکرنیاں پہلیاں، دوہے، جھولنے اور کبت بھی کہے اور بارہ ماسی تالیف کی۔ شفیق نے اپنے تذکرہ میں اسکی چند مثالیں دی ہیں۔

عزلت کے کمال کا اصلی جوہر ان کی ریختہ گوئی ہے۔ دہلی جانے سے پہلے نہ صرف شعر کہنے لگے تھے بلکہ ان کے اورنگ آباد اور سورت میں کئی شاگرد ہو گئے تھے۔ مرشد آباد جانے تک اپنے اردو کلام کو مرتب کر لیا تھا۔ چنانچہ صاحب گلزار ابراہیم کا بیان ہے کہ "اشعارش مدون بہ نظر ایں خاکسار درآمد"۔ میر انھیں ریختہ گوئی کے لئے موزوں خیال کرتے ہیں چنانچہ لکھتے ہیں "مزاج اوشاں میلان ریختہ بسیار دارد، نسبتے تمام بسخن دارند از اسالیب کلام شاں واضح میگردد کہ بہرہ بسیارے از دردمندی دارند۔" دردمند کے مشہور "ساقی نامہ" کے جواب میں ایک ساقی نامہ حیدرآباد میں نظم کیا جس میں تین سو اکتیس ابیات ہیں

نورس نامہ تصنیف سلطان ابراہیم عادل شاہ

"دا ـ مه هد عصم ه ـ و ں ه ـ س"

ساخت: جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دیوان ترتیب پا گیا۔ اس کے بعد علم ابدان کی تحصیل کا خیال پیدا ہوا اسلئے کہ اس کا جاننا "حفظ صحت" "دفع امراض و ازالۂ اعراض" کے لحاظ سے مقدم ہے۔ اس زمانہ میں جبکہ وہ "بے نظیر" کی تالیف میں مشغول تھے تحصیل متداولات فن طب بھی جاری تھی اور امید کرتے ہیں کہ "مشق طبابت ظاہری" میں "تدبیر اصلاح باطنی" اور "توفیق ازالہ امراض روحانی" بھی حاصل ہو جائیگی۔ ۱۱۸۲ھ میں غیور جنگ کی بارگاہ میں متوسل تھے۔ سنہ ۱۱۹۰ھ کے قریب ہی زمانہ میں فوت ہوئے اور دولت آباد میں حضرت برہان الدین غریبؒ کے روضہ کے قریب مدفون ہیں۔[1]

فارسی کلام آزاد بلگرامی کو دکھلاتے تھے۔ آزاد کی رائے ہے کہ "از خوش فکران ایں عصر است" ان ہی کے اشارے سے "تذکرہ بے نظیر" کو مرتب کیا۔ اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانۂ آصفیہ میں موجود ہے یہ فارسی شعراء کا تذکرہ ہے زبان شگفتہ ہے لیکن بیان پر از استعارہ ہے۔

بیتکل کو ریختہ میں عزلت سے تلمذ حاصل تھا اور یہ تعلق ۱۱۶۴ھ سے پہلے جبکہ عزلت ابھی دہلی نہیں گئے تھے قائم ہو گیا تھا۔ لچھمی نرائن شفیق ان کے استاد بھائی تھے جن سے حضرت آزاد بلگرامی کے مکان پر ملاقات ہوا کرتی تھی ان کے متعلق شفیق لکھتے ہیں کہ "بیتکل صاحب فطانت اور ذہین معلوم ہوتے ہیں"

بیتکل اس دور کی پیداوار ہیں جبکہ اورنگ آباد شعر و شاعری کا زبردست مرکز تھا اور شمال و دکن کے شعراء کا جائے اتصال۔ اسی بنا پر شمال کی تحریکوں کو سب سے پہلے یہاں قبول کر لیا جاتا تھا۔ بیتکل پر بھی یہ رنگ غالب ہے۔ انھوں نے شمال کا سفر بھی کیا تھا۔ نواب سراج الدولہ کے عہد میں بنگالہ گئے۔ ممکن ہے اس زمانہ میں گئے ہوں جبکہ عزلت دلّی سے مرشد آباد آچکے تھے۔ علی ابراہیم خاں کے بیان سے ان کی ملاقات کا پتہ نہیں چلتا چہ جائیکہ اصلاح اشعار کا۔[2] ریختہ میں صاحب دیوان ہیں ان کے کلام میں صفائی اور اسلوب میں دلکشی موجود ہے ؎

میرا دل گلرخاں نے سات لے گئے ۔۔۔ حنا کا رنگ ہاتھوں ہات لے گئے

تری زلفوں نے کئی کئی پیچ دکھلا ۔۔۔ ا بنگال کو راتوں رات لے گئے

عشق میں کیا تابتی ہے مجھ دل بیتاب کو ۔۔۔ [illegible] سکھلا اسی سیماب کو

سرو کو رتبہ ترے آگے نہیں اے سبزپوش ۔۔۔ ایک تجھ بازار خوبی کا ہے وہ سبزی فروش

نین [illegible] کا رتبہ ہے بڑا تجھ او پرستی میں ۔۔۔ کر دل حافظ ہے اس مصحف کا آنکھیں ناظرہ خواں میں

تری آنکھوں کی کیفیت نے کھویا ہوش عالم کا ۔۔۔ دو انوں کو کہے کیا کوئی ہیں متوالے

---

[1] محبوب الزمن [2] طبقات شعراء ہند۔

تری ابرو کی تیغ ہے بارِ جسیل — جس کو لگتی ہے خوب لگتی ہے
جاتا ہے وہ کہ تھا لطف زندگانی — آتی ہے اجل ہماری جواب نہیں تو پھر کب
عکس رخ سے ہے یار کے نیر وست — آئینہ چشمۂ گلاب رہا

ان کا ایک مشہور شعر زباں زد خاص و عام ہے [۱]

سیرت کے ہم غلام ہیں صورت ہوئی تو کیا؟ — سُرخ و سفید مانی کی مورت ہوئی تو کیا؟

علاوہ ازیں اپنے استاد کی طرح ریختہ میں دو ہے، کبت، جھولنے، کہہ کرنی، اور پہیلیاں بھی کہی ہیں۔

۱۸۵۷ء کے بعد

مغلیہ سلطنت کے آخری تاجدار جواں بخت، شاہ عالم ثانی، اکبر شاہ ثانی، اور بہادر شاہ ظفر تھے۔ یہ بیچارے انگریزوں کے وظیفہ خوار اور لال قلعے کے حاکم تھے۔ ہندوستان کے اکثر حصوں پر انگریز قابض ہوتے جارہے تھے لیکن ان بادشاہوں کا ادب و احترام ہندستانیوں کے دلوں میں جاگزیں تھا۔ انگریز لال قلعہ کو ہاتھ لگاتے ڈرتے تھے۔ سر ٹامس مٹکاف نے جو بیان دیا ہے وہ قابلِ ذکر ہے:-

"عزیزو! میں پچاس سال سے ہندوستان میں رہتا ہوں وہاں کے رنگ سے اچھی طرح واقف ہوں میں جانتا ہوں کہ دلی کا قلعہ کیا ہے؟ اسکی بنیاد اگر ایک طرف کابل تک گئی ہے تو دوسری طرف راس کماری تک ایک جانب آسام تک ہے تو دوسری جانب کاٹھیاواڑ تک، ذرا قلعہ کو ہاتھ لگایا تو وہ زلزلہ آئیگا کہ سارا ہندوستان ہل جائیگا یہ برائے نام بادشاہت جس طرح چل رہی ہے اسی طرح چلنے دو۔"

دلی کی معاشی اور معاشرتی حالت کی رہی سہی بہار انھیں کے دم سے تھی" اور دلی کی بستی منحصر انھیں ہنگاموں پر ہے۔ قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز مجمع جامع مسجد کا، ہر ہفتہ سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ غدر نے سلطنتِ مغلیہ کی ٹمٹماتی شمع کو ہمیشہ کے لئے گل کر دیا۔ اور یہ پانچوں باتیں اب نہیں۔ دلی پر پنجابی اور دیہاتی آ آ کر بس گئے۔ شرفاء ایک ایک کرکے سب لکھنو اور دکن کی طرف چلے گئے۔

بہادر شاہ ظفر کی وجہ سے اردو شاعری کو بھی فروغ ہوا وہ خود اچھے شاعر تھے مگر ان پر اس انقلاب کا بہت برا اثر پڑا۔ دلی میں مشاعروں کی رونق شہزادوں کے دم سے تھی۔ ذوق اور غالب بہادر شاہ ہی کے خیال سے دلی میں پڑے رہے۔ باوجودیکہ ذوق کو بہادر شاہ کی ولیعہدی کے زمانہ میں (ملحہ) اور

---

[۱] تذکرۂ ریختہ گویاں۔

شمس الامرا دکن میں اسی زمانہ میں خطاب پایا۔ مگر خاقانی ہند کا ماہانہ سے زیادہ نہیں ملے۔ (صہ) ظفر جب روزینہ مقرر تھا۔ (صہ) (صہ) کو شاعروں آنیوالے باہر سے اکثر بارگاہوں سے لال کی چندو .. غالب کو بھی اپنی عطا ہوی۔ جاگیر اور خلعت کو "استاد شہ" تب کہیں دہلی ہوے سلطنت آرائے نیر ۔ منت، لطف، مشتاق، شاہ حفیظ، شاہ نصیر، شعراء باکمال ہند کے شمالی رہی۔ شکایت .. لی ماہی چھہ اپنی بہادر شمس الامرا اور چندو لال مہاراجہ پھر اور عالم میر اور جاہ ارسطو نواب جہاں چلے گئے دکن .. ان ۔ گلے کہنے شعر میں زبان کی دہلی کو ترک کرکے محاورہ اپنے دکن اہل میں وجہ اس تھے کھلارہے دیاں فیا

کلیات ولیؔ کے قلمی نسخے

اس وقت تک ولی کے جن قلمی نسخوں کا پتہ چلا ہے اُن کی ایک تفصیلی فہرست یہاں درج کی جاتی ہے جس کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ ولی کے کلیات کے نسخے کن کن مقامات میں کن کن زمانوں میں اور کن اشخاص نے نقل کئے اور اب وہ کہاں موجود ہیں جو اصحاب آیندہ ولی کے متعلق کام کرنا چاہتے ہوں ان کے لیے یہ مواد خاص طور پر کارآمد ہوگا۔

۱۔ وہ نسخے جن پر تاریخ کتابت درج ہے

۱۔ سنہ ۱۱۱۲ھ

یہ نسخہ اورنگ آباد میں لکھا گیا تھا، و نواب نصیر حسین خاں خیال کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

۲۔ سنہ ۱۱۲۵ھ

نواب سالار جنگ بہادر کے کتب خانہ میں ہے۔

۳۔ سنہ ۱۱۴۱ھ

اس نسخہ پر ولی اور قاضی القضاۃ کی مہریں ثبت ہیں کتب خانہ مولوی حکیم سید محمد قاسم صاحب ناظم عمیات میں موجود ہے اور اس کے آخر میں یہ عبارت درج ہے:۔

"مختصر حالات ولیؔ سید عبدالغفار نے اپنے والد بزرگوار مولانا سید قاسم صاحب شاہ نوری سے، پیدائش ولیؔ سنہ ۱۰۷۵ھ، تصنیف پہلے سنہ ۱۱۴۰ھ دہ مجلس کئے، دیوان دکنی ثنٰی وغیرہ۔ دہ مجلس و دیوان محمد ولی (محمد شمس الدین المتخلص ولیؔ، وحمت شاہ، مولا سید اسمٰعیل صاحب شیخ الحدیث مدرسہ علویہ گجرات متوطن دارالظفر بیجاپور، شاہ نور کے ملاحظہ میں پیش کیا کرتے محمد ولیؔ کی اورنگ آباد میں ولادت ہوئی شوق تحصیل علم گجرات کے مدرسہ علویہ میں کھینچ لایا۔ بعد الفراغ تحصیل علم بانی مدرسہ سجادہ نشیں علوی کے معتقد مریدوں میں داخل ہوئے۔

المرقوم سنہ ۱۳۰۵ھ

سید عبدالغفار شاہ نوری"

۲۰۔ سنہ ۱۱۸۰ھ

گارساں دتاسی کے کتب خانہ پیرس میں ہے۔

۲۱۔ سنہ ۱۱۸۵ھ

مولوی سبحان اللہ خاں صاحب کے کتب خانہ گورکھپور میں ہے۔

۲۲۔ سنہ ۱۱۸۷ھ

۲۸ جمادی الثانی آغا حیدر حسن صاحب پروفیسر نظام کالج حیدرآباد کتب خانہ میں ہے۔

۲۳۔ سنہ ۱۱۹۱ھ

کاتب موہن لعل۔ مقام کتابت حیدرآباد دکن۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور پروفیسر عثمانیہ کالج کے کتب خانہ میں ہے۔

۲۴۔ سنہ ۱۱۹۴ھ

گارساں دتاسی کے کتب خانہ میں ہے۔

۲۵۔ سنہ ۱۲۱۲ھ

کنگس کالج کیمبرج کے کتب خانہ میں ہے۔

۲۶۔ سنہ ۱۲۱۳ھ

حیدرآباد دکن میں لکھا گیا۔ جامعہ عثمانیہ کے کتب خانہ میں ہے۔

۔۔ھ

۱۱ جمادی الاول۔ کاتب کریم علی۔ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد۔

۲۸۔ سنہ ۱۲۴۱ھ

۲۷ ربیع الثانی۔ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد۔

۲۹۔ سنہ ۱۲۴۵ھ

۲ ربیع الاول۔ مقام کتابت بوٹن پلی۔ برٹش میوزیم لندن میں موجود ہے۔

۳۰۔ سنہ ۱۲۴۹ھ

مکتبہ گارساں دتاسی۔

۳۱۔ سنہ ۱۲۵۰ھ

دتاسی کے کتب خانہ پیرس میں موجود ہے۔

۳۲۔ سنہ ۱۲۶۱ھ

نواب سالار جنگ بہادر کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

۳۳۔ سنہ ۱۲۸۰ھ

۲۷ ذی الحجہ۔ کاتب غلام محمد۔ انڈیا آفس لندن کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

دیوان ولی کے ایسے نسخے جن پر تاریخ کتابت درج نہیں ہے

۱۔ انڈیا آفس لندن کے نسخے

۳۴۔ (۱۱۶) اوراق میں خط نستعلیق۔ اس دیوان پر فورٹ ولیم کالج کی مہر ثبت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ کالج کی ملک رہا ہے۔

۳۵۔(۱۱۷) اوراق ہیں۔ بموجب فرمودہ جیو کر جیو۔

۳۶۔(۱۱۹) اوراق۔ بلحاظ کاغذ، خط تیرھویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے۔

۳۷۔(۱۱۹) اوراق۔ خط نستعلیق۔ یہ دیوان ناقص الاول و ناقص آخر ہے۔ بلحاظ شان و کاغذ بارھویں صدی ہجری کا ہے۔

۳۸۔ کنگس کالج کیمبرج کا نسخہ دیوان ولی۔

۳۹۔(۹۱) ورق۔ خط نستعلیق۔ بلحاظ شان و غالباً تیرھویں صدی ہجری کا ہے۔

۲۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کے کتب خانہ کا نسخہ

۴۰۔(۱۲۵) اوراق۔ خط نستعلیق۔ خاتمے پر جو (۱۱۲۱) میں "تمت تمام شد دیوان ولی" لکھا گیا ہے۔

۳۔ انجمن ترقی اردو کے نسخے

۴۱۔ اول و آخر سے ناتمام مگر خوشخط اور صاف۔

۴۲۔ آخر سے ناتمام اور کرم خوردہ و نیز بد خط اور تاریخ کتابت درج نہیں۔

۴۳۔ جدید قلمی نسخہ۔ حکیم سید شمس اللہ قادری صاحب نے قدیم نسخہ سے نقل کرایا تھا اور استفادہ کی غرض سے مولوی عبد الحق صاحب کو عنایت فرمایا تھا۔ بالکل محفوظ سالم اور صحیح۔

۴۴۔ مولوی غلام سبحانی صاحب کے کتب خانہ [illegible] قلمی نسخہ ہے جس کا اول و آخر ناتمام ہے۔

۴۵۔ مولوی حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی المخاطب بہ نواب صدر یار جنگ بہادر رئیس بھیکم پور کے کتب خانہ کا قلمی نسخہ جو بعہد محمد شاہ لکھا گیا۔

۴۶۔ سید محمد [illegible] صاحب قبلہ [illegible] نوشتہ نسخہ۔

۴۔ گارسان دتاسی کے کتبخانہ پیرس کے نسخے

۴۷۔(۱۹۰) صفحات کا نسخہ ہے۔

۴۸۔(۱۲۵) اوراق۔ یہ دیوان مخطوطات دتاسی میں سب سے زیادہ مکمل ہے۔

۴۹۔ مخطوطہ قدیم، نہایت صحیح۔ یہ مخطوطہ پرانس صاحب کی ملکیت تھا، اس سے اپنی ہندوستانی گرامر میں منتخب کر لئے ہیں۔ اس میں (۱،۲۰۷، ۱۱) اوراق ہیں۔

۵۰۔ یہ مخطوطہ نہایت اچھا خوشخط بصورت [illegible] ناکمل۔ یہ مخطوطہ [illegible] صاحب کی ملکیت رہ چکا ہے اور

نامی کی مشہور مستشرق شیکسپیر نے دیا تھا۔ (۱۲۶) صفحات ہیں۔

۵۱۔ نفیس تحریر۔ صحیح اور تغیر و تبدل کے ساتھ

(۲۲۱) صفحات ہیں۔

۵۲۔ یہ مخطوطہ مکمل اور اچھی حالت میں ہے۔

۵۔ نواب سالار جنگ بہادر کے کتب خانہ کے نسخے

۵۳۔ ایک نسخہ جو بیاض کی شکل میں ہے رنگین جدولوں کے ساتھ خوشخط لکھا گیا ہے۔

۵۴۔ خوشخط اور اس کے ساتھ سراج اورنگ آبادی کا دیوان بھی شامل ہے۔

۵۵۔ ایک قدیم نسخہ جس کا کاغذ بھی قدیم ہے۔

۵۶۔ ایک قدیم خوشخط نسخہ جس کے حاشیے پر مرثیے بھی درج ہیں۔

۵۷۔ دیوان ولی کے ساتھ اور چار کتابیں "احوال قیامت" از محیا "معراج نامہ" از بلاقی "بحث کہانی" از افضل "کاک سندیسہ" از اکرم۔

حیدرآباد دکن کے متفرق نسخے

۵۸۔ کتب خانہ آغا حیدر حسن صاحب۔

شعرا مثلاً نصرتی وغیرہ کی غزلیات بھی موجود ہیں۔

۵۹۔ محمد علیم الدین صاحب کتب فروش اسٹیشن روڈ

۶۰۔ صاف خط نسخہ مملوکہ مولوی سید محمود صاحب

۹	بستان تصنیف تصوف	شاہ برہان الدین جانم وفات ۹۹۰	نثر	۔	۔	نواب سالار جنگ بہادر
۱۰	ارشاد نامہ	〃	〃	۔	سنہ ۱۱۵۱ھ	〃
۱۱	نورس	ابراہیم عادل شاہ	نظم	۔	۔	کتب خانہ حسین علیخاں
۱۲	ابراہیم نامہ	عبدل بیجاپوری	〃	سنہ ۱۰۱۲ھ	۔	نواب سالار جنگ بہادر
۱۳	تحفۂ عاشقاں یا تحفۂ دل پذیر	عاجز	〃	سنہ ۱۰۱۵ھ ؟	سنہ ۱۱۵۴ھ	〃
۱۴	〃		〃	〃	سنہ ۱۲۶۱ھ	〃
۱۵	دیوان محمد قلی قطب شاہ	محمد قلی قطب شاہ وفات ۱۰۲		قبل سنہ ۱۰۲۰ھ	۔	ناصر حسن صاحب
۱۶	دیوان محمد قلی قطب شاہ	〃	〃	〃	۔	نواب سالار جنگ بہادر
۱۷	دیوان محمد قطب شاہ	〃	〃		۔	
۱۸	بیاض نامہ	مخدوم شاہ	〃	سنہ ۱۰۱۷ھ	۔	〃
۱۹	سیف الملوک و بدیع الجمال	ملا غواصی	〃	سنہ ۱۰۳۵ھ	سنہ ۱۰۶۷ھ	〃
۲۰	〃	〃	〃	〃	〃	〃
۲۱		〃				〃
۲۲	نصیحت نامہ علم اخلاق	۔	۔	۔	[illegible]	جامعہ عثمانیہ
۲۳	تحفۃ النصائح	قطب الدین رازی (ملا قطبی)	نظم (اخلاق)	سنہ ۱۰۰۲ھ		نواب سالار جنگ بہادر
۲۴	〃	〃	〃	〃	سنہ [illegible]ھ	〃
۲۵	〃	〃		〃	۲۰؟	〃
۲۶		〃		〃	سنہ ۱۱۲۳ھ	〃
۲۷	سب رس	ملا وجہی گولکنڈہ	نثر	سنہ ۱۰۴۵ھ	۔	جامعہ عثمانیہ
۲۸		〃	〃	〃	سنہ ۱۰۷۳ھ	نواب سالار جنگ بہادر
۲۹	〃	〃	〃	〃	سنہ ۱۲۱۴ھ	ناصر حسن صاحب

۹۳	،،	،،	،،	،،	۱۱۸۶ھ	آغا حیدر حسن صاحب
۹۴	،،	...	،،	،،	۱۱۹۱ھ	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
۹۵	،،			،،	۱۲۱۳ھ	جامعہ عثمانیہ
۹۶	،،	،،	،،	،،		علیم الدین صاحب [illegible]
۹۷	بیاض [illegible]					آغا حیدر حسن صاحب
۹۸	ظفرنامۂ عشق	سید مظفر		۱۱۲۰ھ		نواب سالار جنگ بہادر
۹۹	مصطفیٰ نامہ	مصطفیٰ	،،	۱۱۲۶ھ	۱۲۶۶ھ	آغا حیدر حسن صاحب
۱۰۰	روضۃ الشہداء	سید فیاض ولی دہلوی	،،	۱۱۳۰ھ	۱۱۵۹ھ	نواب سالار جنگ بہادر
۱۰۱	،،	،،	،،	،،	۱۲۲۴ھ	،،
۱۰۲	،،			،،	۱۲۳۱ھ	،،
۱۰۳	،،	،،		،،	۱۲۵۵ھ	،،
۱۰۴		،،	،،	،،		،،
۱۰۵	پنچھی باچھا	وجدی		۱۱۴۵ھ	۱۲۵۲ھ	جامعہ عثمانیہ
۱۰۶	کلیات ایجاد	نقد علی خاں	نظم			نواب سالار جنگ بہادر
۱۰۷	،،	،،				
۱۰۸	سوال جواب حضرت موسیٰ		نثر		۱۱۰۴ھ	،،
۱۰۹	طوطی نامہ	محمد قادری		۱۱۴۲ھ		جامعہ عثمانیہ
۱۱۰	تنبیہ	سید محمد خاں عشرتی	نظم	۱۱۴۴ھ	۱۲۶۹ھ	نواب سالار جنگ بہادر
۱۱۱	ایک پلنگ	،،	،،			،،
۱۱۲	چت لگن	،،	،،			،،
۱۱۳	دیوان قاسم	شاہ قاسم اورنگ آبادی	،،		۱۱۶۰ھ	،،

۱۱۴	پنچھی بہاچا	شیخ وجیہ الدین وجدی	،،	۱۱۵۵ھ	۱۲۵۲ھ	،،
۱۱۵	،،	،،	،،	،،	۱۲۴۰ھ	،،
۱۱۶	،،	،،	،،	،،		،،
۱۱۷	جنگ نامہ محمد حنیف	میران	،،		۱۱۵۰ھ	آغا حیدر حسن صاحب
۱۱۸	دیوان عثمان خاں ...	عثمان خاں ...	،،			نصیر الدین صاحب ہاشمی
۱۱۹	محشر نامہ	توفیق	،،	۱۱۶۱ھ		نواب سالار جنگ بہادر
۱۲۰	قصہ ملکہ مصر	عبد اللطیف	،،	۱۱۰۰ھ		جامعہ عثمانیہ
۱۲۱	دیوان سراج	شاہ سراج الدین اورنگ آبادی		،،		نواب سالار جنگ بہادر
۱۲۲	،،	،،	،،	،،	۱۲۰۵ھ	جامعہ عثمانیہ
۱۲۳	،،	،،	،،	۱۱۶۱ھ	۱۰۶۱ھ	پروفیسر یسین علیخاں صاحب
۱۲۴	پنج گنج				۱۱۰۸ھ	جامعہ عثمانیہ
۱۲۵	بوستان خیال	شاہ سراج الدین	نظم	۱۱۰۳ھ	۱۲۱۲ھ	نواب سالار جنگ بہادر
۱۲۶	بیاض مراثی	نواب درگاہ قلی خاں		۱۱۵۰ھ		،،
۱۲۵	روضۃ الاطہار	نوازش علیخاں شیدا		۱۱۰۳ھ	۱۱۰۳ھ	،،
۱۲۸	،،		،،		۱۲۰۱ھ	،،
۱۲۹	،،	،،			۱۲۱۲ھ	،،
۱۳۰	،،	،،	،،	،،		
۱۳۱	،،	،،		،،		آغا حیدر حسن صاحب
۱۳۲			،،	،،		[illegible]
۱۳۳	لعل و گوہر	عاجز		۱۱۹۰ھ	۱۱۹۹ھ	نواب سالار جنگ بہادر
۱۳۴	،،	،،	،،	،،		[illegible]

۱۵۶	سراج الایمان	حافظ احمد بن محمد		سنہ ۱۲۰۰ھ		جامعہ عثمانیہ
۱۵۷	بیاض العارفین	اسحق	نظم	سنہ ۱۲۰۶ھ	سنہ ۱۲۳۰ھ	نواب سالار جنگ بہادر
۱۵۸	"	"	"			جامعہ عثمانیہ
۱۵۹	کلام نبی	غلام نبی	"	سنہ ۱۲۰۷ھ		نواب سالار جنگ بہادر
۱۶۰	دیوان ممتاز	عمدۃ الامراء	"	"		نصیر الدین صاحب ہاشمی
۱۶۱	ریاض الجنان	محمد باقر آگاہ	"	"	سنہ ۱۲۴۰ھ	نواب سالار جنگ بہادر
۱۶۲	انوار محمدی	کرامت علی	"	سنہ ۱۲۱۲ھ		جامعہ عثمانیہ
۱۶۳	فوائد در فوائد	محمد باقر آگاہ	"	سنہ ۱۲۱۰ھ	سنہ ۱۲۰۰ھ	"
۱۶۴	تحفہ نامہ طائی	مہمان	"	سنہ ۱۲۱۶ھ		نواب سالار جنگ بہادر
۱۶۵	مثنوی حاتم طائی	"	"	"	سنہ ۱۲۰۳ھ	آغا حیدر حسن صاحب
۱۶۶	"	"	"	"	"	"
۱۶۷	تلاوت الوجود	مخدوم شاہ حسینی رہنما	"	سنہ ۱۲۱۹ھ		"
۱۶۸	مکافات حسین محمد نامہ	سلام الدین گیسو	"		سنہ ۱۲۰۷ھ	نواب سالار جنگ بہادر
۱۶۹	ہشت بہشت	محمد باقر آگاہ		سنہ ۱۲۰۰ھ	سنہ ۱۲۶۹ھ	جامعہ عثمانیہ
۱۷۰	"	"			سنہ ۱۲۵۴ھ	نواب سالار جنگ بہادر
۱۷۱	"	"	"		سنہ ۱۲۶۲ھ	
۱۷۲	"	"			"	"
۱۷۳	دوازدہ مجلس	محکم	"		سنہ ۱۲۲۲ھ	جامعہ عثمانیہ
۱۷۴	گلشن احسان	احسان علی	"	سنہ ۱۲۲۳ھ	سنہ ۱۲۲۴ھ	نواب سالار جنگ بہادر
۱۷۵	نقد المبین		نثر		سنہ ۱۲۲۳ھ	جامعہ عثمانیہ
۱۷۶	مجموعہ رسائل فقہ				سنہ ۱۲۲۴ھ	"

۱۷۷	اسرار عشق	محمد	نظم	سنہ ۱۲۲۵ھ	سنہ ۱۳۰۰ھ	نواب سالار جنگ بہادر
۱۷۸	محبوب القلوب	باقر آگاہ		سنہ ۱۲۲۷ھ	[illegible]	جامعہ عثمانیہ
۱۷۹	دیوان فیض	شمس الدین فیض	نظم	سنہ ۱۲۳۹ھ		ڈاکٹر سید محی الدین قادری
۱۸۰	تحفۃ النساء	باقر آگاہ	"	سنہ ۱۱۸۵ھ		نواب سالار جنگ بہادر
۱۹۱	گلزار عشق		"	سنہ ۱۲۲۶ھ	سنہ ۱۲۴۹ھ	"
۱۸۲	ریاض الجنان	باقر آگاہ	"	سنہ ۱۲۲۷ھ	"	جامعہ عثمانیہ
۱۸۳	واحد باری	اشرف	"		سنہ ۱۲۲۶ھ	نواب سالار جنگ بہادر
۱۸۴	مثنوی نہ سپہر عشق	آگاہ بیجاپوری	"	سنہ ۱۲۱۴ھ		جامعہ عثمانیہ
۱۸۵	مولود شریف	قاسم	"	سنہ ۱۲۰۹ھ	سنہ ۱۲۴۶ھ	نواب سالار جنگ بہادر
۱۸۶	قصص الانبیاء		نثر		سنہ ۱۲۴۷ھ	آغا حیدر حسن صاحب
۱۸۷	مدینۃ الانوار	نامی	نظم مذہبی	سنہ ۱۲۱۳ھ	سنہ ۱۲۱۶ھ	نواب سالار جنگ بہادر
۱۸۸	"	"	"	"	"	"
۱۸۹	معجزات	حبیب اللہ قادری	"	سنہ ۱۲۱۴ھ	سنہ	"
۱۹۰	عقائد باقر آگاہ	باقر آگاہ	"	قبل سنہ ۱۲۰۰ھ	سنہ ۱۲۵۳ھ	"
۱۹۱	اسرار احمدی	محمد خاں عرف بدو میاں			سنہ ۱۲۶۸ھ	جامعہ عثمانیہ
۱۹۲	چہار درویش	شوق	نظم	سنہ ۱۲۱۴ھ		نواب سالار جنگ بہادر
۱۹۳	ملکہ زماں کام کندلا		نثر		سنہ ۱۲۳۴ھ	"
۱۹۴	ابلیس نامہ	عاجز	نظم و نثر	سنہ ۱۲۰۰ھ	سنہ ۱۲۵۴ھ	"
۱۹۵	عقائد اہل سنت				سنہ ۱۲۳۸ھ	جامعہ عثمانیہ
۱۹۶	ترجمہ قصیدہ بردہ	عاجز	نظم			نواب سالار جنگ بہادر
۱۹۷	مفتاح الصلوٰۃ	شاہ سعید الدین	نثر	سنہ ۱۲۴۱ھ	[illegible]	"

نمبر	نام کتاب	مصنف	نظم/نثر	سنہ تصنیف	سنہ کتابت	مالک
۲۲۰	رسالہ فقہ و چہار مسائل	اشرف	نظم		۱۲۶۵ھ	نواب سالار جنگ بہادر
۲۲۱	وفات نامہ حضرت خاتون جنت		"		۱۲۷۵ھ	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
۲۲۲	گلزار حضرت خاتون جنت		"		۱۲۸۰ھ	"
۲۲۳	نل دمن		"		۱۲۶۳ھ	جامعہ عثمانیہ
۲۲۴	قصہ باز و فاختہ		"		۱۲۷۵ھ	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
۲۲۵	تفسیر ہندی	کمال شاہ دکنی			"	جامعہ عثمانیہ
۲۲۶	روضۃ الشہدا	ولی ویلوری	نظم		۱۲۷۴ھ	"
۲۲۷	"	"	"		۱۲۷۵ھ	محمد علیم الدین صاحب تاجر کتب
۲۲۸	چندر بدن و مہیار	واقف	"	۱۲۲۷ھ	۱۲۷۰ھ	نواب سالار جنگ بہادر
۲۲۹	"	"	"	"	۱۲۶۰ھ	"
۲۳۰	غوث نامہ	لعل خاں شاہ			۱۲۷۷ھ	جامعہ عثمانیہ
۲۳۱	راحت دل	اشفاق	نظم	۱۲۴۷ھ		نواب سالار جنگ بہادر
۲۳۲	من موہن	آزاد		۱۲۴۷ھ	۱۲۷۵ھ	"
۲۳۳	وفات نامہ آنحضرت		"		۱۲۸۰ھ	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
۲۳۴	شرح تمثیلات	آزاد	نظم و نثر	۱۲۵۱ھ		نواب سالار جنگ بہادر
۲۳۵	نکات الاسرار	شاہد چشتی	نظم	۱۲۶۲ھ	۱۲۶۳ھ	"
۲۳۶	دیوان شاہد	"	"	"	"	"
۲۳۷	ترجمہ گلشن زار	آزاد	"	۱۲۸۶ھ	۱۲۸۶ھ	"
۲۳۸	معجزۂ حضرت خاتون جنت		"		"	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
۲۳۹	وفات حضرت خاتون جنت		"		۱۲۸۳ھ	"
۲۴۰	تنبیہ النساء		"		۱۲۶۲ھ	"

۲۴۱	روضۃ الشہداء	میر حسن جعفری	نظم			نواب سالار جنگ بہادر (دس جلد وسیں) ۱۰ (بارہ جلد ناقص)
۲۴۲	روضہ ہندی	محکم	"			
۲۴۳	دیوان ایمان	ایمان			سنہ ۱۲۹۶ھ	جامعہ عثمانیہ
۲۴۴	دیوان حسینی	حسینی	نظم		"	نواب سالار جنگ بہادر
۲۴۵	ہدایۃ الہدی	شیخ داؤد دکنی	"		سنہ ۱۲۶۱ھ	جامعہ عثمانیہ
۲۴۶	کنز المکان	عابد شاہ حسینی			سنہ ۱۲۵۷ھ	"
۲۴۷	بوستان خیالی	سراج	نثر		"	نواب سالار جنگ بہادر
۲۴۸	انوار بدریہ	شاہ علی	"		سنہ ۱۲۵۸ھ	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
۲۴۹	کلام روپ کلا		"		سنہ ۱۲۴۸ھ	نواب سالار جنگ بہادر
۲۵۰	دستور الصبیان	تونمدرات	نظم		سنہ ۱۲۰۶ھ	"
۲۵۱	قادر باری	تربان علی خاں	"		"	"
۲۵۲	دیوان تمیز	بدر الدین خاں تمیز	"		سنہ ۱۲۸۴ھ	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
۲۵۳	مجموعہ دواوین	مظفر الدین خاں مرآتی	"		سنہ ۱۲۹۱ھ	"
۲۵۴	قصہ بدر الدین وحسن پری	یار محمد خاں	"	سنہ ۱۲۸۸ھ		جامعہ عثمانیہ
۲۵۵	حبل الورید				سنہ ۱۳۰۰ھ	"
۲۵۶	دیوان رباعیات عصر	میر احمد علی عصر	نظم		سنہ ۱۳۱۳ھ	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
۲۵۷	دیوان وزیر	آصف یار الملک	"		سنہ ۱۳۳۱ھ	"
۲۵۸	دیوان فیض	فیض	"			نواب سالار جنگ بہادر
۲۵۹	رسالہ تصوف	خواجہ حسینی بادشاہ	نثر			"
۲۶۰	نقش بدیع	محمد قلی قطب شاہ	نظم			"
۲۶۱	کلیات ایجاد	ایجاد	نثر			"

۲۶۲	باب المغفرت	حیات	نثر			نواب سالار جنگ بہادر
۲۶۳	تنبیہ الریاحین	سرمد	نظم			″
۲۶۴	مرآۃ توحید	″	نثر			″
۲۶۵	کرامات شیخ عبدالقادرؒ	علی	″			″
۲۶۶	رسالہ کلمۂ توحید	آزاد	نثر، مذہبی			″
۲۶۷	جنگ نامہ محمد حنیف		مثنوی			″
۲۶۸	″		″			جامعہ عثمانیہ
۲۶۹	لبنیٰ نامہ	خالدی	نظم			″
۲۷۰	تفسیر یا محمدؐ		نثر			نواب سالار جنگ بہادر
۲۷۱	قوت نامہ	عاجز	نظم			″
۲۷۲	رسالۂ آزاد	آزاد	نظم و نثر			″
۲۷۳	قصۂ حضرت حسینؓ	کمترین	نظم			″
۲۷۴	قصۂ گربہ و موش		″			″
۲۷۵	قصۂ منصور		″			″
۲۷۶	ترجمہ قصیدۂ اسرار		″			″
۲۷۷	خلاصہ تصوف		نثر			″
۲۷۸	قصص الانبیاء	نوحی	نظم			″
۲۷۹	زاد المومنین		″			″
۲۸۰	مسائل فقہ		نثر			″
۲۸۱	صراط المستقیم	خیرالدین لایق	نظم و نثر			″
۲۸۲	وفات نامہ حضرت فاطمہؓ		نظم			″

نمائش مخطوطات و مطبوعات کا ایک منظر

۲۸۳	قصۂ دنیا		نظم			نواب سالار جنگ بہادر
۲۸۴	اصول الحکمت فی جمعیت شان	شیخ باقر	نثر			″
۲۸۵	مجموعۂ معجزات	محی الدین قتالی	نظم			″
۲۸۶	سب رس	شاہ محمد ولی اللہ قادری	″			″
۲۸۷	معجز نامہ	قادر	″			″
۲۸۸	مثنوی آصف	آصف	″			″
۲۸۹	کنز الہدایا		″			″
۲۹۰	پنج رسالہ منظوم	معظم	نثر			″
۲۹۱	بیاض مراثی	رضا وغیرہ	نظم			″
۲۹۲	تنبیہ النساء	شاہ رحمت اللہ	″			″
۲۹۳	مجموعۂ المسائل		نثر			″
۲۹۴	کنز المومنین	نواب الدین خدام علی شاہ	″			″
۲۹۵	رسائل	شاہ صدر الدین	نظم		بزمانۂ مصنف	آغا سید حسن صاحب
۲۹۶	مجموعۂ دواوین	بہاری لعل رمز	″			ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
۲۹۷	دیوان آصفی	آصفی حسام الملک خانخاناں	″			″
۲۹۸	اساس فقہ					جامعہ عثمانیہ
۲۹۹	رسائل قادریہ					″
۳۰۰	تاریخ سلاطین بہمنیہ					″
۳۰۱	مجموعۂ ملفوظات اولیائے دکن					″
۳۰۲	شمائل نامہ					″
۳۰۳	مجموعۂ مثنویات دکن					″

۳۰۴	رسالہ تصوف دکھنی					جامعہ عثمانیہ
۳۰۵	رموز العارفین					″
۳۰۶	رسالہ کلمۃ الاسرار					″
۳۰۷	مثنوی چھو منتر	ذوالفقار علی خاں صفا				″
۳۰۸	اعجاز احمدی	نوازش علی خاں شیدا				″
۳۰۹	شمائل الاتقیاء	میراں یعقوب				″
۳۱۰	ترجمہ حملۂ حیدری					″
۳۱۱	بیاض کلام شعرائے دکن		نظم			″
۳۱۲	قواعد عروض	محمد باقر آگاہ				″
۳۱۳	انتخاب کلام شعرائے دکن		نظم			″
۳۱۴	مثنوی دکھنی درسیر		″			″
۳۱۵	فقہ دکھنی	باقر آگاہ	″			″
۳۱۶	جنگ سلوک					نصیر الدین صاحب ہاشمی
۳۱۷	فقۂ ہندی	مہدی				″
۳۱۸	نورس					مرزا حسین علی خاں صاحب
۳۱۹	نوحہ جات و سلام آصفی	آصفی				عباس حسین صاحب نقوی
۳۲۰	تاج الحقائق					بذریعہ غفور احمد صاحب مجددی
۳۲۱	دیوان ولی	ولی	نظم			
۳۲۲	″	″	″			
۳۲۳	دیوان عصر	عصر	″			
۳۲۴	رباعیات عصر	″	″			
۳۲۵[1]	″	.	″			

[1] نوٹ۔ یہ وہ کتابیں تھیں جو نمایش کے دو روز قبل تک وصول ہو چکی تھیں بعد میں اور متعدد کتابیں وصول ہوئی تھیں جنکی تفصیلی فہرست تیار نہ ہوسکی اس لیے یہاں درج نہ ہوسکیں۔

فہرست نمائش تصاویر قلمی

قدیم قلمی تصاویر از کتب خانہ نواب سالار جنگ بہادر

۱۔ سلطان قلی قطب شاہ بانی گولکنڈہ۔
۲۔ فرزندان سلطان قلی قطب شاہ۔
۳۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ۔
۴۔ 〃 〃 〃 دیگر
۵۔ ابوالحسن تانا شاہ
۶۔ 〃 〃 〃 〃
۷۔ 〃 〃 〃 〃
۸۔ مادنا۔ دیوان قطب شاہی۔
۹۔ 〃 〃 دیگر
۱۰۔ پیامتی قطب شاہی۔
۱۱۔ ابراہیم عادل شاہ نورس۔
۱۲۔ نورس پیکر۔
۱۳۔ جشن طرب نورس۔
۱۴۔ چاند سلطانہ۔
۱۵۔ 〃 〃 دیگر
۱۶۔ 〃 〃 〃 〃

قدیم قلمی تصاویر از کتب خانۂ آغا حیدر حسن صاحب

۱۷۔ سکندر عادل شاہ بیجاپوری۔
۱۸۔ میر مومن حیدرآبادی۔
۱۹۔ حضرت علی بمل عبدالولی عزلت۔
۲۰۔ حضرت محبوب سبحانیؒ۔
۲۱۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ۔
۲۲۔ شیخ فریدالدینؒ شکر گنج۔
۲۳۔ حضرت خواجہ نظام الدینؒ اولیا۔
۲۴۔ حضرت قطب الدینؒ بختیار کاکی۔
۲۵۔ حضرت نصیرالدینؒ چراغ دہلوی۔
۲۶۔ ابراہیم عادل شاہ نورس۔
۲۷۔ بوبوجی خانم زوجہ یوسف عادل شاہ۔
۲۸۔ محمد عادل شاہ۔
۲۹۔ محمد عادل شاہ اور اسکی رانی۔
۳۰۔ جمشید قطب شاہ۔
۳۱۔ محمد قلی قطب شاہ۔
۳۲۔ 〃 〃 دیگر

۳۴۔ ابراہیم عادل شاہ اول۔
۳۵۔ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر۔
۳۶۔ نواب آصفجاہ اول۔
۳۷۔ نواب میر نظام علی خان آصفجاہ ثانی۔
۳۸۔ نواب سکندر جاہ آصفجاہ ثالث۔
۳۹۔ نواب ناصرالدولہ آصفجاہ رابع۔
۴۰۔ نواب میر محبوب علی خان آصفجاہ سادس۔
۴۱۔ ماہ لقا بائی چندہ۔
۴۲۔ حضرت خواجہ بندہ نوازؒ۔
۴۳۔ میر عالم بہادر دیوان دکن۔
۴۴۔ مادنا۔ دیوان گولکنڈہ۔
۴۵۔ شاہ ہاشم بیجاپوری۔
۴۶۔ شاہ بہاؤالدین باجن۔
۴۷۔ سکندر جاہ۔
۴۸۔ ماہ لقا بائی۔

قدیم قلمی تصاویر از کتب خانہ سید قاسم صاحب

۴۹۔ خواجہ عثمان ہارونؒ۔

۵۰۔ عبدالرحمٰن جامیؒ۔

۵۱۔ مہارانی۔

۵۲۔ شاہ عبدالرزاق قادری بیجاپوری۔

۵۳۔ شاہ رضا حسینی۔

حال کی قلمی تصاویر از کتب خانۂ نواب سالار جنگ بہادر

۵۴۔ سلطان قلی قطب شاہ۔

۵۵ جمشید قلی قطب شاہ۔

۵۶۔ ابراہیم قلی قطب شاہ۔

۵۷ محمد قلی قطب شاہ۔

۵۸۔ محمد قطب شاہ۔

۵۹۔ عبداللہ قطب شاہ۔

۶۰۔ ابوالحسن تانا شاہ۔

۶۱۔ آصفجاہ اول۔

۶۲ میر نظام علی خاں آصفجاہ ثانی۔

۶۳۔ نواب سکندر جاہ آصفجاہ ثالث۔

۶۴۔ نواب ناصر الدولہ آصفجاہ رابع۔

۶۵۔ نواب افضل الدولہ آصفجاہ خامس۔

۶۶۔ نواب میر محبوب علی خاں آصفجاہ سادس۔

۶۷۔ نواب میر عثمان علیخاں خلد اللہ ملکہ۔

۶۸۔ مہاراجہ چندو لال۔

۶۹۔ نواب مختار الملک۔

۷۰۔ مہاراجہ نرندر پرشاد۔

۷۱۔ نواب عماد السلطنت۔

۷۲۔ نواب خیر الملک۔

۷۳۔ نواب آسمان جاہ۔

۷۴۔ نواب وقار الامراء۔

۷۵۔ مہاراجہ کشن پرشاد۔

۷۶۔ نواب سالار جنگ بہادر۔

۷۷۔ نواب خورشید جاہ۔

۷۸۔ نواب معین الدولہ بہادر۔

۸۱۔ ابراہیم قلی قطب شاہ۔

۸۲۔ محمد قلی قطب شاہ۔

۸۳۔ محمد قطب شاہ۔

۸۴۔ عبداللہ قطب شاہ۔

۸۵۔ ابوالحسن تانا شاہ۔

۸۶۔ ابراہیم عادل شاہ نورس۔

۸۷۔ سلطان علی عادل شاہ ثانی۔

حال کی قلمی تصاویر جو قیوم صاحب کی بنائی ہوئی ہیں

۸۸۔ ایجنتا کی پیدائش۔

۸۹۔ چاند بی بی معرکہ قلعہ احمد نگر میں۔

۹۰۔ ٹیپو سلطان شہید۔

۹۱۔ پرتھال اور برہمن۔

دیگر تصاویر جو مختلف اصحاب نے پیش کیں

حال کی قلمی تصاویر جو سٹی کالج کی جانب سے تیار کرائی گئیں ۹۲ سلطان محمد قلی قطب شاہ۔

۷۸۔ سلطان قلی قطب شاہ۔

۷۹۔ ابراہیم قلی قطب شاہ۔

۸۰۔ جمشید قلی قطب شاہ۔

۹۳ سلطان عبداللہ قطب شاہ۔

۹۴۔ اعلیحضرت میر محبوب علیخاں غفران مکاں۔

۹۵۔ ہز ہائینس پرنس آف برار نواب اعظم جاہ بہادر۔

۹۶۔ آنریری جنرل شہزادہ والا شان نواب معظم جاہ بہادر۔

۹۷۔ شہزادی دُرِّ شہوار دردانہ بیگم صاحبہ۔ ۹۸۔ شہزادی نیلوفر فرحت بیگم صاحبہ۔

۹۹۔ نواب مکرم جاہ بہادر۔

۱۰۰۔ نواب سالار جنگ بہادر۔

انتخاب کلام ولی

کہتا ہوں ترے نانوں کوں میں ورد زباں کا ‏ ‏ کیتا ہوں ترے شکر کوں عنوان بیاں کا
جس گرد اُپر پاؤں رکھیں تیرے رسولاں ‏ ‏ اُس گرد کوں میں کُحل کروں دیدہ جاں کا
مجھ صدق تی طرف عدل سوں اے اہل حیا دیکھ[1] ‏ ‏ تجھ ظلم کے چہرے پہ نہیں رنگ گماں کا
ہر ذرۂ عالم میں ہے خورشید حقیقی ‏ ‏ یوں بوجھ کہ بلبل ہوں ہر اک غنچہ دہاں کا
کیا سہم ہے آفات قیامت ستی اس کوں ‏ ‏ کھایا ہے جو کوئی تیر تجھ ابرو کی کماں کا
کہتا ہے ولی دل ستی یو مصرع رنگیں ‏ ‏ ہے یاد تری مجکو سبب راحت جاں کا

الٰہی! کر مجھے تو خاک پا اہل معانی کا ‏ ‏ کہ کھلتا ہے اسی صحبت سے نسخہ نکتہ دانی کا
عزیزاں بعد مرنے کے نہ پوچھو تم کہ تنہا ہوں ‏ ‏ لکھا ہوں پردۂ دل پر خیال اُس یار جانی کا
پرت کی بزم میں تا رخ روئی مجکو ہو حاصل ‏ ‏ نین سوں پینے لے ساغر شراب ارغوانی کا
ترے مکھ کی صفائے حیرت افزا کوں سکے کیونکر ‏ ‏ قلم ہے جوہر آئینہ تا صاف مانی کا
شراب جلوۂ ساقی سوں مت کر منع اے زاہد ‏ ‏ یہی ہے مقتضا عالم میں ہنگام جوانی کا

ہوا ہے دل مرا مشتاق تجھ چشم شرابی کا ‏ ‏ خراباتی اُپر آیا ہے شاید دن خرابی کا
کیا بیہوش مجھ دل کوں انیندی نین ساقی نے ‏ ‏ عجب رکھتا ہے کیفیت زمانہ نیم خوابی کا
نہ جاؤں صحن گلشن میں کہ خوش آتا نہیں مجکو ‏ ‏ بغیر از ماہ رو ہرگز تماشا ماہتابی کا

ترے غم میں نکلتا ہے جو باہر نین سوں آنسو ‏ ‏ دُر جا گوہر کہاں ہے جگ میں اسکی آبداری کا

---

[1] بمبئی کے چھپے ہوئے دیوان میں یہ مصرع اس طرح ہے۔ اس صاد صداقت کی طرف اہل حیا دیکھ

طالب نہیں ماہ و مشتری کا
دیوانہ ہوا جو تجھ پری کا

کفارِ فرنگ کوں دیا ہے
تجھ زلف نے درس کافری کا

پایا ہے جو کوئی دولتِ فقر
مشتاق نہیں سکندری کا

پھیکی لگے اُس کوں شانِ دولت
چاکھا جو مزہ قلندری کا

کہتا ہے ولی پکار یو بات
بندہ ہوں پیا کی دلبری کا

یکایک مجھ دسا ایک شہ جواں اسوار تازی کا
کہ جن نے حق سوں پایا ہے خطاب عاشق نوازی کا

نزک میرے کرم کو کر فصاحت ہور بلاغت سوں
کہا وہ سرو قد مجکوں سخن یو سرفرازی کا

محبت یار بے پروا کی سینے میں ہے رات ہور دن
یہی مطلب ہے رات اور دن نمازی اور نیازی کا

مجھے بولیا کہ تو واقف نہیں عشق حقیقی سوں
تو بہتر یوں ہے جا دامن پکڑ عشق مجازی کا

سنیا ہوں جب سوں یہ نکتہ ولی شیریں سخن سیتی
لگیا ہے تب سوں شیوہ جی کو میرے عشق بازی کا

شغل بہتر ہے عشق بازی کا
کیا حقیقی و کیا مجازی کا

ہر زباں پر ہے مثلِ شانہ مدام
ذکر اُس زلف کی درازی کا

ہوش کے ہاتھ میں عناں نہ رہی
جب سوں دیکھا سوار تازی کا

تیں دکھا کر آپس کے مکھ کی کتاب
علم کھویا ہے دل سوں قاضی کا

آج تیری نگہہ نے مسجد میں
ہوش کھویا ہے ہر نمازی کا

گر نہیں راز فقر سوں آگاہ
فخر بیجا ہے فخر رازی کا

دیکھنا ہر صبح تجھ رخسار کا
ہے مطالع مطلع الانوار کا

بلبل و پروانہ کرنا دل کے تئیں
کام ہے تجھ چہرۂ گلنار کا

صبح تیرا درس پایا تھا صنم
شوقِ دل مشتاق ہے تکرار کا

ماہ کے سینے اُپر اے شمع رُو
داغ ہے تجھ حسن کی جھلکار کا

دل کو دیتا ہے ہمارے پیچ و تاب — پیچ تیرے طرۂ طرار کا
اے ولی کیوں سن سکے ناصح کی بات — جو ہے دیوانہ پری رخسار کا

یاد کرنا ہر گھڑی اس یار کا — ہے وظیفہ مجھ دل بیمار کا
آرزوئے چشمۂ کوثر نہیں — تشنہ لب ہوں شربت دیدار کا
عاقبت ہووے گا کیا معلوم نہیں — دل ہوا ہے مبتلا دلدار کا
گر ہوا ہے طالب آزادگی — بند مت ہو سبحہ و زنار کا
مسند گل منزل شبنم ہوی — دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا
اے ولی ہونا سری جن پر نثار — مدعا ہے چشم گوہر بار کا

جیوں لالہ بجز آتش خاموش لب یار — مرہم نہیں عالم میں ولی داغ جگر کا

آیس کی زلف کافر کیش کی جھلکار ٹک دکھلا — کہ زاہد بے خبر دم مارتا ہے پارسائی کا
مرے دل کی حقیقت یوں ہوی ہے شہرۂ عالم — کہ جیوں مشہور ہے مذکور تیری دلربائی کا

گزر ہے تجھ طرف ہر بوالہوس کا — ہوا • عام اشتہائی مگس کا
نبس گھر میں رقیباں کوں نہ دے بار — چمن میں کام کیا ہے خار و خس کا
نگہ سوں تری ڈرتے ہیں نظرباز — سدا ہے خوف دزداں کوں عسس[1] کا
بجز رنگیں ادا دوجے سوں مت مل — اگر مشتاق ہے توں رنگ و رس کا

چاروں طرف کھلیا ہے گلزار رنگ و رس کا — اس سیر جاں فزا سوں سینہ کھلیا ہوس کا
تجھ مکھ کے دیکھنے کوں اے آفتاب طلعت — مشتاق دل سوں میرے شعلہ اُٹھا ہوس کا
دریا میں ہیم کے یہاں گرداں ہے کشتی عقل — اس موج شعلہ زن میں کیا آسرا ہے خس کا

[1] کوتوال

بھر بھر ولی ترے کن آتا ہے جیوں کہ سائل
ترے میٹھے بیاں کا جب سوں پڑیا ہے چسکا

عیاں ہے ہر طرف عالم میں حسن بے حجاب اُس کا
بغیر از دیدۂ حیراں نہیں جگ میں نقاب اُس کا

ہوا ہے مجکو شمع بزم یکرنگی سوں یو روشن
کہ ہر ذرے اُپر تاباں ہے دائم آفتاب اُس کا

کرے عشاق کوں جیوں صورت دیوار حیرت سوں
اگر پردے سوں وا ہووے جمال بے حجاب اُس کا

اگرچہ سب ظاہر میں ہے فرقت درمیاں لیکن
تصور دل میں میرے جلوہ گر ہے صبح و شام اُس کا

محبت کے سرے رووے یہ تا ہووے سند مجکوں
لکھیا ہوں صفحۂ سینہ پہ خون دل سوں نام اُس کا

کفر کوں توڑ دل سوں دل میں کہ بے نیت خالص
ہوا ہے م بن حسرت سوں جا بجمن سوں رام اُس کا

روح بخشی ہے کام تجھ لب کا
دم عیسیٰ ہے نام تجھ لب کا

حسن کے خضر نے کیا لبریز
آب حیواں سوں جام تجھ لب کا

منطق و حکمت و معانی پر
مشتمل ہے کلام تجھ لب کا

نہیں درکار تا بولے بیاں اپنی زباں سیتی
عیاں ہے اشک کے طومار سوں احوال عاشق کا

نہ جاوے کاسہ بیتابی سوں یک لمحہ کدی باہر
زمین بیقراری میں گڑیا ہے نال عاشق کا

ولی یو مصرع رنگیں ہوا ہے دردِ جانِ دل
فدا ہے عشق میں دلبر کے جان و مال عاشق کا

دیکھا ہوں قد و زلف و دہن جب سوں پیو کا
کرتا ہوں تب سوں ورد الف لام میم کا

پری رویاں کے کوچے میں خبرداری سوں جا اے دل
کہ اطراف حرم میں ڈر ہمیشہ ہے حرامی کا

حقیقت سوں تری مدت سوں ہم واقف ہیں اے زاہد
عبث ہم پختہ مغزاں سوں نہ کر اظہار خامی کا

دل کو گر مرتبہ ہے درپن کا
مفت ہے دیکھنا سری جن کا

جامہ زیبوں کوں کیوں تجوں کہ مجھے
گھیر رکھتا ہے دور دامن کا

اے زباں کر مدد کہ آج صنم
منتظر ہے بیان روشن کا

حکمت عشق بوعلی سوں نہ پوچھ
نہیں قانوں شناس اس فن کا

آئینہ تجھ سے ہوکے ہم زانو
حیرت افزا ہوا ہے گلشن کا

دل صد پارہ تجھ پلک سوں ہے بند
خرقہ دوزی ہے کام سوزن کا

لگتا ہے مجکو پنجہ خورشید رعشہ دار
دیکھا ہوں جب سوں دست نگارین نگار کا

ہر ذرہ اس کی چشم میں لبریز نور ہے
دیکھا ہے جن نے حسن تجلی بہار کا

طاقت نہیں کسی کو جو یک حرف سن سکے
احوال گر کہوں میں دل بیقرار کا

پڑیا ہے لعل میں پرتو سجن تجھ مکھ کی لالی کا
بیاں ہے مہر سوں روشن تری صاحب کمالی کا

ترا قد مصرع برجستہ دیوان خوبی ہے
تری یو بیت ابرو شعر بستا ہے ہلالی کا

ترے لب کی حلاوت نے کیا مجھ طبع کو شیریں
ہوا ہے نقل مجلس ذکر مجھ شیریں مقالی کا

نزاکت تجھ کمر کی دل نشیں ہے اس سبب ساجن
ہوا ہے شہرہ عالم میں مری نازک خیالی کا

نگیلے شوخ کا کہنا کیا تھا ترک مدت سوں
ترا یو قد ہوا ہے پھر کے باعث فکر عالی کا

ولی تجھ شعر کوں سنکر ہوئے ہیں مست اہل دل
اثر ہے شعر میں تیرے شراب پرتگالی کا

عبث غافل ہوا ہے گا فکر کرنی کے پانے کا
صفا کر آرسی دل کی سکندر ہو زمانے کا

چراغ دل اگر گل ہے تو کر جیوں گل اسے روشن
کہ یہ تحفہ ہے سالک کوں نزک حق کے لے جانے کا

نہ پاوے دین کی لذت جسے دنیا کی ہے خواہش
قفل ہے لذت دنیا حقیقت کے خزانے کا

لاگی ہے لگن تم سے چھڑا کون سکے گا
اب مجکوں وطن اپنے لجا کون سکے گا

ذرا ہے جو نظا ملہنے ادایاں سوں ہمن کو
اس جگ میں مری داد دلا کون سکے گا

پھرتی ہیں سیہ مست ہو شمشیر نظر لے
تن نیند ان انکھیاں کو پکڑ کون سکے گا

جس وقت لے سری جن تو بے حجاب ہوگا
ہر ذرہ تجھ جھلک سوں جیوں آفتاب ہوگا

مت جا چمن میں لالن بلبل پہ مت ستم کر
گرمی سوں تجھ نگہ کی گل گل گلاب ہوگا

مت آئینہ کوں دکھلا اپنا جمال روشن
تجھ مکھ کی تاب دیکھے آئینہ آب ہوگا

نکلا ہے وو ستمگر تیغ ادا کوں لے کر
سینہ کا عاشقاں کے اب فتح باب ہوگا

دکھتا ہے کیوں جفا کوں مجھ پر روا اے ظالم
محشر میں تجھ سوں میرا آخر حساب ہوگا

تجھ لب کی صفت لعل بدخشاں سوں کہونگا
جادو ہے تری نین غزالاں سوں کہوں گا

دی حق نے تجھے بادشہی حسن نگر کی
جا کشور ایراں میں سلیماں سوں کہوں گا

تعریف ترے قد کی الف وار سری جن
جا سرو گلستاں میں خوش الحاں سوں کہونگا

زخمی کیا ہے دل تری پلکاں کی انی نے
یو زخم ترا خنجر و پیکاں سوں کہوں گا

دیکھا ہوں تجھے خواب میں اے مایۂ خوبی
اس خواب کو جا یوسف کنعاں سوں کہونگا

وو صنم جب سوں بسا دیدۂ حیراں میں آ
آتش عشق پڑی عقل کے ساماں میں آ

ناز دیتا نہیں گر رخصت گلگشت چمن
اے چمن زار حیا دل کے گلستاں میں آ

حسن تھا پردۂ تجرید میں سب سوں آزاد
طالب عشق ہوا صورت انسان میں آ

حاکم وقت ہے تجھ گھر میں رقیب بد خو
دیو مختار ہوا ملک سلیمان میں آ

کتاب حسن کا یہ مکھ صفا تیرا صفا دستا
ترے ابرو کے دو مصرع سوں اس کا ابتدا دستا

ترا مکھ حسن کا دریا و موجاں چیں پیشانی
اپر ابرو کی کشتی کے یو تل جیوں ناخدا دستا

ترے لب ہیں بظاہر حوض کوثر مخزن خوبی
یہ خال عنبریں تس پر بلال آسا کھڑا دستا

اشارت کر انکھاں سوں گرچہ ہوں بیمار ہیں لیکن
ترا لب اے مسیح وقت قانون شفا دستا

یو خط کا حاشیہ گرچہ ولی ہے مختصر لیکن
مطول کے معانی کا تمامی مدعا دستا

مت آتش غفلت سوں مرے دل کوں جلا جا
مشتاق ہوں تجھ درس کا ٹک درس دکھا جا

آزردہ نہ ہو، غصہ نہ کر، بات مری سن
ڈرتا نہیں یک بات کی سو بات سنا جا

جلتا ہوں میں مدت ستی اے حسن کے دریا
ٹک مکھ کوں دکھا، آگ مرے دل کی بجھا جا

خواہش ہے مجھے درد کے پڑھنے کی ہمیشہ
یکبار کسو طرز سوں ٹک اسم بتا جا

دل کوں لگتی ہے دلربا کی ادا
جی میں بستی ہے خوش ادا کی ادا

گرچہ سب خوبرو ہیں خوب ولے
قتل کرتی ہے میرزا کی ادا

حرف بیجا بجا ہے گر بولوں
دشمن ہوش ہے پیا کی ادا

نقش دیوار کیوں نہ ہو عاشق
حیرت افزا ہے بیوفا کی ادا

گل ہوے غرق آب شبنم میں
دیکھ اس صاحب حیا کی ادا

اشک رنگیں میں غرق ہے نس دن
جن نے دیکھی ہے تجھ حنا کی ادا

اے ولی درد سر کی دارو ہے
مجکو اس صندلی قبا کی ادا

دیکھا ہے جن نے تیرے رخسار کا تماشا
نہیں دیکھتا سورج کی جھلکار کا تماشا

رشتے کوں بندگی کے ڈالیا اپس گلے میں
دیکھا جو تجھ صنم کے زنار کا تماشا

موسیٰ اگر جو دیکھے تجھ نور کا تماشا
اس کوں پہاڑ ہووے پھر طور کا تماشا

کثرت کے پھول بن میں جاتے نہیں ہیں عارف
بس ہے موحداں کوں منصور کا تماشا

تیرے شکر لب کو اب مثل عسل بولنا
بلکہ عسل ہے نقل اس کوں اصل بولنا

تجھ حُسنِ عالم تاب کا جو عاشق و شیدا ہوا
ہر خوبرو کے حُسن کے جلوے سوں بے پروا ہوا

ہیں مصلحِ کُل کے جوہراں میرے سخن سوں جلوہ گر
از بسکہ وسعت مشربی سوں دل مرا دریا ہوا

پایا ہے جگ میں اے ولی وہ لیلیِ مقصود کوں
جو عشق کے بازار میں مجنوں نمن رسوا ہوا

تجھ مکھ کے مُصحف کے بیچ آیت جو دیکھی قہر کی
ہیبت سوں جیوں زیر و زبر دل ٹوٹ، سی پارا ہوا

غافل نہ رہ اے سنگدل ہرگز ولی کے حال سوں
جس آہ کی آتش کوں سُن خارا کا دل پارا ہوا

جب صنم کو خیال باغ ہوا
طالبِ نشۂ فراغ ہوا

فوجِ عشاق دیکھ ہر جانب
نازنیں صاحب ۰ اغ ہوا

رشک سوں تجھ لباں کی سرخی کے
جگر لالہ داغ داغ ہوا

دل عشاق کیوں نہ ہوں روشن
جب خیال صنم چـ اغ ہوا

اے ولی گلبدن کوں باغ میں دیکھ
ل صد برگ باغ باغ ہوا

مسجودِ آفتاب ہوا ہے شرف سوں آج
وہ نقشِ پا کہ زینتِ روئے زمیں ہوا

پھر میری خبر لینے وہ صیّاد نہ آیا
شاید کہ مرا حال اُسے یاد نہ آیا

مدت ستی مشتاق ہیں عشاق جفا کے
بیداد کہ وہ ظالم بیداد نہ آیا

جاری کیا ہوں جوئے رواں اشک رواں سوں
افسوس کہ وہ غیرتِ شمشاد نہ آیا

جس غم نیں موزوں کیا ہے آہ کا مصرع
وہ مصرعِ دلچسپ پری زاد نہ آیا

پہنچی ہے ہر اک گوش میں فریاد ولی کی
لیکن وہ صنم سُننے کو فریاد نہ آیا

صد حیف کہ وہ یار مرے پاس نہ آیا
میرا سخن راست اُسے راس نہ آیا

بیگانگی بات یگانے کی عجب ہے
آخر کو اُسے غیر سوں وسواس نہ آیا

بلبل کی نمط نالہ و زاری میں رہوں نس دنا
افسوس وہ گلدستۂ خوش باس نہ آیا
اس یار وفادار سوں مجھ آس تھی لیکن
ہرگز وہ بجھانے کو مری پیاس نہ آیا

دل میں جب عشق نے تاثیر کیا
فردِ باطل خطِ تدبیر کیا
بند کرنے دلِ وحشی زدہ کوں
دامِ رہ زلف گرہ گیر کیا
جز الم اُس کو نہ ہووے حاصل
عشق بے پیر کوں جن پیر کیا
گریہ و گرد ملامت سوں ولی
خانۂ عشق کوں تعمیر کیا

کشورِ دل کوں ترے ناز نے تسخیر کیا
فوج مجنوں کوں تری زلف نے زنجیر کیا
عاشقِ زار مجھ سوں ہوا ہے بیزار
نقد دل دے کے میں دلدار کو دلگیر کیا
گردِ غم آبِ نین درد کے معمار نے
خانۂ عشق جگر سوز کوں تعمیر کیا

برائی جو کہاتے ہیں، اُسے کم یار کرنا کیا
ہوی جوگن جو کوئی پی کی اُسے سنسار کرنا کیا
جو پیوے پرت کا پانی اُسے کیا کام پانی سوں
جو بھوجن دکھ کا کرتا ہے اُسے آہار کرنا کیا

معنی طرف چلیا ہے صورت سوں یوں مرا دل
سوت ستی چلیا ہے تجھے جہاز گویا
ہر یک نگہ میں تیری ہے نغمۂ محبت
ہر تار تجھ نگہ کا ہے تار ساز گویا

باعثِ نشہ دو بالا ہے
حسنِ صورت کے ساتھ حسنِ ادا
اے ولی مجھ سخن کو دو بوجھے
جس کو حق نے دیا ہے فکر رسا

حق نے کو لولاکَ لمَا حق میں محمد کے کہا
اُن سوا کون سے مرسل نے یہ رتبہ پایا

جب سوں وو نازنیں کی میں دیکھا ہوں چھب عجب — دل میں مرے خیال ہیں تب سوں عجب عجب
جاتا ہے دن تمام اُسی لمحہ کی یاد میں — ہوتا ہے فکرِ زلف میں احوالِ شب عجب

* * *

بیتاب ہو کے مثلِ گدایاں نزیک جا — بیباک ہو کے تب یو کیا میں طلب عجب
دو نین سوں ترے ہے دو بادام کا سوال — سُن یو سوال دل میں رہا بستہ لب عجب
بولیا مری نگاہ کی قیمت ہے دو جہاں — جس دیکھنے سوں دل میں ترے ہے طرب عجب
اس دولتِ عظیم کوں یوں مفت مانگنا — لگتی ہے مجکوں بات تری بے ادب عجب

* * *

نتھے احباب خود بینی سوں دائم عکس ہے دل میں — کیا جو ترکِ زینت کوں اُسے درپن سوں کیا مطلب
سخن صاحبِ سخن کا سُنکے ملنے کی ہوس مت کر — جواہر جب ہوے حاصل تو بحرِ معدن سوں کیا مطلب
ولی جنت منیں رہنا نہیں درکار عاشق کوں — جو طالب لامکاں کا ہے اُسے مسکن سوں کیا مطلب

* * *

ہمیشہ ہے بہارِ سروِ آزاد — نہ جاوے دولتِ حُسنِ خداداد
وفا کو ترک مت کر ہرگز اے دل — محبت ہے وفا بن سست بنیاد

* * *

مت پست فطرتاں سوں مل اے سروِ نازنیں — تجھ قد کا نام جگ میں ہے نام خدا بلند

* * *

سُخن شناس کے نزدیک کم نہیں یزید — کسو کے مطلبِ رنگیں کوں جو کیا ہے شہید
یہ زلف و خالِ سیہ نے دیا ہے جگ کوں فریب — وفا کے دینے میں یک رنگ ہیں یہ پیر و مرید
کھلا ہے عقدۂ دل تجھ پلک کی سوزن سوں — ترے نین کا اشارہ ہے قفلِ دل کی کلید

* * *

سجن تجھ گلبدن سا آج نہیں ثانی چمن بھیتر — غلط بولا چمن کیا بلکہ جنات عدن بھیتر

بے جدائی نہ کر خدا سوں ڈر — بے وفائی نہ کر خدا سوں ڈر
راست کیشاں سوں لے کمان ابرو — کج ادائی نہ کر خدا سوں ڈر
مت تغافل کوں راہ دے اے شوخ — جگ ہنسائی نہ کر خدا سوں ڈر
ہے جدائی میں زندگی مشکل — آ جدائی نہ کر خدا سوں ڈر
عاشقاں کو شہید کر کے صنم — کف حنائی نہ کر خدا سوں ڈر
اے ولی غیر آستانۂ یار — جبہہ سائی نہ کر خدا سوں ڈر

رحم بیجا ستم برابر ہے — توں رقیباں اوپر کرم مت کر

عالم میں ہے وہ تیر ملامت کا نشانہ — جس تن سوں ترے غم کا کیا تیر گزر کر
تجھ حسن کی جھلکار سوں کیا بدر کوں نسبت — جو کوئی کہ تجھے بدر کہے اس کو بدر کر
اس ظالم خونخوار کوں جی بخش کیا ہوں — جس عشق نے عالم کوں دیا زیر و زبر کر

دل لگا یار سوں اس دل کا چھڑانا مشکل — عشق کا زخم لگا اس کا سلانا مشکل
حسن ہے دام بلا زلف ہیں دو کالے ناگ — جس کے تئیں ناگ ڈسا اس کا جلانا مشکل
آتش عشق نے بہتوں کا کیا خانہ خراب — آگ دریا کوں لگی اس کا بجھانا مشکل
یاد کرنے کوں لیا ہاتھ میں من کا منکا — دل اپر بوجھ پڑے من کا پھرانا مشکل
راز مخفی ولی ظاہر نہ کسو سوں کرنا — ہاتھ سوں بات گئی اس کا پھر آنا مشکل

جیوں گل شگفتہ رو ہیں سخن کے چمن میں ہم — جیوں شمع سر بلند ہیں ہر انجمن میں ہم

قسمت تری ہے حق پہ نہ ہونا امید یہاں — نہیں بس تغافل کوں غیر توکل کلید یہاں
سختی کے بعد عیش کا امیدوار رہ — آخر ہے روزہ دار کوں اک روز عید یہاں

ظلمات میں یقیں کم لے گا تجھ آب خضر — دامن تلے ہے رات کے روز سفید یہاں
سب کام اپس کے سونپ کے حق کوں نجنت رَو — یہ ہے تمام مقصد گفت و شنید یہاں

دل ہوا ہے مرا خراب سخن — دیکھ کر حُسن بے حجاب سخن
راہ مضمون تازہ بند نہیں — تا قیامت کھُلا ہے باب سخن
گوہر اس کی نظر میں جا نہ کرے — جن نے دیکھا ہے آب و تاب سخن
ہے تری بات اے نزاکت فہم — لوح دیباچۂ کتاب سخن

یک بار مری بات اگر گوش کرے توں — ملنے کو رقیباں کے فراموش کرے توں
ہے بسکہ تری نین میں کیفیت مستی — یک دید میں کونین بیہوش کرے توں
اے سرو گل اندام اپس نقش قدم سوں — بر جا ہے اگر صحن کوں گل پوش کرے توں
اے جان ولی وعدۂ دیدار کو اپنے — ڈرتا ہوں مبادا کہ فراموش کرے توں

چلنے نہیں اسے چنچل ہاتی کوں لجاوے توں — بے تاب کرے جگ کوں جب ناز سوں آوے توں
گویا کہ شفق پیچھے خورشید ہوا ظاہر — جب اوٹ میں پردے کی چہرے کوں دکھاوے توں
لوٹی فلک انکھ میں انگشت تحیر لے — جب پاؤں نزاکت سوں مجلس میں بجاوے توں
یک تان سنانے میں جی جان لیا سب کا — اب دل سوں گزر جاویں، گر بھاؤ بتاوے توں

کیا کہوں تجھ قد کی خوبی سرو عریاں کے حضور — خود بخود رسوا ہے اُس کوں پھر کے رسوا کیا کروں

خدایا ملا صاحب درد کوں — کہ میرا کہے درد بے درد کوں
کرے غم سوں صد برگ صد پارہ دل — دکھاؤں اگر چہرۂ زرد کوں

مجلس ادارت قومی سنہ ۱۳۴۶ ف

یکبارگی ہوتا ہے ولی زر کے نمن زرد　　جب باندھ کے آتا ہے تو دستار زری کوں

پڑے سن کر اچھل جیوں مصرع برق　　اگر مصرع لکھوں ناصر علی کوں

فدائے دلبر رنگیں ادا ہوں　　شہید شاہد گلگوں قبا ہوں
ہر اک مہ رو کے ملنے کا نہیں شوق　　سخن کے آشنا کا آشنا ہوں
کیا ہوں ترک نرگس کا تماشا　　طلبگار نگاہ باحیا ہوں
نہ کر شمشاد کی تعریف مجھ پاس　　کہ میں اس سرو قد کا مبتلا ہوں
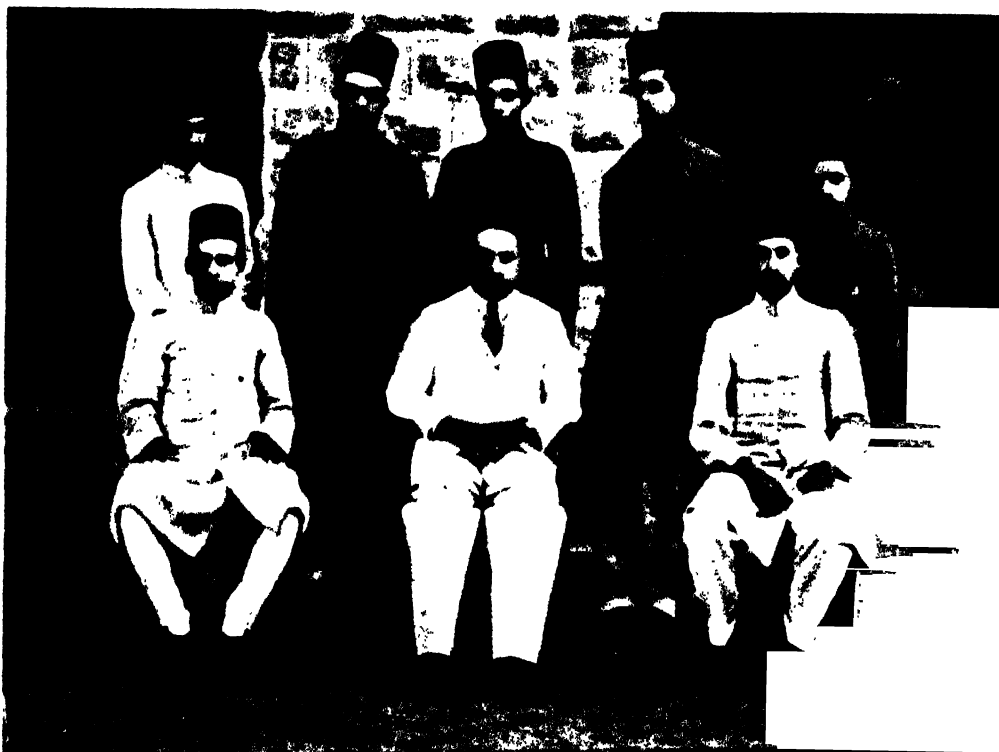
پیدا ہوا ہے ملک میں ولی صاحب سخن　　میری طرف سوں جا کے لکھاؤ نئی کے تئیں

تیری تواضع دیکھکر یہ جانا ہے اے جان ولی　　گر بو علی سینا لکھے دفتر ترے اخلاق میں

دل نے تسخیر کیا شوق کوں حیرانی میں　　آرسی سیتی ملاقات ہے [illegible] خوانی میں
خط کے آنے نے خبردار کیا گلرو کوں　　نشہ ہوش ہے اس بادۂ ریحانی میں
دہر آئینہ تجھ خط کی سنا جب سوں خبر　　تب لگ یہ رنگ نمن غرق ہوا پانی میں
خط کا آخر کوں ہوا تخت پہ پری رو کے گزر　　ہو کوں راہ ملی ملک سلیمانی میں
دل بے تاب کہ اک آن نہیں اس کوں قرار　　زلف دلدار سوں ہم ہے پریشانی میں

کیوں کہ سیری ہو حسن سوں تیرے　　دھوپ کھانے سوں پیٹ بھرتا نہیں

مجکوں تجھ بن کسی سوں کام نہیں　　فکر ناموس و ننگ و نام نہیں
صف عشاق کوں بکعبہ قسم　　غیر آوارگی امام نہیں

گرچہ پچھن ترا ہے رام ولے — اے سجن تو کسی کا رام نہیں
زندگی جامِ عیش ہے لیکن — فائدہ کیا اگر مدام نہیں
عشق اُس کا ہے ناتمام جسے — پی کی خاطر کا اہتمام نہیں

خوب رُو خوب کام کرتے ہیں — یک نگہ میں غلام کرتے ہیں
دیکھ خوباں کوں وقت ملنے کے — کس ادا سوں سلام کرتے ہیں
کم نگاہی سوں دیکھتے ہیں ولے — کام اپنا تمام کرتے ہیں
کھولتے ہیں جب اپنی زلفاں کوں — صبح عاشق کوں شام کرتے ہیں
صاحب لفظ اُس کوں کہہ سکیے — جس سوں خوباں کلام کرتے ہیں

گرد خجلت کوں ندامت کے انجھو سات ملا — مور در رحمت حق اس ستی تعمیر کرو
عشق کہتا ہے ولی آکے بہ آواز بلند — اے جواناں تمھیں سب درد کوں دل گیر کرو

چاہو کہ پی کے پگ تلے اپنا وطن کرو — اول اپس کوں عجز میں نقش چرن کرو

سفرِ عشق کا اگر ہے خیال — ہمت دل کوں زاد راہ کرو
عاشقاں! عاشقی کے دعوے پر — آہ و زاری کوں دو گواہ کرو
گل و بلبل کا گرم ہے بازار — اس چمن میں جدھر نگاہ کرو

پاکبازاں میں ولی ہے مشہور — اُس سوں چہرے کوں چھپایا نہ کرو

فکر جمعیت اپس دل میں کیئے ہیں زہاد — زلف کو کھول غریباں کو پریشاں نہ کرو

غفلت میں وقت اپنا نہ کھو ہشیار ہو ہشیار ہو — کب لگ رہیگا خواب میں بیدار ہو بیدار ہو
گر دیکھنا ہے مدعا اس شاہدِ معنی کا رُو — ظاہر پرستاں سوں سدا بیزار ہو بیزار ہو
وہ نو بہارِ عاشقی ہے جیوں سحر جگ میں عیاں — اے دیدہ وقتِ خواب نہیں بیدار ہو بیدار ہو

سجن تم مکھ ستی کھولو نقاب آہستہ آہستہ — کہ جیوں گل سوں نکلتا ہے گلاب آہستہ آہستہ
ہزاراں لاکھ خوباں میں سجن میرا چلے یوں کر — ستاروں میں چلے جیوں ماہتاب آہستہ آہستہ
سلونی سانوری پیتم ترے موتی کی جھلکاں نے — کیا عقدِ ثریا کوں خراب آہستہ آہستہ

یہ مرا رونا کہ ہے تیری ہنسی — آپ بس نہیں پر بسی ہے پر بسی
کل رقیباں میں کرم میرے اُپر — جور سی ہے جور سی ہے جور سی
رات دن جگ میں رفیقِ بیکساں — بے کسی ہے بیکسی ہے بے کسی
سست ہونا عشق میں تیرے صنم — ناکسی ہے ناکسی ہے ناکسی
باعثِ رسوائی عالم ولی — مفلسی ہے مفلسی ہے مفلسی

اُس کوں حاصل جگ میں ہو کیوں کر فراغِ زندگی — گردشِ افلاک ہے جس کوں ایاغِ زندگی
بے عزیزاں سیرِ گلشن ہے گلِ داغِ الم — جنتِ احباب ہے معنی میں باغِ زندگی
آسماں میری نظر میں کلبۂ تاریک ہے — گر نہ دیکھوں تجکوں اے چشم و چراغِ زندگی
لالۂ خونیں کفن کے حال سوں ظاہر ہوا — بستگی ہے خال سوں خوباں کے داغِ زندگی
کیوں نہ ہووے اے ولی روشن شبِ قدرِ حیات — ہے نگاہِ گرم گل رویاں چراغِ زندگی

جسے عشق کا تیر کاری لگے — اُسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے
نہ چھوڑے محبت دمِ مرگ تک — جسے یارِ جانی سوں یاری لگے
نہ ہووے اُسے جگ میں ہرگز قرار — جسے عشق کی بیقراری لگے

ہر اک وقت مجھ عاشق زار کوں ـــ پیارے تری بات پیاری لگے
ولی کوں کہے تو اگر یک بچن ـــ رقیباں کے دل میں کٹاری لگے

تعریف اُس پری کی جسے تم سُناؤگے ـــ تا حشر اُس کے ہوش کوں اُس میں نہ پاؤگے

چھوڑ اے شوخ طرز خود کامی ـــ مت ہو ہر دیدہ بازکادامی
تجھ لب و زلف کے تماشے کوں ـــ چل کے آئے ہیں مصری و شامی
اے ولی غیر عشق حرف دگر ـــ پختہ مغزاں کے نزد ہے خامی

آغوش میں آنے کی کہاں تاب ہے اُس کوں ـــ کرتی ہے نگہ جس قدِ نازک پہ گرانی
مت دور ہو یک آن ولی پاس سوں ہرگز ـــ اے باعثِ جمعیت ایام جوانی

نہ وہ بالا نہ وہ بالی بلا ہے ـــ بلائے عاشقاں ناز و ادا ہے
تغافل شوخ کا عاشق کے حق میں ـــ ستم ہے ظلم ہے جور و جفا ہے
نہ جاوے تجکوں چھوڑ اے گلشن ناز ـــ مرا دل بلبلِ باغ وفا ہے

صنم میرا سخن سوں آشنا ہے ـــ مجھے فکرِ سخن کرنا روا ہے
تغافل نے ترے زخمی کیا مجھ ـــ تری یہ کم نگاہی نیمچا ہے
نہیں واں آب غیر از آب خنجر ـــ شہادت گاہِ عاشق کربلا ہے
غنیمت بوجھ ملنے کو ولی کے ـــ نگاہِ پاکبازاں کیمیا ہے

دیکھا ہوں جسے وہ مبتلا ہے ـــ خوباں کی نگہ نہیں بلا ہے
گر تجکوں ہے عزم سیر گلشن ـــ دروازۂ آرسی کھلا ہے

اک دل نہیں آرزو سے خالی — ہر جا ہے محال اگر خلا ہے
تسخیر کیا ہے گوشۂ گل کوں — بلبل کا ولی عجب گلا ہے

ساقی و مطلوب آج ہیں ہم رنگ — نشۂ بے خودی دو بالا ہے
کیوں نہ ہر ذرہ رقص میں آوے — جلوہ گر آفتاب سیما ہے

عشق کے مفتی نے یوں فتوے دیا — دیکھنا خوباں کا بس خوب ہے
تخت دل پر خط لکھا ہوں یار کوں — داغ دل مہر سر مکتوب ہے
غمزہ و ناز و ادائے نازنیں — ظلم ہے طوفان ہے آشوب ہے
للہ یا یوسف غلامی خط تجھے — گرچہ نور دیدۂ یعقوب ہے

عاشقاں کی قید تیرا حسن عالمگیر ہے — بلبلاں کوں بند کرنے موج گل زنجیر ہے
تجھ نین کی ہے نگاہ راست تیر بے خطا — کج ادائی تجھ بھواں کی جوہر شمشیر ہے

موسم خط میں ذکر کر اے گل رنگیں ادا — سبزۂ گلزار خوبی کا ہنوز آغاز ہے
زندگی میں طائر دل کوں خلاصی کیوں کر ہو — پنجۂ عشق ستمگر چنگل شہباز ہے
دردمنداں کوں سدا ہے قول مطرب دل نواز — گرمی افسردہ طبعاں شعلۂ آواز ہے

شوق کے مرکب کوں راہ عشق میں — اے سجن تیری نگہ مہمیز ہے
ہر پلک تیری کرے ہے تیغ فرنگ — عاشقاں کے مارنے کوں تیز ہے
ہاتھ میں میرے نہ سمجھو تم بیاض — شوخ کے لینے کی دست آویز ہے

خاطر سوں گئی ہے خواہش اسباب دنیوی کی — ہمت بلند کی رہ میں مجھ زاد راہ بس ہے

جو صاف دل ہیں اُن کوں درکار نہیں ہے زینت
جیوں آرسی، نمد کی سر پر کلاہ بس ہے

اسباب جنگ رکھنا درکار نہیں ہے ہم کوں
دشمن کے مارنے کوں اک تیر آہ بس ہے

نہیں آرزو کہ بیٹھوں مسند پہ سلطنت کی
تیری گلی میں آنا، یہ دستگاہ بس ہے

درکار نہیں ہے مسجد سجدے کوں عاشقاں کے
محراب تجھ بھواں کی لے قبلہ گاہ بس ہے

مت تیر اور کماں کی کر فکر اے خوش ابرو
عاشق کے مارنے کوں سیدھی نگاہ بس ہے

دل لے گیا ہمارا جادو سوں وو پری رو
دیوانگی ہماری اُس پر گواہ بس ہے

جس کوں تجھ حسن کی نہیں ہے خبر
بے گماں وو جہاں میں غافل ہے

عشق کی راہ کے مسافر کوں
ہر قدم تجھ گلی میں منزل ہے

اے **ولی** طرز عشق آساں نہیں
آزمایا ہوں میں کہ مشکل ہے

ہر ایک سوں متواضع ہو سروری یہ ہے
سنبھال کشتیٔ دل کوں قلندری یہ ہے

نکال خاطر خاتر سوں جام جم کا خیال
صفا کر آئینۂ دل سکندری یہ ہے

تو جان بوجھ، جانا ہوا سو میں بوجھا
کہ زندگی منیں مقصود زرگری یہ ہے

خیال یار سوں رکھ اپنے دل میں محکم کر
کہ عاشقاں کے نزک شیشۂ پری یہ ہے

بسا عزیز ہیں تجھ مکھ کے آفتاب پرست
تو جلوہ گر ہو کہ اب ذرہ پروری یہ ہے

مفلسی سب بہار کھوتی ہے
مرد کا اعتبار کھوتی ہے

کیوں کہ حاصل ہو مجکوں جمعیت
زلف تیری قرار کھوتی ہے

ہر سحر شوخ کی نگہ کی شراب
مجھ انکھاں کا خمار کھوتی ہے

کیوں کہ ملنا صنم کا ترک کروں
دلبری اختیار کھوتی ہے

عشق بے تاب جاں گدازی ہے
حسن مشتاق دل نوازی ہے

اشکِ خونیں سوں جو کیا ہے وضو — مذہبِ عشق میں نمازی ہے
جو ہوا رازِ عشق سوں آگاہ — وو زمانے کا فخرِ رازی ہے
پاک بازاں سوں یوں ہوا معلوم — عشق مضمونِ پاکبازی ہے
جا کے پہنچی ہے حدِ ظلمت کوں — بس کہ تجھ زلف میں درازی ہے
تجربے سوں ہوا مجھے ظاہر — نازِ مفہومِ بے نیازی ہے
اے ولی عشقِ ظاہری کا سبب — جلوۂ شاہدِ مجازی ہے

تو جتے یار مین کاسی ہے — جوگی دل وہاں کا باسی ہے
پی کے بیراگ کی اداسی سوں — دل بھی بیراگی و اداسی ہے
اے صنم تجھ جبیں اُپر یہ خال — ہندوے ہردوار باسی ہے
زلف تیری ہے موج جمنا کی — پاس تل اُس کے جیوں سناسی ہے
گھر ترا ہے یہ رشک دیوالیں — اس میں مدت سوں دل اُپاسی ہے
یہ سیہ زلف تجھ زنخداں پر — ناگنی جیوں کنویں پہ پیاسی ہے

ترا مکھ مشرقی، حسن انوری، جلوہ جمالی ہے — نین جامی، جبیں فردوسی و ابرو ہلالی ہے
ریاضی فہم و گلشن طبع و دانا دل، علی فطرت — زباں تیری فصیحی و سخن تیرا زلالی ہے
جگہ میں فیضی و قدسی سرشت و طالبِ شیدا — کمال بدر دل اہلی و انکھیاں سوں غزالی ہے
توہی ہے خسرو روشن ضمیر و صائبِ شوکت — ترے ابرو یہ مجھ بیدل کوں طغرائے وصالی ہے
ولی تجھ قد و ابرو کا ہوا ہے شوقی و مائل — تو ہر اک بیت عالی اور ہر اک مصرع خیالی ہے

باعثِ دلربائی عاشق — خوش نگاہوں میں خوش نگاہی ہے

مت تصور کرو مجھ دل کوں کہ ہرجائی ہے — چمنِ حسن پری رو کا تماشائی ہے

اے ولی رہنے کوں دنیا میں مقام عاشق ۔ کوچۂ یار ہے یا گوشۂ تنہائی ہے

شکر، وہ جان گئی، پھر آئی ۔ عیش کی آن گئی پھر آئی
تیرے آنے ستی اے راحت جاں ۔ شہر کی جان گئی پھر آئی
پھر کے آنا ترا ہے باعث شوق ۔ جس طرح تان گئی پھر آئی

تجھ مکھ کا رنگ دیکھ کنول جل میں جل گئے ۔ تیری نگاہ کرم سوں گل گل پگھل گئے
صافی ترے جمال کی کاں لگ بیاں کروں ۔ جس پر قدم نگاہ کے اکثر پھسل گئے

در نعت حضرت خیر البشر صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم

عشق میں لازم ہے اول ذات کوں فانی کرے ۔ ہو فنا فی اللہ دائم یاد یزدانی کرے
یاد کے گلزار پر دونین کر ابر بہار ۔ پیچ کھا سینے میں دل کوں سنبلستانی کرے
مرتبہ خلت پناہی کا وہ پاویگا جو کئی ۔ مثل اسماعیل اول جی کوں قربانی کرے
جوش دے یکبارگی دریا کوں دل کے لہو ستی ۔ گوہر انجھواں کوں رو رو رنگ مرجانی کرے
جو اپس تن کو گلاوے عشق میں ہر صبح و شام ۔ وہیچ کامل ہو سو جیسے ماہ تابانی کرے
سرخرو ہو آبرو دو جگ میں پاوے اے عزیز ۔ دل کو لوہو کر اول لوہو سوں جو پانی کرے
عشق کی آتش میں جلنے تن کوں جو کئی رات دن ۔ وہ قیامت لگ سو جیوں سورج درخشانی کرے
وہیچ پاوے مطلب راضیۃ مرضیۃ ۔ محض للہ جگ میں جو اعمال پنہانی کرے
درد پڑھنے درد کا انجھواں کی تسبی ہاتھ لے ۔ دل کوں کرسی پارۂ غم ذکر قرآنی کرے
عشق سوں فارغ جو کئی وہ نحس اکبر ہے مدام ۔ ساتویں خندق پر اگر ایوان کیوانی کرے
وہیچ دانا ہے تجے کر دوں دوں کوں ایعزیز ۔ مٹ کے دنیا کوں جو کئی جگ میں خدادانی کرے
اپنے مطلب کے سوں لیلیٰ کا وہی دیکھے جمال ۔ عشق میں دل کو جو مجنون بیابانی کرے

حشر میں شیریں ہو وہ حق سوں سُنے شیریں بچن
شوق میں دل کوں جو فرہاد کہستانی کرے

بوریائے بے ریا کوں تخت سوں بوجھے ادھک
فقر اُپر ہو کر سلیماں شکر رحمانی کرے

جیوں انگوٹھی میں نگینہ یوں کرے تسخیر خلق
تخت دل کوں جو بہ از تخت سلیمانی کرے

زندگی پاوے ابد کی جگ منیں وہ خضر وقت
جو اپس کوں فدوی محبوب سبحانی کرے

الحمد دو جہاں کی عید ہے تجھ ذات سوں
خلق کوں لازم ہے جی کوں تجھ پہ قربانی کرے

وہ اچھے آزاد جو بازار میں تجھ حسن کے
بندگی میں آپ کوں جیوں ماہ کنعانی کرے

ربنوا الحانکہ کا گر سُنے داؤد شاد
ہووے خوش دربار پر تیرے خوش الحانی کرے

نوح تجھ رحمت کی کشتی باج کہیں پاوے نجات
تجھ غضب کا گر سمندر جوش طوفانی کرے

بندۂ عالی میں دیکھے حق نزیک پیا کلام
گر علیم اللہ آ تیری ثنا خوانی کرے

جسم کوں من روح سوں آوے بہت مشتاق ہو
گر تری امت خلیل اللہ کی مہمانی کرے

تب مسیحا فقر کے خط کوں سکھے گا تجھ نزیک
مشق کرنے فقر کی جب لوح پیشانی کرے

جس مکاں میں ہے تمہاری فکر روشن جلوہ گر
عقل اول آ کے واں اقرار نادانی کرے

علمتاں کی سب کتاباں دھوئے یکبارگی
گر فلاطوں تجھ دبستاں میں سبق خوانی کرے

تجھ قدم پر جو اپس کا سیس راکھے جیوں سپج
وہ قیامت لگ اپس جبہے کوں نورانی کرے

کیا ملک کیا انس و جن یہ جگ میں کس کوں ہو سکت
خط بنا تجھ کہہ کے جو تفسیر قرآنی کرے

دیکھ طوبیٰ قد ترا جنبش میں آوے شوق سوں
جب گلستاں ارم کی تو خرامانی کرے

عارفاں بولیں گے جان و دل سوں لاتعد آفریں
جب ولی تیری مدح میں گوہر افشانی کرے

مثنوی

الٰہی دل اُپر دے عشق کا داغ
یقیں کے نین میں سٹ کحل مازاغ

الٰہی عشق میں مشتاق کر مجھ
اپس کے عشق کا مشتاق کر مجھ

شریعت کا جہاں ہے شائع عام
یہ من کا دھانچہ کر آغاز و انجام

عیاں کر دل اُپر راز طریقت
سنے پر کھول ابواب حقیقت

پرکھنے معرفت کا جو ہے صاف — اپس کے فرض سوں کر دل کوں صاف

چمن یوں شوق کے دل کھول جیوں گل — اسی گل کے اُپر کر دل کوں بلبل

مجھے دے نقش گل سوں دل بیناں — مرے مقصد کے روشن کر چراغاں

برہ کی بارگہ میں مجلوں جاوے — مجھے اس شوق کی عشرت سداوے

یہ دل میرا کر جیوں شیشۂ دل — پریشانی نہ دے مانند سنبل

محبت کی عطا کر مے پرستی — اپس کی معرفت کی بخش مستی

جہاں کی فکر سوں آزاد کر مجھ — اپس کی یاد سوں آباد کر مجھ

برہ کے باغ میں دے آبداری — ہمیشہ رکھ جھڑی نیناں کی جاری

مجازی کی مجالس سوں جدا رکھ — مجھے اس فتنہ سوں نا آشنا رکھ

حقیقت کی زلف کا کھول بستار — سو یک یک تار کا مجھ کر گرفتار

شتابی سوں نے لے ساقی مہرباں — برہ کا جام جیوں سورج درخشاں

کہ خورشید نبوت کی مدح میں — کنول کا دل کھلا سینہ کے دچ[1] میں

محمد وہ کہ جس کے حق میں لولاک — کہا ہے خالق املاک و افلاک

عجب گلزار ہے وہ مظہر گل — کہ ہے جس باغ کا خورشید اک گل

وہی ہے بیدلاں کا دل کشا باغ — وہی ہے عاشقاں کا مرہم داغ

اسی کا ذکر ہے ایمان مومن — اسی کی یاد اطمینان مومن

وہی ہے باغ اقدس سرور دیں — کہ جس کے باغ کا رضواں ہے گلچیں

کھلا کونین میں وہ دین کا گل — دو جگ مشتاق اس کے مثل بلبل

دو عالم جسم وہ ہے جان عالم — نبیاں امرا وہ ہے سلطان عالم

دکھایا عاشقاں کوں عشق کی راہ — کیا عارف کوں عرفاں بیچ آگاہ

ہوا جو کوئی اس گل سوں معطر — رہا وہ مست ہو، تا روز محشر

---

[1] منتخب اللغات میں اس لفظ کے معنی کسی چیز کا زمین میں پوشیدہ کرنے کے لکھے ہیں مگر یہاں ربط کلام سے دوحہ باغ کا مخفف قیاسی معلوم ہوتا ہے۔

کیا حق اُس ابو الارواح خاطر　　مرتب چار دیوار عناصر
ہوا جب چار باغ دیں روشن　　شریعت کا کھلا اُس بیچ گلشن
سنواری گرد اُس کے چار دیوار　　حقیقت میں سمجھ ہیں یار وو یا
وو ہیں مقبول درگاہ صمد کے　　وہی ہیں منتخب اس چار حد کے
دے اے ساقی پیالے جام دو چار　　کہ مائل ہوں اُسی مے کا میں لاچار
جو بخشے وو مجھے یک جوش مستی　　فراموشی میں بھولے خود پرستی

مثنوی در تعریف شہر سورت

عجب شہراں میں ہے پُر نور یک شہر　　بلا شک وو ہے جگ میں مقصد دہر
اہے مشہور اُس کا نام سورت　　کہ جاوے جس کے دیکھے سب کدورت
جگت کی آنکھ کا گویا ہے یہ نور　　اچھو اُس نور سوں ہر چشم بد دور
شہر جیوں منتخب دیوان ہے سب　　ملاحت کی وہ گویا کان ہے سب
سرج سن آب اُس کی جگ میں کانپا　　سمندر موجزن رگ رگ میں کانپا
کنارے اُس کے اک دریا ہے تپتی　　کہ دنیا دیکھنے کوں اُس کے تپتی
کیا سب تن خجالت سوں یو جیوں عرق　　ہوا دریا اپس کے عرق میں غرق
شہر سوں ہے وو ہمراز ہمیشہ　　دریا سوں ہے وو ہم پہلو ہمیشہ
کہ آب خضر کی ہے اُس میں تاثیر　　ہوا دیتی ہے اُس کی یاد تکبیر
وہاں اشنان جب کرتا ہے عالم　　صبح اور شام جب کرتا ہے عالم
عجب قلعہ ہے واں اک با قرینہ　　انگوٹھی میں دنیا کے جیوں نگینہ
نزک قلعے کے بارا گھاٹ ہے واں　　کہ دائم گُلر خاں کی ہاٹ ہے واں
رہے اس حاشیے پر جائے آرام　　طلسمی باغ واں ہوتا ہے ہر شام
اے بلبل پاک بینی سوں نظر کر　　کثافت کی نظر سوں بس حذر کر
کھلے ہیں ہر طرف رخسار کے گل　　ہر اک گل کے نزک واں پر ہے سنبل

جو کئی دیکھا ہے اُن کا باغ رخسار — ہوا اک دید میں وہ محو دیدار
جو ہیں وہ محض تصویرات اخلاص — سو عاشق پروری میں وہ ہیں خاص
کہاں ہے ساقی اخلاص انگیز — محبت کی کرے مئے مجھ اُپر ریز
صفائی سوں کھلے مجھ جیو کا باغ — کروں اُس درد کے کوں مرہم داغ
اہے صورت حقیقت کی نشانی — کہ ہیں معمور واں اہل معانی
شرافت میں یہ ہے جیوں باپ مکہ — تو ہے سب ملک پر اُس کا جو سکہ
اگر دیکھے ہیں لوگاں شام و تبریز — نہ دیکھا کوئی ایسا ملک زرخیز
کہ اُس بھیتر کنے ایسے ہیں تجار — کہ تاروں کوں نہیں اُن کے نزک بار
اتی آتش پرستاں کی ہے بستی — سکے نمرود واں آتش پرستی
فرنگی اس میں پاتے ہیں کاپوشش — وہ وہاں جنکی گنتی میں ہے بیہوش
وہاں ساکن اِتے ہیں اہل مذہب — کہ گنتی میں نہ آویں اُن کے مشرب
اگر یہ سب ہیں وہ انسائے آدم — ولے بنیش میں رنگارنگ عالم
بھری ہے سیرت و صورت سوں سورت — ہر اک صورت ہے واں نول مورت
ختم ہے امرداں پر رو صفائی — ولے ہے بیشتر حسن نسائی
سبھا اندر کی ہے ہر اک قدم میں — چھپا اندر سبھا کو لے عدم میں
کشن کی گوپیاں کی نہیں ہے یہ نسل — کہ ہیں سب گوپیاں وہ نقل یہ اصل
زلف اور مکھ کے طالب سوں چھپو بات — بسے ہر دن ہے عید، ہر رات شبرات
ہزاراں اس سبب شیدا ہیں بلبل — کہ ہیں واں غنچہ لب دائما گل
نہ کئی وقت سوں کھینچے شوخ چنچل — وہ مکھ کے باغ کن دیوار آنچل
نظر بھر کر دیکھو ہر گل بدن کوں — کہ ہے پردے سوں بے پروا اُنن کوں
رہے وہاں عاشقاں کو عام آواز — کہ نہیں پردہ بغیر از پردۂ ناز
کسی کوں نہیں نظر بازی بنا چین — کھلے ہیں رات دن سب غرفۂ عین
ہر اک لب ہیں سوں جیوں یاقوت انمول — کرے وہ بات جب میٹھے لباں کھول

وو باتاں نہیں سراپا ہے سُہاگ   کہ جن باتاں اُپر ہے نیشکر بند

پڑا شیریں بچن سُن اُن کے بس جو   پھنسا اس شہد میں جا کر مگس ہو

ہوا اُن کو نکلنا کام دشوار   رہا تھا آخری دم تک گرفتار

شبہ بچھتر جو آوے نہان کاوں   ہندو کی قوم کے اشنان کا دن

ہر اک جانب دکھوں میں فوج در فوج   تجلی کے سمندر کی اُٹھے موج

نین کی بیٹھ کشتی پر تو لے پال   یہ طے کر بیچ میں موج خطرناک

مہرباں ہو کے لے ساقیٔ کوثر   کرم سوں کشتی مے مجکوں دے بھر

ایس کے لطف سوں اپنے عطائے   جو اس نشّے میں دریا کوں کروں طے

عبث باتاں ہیں بس کر لے ولی تو   ذکر مقصد سوں اپنے کاہلی تو

قطعات در فراقِ گجرات

گجرات کے فراق سوں ہے خار خار دل   بے تاب ہے سنے منیں آتش بہار دل

مرہم نہیں ہے اس کے زخم کا جہاں منیں   شمشیرِ ہجر سوں جو ہوا ہے فگار دل

اول سوں تھا ضعیف پہ پابستہ سوز میں   جیوں بال ہے اگن کے اُپر بے قرار دل

سن سیر کے نشے سوں دل تر دماغ تھا   آخر کوں بس فراق میں کھینچا خمار دل

میرے سنے میں آکے چمن دیکھ عشق کا   ہے جوش خوں سوں تن میں مرے لالہ زار دل

حاصل کیا ہوں جگ میں سراپا شکستگی   دیکھا ہے مجھ شکیب سوں صبح بہار دل

ہجرت سوں دوستاں کے ہوا جی مرا گداز   عشرت کے پیرہن کوں کیا تار تار دل

ہر آشنا کی یاد کی گرمی سوں تن منیں   ہر دم میں بے قرار ہے مثل شرار دل

سب عاشقاں حضور اچھے پاک سرخ رو   اپنا اپس لہو سوں کیا ہے فگار دل

حاصل ہوا ہے مجکوں ثمر مجھ شکست سوں   پایا ہے چاک چاک ہو شکل انار دل

مجمر نہیں ہوا ہے بدن سوز ہجر سوں   اسپند کی مثال ہے آتش سوار دل

افسوس ہے تمام کہ آخر کو دوستاں   اس میکدے سوں اُٹھ کے چلا سدہ بسار دل

لیکن ہزار شکر ولی حق کے فیض سوں   پھر اُس کے دیکھنے کا ہے امیدوار دل

حُسن دلبر کا خواب میں دیکھا   نور حق تھا حجاب میں دیکھا
خود فنا ہو کے ذات میں ملنا   یہ تماشا حباب میں دیکھا

مُستزاد

بے تاب کیا شوق نے مجھ دل کوں بدن میں   گُل پیرہناں کا
جیوں غنچہ کیا بند محبت کے چمن میں   رنگیں دہناں کا
مجھ دل کی نمن عشق سوں گردش میں ہمیشہ   تنہا نہیں خورشید
مشتاق ہو پھرتا ہے سدا ماہ گگن میں   سیمیں بدناں کا
مت بوجھ کہ ہے آپ سوں وحشت منیں آہو   اے کُشتۂ خوباں
پھیلا ہے سحر جا کے یہ اطراف ختن میں   جادو نیناں کا
رکھتا ہے محبت کا سدا داغ جگر پہ   ہر لالۂ رنگیں
تجھ عشق سوں کیا حال ہے ٹک دیکھ چمن میں   خونیں کفناں کا
فرہاد کی آتی ہے صدا روح صبا ہو   مجھ شعر کو سننے
مذکور ہے از بسکہ ولی میرے سخن میں   شیریں بچناں کا

ولہ

لاگی ہے لگن تم سوں چھڑا کون سکے گا   ہے کس میں یہ قدرت
اب مجکوں وطن اپنے لجا کون سکے گا   کر دل سوں رفاقت
ہے نقش کناری کا ترے جامے کے اوپر   اے ہند کے بانکے

دامن کوں ترے ہاتھ لگا کون سکے گا — نہیں زور نہ طاقت

ہوں خاک تمہاری ہی گلی کا اے سری جن — نہیں کام کفن سوں

اب مجکوں جنازے میں اُٹھا کوں سکیگا — یوں گر ہے حقیقت

مت مار ولی کوں میں یہ کہتا ہوں کہا کر — سُن بات ہماری

اس ہجر کے طومار کو پا کون سکے گا — بن غمزہ و ظرافت

مخمسات

تجھ قد نے مجھ نگاہ کوں عالی نظر کیا — تجھ مکھ نے شوق بدر کوں دل سوں بدر کیا

لب نے ترے عقیق کوں خونیں جگر کیا — مستی نے تجھ نین کی مجھے بے خبر کیا

دل کو مرے بھواں نے تری جیوں بھنو کیا

تجھ چشم نیم باز کی جرأت کوں دل میں رکھ — تیری بھواں کی تیغ کی دہشت کوں دل میں رکھ

پلکاں کے خنجراں کی صلابت کوں دل میں رکھ — تیری نگہ کے تیر کی ہیبت کوں دل میں رکھ

سورج نے تن اُپس کا سراسر سپر کیا

ہے تجھکوں مرتبے منیں پریاں سوں برتری — تجھ مکھ کوں دیکھ جگ میں کیا حور کیا پری

ناہید میں کسی نے نہ دیکھی یہ دلبری — تجھ مہر کا ہوا ہے دل و جاں سوں مشتری

جب سوں ترے جمال پہ مہ نے نظر کیا

تیرا فراق تھا دل و سینہ پہ شل سل — مدت سوں دل دُہا تھا ترے غم میں پاکل

دیکھا نہ تھا جس خواب میں آرام ایک پل — تب سوں ہوا ہے محمل لیلیٰ کی شکل دل

جب سوں ترے خیال نے دل میں گزر کیا

سرے درس میں علم معانی پڑھا ہے جی — تجھ مکھ کو دیکھ شمسی کی شمسیہ لکھی

لیلاوتی تو خواب میں پائی ہے منتہی — ہر شب تری زلف سوں مطول کی بحث تھی

تیرے دہن کو دیکھ سخن مختصر کیا

شہرت کا تیری جگ میں بجا ہر طرف دُہل — تجھ سرو قد کوں دیکھ ہوے بند جزو و کل

سرشار تجھ نین کے نشے سوں ہے جام مل   حق تجھ عذار دیکھ سو چاہے رنگ گل
پیدا اترے لباں ستی شہد و شکر کیا

تیری معاونت میں ہیں نت مرتضیٰ علیؑ   تو اس سبب سوں ملک سخن میں ہوا علی
خورشید کی نمن ہے تری طبع منجلی   تیرا یہ شعر جگ میں مؤثر ہے اے ولی
تو دل منیں ہر ایک کے جا کر اثر کیا

رُباعیات

میخانۂ جگ کا جسے سر جوش کیا   اُس ہاتھ سوں عالم نے قدح نوش کیا
اُس سید عالم کوں جو دیکھا یکبار   یکبارگی عالم کوں فراموش کیا

دل، جام حقیقت ستی جو مست ہوا   ہر مست مجازی سوں زبردست ہوا
یہ باغ وسما نظر میں تنکے سوں کم   اور عرش عظیم پگ تلے پست ہوا

یہ ہستی موہوم دسے مجکوں سراب   پانی کے اُپر نقش ہے یہ مثل حباب
ایسے کے اُپر دل کوں نہ کر ہرگز بند   آپس کوں نہ کر خراب لے خانہ خراب!

تجھ مکھ کا ہے یہ پھول چمن کی زینت   تجھ شمع کا شعلہ ہے اگن کی زینت
فردوس میں نرگس نے اشارے سوں کہا   "یہ نور ہے عالم کے نین کی زینت"

رکھ دھیان کوں ہر آن تو معبود طرف   رکھ سیس کوں ہر حال میں مسجود طرف
معدوم کوں، موجود سوں کیا نسبت ہے   اولیٰ ہے کہ مائل ہو تو موجود طرف

the MOOSi

جلد چہارم
شمارہ سوم و چہارم

یادگارِ ولی

المُوسیٰ

طلبۂ سٹی کالج کا علمی ادبی رسالہ

(زیرِ نگرانی)

جنابِ سید محمد اعظم صاحب ایم اے بی ایس سی (کینٹب) [illegible]

جنابِ ابوظفر عبدالواحد صاحب ایم اے || جنابِ سید محمد صاحب ایم اے

لکچرار اردو || [illegible]

مدیران

شیخ عبدالصمد متعلم سال دوم —— محمد رفیع زمان متعلم سال دوم

[illegible]

دفتر المُوسیٰ سٹی کالج حیدرآباد دکن

(۱) شیخ عبدالصمد	متعلم سال دوم
(۲) محمد رفیع زماں	" "
(۳) شیخ محمد علی انصاری	" " "
(۴) ریاض احمد	" "
(۵) سید محمد ثاقب	" اول
(۶) سید مبارز الدین	"

مطبع مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ میں چھپکر دفتر الموسیٰ سٹی کالج سے شایع ہوا

المؤسی

یادگارِ ولی

مرتبۂ

سید محمد ام۔ اے

فہرست مضامین

(۱)

یادگارِ ولی

فہرستِ تصاویر

یومِ ولیؔ

قدیم دکنی ادبیات کے "خاتم الشعرا" اور جدید اُردو شاعری کے "باوا آدم" استاد الاساتذہ ولی اورنگ آبادی کے دو صد سالہ جشن یادگار منانے کی تحریک ابتدا، ہماری بزمِ ادب کے سرگرم نائب صدر خلیل احمد صاحب آزاد نے اپنی کابینہ کی متفقہ قرارداد کے ساتھ جناب صدر صاحب کلیہ کی خدمت میں پیش کی۔ صاحب معز کو فنِ تعلیم کے ساتھ ساتھ ادبیات کا اعلیٰ ذوق اور خصوصاً اُردو زبان و ادب کی توسیع و ترقی کا غیر معمولی خیال ہے انھوں نے اس گراں قدر تحریک کو نہ صرف رسماً منظور فرمایا بلکہ بطورِ خاص دلچسپی لی اور مندرجۂ ذیل اصحاب کی ایک مجلسِ انتظامی مقرر فرماکر اس اہم کام کو بہ عجلت ممکنہ عملی جامہ پہنانے پر زور دیا۔

۱۔ مولوی غلام قادر صاحب بی۔ اے نائب صدر کلیہ

۲۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زورؔ ایم، اے، پی ایچ ڈی (لندن) پروفیسر جامعہ عثمانیہ

۳۔ مولوی عبد المجید صاحب صدیقی ایم، اے، ال ال بی لکچرار تاریخ جامعہ عثمانیہ

۴۔ مولوی ابو ظفر عبد الواحد صاحب ایم، اے لکچرار اُردو سٹی کالج

۵۔ مولوی عبد القادر صاحب سروری ایم، اے، ال ال بی لکچرار اُردو جامعہ عثمانیہ

۶۔ مولوی میر حسن صاحب ایم، اے مددگار سٹی کالج

۷۔ خلیل احمد صاحب آزاد نائب صدر انجمن اتحاد سٹی کالج

۸۔ سید محمد (معتمد)

اس مجلس نے جناب صدر صاحب کی صدارت میں اپنی اجلاس منعقد کیے اور جشن یادگار ولی سے متعلق نظام العمل وغیرہ مرتب کیا۔ اس سلسلے میں بہ اتفاق آرا طے پایا کہ

(۱) حیدرآباد اور بیرون حیدرآباد کے بلند پایہ ادیبوں اور شاعروں کو قلمی اعانت کے لیے مدعو کیا جائے۔

(۲) ہندوستان کی مختلف جامعات کے طیلسانی اور غیر طیلسانی طلبہ سے حسب ذیل موضوع پر مسابقتی مضامین لکھائے جائیں "اردو شاعری میں ولی کا رتبہ"

(۳) قدیم اردو (دکنی) کے نادر اور گراں بہا مخطوطات نیز اس دور سے متعلق قدیم قلمی تصاویر کی ایک شایان شان نمائش کی جائے۔

(۴) سٹی کالج میگزین "الموسی" کا ایک خاص نمبر "یادگار ولی" شائع کیا جائے۔

اس مجلس نے مختلف امور کی انجام دہی کے لیے اساتذہ، طلبہ اور دیگر ہمدردوں کی ذیلی کمیٹیاں بھی مقرر کیں۔ جو حسب ذیل ہیں:۔

ادبی کمیٹی

(۱) ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور
(۲) مولوی ابوظفر عبدالواحد صاحب لکچرار سٹی کالج
(۳) " عبدالقادر صاحب سروری لکچرار جامعہ عثمانیہ
(۴) سید محمد (معتمد)

ڈرامے کی کمیٹی

(۱) مولوی ابوظفر عبدالواحد صاحب لکچرار سٹی کالج
(۲) " رکن الدین احمد صاحب قریشی مددگار سٹی کالج
(۳) مسٹر سیون مددگار سٹی کالج
(۴) مسٹر جے ایس بھان مددگار سٹی کالج

نمائش کی کمیٹی

(۱) ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور صدر
(۲) مولوی عبدالرحمٰن شریف صاحب مددگار سٹی کالج
(۳) غلام رسول صاحب مددگار سٹی کالج
(۴) صاحبزادہ محمد علی خاں میکش معلم جامعہ عثمانیہ
(۵) سراج الدین صاحب متعلم سٹی کالج
(۶) سید محمد معتمد

کمیٹی نے اس مایۂ ناز شاعر کے دو صد سالہ جشن یادگار کی صدارت کے لیے اس کے شایان شان ہستی کا انتخاب کیا۔ عالیجناب نواب سالار جنگ بہادر نے اپنی مشہور خاندانی علم دوستی سے کام لے کر اس ادبی تقریب کی سرپرستی قبول فرمائی اور اس میں اس قدر دلچسپی لی کہ اجلاس اوّل کی صدارت کرنے کے علاوہ اپنے مشہور و معروف خاندانی کتب خانہ سے اردو کے نادر و بیش قیمت مخطوطات اور گراں بہا تصویریں مستعار عنایت فرما کر نمائش کو کامیاب بنایا۔

اردو ادب کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ اس طرح کی کامیاب نمائش منعقد کی گئی جس کی تفصیلی فہرست ایک جداگانہ عنوان کے تحت ڈاکٹر محی الدین قادری صاحب زور کے قلم سے جو اس کمیٹی کے صدر تھے آئندہ صفحات میں درج ہے۔

جشن ولی کے دوسرے اجلاس کی صدارت ملک کے مایۂ ناز سیاست داں اور مشہور علم دوست نواب مہدی یار جنگ بہادر صدر المہام تعلیمات و سیاسیات نے باوجود اپنی غیر معمولی مصروفیات کے قبول فرمائی۔

دونوں جلسوں کے صدر صاحبان نے اس موقع پر جن گراں بہا خیالات کا اظہار کیا ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس قدیم شاعر کی دو صد سالہ یادگار منانے کی ملک کو کتنی ضرورت تھی۔ یہ دونوں صدارتی خطبے آئندہ صفحات میں شائع کیے جاتے ہیں۔

"یوم ولی" کا پہلا اجلاس ۴ فروری ۱۹۳۸ء کو چہارشنبہ ۵½ بجے سے شروع ہوا

پہلے نواب سالار جنگ بہادر نے نمائش کا افتتاح فرمایا' اس کے بعد مولوی سید محمد اعظم صاحب ام' اے (کینٹب) صدر کلیہ نے خطبۂ استقبالیہ اور ہندوستان کے مختلف علم دوست اصحاب کے پیامات پڑھ کر سنائے۔ پھر صدر عالی قدر کے خطبۂ صدارت کے بعد کلام ولی کی قرات کے ساتھ جلسہ کا آغاز کیا گیا۔ اس تقریب کے لیے ولی کے وطن اورنگ آباد سے وہاں کے کالج نے بھی نمایندگی کی اور مولوی سید محی الدین صاحب بی' اے (آکسن) صدر اورنگ آباد کالج نے ایک دلچسپ پیام مولوی غلام طیب صاحب بی' اے' بی ٹی لکچرار اردو کے ذریعہ روانہ کیا جس کو صاحب موصوف نے جلسہ میں پڑھ کر سنایا اور اس کے بعد اپنی ایک نظم بھی سنائی جو خاص اس تقریب کے لیے لکھی گئی تھی۔ مولوی عبدالحق صاحب بی' اے پروفیسر کی تقریر "ولی کی وفات" کے بعد نماز مغرب کے لیے وقفہ دیا گیا۔ اس وقفہ کے بعد حسب ذیل نظمیں اور تقریریں پڑھی گئیں۔

(۱) نظم۔ مولوی سید سکندر علی صاحب وجد بی' اے' ایچ سی ایس پروبیشنر

(۲) عہد ولی میں دکن کی علمی و تمدنی حالت۔ از مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی ام' اے ال ال بی لکچرار تاریخ جامعہ عثمانیہ

(۳) نظم۔ صاحبزادہ مولوی میر محمد علی خاں صاحب میکش (عثمانیہ)

(۴) ولی کی شاعری۔ مولوی ابوظفر عبدالواحد صاحب ام' اے لکچرار سٹی کالج

ان نظموں اور تحریروں کے درمیان ولی کا کلام تحت اللفظ اور لیئے کے ساتھ پڑھا گیا جس کے سننے سے حاضرین پر ایک خاص کیف و اثر طاری ہوتا رہا۔ اس طویل عرصہ یعنی تقریباً چار گھنٹے تک نواب سالار جنگ بہادر نے اس جلسہ کی صدارت فرمائی اور نہایت دلچسپی سے کارروائیوں میں حصہ لیا۔

"یوم ولی" کا دوسرا اجلاس دوسرے دن صبح میں ۸½ سے ۱۲ بجے تک منعقد ہوا' اس کی صدارت جیسا کہ بیان کیا گیا ہے نواب مہدی یار جنگ بہادر نے فرمائی جنہوں نے پہلے نمائش کو معائنہ فرما کر خاص دلچسپی اور تاثر کا اظہار کیا۔ اس جلسہ میں حسبِ ذیل نظمیں اور تقریریں پڑھی گئیں:۔

(۱) نظم۔ جناب مولوی مخدوم محی الدین صاحب ام' اے

(۲) ولی کا اسلوب شاعری و زبان - جناب مولوی عبدالقیوم خاں صاحب باقی ام' اے
(۳) نظم - جناب مولوی بدرالدین صاحب شکیب بی' اے' ال ال بی
(۴) ولی کا وطن۔ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور ام' اے' پی' ایچ ڈی
(۵) کلام امجد - حکیم الشعرا' مولانا سید احمد حسین صاحب امجد
(۶) ولی سے پہلے دکن کی اردو شاعری - جناب مولوی نصیرالدین صاحب ہاشمی
مددگار دیوانی بلدہ
(۷) نظم - جناب سید عباس حسین صاحب امید
(۸) نظم - جناب مولوی ابوظفر عبدالواحد صاحب ام' اے
(۹) تلامذۂ ولی کا دور - جناب مولوی عبدالقادر صاحب سروری ام' اے' ال ال بی لکچرار اردو جامعہ عثمانیہ

ان دونوں اجلاسوں میں حاضرین کی بڑی تعداد میں تھے۔ اور حیدرآباد کے اکثر عہدہ دار' جملہ ارباب ذوق اور طلبہ شریک رہے۔

اس تقریب کے بعد بھی روز تک مقامی اخبارات اس کی روئدادیں اور اس کے متعلق مراسلے شایع کرتے رہے اور اپنے اداریوں میں اس کی کامیابی پر اظہار خیال کیا۔ ان اداریوں اور مراسلوں میں سے ایک کا مختصر سا اقتباس یہاں درج کیا جاتا ہے۔ جس سے پبلک پر اس تقریب سے تاثرات کا اظہار ہوتا ہے۔

(نقل مراسلہ پیام)
دکن کے عظیم الشان شاعر اور اردو شاعری کے باوا آدم کی دو صد سالہ تقریب یادگار نے جوسٹی کالج میں شاندار پیمانہ پر منعقد ہوئی' حیدرآباد کی علمی دلچسپیوں میں دو دن تک خاص چہل پہل پیدا کر دی تھی۔ اس کے اجلاسوں میں سامعین کی کثرت ارباب ملک کے علمی ذوق اور احساس بیداری کا خوش گوار نظارہ پیش کر رہی تھی۔جس طرح یہ جشن اپنے باطن میں ایک شاندار مادی پہلو رکھتا ہے۔ اسی طرح اس کو ظاہرا بھی شایان شان بنانے کی کوشش کی گئی تھی اور حیدرآباد کے اس قدیم علمی ادارہ کو جس میں دکن کے جگت استاد شاعر کا یادہ کی جشن منایا گیا' دلہن کی طرح سنوار کر ایک مشت مختصر بنا دیا گیا تھا۔

نواب سالار جنگ بہادر کی سرپرستی، مسٹر سید محمد اعظم پرنسپل سٹی کالج، ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور پروفیسر جامعہ عثمانیہ اور مولوی سید محمد صاحب لیکچرار سٹی کالج کی مخلصانہ مساعی سے یہ جشن ہر طرح کامیاب اور شاندار رہا۔

اس جشن کی تصویر کا نمایاں رُخ، جو سب سے پہلے دیدہ دل کے لیے باعث فخر و ناز اور بصیرت افروز ثابت ہوا، وہ دکن کے قدیم قلمی کتابوں اور تصاویر کی گراں مایہ نمائش تھی - اس کو دیکھ کر ہمارا یہ احساس قوی تر ہو گیا ہے کہ فرخندہ بنیاد میں قدیم علمی جواہر پاروں کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ اس خصوص میں سب سے بڑھ کر نواب سالار جنگ بہادر کا علمی حصہ ہے جن کی عنایتوں اور شوق کے بغیر یہ نمائش کامیاب نہ ہو سکتی تھی - جامعہ عثمانیہ، پروفیسر ... علی خان نائب صدر جامعہ عثمانیہ، ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، آغا حیدر حسن صاحب پروفیسر نظام کالج، ڈاکٹر محمد قاسم صاحب اور نصیر الدین صاحب ہاشمی نے بھی اپنے کتب خانوں سے کئی قلمی نسخے مستعار دے کر نہ صرف اپنی علم دوستی کا ثبوت دیا بلکہ ارباب ملک کو اپنے اسلاف کے کارناموں سے واقف ہونے کا سنہری موقع بھی۔

اس نمائش میں تقریباً (۵۰۰) قلمی نسخے موجود تھے ان کے علاوہ ملک اور بیرون ملک کے دوسرے کتب خانوں میں بھی کئی قلمی کتابیں جو خالص دکنی پیداوار ہیں محفوظ ہیں، اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بھاگ نگر کی پرانی بستی کا علمی ماحول شروع ہی سے تصنیف و تالیف کا گہوارہ رہا ہے۔

اب وقت آگیا ہے کہ ان کارناموں کو جو شیشوں کی الماریوں میں بے طور نمائش بند پڑے ہوئے ہیں، جیسا کہ نواب سالار جنگ بہادر نے ایک اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے فرمایا ارباب ملک کے افادہ کی خاطر منظر عام پر لایا جائے۔ ہمیں امید ہے کہ نواب صاحب کی فیاضانہ اعانت اور مولوی سید محمد اعظم صاحب ڈاکٹر زور اور مولوی سید محمد صاحب کی گرمجوشانہ مساعی سے مستقبل قریب میں اس خوش آئند کام کا آغاز ہو جائیگا۔

اس کے علاوہ نواب مہدی یار جنگ بہادر صدر المہام سیاسیات کی وہ قیمتی تحریر بھی محل جگہ پہنچنے کے قابل ہے جو انہوں نے دوسرے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے فرمائی کہ اس قسم کی

آخر میں ہم اپنی محبوب مادر علمی کے ہونہار سپوتوں، فاضل اساتذہ اور محترم صدر کو دلی مبارکباد دیتے ہیں کہ ان کی محنتیں ثمر آور ہوئیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر زور کی پر خلوص خدمات اور نواب سالار جنگ بہادر کی مہربانیاں بھی یاد رکھنے کے قابل ہیں۔ "یوم ولی" نے دلوں پر ایسے نقوش مرتسم کیے ہیں جو خوش گوار یاد اور بیداری کی صورت میں ہمیشہ رہیں گے۔

کیا ہی اچھا ہو کہ ولی کی طرح دکن کے قدیم شاعروں مثلاً قلی قطب شاہ، وجہی، غواصی، نصرتی وغیرہ کے بھی یادگاری جشن منائے جائیں تاکہ ان کے متعلق بھی اہل ملک کو واقف ہونے کا موقع ملے۔ سٹی کالج کی اس خوش آئند ابتدا اور یوم ولی کی ہمت افزا کامیابی کے بعد یہ توقع بے جا نہیں۔ فقط

اس نمبر میں مذکورہ بالا مضامین کے علاوہ اور بھی کئی دلچسپ مضمون اور نظمیں شریک ہیں جن کے مطالعہ سے اہل ذوق پر واضح ہوگا کہ یہ تقریب کس قدر کامیاب رہی۔ اس سلسلے میں اہل علم حضرات نے جس ذوق دلچسپی کا اظہار کیا اور اس تقریب کے بعد سے ملک میں علمی و ادبی سرگرمیوں میں اضافہ ہو گیا ہے نیز اس کے بعد اندھیری کالج میں جو یوم ولی منایا گیا وہ ظاہر کرتا ہے کہ اپنے قومی ادب اور قومی شاعروں کے ساتھ ہماری دلچسپیاں کسی طرح کم نہیں ہوئی ہیں اور وہ دن دور نہیں جب کہ ہم اپنے ادب کی پوشیدہ قوتوں سے بہ ہمہ وجوہ آگاہ ہو کر دنیا کی دوسری مہذب اقوام کی طرح اس پر ناز کریں گے۔

خطبۂ استقبالیہ

جناب پروفیسر سید محمد اعظم صاحب ایم اے (کینٹب) بی ایس سی پرنسپل سٹی کالج

عالیجناب نواب سالار جنگ بہادر و معزز حضرات !

میں سب سے پہلے آپ کی خدمت میں ہدیۂ سپاس پیش کرتا ہوں کہ آپ نے اپنی گوناگون مصروفیات کو تھوڑی دیر کے لیے بھلا کر اس تقریب سعید میں شرکت کی غرض سے یہاں تک آنے کی زحمت گوارا فرمائی۔ اس شاندار علمی اجتماع کو دیکھ کر ہمارے دلوں میں مسرت کی موجیں اٹھتی ہیں کہ آج کا یہ جلسہ رسمی اور محض ایک دل خوش کن اجتماع نہیں بلکہ ایک ایسا جلسہ ہے جس کی یاد دلوں میں تادیر قایم رہیگی۔

حضرات ! ولی کی عظمت اور اس کے کمالات شعری کی اہمیت جتانا میرا کام نہیں۔ یہ کام ان حضرات کا ہے جو اس غرض کیلئے بلحاظ موزونیت مختص کردیے گئے ہیں اور جن کے مقالے آپ آج اور کل کے اجلاس میں سنینگے۔ البتہ مجھ جیسا ایک عامی اور اردو ادب کے مشاہیر سے محض سطحی واقفیت رکھنے والا آدمی بھی اس موقع پر کچھ کہنے اور اپنے تاثرات کو پیش کرنے کی جسارت ضرور کرسکتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ اردو ادب کے قدیم و جدید شعرا کی خاصی طویل فہرست میں کوئی شاعر ایسا نہیں جو ولی کی طرح صد فی صد شاعر اور صد فی صد ہندی کہلانے کا مستحق ہو۔ اردو شاعری پر میں یہ اعتراض کرونگا۔ مجھے تو یہی عیب نظر آتا ہے اور وہ عیب ہے اس کا یکرخا پن۔

زندگی اور زندگی کی دلچسپیاں تنگ و محدود نہیں جتنا کہ ہمارے شعرا نے اس کو بنانے کی کوشش کی ہے۔ زندگی کے وسیع میدان میں ہماری تنگ حوصلگی کی ذمہ داری ہمارے شعرا پر عاید ہوتی ہے۔

وہ شگفتگی، جوش عمل، تنوع اور جذبات انسانی کی جاندار تصویریں اور زندگی کی وہ رنگارنگ کیفیتیں، جن سے شعرائے عرب یا فرنگی شعراء کا کلام مالامال نظر آتا ہے، یہ چیزیں ہمارے شعراء کے ہاں عنقا ہیں۔ اس کی بڑی وجہ غالباً یہ ہے کہ ایک زمانے تک اردو شاعری، فارسی شعراء اور شاعری کی مقلد اور دست نگر رہی ہے۔ البتہ ولی اس معاملے میں صد فی صد ہندی اور اس کی شاعری زندگی کی عین مین تصویر ہے۔ یہ مانا کہ قدیم زبان کی حیثیت سے بھی اس کی عظمت اور برتری مسلم ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ اس کے شاعرانہ کمال اور اس کی ہمہ گیر شخصیت کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔ وہ ایک کامل شاعر اور ایک کامل انسان تھا۔ ایسے جوہر کامل اور باکمال انسان دنیا میں بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی دل سے قدر کرنا اور ان کی یاد کو تازہ کرنا صرف اقتضائے بشری اور شرط انصاف ہی نہیں بلکہ کسی ملک کی قومی روایات کی شیرازہ بندی کے لیے از حد ناگزیر ہے۔ اس موقع پر ایک امر لائق اظہار ہے اور وہ یہ کہ استاد ولی کا سنہ وفات ایک حد تک معرض بحث میں ہے بعض کا خیال ہے کہ ولی نے ۱۱۱۹ھ میں وفات پائی۔ بعض نے ۱۱۵۵ھ قرار دیا۔ اگر آخر الذکر سنہ صحیح ہے تو ہمارا یہ جشن ٹھیک دو سو سال کے اختتام پر منایا جا رہا ہے اگر اول الذکر سنہ درست ہے تو بھی دو سو سال گزر چکنے کے بعد ہم یہ جشن منا رہے ہیں۔

یہ ہماری خوش بختی ہے کہ جس ساز و سامان اور جس اہتمام کے ساتھ ہم دکن کے جگت استاد کا یادگاری جشن منا رہے ہیں غالباً ہندوستان کے کسی دوسرے مقام کو جو آئندہ استاد ولی کی برسی منانے کا عزم کرے (مثلاً اسمٰعیلیہ کالج صوبۂ بمبئی میں ولی کی دو صد سالہ برسی منائی جانے والی ہے) یہ مواقع اور سہولتیں شاذ و نادر ہی حاصل ہو سکیں۔ بلدہ حیدرآباد ایک زمانہ تک قطب شاہی سلاطین کی راجدھانی رہا ہے۔ اس کی شاندار تاریخ اور روادارانہ آئین حکومت کے چرچے آج بھی زبان زد خاص و عام ہیں، لیکن اس سے کہیں زیادہ مہتم بالشان یادگار اس کی وہ ادبی خدمات ہیں جن کی بدولت اردو زبان میں ادبی زبان بننے کی صلاحیت پیدا ہوئی۔ چنانچہ اس کا روشن ثبوت وہ انمول قلمی نسخے ہیں جن کی نمائش کا افتتاح آج ان ہاتھوں سے ہوا جن کی رگوں میں میر عالم جیسے مدبر اور سالار جنگ اعظم جیسے محسن قوم و ملک کا خون موجزن ہے۔

یہ ہماری بہت بڑی خوش قسمتی ہے کہ نواب سالار جنگ بہادر بالقابہم نے اس موقع پر زحمت صدارت قبول فرما کر اپنی آبائی [illegible] وجاہت اور معارف نوازی کا ثبوت دیتے [illegible]

نے اپنے مشہور و معروف کتب خانے سے نہ صرف متعدد نہایت قیمتی اور نادر الوجود قلمی تصاویر و نسخہ جات مستعار مرحمت فرمائے بلکہ اس سے بہت زیادہ اپنے اُن قیمتی مشوروں سے مستفیض فرمایا جو بڑی حد تک اس نمائش کی کامیابی کے ضامن ہیں۔ ان عنایات اور توجہ خاص کا میں اپنی اور اپنے رفقائے کار کی جانب سے پرخلوص ہدیۂ تشکر نواب صاحب کی خدمت میں پیش کرنا اپنا فرض اولین سمجھتا ہوں۔

ہماری مزید خوش قسمتی یہ ہے کہ اس یوم سعید کے دوسرے جلسہ کی صدارت ہماری ریاست ابد مدت کے قابل، علم دوست، اور ہر دل عزیز وزیر تعلیم عالیجناب نواب مہدی یار جنگ بہادر فرما رہے ہیں جن کی ذاتی اور آبائی خصوصیات علمی اور بے لوث ملکی خدمات سے ملک کا ہر طبقہ بخوبی واقف ہے۔

حضرات جس کام کی ابتدا ایسے مبارک ہاتھوں اور خوشگوار حالات میں ہو اس کا انجام لازماً اچھا ہونا چاہیے۔ ع کارے نہ کرد است از بہر کشش پیداست!

آپ حضرات کا پھر ایک مرتبہ شکریہ ادا کرتے ہوئے میں اپنی یہ کاغذی تقریر ختم کرتا ہوں مجھے امید ہے کہ ولی کا کلام و ولی کی ولایت کے عالمانہ ذکر وا ذکار سے جو ولی کے فاضل پرستار آپ کے سامنے پیش کریں گے آپ مسرور ہوں گے۔ آپ کی خوشنودی ہی ہماری محنت کا صلہ ہے۔ میں اس نمائش کے سلسلہ میں حسب ذیل حضرات کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جن کی اعانت کے بغیر اس کا قیام ہی ممکن نہ تھا۔

عالیجناب نواب سالار جنگ بہادر۔

مولوی آغا حیدر حسن صاحب پروفیسر اردو نظام کالج

مولوی [illegible] علی خاں صاحب پروفیسر [illegible] جامعہ عثمانیہ

ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور پروفیسر [illegible]

اور دیگر حضرات

پیامات

(۱)

عالیجناب مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر یمین السلطنت جی سی ایس آئی ای، کے سی آئی ای پیشکار و صدر اعظم باب حکومت سرکار عالی

جناب مولوی سید محمد مہدی صاحب معتمد پیشی عالیجناب مہاراجہ بہادر تحریر فرماتے ہیں :—
عالیجناب مہاراجہ بہادر بالقابہم نے ارشاد فرمایا ہے کہ "کل یوم ولی میں بوجہ ناسازی مزاج شریک نہ ہو سکا، جس کا افسوس ہے ۔ بانیان یوم ولی نے دکن اور ہندوستان کے مائیہ ناز اور قدیم شاعر ولی اورنگ آبادی کا دن منانے میں جو اہتمام کیا ہے، وہ قومی بیداری کی علامت اور علمی زندگی کی دلیل ہے ۔ اس لیے لائق قدر اور باعثِ مسرت ہے ۔ مجھے امید ہے کہ ایسی قومی تقاریب کا سلسلہ جاری رہیگا اور اُن میں میری طرف سے تقدمے، درمے شرکت سے مجھے خوشی ہوگی" مورخہ ۴ ۔ اسفندار ۱۳۴۶ف

(۲)

عالیجناب رائٹ آنریبل نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر بی اے، سی کے ٹی، ال ال ڈی صدر المہام فینانس سرکار عالی

غالباً آپ کو علم ہوگا کہ ہنوز میری طبیعت نادرست ہے اور میں باہر نہیں نکل رہا ہوں۔

"As you Probably know I am still confined to my room and I do not

think the doctors will allow me to venture out in the evenings much as I should I have liked to have been present at the celebration of the Bicentenary of the Great Poet Wali".

میں شاعر اعظم ولی کے دو صد سالہ جشن یادگار میں شرکت کا بہت خواہشمند تھا مگر میں نہیں سمجھتا کہ میرے معالج مجھے شام میں باہر نکلنے کی اجازت دینگے۔

مورخہ ۲۔ فروری ۱۹۳۰ء

—— (۳) ——

عالیجناب نواب نظامت جنگ بہادر سابق صدر المہام سیاسیات سرکار عالی

" جشن یادگار ولی " کے موقعے پر آپ حضرات کو مبارک باد کہتے ہوئے اپنا یہ خیال ظاہر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اسلاف کے نمایاں کاموں کی قدر جن دلوں میں ہوتی ہے وہ ہدایت کے راستے پر آتے ہیں۔ امید ہے کہ آپ کا یہ جلسہ دکھنیوں کے ادبی کاموں کو جو عام نظروں سے پوشیدہ ہوں روشنی میں لانے کا محرک ہوگا۔ مورخہ ۲۶۔ جنوری ۱۹۳۰ء

—— (۴) ——

علامہ ڈاکٹر سر اقبال

افسوس کہ میں ایک طویل علالت کی وجہ سے آپ کے جشن میں شرکت سے معذور ہوں۔ آپ نے یوم ولی منا کر شاعر اعظم ولی کی یاد کو جو تازہ کرنے کا ارادہ کیا ہے وہ قومیت اور اسلاف پرستی کا صحیح جذبہ ہے۔ خدا کرے کہ یہ جلسہ کامیاب ہو۔

مورخہ ۲۳ جنوری ۱۹۳۰ء

(۵)

جناب سر عبدالقادر ممبر انڈیا کونسل (لندن)

"Heartiest good wishes for Successfull celebration of the Second Centenary of Wali, Great Deccan poet. Regret absence".

دکن کے شاعر اعظم ولی کے دو سو سالہ
جشن یادگار کی کامیابی کے لیے نیک تمنا
مبارکباد قبول فرمائیے۔ اپنی غیر حاضری کا
افسوس ہے۔ مورخہ ۲۶۔ جنوری ۱۹۳۷ء
(بذریعہ تار)

(۶)

نواب صدر یار جنگ بہادر جنرل سکریٹری آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علیگڈھ

"جشن یادگار ولی کامیاب ہو یہی تمنا ہے۔ دل یہ چاہتا ہے کہ موقع ملے تو ولی کے کلام کی بابت کچھ لکھ کر پیش کر سکوں" مورخہ ۱۰۔ نومبر ۱۹۳۶ء

(۷)

نواب سر مسعود جنگ بہادر وزیر تعلیمات بھوپال

My Dear Azam

"Very many thanks for your extremely kind invitation to me to attend the Bicentenary of Wali. I wish I could have attended it, but unfortunately owing to heavy pressure of official engagements I am compelled

مائی ڈیر اعظم! دو صد سالہ جشن
یادگار ولی میں شرکت کے لیے آپکی عنایت آمیز
دعوت کا بہت بہت شکریہ۔ میں اس میں
شرکت کا متمنی ہوں مگر بدقسمتی سے سرکاری
مصروفیات کی کثرت مجھے اس پر لطف محفل کی

شرکت سے باز رکھتی ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ یہ میرا کامل ایقان ہے کہ جو لوگ اپنے بزرگوں کی عزت و احترام نہیں کرتے وہ خود بھی دوسروں کی نظروں میں معزز و محترم بننے میں کامیاب نہیں ہو سکتے مجھے یقین ہے کہ آپ کی فاضلانہ قیادت و رہنمائی میں یہ تقریب نہ صرف بہت ہی کامیاب رہیگی بلکہ سارے ہندوستان کے تعلیمی اداروں کے لیے ایک قابل عمل نمونہ ثابت ہوگی۔ مورخہ ۲۴۔ نومبر ۱۹۳۶ء

to forego the pleasure. You know that it has ever been my firm conviction that those who do not honour their own great men can never succeed in being honoured by others. I am sure that under your able guidance the function will be not only a great success, but also a great example for other educational institutions throughout India to follow.

---

(۸)

علامہ عبداللہ یوسف علی سی بی ای ام اے ال ال ام پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور

آپ نے مجھے اس امر کی دعوت دی ہے کہ میں ولی اورنگ آبادی کے دوصد سالہ جشن یادگار میں جو حیدرآباد میں ۲۹ تا ۳۰۔ جنوری ۱۹۳۷ء کو منعقد ہونے والا ہے شرکت کروں اس دعوت کے لیے میرا شکریہ قبول فرمائیے۔ میں تیقن کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ آیا ان ایام میں فارغ بھی ہو سکونگا یا نہیں۔ اس لیے حاضری سے معافی چاہتا ہوں۔ میں دلی مسرت کے ساتھ اپنا پیغام بھیج رہا ہوں۔ خداوند کریم آپ کی کانفرنس کو کامیاب کرے۔ میری دلی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

ولی اورنگ آبادی اردو کا قدیم ترین شاعر ہے جس کا کلام ہمارے پاس محفوظ ہے اور وہ اس قابل ہے کہ اس کی یادگار میں مجالس قائم کی جائیں اور اس کی دوصد سالہ برسی منائی جائے۔ یہ فرض اہل دکن پر خاص طور سے عاید ہوتا ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ

ہندوستان والے خاموش رہیں بلکہ تمام اُردو دنیا کو یہ جشن منانا چاہیے ۔ مورخہ ۲۴، نومبر ۱۹۳۶ء

(۹)

مولانا سید سلیمان ندوی ناظم دارالمصنفین اعظم گڈھ

وَلی ہماری زبان کا آدم ہے ۔ اس لیے اس زبان کے سارے بنی آدم کا فرض ہے کہ وہ اپنے اس محسن اوّل کا شکریہ ادا کریں اور اُس کی برسی کے دن اُس کی مغفرت کی دعا مانگیں۔ آپ کی انجمن مبارک باد کی مستحق ہے کہ اُس نے اس فرض کی اہمیت کو دوسو برس کے بعد محسوس کیا ۔ ابھی تک وَلی کے شعر و ادب اور حسن خدمات و سوانح پر ہماری زبان میں محققانہ مواد فراہم نہیں ہوا ہے ۔ امید ہے کہ آپ کی اس تقریب کے موقعے پر یہ اہم کام تکمیل پا جائے۔ آپ کے کالج کے پرنسپل صاحب کی حسن توجہ کا تمام اہل ادب شکریہ ادا کریں گے ۔

مورخہ ۱۰، رمضان المبارک ۱۳۵۵ھ

(۱۰)

جناب علامہ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی

خدائے کریم کو اُس کی قدرت اور فطرت کی گوناگونی سے پہچانا جاتا ہے ۔ صوفیائے کرام میں ذات و صفات کا مباحثہ ابھی تک ایک مسئلہ کی حیثیت رکھتا ہے ۔ اِس مسئلہ کا اطلاق اگر اُردو کے ارباب بالخصوص شاعری پر کیا جائے تو ہم کو وہ دیوان اور منظوم کلام کے مجموعے جو بہت قدیم زمانے میں مرتب ہوئے لیکن کسی وجہ سے معرض گم نامی میں پڑے رہے ، نہ وہ نقد و مقابلہ کے تحت آئے نہ اہلِ اُردو اُن سے مستفیض ہو سکے ، نظر انداز کر دینے پڑتے ہیں۔ اُردو کا پہلا دیوان یا مجموعۂ کلام جس سے دنیا روشناس ہوئی اور جس کا تتبع اور جس سے استفادہ کیا گیا وہ وَلی مرحوم کا ہے ۔ اِس لیے میں خلوص دل اور گرم جوشی سے اور فراخدلی سے

حیدرآباد سٹی کالج یونین کے کارکنوں کو مبارک باد دیتا ہوں کہ انہوں نے یوم ولی منانے کا عزم کیا۔ میں اس موقعے پر خود حاضر ہوتا اور خالی ہاتھ نہ آتا، لیکن ایسے موانع پیش آئے جنہوں نے معذور کردیا۔

جس طرح دکن کا خطہ اردو کی تعمیر و ترتیب و توسیع میں بڑا حصہ دار ہے۔ اسی طرح یہ مناسب تھا کہ یوم ولی کی تقریب کے انعقاد میں وہیں سے ابتدا کی جائے اور ایسا ہو، مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ولی کی عظمت صرف ارباب دکن کے دل میں ہے۔ ولی کی وہ ہستی ہے کہ ہر اہل اردو اُس کا نام ادب سے لے کر کو ہاتھ [illegible] دیتا ہے۔ جہاں تک (وطنیت سے قطع نظر) اُردو کا تعلق ہے۔ ہم سب اردو والے ایک ہیں خواہ دکن میں رہتے ہوں یا پنجاب میں۔ ہم اس کلچر کے کلمہ خواں ہیں جو ہندو مسلمان ارتباط سے پیدا ہوئی اور ولی مرحوم جس کا پہلا نمائندہ اور منادی تھا۔

دعا ہے کہ کریم کارساز آپ کی مساعی کو کامیاب اور بارآور کرے۔ مورخہ ۲۲۔ جنوری سنہ ۳۶ء

(۱۱)

جناب مولانا عبدالماجد دریابادی

ولی کے مرتبے کو تو کوئی ولی ہی پہچان سکتا ہے۔ البتہ اتنا اندازہ تو ہم نااہلوں کو بھی کلام دیکھ کر ہوتا ہے کہ شاعر کی نگاہ معرفت بین تھی۔ آپ لوگ قابل مبارکباد ہیں کہ اردو شاعری کے باوا آدم کے فاتحہ کا آپ کو خیال آیا۔ ضرور یادگار منائیے اور اس تحریک کو پھیلائیے۔

یہ شرف آپ کی سرزمین کے لیے ازل سے مخصوص ہوچکا تھا کہ اردو شعر و سخن بھی سب سے پہلے آپ ہی کے ہاں جنم لے اور اردو علم و ادب بھی آپ کے شاہ ذی جاہ کے زیر سایہ ترقی کے مدارج طے کرے۔ مورخہ ۲۳۔ جنوری سنہ ۳۶ء

(۱۲)

جناب حبیب اشرف ندوی پروفیسر اردو اسمٰعیل کالج اندھیری بمبئی

ولی نے دورِ جدید کا آغاز کیا تھا اور مجھے امید کامل ہے کہ یومِ ولی کا جشن اردو ادب و شاعری میں ایک نئے باب کا آغاز کریگا۔ ورنہ اگر زندگی میں وہ ولی تھا تو مرنے کے دو سو سال بعد بھی اپنی ولایت و کرامت سے ادبی زندگی میں قوت پیدا کرکے اپنے نام کی عملی صحت کا ثبوت دیگا۔

ولی کو گجرات سے جو وطنی و روحی تعلق ہے، اسی بناء پر سارے صوبہ بمبئی کی آنکھیں آپ کی طرف لگی ہوئی ہیں اور ہم لوگ نہایت دلچسپی و توجہ سے دیکھینگے اور ان سے مستفید ہونگے۔

آپ نے جس اہم کام کی طرف قدم اٹھایا ہے اس کی ادنیٰ کامیابی کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ خود ہمارے کالج کی ادبی مجلس مجمع الادب نے یوم ولی منانا طے کیا ہے۔ اللہ پاک اس شوق کو دوام کرے۔ مورخہ ۲۲ جنوری ۱۹۳۷ء

(۱۳)

جناب میاں بشیر احمد بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا مدیر ہمایوں لاہور

خوشی کا مقام ہے کہ آپ لوگ اردو کے ایک بڑے شاعر کی یادگار میں یہ جشن منا رہے ہیں، خدا آپ کی مساعی کو کامیاب کرے۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ میں شرکت کا فخر حاصل نہ کرسکونگا۔ ۵؍ دسمبر ۳۶ء

(۱۴)

مولانا سید محمد احسن مارہروی پروفیسر اردو مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

باوجود بعد مسافت اور کثرت مصارف دل چاہتا تھا کہ حاضری کی کوشش کروں مگر عین وقت پر

معلوم ہوا کہ مسلم یونیورسٹی میں صوبۂ متحدہ آگرہ و اودھ کے ہز ایکسلنسی گورنر صاحب بہادر تشریف لانے والے ہیں۔ جشن یادگار ولی کے اہتمام پر مبارک باد قبول فرمائیے۔ ۲۶ دسمبر ۱۹۳۶ء

(۱۵)

جناب قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی

اردو شاعری کے اس چاسرکی یادگار میں آپ نے جشن منانے کا جو اہتمام کیا ہے وہ مستحق آفریں و لائق تحسین ہے۔ ایران میں فردوسی کا جشن ہزار سالہ، عراق میں متنبی کا جشن ہزار سالہ، اور ادھر ہندوستان میں حالی کا جشن صد سالہ قوم کی زندہ دلی کے آثار ہیں۔ اس پر آپ نے جشن یوم ولی اضافہ کر کے قوم کی ادبی زندگی کا ثبوت پیش کیا ہے جس کے لیے آپ اور آپ کے رفقا و شرکاء کار لائق تہنیت و مبارک باد ہیں۔

خدا کرے یہ جشن ہر طرح کامیاب رہے اور ایسے ہی دیگر علمی و ادبی مشاغل کے لیے محرک ثابت ہو۔ ۲۵ جنوری ۱۹۳۷ء

(۱۶)

جناب صغرا ہمایوں مرزا صاحبہ مدیرۂ النساء

دکن میں ہی اردو نے جنم لیا تھا۔ اردو کا پہلا شاعر ولی دکنی تھا۔ اس کا فخر [illegible] ہے کہ ولی دکنی شاہ دکن میں [illegible] اردو یونیورسٹی بھی دکن میں قائم ہوئی۔ یہاں بیان جانے [illegible] ہے کہ انہوں نے دو سو سال کے بعد ولی دکنی کی یاد تازہ کر دی۔ یہ بھی [illegible] کی قسمت میں تھا۔ [illegible] شاعر کی یادگار میں جشن کر لیا۔ قدردانی بڑی چیز ہے۔ زندگی میں تو شاعر [illegible] محبت سے لوگ پوجا کرتے ہیں مرنے کے بعد وہ بھی دو سو سال کے بعد جشن کرنا شاعر غریب کی روح کو خوش کرنا ہے۔

یوں تو منہ دیکھے کی ہوتی ہے محبت سب کو ⁂ جب میں جانوں مرے بعد مرا دھیان رہے

۱۷

پیام عقیدت بتقریب جشن یوم ولی

منجانب

اہالیان طلبا اساتذہ و کلیہ عثمانیہ اورنگ آباد

خدا کا شکر ہے کہ ارباب ملک کی توجہ متقدمین کے کارناموں کی طرف مبذول ہو رہی ہے۔ یہ بھی ہمارے آقائے ولی نعمت خسرو دکن کی مسیحائی کا ایک کرشمہ ہے کہ آئے دن قدیم باکمالوں کے شاہکار روشنی میں آ رہے ہیں۔ اعلیٰحضرت بندگان عالی متعالی، ظلّہ العالی کی علم نوازی اور شاہانہ کلام کی بلاغت اور فصاحت نے ادب کا جو اعلیٰ ذوق حیدرآباد میں پیدا کردیا ہے وہ الناس علیٰ دین ملوکہم کا مصداق ہے۔ زبان اردو کے لیے یہ فال نیک ہے کہ اس کے محسنوں کی یاد تازہ کی جارہی ہے۔ اورنگ آباد کالج نے یوم حالی منا کر سعدی ثانی کی علمی اور قومی خدمات کا اعتراف کیا۔ اہل دہلی نے یوم غالب منایا تھا۔ ارباب سٹی کالج [illegible] کے نغز گو باکمال شاعر اردو شاعری کے باوا آدم اور زبان اردو کے سب سے پہلے محسن حضرت ولی کا دو صد سالہ جشن یادگار منا رہے ہیں۔ جامعہ عثمانیہ کی علمی تحریکات میں یہ چیز سب سے زیادہ نمایاں ہے کہ اس نے اپنے علوم اور اپنے باکمالوں کی قدر کا ذوق اہل ملک میں پیدا کردیا۔

حضرت ولی کا شگفتہ تغزل اور پرکیف اسلوب — ان کی پاکیزہ سیرت درویشانہ زندگی اور وسیع اخلاق نے اہل ذوق سے خراج تحسین حاصل کیا ہے۔ زبان اردو ان کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ ہماری سوسائٹی کو آج سب سے زیادہ ضرورت ان بزرگوں کی صاف دلی۔ سادگی اور روحانیت کی ہے۔ یہ بزرگ انسانیت کے پیغام بر تھے۔

ان کی پریم لاپون نے ملک میں ایسی خوشگوار فضا پیدا کردی تھی جس میں ہماری زبان، ادب اور
ہندوستانی تمدن کا نشوونما ہوا۔ خدا کرے ان کا زندہ کلام پھر وہی ماحول پیدا کردے۔ جس میں
اتحاد اور اتفاق۔ محبت اور انسانیت کی گرم بازاری تھی۔ ان کی شاعری ان کے دل کی آواز تھی
یہ اپنے فن میں ڈوبے رہتے تھے۔ ان کی ذات میں عجیب و غریب کشش تھی۔ اپنے
کمال سے یہ عوام و خواص کے دلوں پر حکومت کرتے تھے۔ ہر مذہب و ملت کے
افراد ان کی طرف بے اختیار کھنچے چلے جاتے تھے۔ ان کی پاکیزہ سیرت نے شاعری کو چار چاند لگائے
اور ان کے ولولہ انگیز ترانوں نے دلوں کو محبت سے بھر دیا۔

اورنگ آباد قدیم زمانے سے جدت و ذہانت کا گہوارہ رہا ہے اس کی خاک میں بڑے
بڑے مدبر، شعرا، فضلا اور صوفیائے کرام محوخواب ہیں۔ انہیں بزرگوں کا فیض ہے کہ آج بھی
اورنگ آباد کے ویرانے اہل ذوق کی زیارت گاہ بنے ہوئے ہیں۔ اردو کے ہر دور میں اورنگ آباد کے
مصنفوں اور شاعروں کے نام نظر آتے ہیں۔ اہالیان اورنگ آباد ارباب سمی کالج کے ممنون ہیں
کہ انہوں نے ان کے ایک باکمال شاعر کی یاد دوسو برس کے بعد تازہ کی۔ میں ان کی اور کلیہ عثمانیہ
اورنگ آباد کی جانب سے اس ادبی جشن پر جناب مولوی سید محمد اعظم صاحب، جناب مولوی
سید محمد صاحب اور دیگر شرکائے کار کو مبارک باد دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ یہ جشن ہر طرح
کامیاب رہے اور ان کی مساعی مشکور ہوں۔

سید محی الدین صدر اورنگ آباد کالج

خطبۂ صدارت

عالی جناب نواب سالار جنگ بہادر دام اقبالہ

حضرات!

ہندوستان کے مایۂ ناز شاعر ولی اورنگ آبادی کے دو صد سالہ جشن یادگار کی صدارت اور افتتاح نمائش کے لیے آپ نے میرا انتخاب فرمایا اس کیلئے میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ جناب مولوی سید محمد اعظم صاحب نے جن سے تعلقات قدیمانہ ہیں اس تقریب کی سرپرستی قبول کرنے کی مجھ سے استدعا کی تو میں کچھ عذر نہ کرسکا کیونکہ میں جانتا تھا کہ ولی میرے بزرگوں کے وطن اورنگ آباد کا شاعر ہے۔ آپ حضرات سے یہ امر مخفی نہیں کہ میرے خاندان کے افراد کو اورنگ آباد سے قدیم تعلق رہا ہے۔ چنانچہ میرے اجداد وہیں سے حیدرآباد آئے۔ اگرچہ اس کی موجودہ حالت کو دیکھکر کوئی شخص اس کی قدیم تاریخی عظمت اور رونق کا اندازہ نہیں کرسکتا لیکن یہ مقام شاہی دور میں عالموں، شاعروں اور بڑے بڑے ارباب فکر و تدبر کا مرکز و مرجع رہا ہے۔

یہ امر ہم سب کیلئے باعث مسرت ہے کہ شعر و سخن میں بھی ہمارے اورنگ آباد ہی کے ایک شاعر کی تمام ہندوستان میں قدر و منزلت کی گئی اور اسی کے وجود سے شمالی ہند خاص کر دہلی میں اُردو شاعری کا آغاز ہوا۔ اسی لیے ہر قدیم تذکرہ نگار اس کو آدم ریختہ یعنے اُردو شاعری کا باوا آدم کہتا ہے۔ اگرچہ ایسا کہنے میں کسی قدر مبالغہ سے کام لیا گیا ہے اور یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ولی اورنگ آبادی ہی اُردو کا پہلا شاعر ہے کیونکہ آپ حضرات ابھی ابھی نمائش میں ملاحظہ فرماچکے ہیں کہ ولی سے ڈیڑھ دو سو سال پیشتر کے اُردو شاعروں کی بھی کتابیں موجود ہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ شمالی ہندوستان میں فارسی شاعری کا اثر کم کرکے اُردو کو رواج دینے والا ولی ہی تھا اور اس لحاظ سے وہ آدم ریختہ کہلانے کا یقیناً مستحق ہے۔

ایسی ہستیاں قابلِ فخر ہیں جو اپنے وطن کا نام روشن کرتی ہیں۔ ولی نے اپنے شعر و سخن کے کمال سے اپنا تمام ہندوستان میں مشہور کردیا اور آنے والی نسلوں کے لیے ایسا سرمایہ چھوڑا جس پر اہلِ ملک بجا طور پر ناز کرسکتے ہیں۔ ہم سب پر بھی فرض ہے کہ اسی طرح اپنے وطن کی خدمت میں اپنی اپنی بساط کے مطابق حصہ لیں اور ہم سے پہلے جن افراد نے اس کی خدمتگزاری میں اپنی عمریں صرف کردی ہیں اُن کی قدر کریں۔

میں اس جلسہ کے بانیوں کو مبارکباد دیتا ہوں کہ اُنہوں نے ایک اچھے کام کا آغاز کیا ہے۔ اس طرح کی تقریبوں سے علمی و عملی دلچسپیوں کو ترقی اور کام کرنے کے وسائل میں اضافہ ہوتا ہے جس کی فی زمانہ ضرورت بھی ہے۔

لیکن اس اہم اور اچھے کام کو اس تقریب کے ساتھ ختم نہ ہوجانا چاہیے۔ بلکہ مناسب یہ ہے کہ اس دوصد سالہ جشنِ ولی کی یادگار میں کوئی مستقل کام آغاز کیا جائے۔ میرے خیال میں اس سے بہتر کوئی کام نہیں ہوسکتا کہ ولی کے معاصرین اور اُن سے پہلے کے شاعروں اور صاحبانِ تصنیف کی کتابیں مرتب و شائع کی جائیں۔ ولی سے پہلے بھی ہمارے ملک میں بڑے بڑے سخنور اور انشاپرداز پیدا ہوچکے ہیں۔ [illegible] میں محمد قلی قطب شاہ اور علی عادل شاہ ثانی بڑے شاعر تھے۔ [illegible] نصرتی، مقیمی وغیرہ ولی سے [illegible] قابلِ قدر ہیں۔ بہرحال [illegible] کام کی تکمیل کے لیے [illegible]

مسرت کا مقام ہے کہ خود ہمارے ملک [illegible] سمجھ کر ان کو جدید ترین طریقوں پر مرتب کرکے شائع کرسکتے ہیں۔ میں بھی [illegible] ہاتھ بٹانے تیار ہوں۔

مجھے اس جلسے کے بانی مولوی سید محمد اعظم صاحب [illegible] سے یقین ہے [illegible] اس کام کو شروع کرادیں گے۔

میں سمجھتا ہوں کہ سب سے پہلے [illegible] سلاطین [illegible] محمد قلی قطب شاہ [illegible] عبداللہ قطب شاہ اور علی عادل شاہ وغیرہ شعرا کے کلام کی اشاعت [illegible] ترتیب و اشاعت کے بعد دوسری اہم [illegible] کتابیں مثلاً [illegible] علی نامہ، قطب مشتری [illegible] اور گلشنِ عشق وغیرہ بھی چھپوائی جاسکتی ہیں۔ ان سب کتابوں کی اشاعت سے اُردو [illegible] کے ذخیرہ میں [illegible] ہوگا اور اُردو بولنے والوں کی معلومات وسیع ہوجائیں گی۔

لیکن ہم کو محض قدیم ادبی سرمایہ کی اشاعت ہی تک اپنے کام کو محدود نہ رکھنا چاہیے۔ ہمارے ملک کے نوجوانوں کو جدید طرز کی ضرورتوں اور ملک کے نئے نئے رجحانات و ضروریات کے مطابق بھی تصنیف و تالیف میں حصّہ لینا چاہیے۔ کیونکہ زمانہ ہمیشہ ایک طرح پر نہیں رہتا۔ دنیا بہت کچھ بدل چکی ہے۔ اِن تغیرات کے ساتھ ساتھ ہم کو بھی جدید حالات، رجحانات اور ماحول سے مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ ہمارے ملک میں اب اچھے ادیب اور علمی کام کرنے والے پیدا ہو گئے ہیں اور وہ جدید حالات و خیالات کے مطابق تصنیف و تالیف میں مشغول ہیں۔ یہ نہایت خوش آیند امر ہے اور ظاہر کرتا ہے کہ اِس ملک میں محمد قلی، وجہی، نصرتی وغیرہ نے علم و ادب کی جو شمع روشن کی تھی اور جس کی روشنی دکّی اور نگ آبادی نے دُور دُور تک پھیلا دی تھی وہ اب بھی روشن ہے اور مجھے توقع ہے کہ ملک کے ہونہار نوجوان اِس کی روشنی میں اضافہ کرنے اور اپنے بزرگوں کے سرمایہ سے مستفید ہونے میں ہر طرح پیش پیش اور کامیاب رہیں گے۔

حضرات!

آج ہم اپنی زبان کے ایک بہت بڑے شاعر کا دو صد سالہ جشن منا رہے ہیں۔ ہزار بار کہا جائے کہ ولی گجراتی تھے لیکن اس کا جواب یہی ہے، جیسا کہ بعض لوگ اپنی کتابوں پر لکھا کرتے ہیں " اگر لکھے دعویٰ کند باطل است"

وہ پیدائشی ملکی تھے! ایسے ملکی جن کو کوئی سرٹیفکٹ کی ضرورت نہ ہو۔ یہاں ملکی اور غیر ملکی کا سوال نہیں۔ جو بڑا شاعر ہوتا ہے وہ تمام ملک کی شستہ کا مالک ہوتا ہے اور بڑے شاعر کی خوبیاں سارے عالم میں پھیل جاتی ہیں۔ کسی کے اعلیٰ شاعر ہونے کا معیار یہی ہے کہ اس کا کلام زبان زد خاص و عام ہو جائے۔ ولی کے کلام کا زبان زد خاص و عام ہونا یوں بھی ثابت ہے کہ کلام کے متعدد نسخوں کی موجودگی سے صاف ظاہر ہے۔ یورپ میں کلام ولی کے بہت سے نسخے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ولی دوسری قوموں میں بھی پسندیدہ نظروں سے دیکھے جاتے ہیں۔

حضرات! حیدرآباد نے زبان اردو کی جو حقیقی خدمت کی اس کا مقابلہ ہندوستان کا کوئی اور خطہ نہیں کر سکتا۔ اگرچہ بعض دوسرے صوبوں نے بھی اس کی نشو و نما میں کافی حصہ لیا اور اب بھی اس کی مزید ترقی میں کوشاں ہیں لیکن یہ کوشش پوری زبان پر حاوی نہیں۔ مثلاً صوبہ پنجاب اردو صحافت کی جو خدمت کر رہا ہے اس کا ہم کو بجا طور اعتراف ہے لیکن حیدرآباد اردو کی جو خدمت ہمیشہ سے کرتا آیا ہے وہ ہم سب جانتے ہیں۔ دور عثمانی میں سلطنت حیدرآباد کی تعلیمی، عدالتی اور سرکاری زبان ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام اور اس کے ساتھ ہی دارالترجمہ کی وجہ سے جو کام اردو کی ترقی کے لیے ہو رہا ہے وہ اپنی آپ نظیر ہے۔ آج سے پچیس تیس سال قبل اردو زبان میں اعلیٰ علمی کتابیں بہت کم دستیاب ہوتی تھیں لیکن اب دارالترجمہ اور جامعہ عثمانیہ کے سپوتوں کی علمی خدمات کی بدولت ایسی کتابیں وافر

عام ہو رہی ہیں ۔ یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں ہے کہ حیدرآباد اُردو کی خدمت کر رہا ہے بلکہ وہ اپنی تاریخ کو دہرا رہا ہے آج سے دو تین سو سال پہلے ہی سے حیدرآباد نے اُردو کی خدمت شروع کی تھی اور آج تک بھی وہ اپنے اس قدیم فریضہ کو ادا کر رہا ہے ۔ اُردو کی نشو و نما زیادہ تر دکن ہی میں ہوئی ۔ دکن ہی میں اُردو نظم اور نثر نے جنم لیا ۔ دکن ہی وہ سرزمین ہے جس میں سلطنت گولکنڈہ کی شاہانہ سرپرستیوں کے وجہ سے غواصی جیسے ناظم اور وجہی جیسے نثار پیدا ہوئے جس زمانہ میں شمالی ہند میں عموماً فارسی بولی جاتی تھی اس سے پیشتر یہاں اُردو بولی جانے لگی ۔ اُردو شاعری کا ابھی شمالی ہند میں کوئی ذکر بھی نہ تھا کہ یہاں نظم میں اعلیٰ اعلیٰ کتابیں لکھی گئیں ۔ اُردو نثر کے عام رواج کو تو تھوڑا عرصہ ہوا لیکن دکن میں عرصہ دراز پیشتر ہی سے نثر میں بلند پایہ تصانیف عام ہو گئی تھیں ۔

اُردو کا رسم الخط عربی اور فارسی رسم الخط سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے کیونکہ ابتدا میں مسلمانوں کی زبان عربی تھی اور ان کی مقدس کتابیں بھی اسی میں ہیں لیکن محض رسم الخط کی عربی رسم الخط سے مشابہت پر اُردو زبان کو مسلمانوں کی زبان سمجھنا صحیح نہیں ۔ اُردو ہندوستانی زبان ہے ۔ اس میں اکثر و بیشتر الفاظ ہندی اور سنسکرت کے ہیں ۔ اس کا صحیح نام "ہندوستانی" ہے اور ہونا چاہیے ۔ "ہندوستانی" تمام ہندوستان کی بولی ہے ۔ اس میں فارسی، عربی، سنسکرت اور ہندی کا اس قدر گھرا میل ہے کہ اب ان کو الگ الگ کرنا محال ہے ۔ اس کی مثال گنگا اور جمنا کی سی ہے ۔ بلا شبہہ ان کا پانی سنگم کے قریب تک الگ الگ نظر آتا ہے لیکن آگے جاکر وہ ایک ہی دکھائی دیتا ۔ زبان الفاظ کے ادخال و اخراج سے نہیں بنتی بلکہ استعمال سے بنتی ہے ۔

حضرات ! جس طرح تلسی داس ہندوستان کا بڑا شاعر تھا اسی طرح ولی بھی پورے ہندوستان کا شاعر ہے اس کا کلام سارے ہندوستان کی میراث ہے ۔ ولی کا مرتبہ اُردو میں وہی ہے جو انگریزی میں چاسر کو حاصل ہے تحقیقی و تاریخی نقطۂ نظر سے ولی کا کلام نہایت دلچسپ ہے ۔ اس نے ایسے زمانے میں شعر کہے جب کہ زبان خود ایک انقلابی دور سے گزر رہی تھی ۔ نئی نئی ترکیبیں، نئے نئے الفاظ زبان میں داخل ہو رہے تھے، قدیم الفاظ ترک کئے جا رہے تھے اور فارسی شاعری کے رنگ سے ہٹ کر اُردو شاعری کا ایک نیا رنگ جم رہا تھا ۔ ولی کی شاعری جذبات سے بھری ہوئی ہے، وہ فطرت کا ترجمان تھا ۔ یقیناً اس کا درجہ اُردو شاعری میں نہایت بلند ہے ۔

اساتذہ کی یادگار منانے کی رسم بہت اچھی ہے ۔ شاعری ایک خداداد ملکہ ہے اس لیے ہر شخص شاعر نہیں ہوسکتا ۔ شعر جذبات انسانی کا آئینہ دار ہوتا ہے ۔ ان تقریبوں سے ملک میں اس کا صحیح مذاق پیدا ہوتا ہے ۔ جو لوگ قدرتی شاعر نہیں بلکہ مشاقی سے شاعر بن بیٹھتے ہیں ان سے ادبیات میں کوئی اضافہ نہیں ہوسکتا ۔ گل و بلبل کے

افسانے اور معشوق کی کمر کی چھان بین سے زبان اردو کو کوئی فائدہ نہیں۔ اچھے لٹریچر کی یہی پہچان ہے کہ اس کو لوگ ذوق وشوق سے پڑھیں۔ جیسے عمر خیام کی رباعیات، حافظ کی غزلیں اور فردوسی کا کلام کہ یورپ اور امریکہ کی متعدد زبانوں میں ترجمہ ہو کر پڑھا جاتا ہے۔

حضرات! ضرورت ہے کہ ہمارے مشاعروں میں اصلاح کی جائے۔ قدیم ڈگر کو چھوڑ کر نئے راستے بنائے جائیں۔ پرانے راستوں سے ہٹ کر نئے نئے میدانوں میں قدم رکھنا اور ذوق سلیم پیدا کرنا ضروری ہے۔

ہم آج ولی کا یادگار جشن منا کر تاریخ ادب میں ایک اہم باب کا اضافہ کر رہے ہیں۔ امید کہ اس کی یادگار میں ہم اپنے ذوق کی ایسی اصلاح کریں جس سے زبان مالا مال ہو اور اخلاق کو فائدہ پہنچے۔ اس جشن کے سلسلے میں قدیم کتابوں کی جو نمائش کی گئی ہے مجھے اس کے دیکھنے سے بڑی خوشی ہوئی۔ مجھے امید ہے کہ ولی کی یادگار میں اس قسم کی ایک مستقل نمائش قائم کی جائیگی جس سے زبان کو ترقی دینے کی ترغیب وتحریص پیدا ہوتی رہیگی۔

پڑھتے ہیں ولی شعر ترا عرش پہ قدسی
باہر ہے تری فکر رسا حدِ بشر سے

یہ عجیب بات ہے کہ جو ہستیاں آسمانِ شہرت پر آفتاب بن کر چمکتی ہیں ان کے حالات و واقعاتِ زندگی کے متعلق مورخوں اور تذکرہ نویسوں میں سخت اختلافِ رائے نظر آتا ہے اور بعض وقت ان اختلافات کی کثرت کی وجہ سے اصل حقیقت کا پتہ چلانا مشکل ہو جاتا ہے۔ اردو شاعری کے ابو الآبا حضرت ولی اورنگ آبادی کا بھی یہی حال ہے ان کی غیر معمولی شہرت اور ان کے کلام کی عالمگیر مقبولیت کے ساتھ ان کے حالات کے متعلق بعض تذکرہ نویس بہت ہی مختلف رائے ہیں۔ ان کے نام، وطن، تعلیم و تربیت، سیر و سیاحت غرض ہر چیز کے متعلق مختلف بیانات پائے جاتے ہیں۔

ان اختلاف بیانیوں کے کئی سبب ہیں۔ اوّل یہ کہ اردو کے تمام تذکرے بارہویں اور تیرہویں صدی ہجری کی تالیفیں ہیں۔ دوسرے یہ کہ ہمارے ان تذکرہ نگار حضرات کے نزدیک حالاتِ زندگی کی تحقیق و صحت کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی بہت

سے تذکرے تو اصل میں بیاضیں معلوم ہوتے ہیں۔ جن میں مختلف شعرا کے پسندیدہ اشعار نقل کر لیے گئے اور ان اشعار سے پہلے شاعر کا نام اور چند سنی سنائی باتیں اضافہ کر دی گئی ہیں۔ خصوصاً ایسے شاعروں کے متعلق جن کا زمانہ مولف کے زمانے سے بہت پہلے کا ہے، دریافت اور تحقیق سے بہت ہی کم کام لیا گیا۔ اکثر اگلے مصنفوں سے خوشہ چینی کر کے صرف لفظی ہیر پھیر کے ساتھ وہی باتیں بیان کر دیں یا ان سے انحراف کر کے کوئی زبانی روایت نقل کر دی اور اسی کو اپنی تحقیق قرار دیا۔ ولی اورنگ آبادی کے حالات کی نسبت اختلاف بیانیوں کا راز انہی وجوہ میں پوشیدہ ہے۔ میر نے اپنے تذکرہ نکات الشعرا میں انہیں اورنگ آبادی بتایا۔ گردیزی نے اسی کو بہ تغیر الفاظ یوں تعبیر کیا کہ "در دکن چہرہ ہستی بر افروختہ"۔ قایم چاند پوری نے اپنے مخزن نکات میں ان دونوں کے بیان کے برخلاف فراق گجرات والے قطعہ اور حضرت شاہ وجیہ الدین گجراتی کی مدح اور شہر سورت کی تعریف میں مثنوی دیکھ کر ان کو گجراتی قرار دیا۔ بعد کے تمام تذکرہ نگاروں کے یہی تین ماخذ ہیں۔ علی ابراہیم خاں مولف گلزار ابراہیم، مرزا علی لطف مولف گلشن ہند، فایق مولف مخزن شعرا اور میر حسن نے قایم چاند پوری کے اتباع میں انہیں گجراتی قرار دیا۔ لچھمی نارائن شفیق مولف چمنستان شعرا، حکیم قدرت اللہ خاں قاسم مولف مجموعہ نغز، عبدالجبار خاں ملکاپوری شدّ و مد سے ان کے اورنگ آبادی اور دکنی ہونے کے موئید ہیں۔

اسی طرح ولی کے نام کے متعلق بھی تذکرہ نویسوں میں سخت اختلاف رائے ہے۔ فتح علی گردیزی، لچھمی نارائن شفیق، قدرت اللہ خاں قاسم نے ان کا نام محمد ولی بتایا ہے۔ خواجہ خاں مولف گلشن گفتار نے ولی محمد لکھا ہے۔ قایم چاند پوری، میر حسن، علی ابراہیم خاں خلیل اور ان کے اتباع میں مرزا علی لطف اور نساخ نے شاہ ولی اللہ تحریر کیا ہے۔ آب حیات میں شمس ولی اللہ بتایا گیا ہے۔ ان ناموں میں سے اوّل الذکر ہی صحیح ہے۔ کیونکہ اس کے راوی نسبتاً قدیم ہیں اور صاحب تذکرہ سے قربتِ زمانی بھی رکھتے ہیں۔ چونکہ ولی کو حضرت شاہ نور الدین صاحب صدیقی سہروردی سے بیعت تھی۔ وہ صوفی منش

اور فقیر دوست بھی تھے نیز اُن کے کلام سے جو متصوفانہ رنگ ظاہر ہوتا ہے ۔ اُس کی بناء
پر متوسط عہد کے تذکرہ نگاروں نے اُن کا نام شاہ ولی اللہ سمجھ لیا اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ
اُن کا لقب ہو ۔ شمس ولی اللہ کی توثیق کسی اور تذکرہ سے نہیں ہوتی اور یہ غالباً محمد حسین
آزاد کی قیاس آرائی ہے ۔

ولی کی ولادت تقریباً ۱۰۷۰ھ میں ہوئی ۔ اُن کے خاندان، تعلیم و تربیت کا
حال بالکل پردہ تاریکی میں ہے ۔ البتہ اتنا پتہ چلتا ہے کہ بیس برس کی عمر حصول علم کے شوق
میں گجرات کا سفر کیا اور احمد آباد میں حضرت شاہ وجیہ الدین رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ کے
مدرسہ میں تعلیم پائی ۔ وہیں حضرت شاہ نورالدین صدیقی سہروردی سے بیعت ہوئے ۔
احمد آباد کے ایک بزرگ زادے سید ابوالمعالی سے ان کی دوستی ہوئی جو غیر معمولی
محبت و شیفتگی کے درجے کو پہنچی ہوئی تھی ۔ ابوالمعالی کے ساتھ ہی ولی نے جلوس عالمگیر کے
چوالیسویں سال یعنی ۱۱۱۲ھ میں دہلی کا سفر کیا یہاں حضرت شاہ سعد اللہ گلشن سے جو
دہلی کے بہت بڑے بزرگ اور شاعر بھی تھے ملے ۔ میر صاحب اور قائم چاند پوری کا بیان
ہے کہ شاہ صاحب ہی نے ولی کو ریختہ گوئی کی ترغیب دلائی ۔ میر حسن، علی ابراہیم اور
قدرت اللہ خاں قاسم نے لکھا ہے کہ اُن سے استفادہ کیا ۔ فائق نے بھی رسالہ
نورالمعرفت کے حوالے سے لکھا ہے کہ وہ شاہ صاحب کے شاگرد تھے ۔

مصحفی نے اپنے تذکرہ میں ایک جگہ شاہ حاتم کی زبانی یہ بیان کیا ہے کہ ولی نے
پیش فقیر نقل می کرد کہ در سن دوم فردوس آرامگاہ دیوان ولی در شاہ جہاں آباد
آمدہ و اشعار بر زبان خورد و بزرگ جاری گشتہ " بعض لوگوں نے غلط فہمی سے اس کا
یہ مطلب لیا کہ ولی نے دوبارہ محمد شاہ کے عہد میں بھی دلی کا سفر کیا تھا ۔ وہ اپنے
خیال کی تائید میں یہ شعر بھی پیش کرتے ہیں

اس کا دل لیا دکنی نے چھین   جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

لیکن جیسا کہ گلشن گفتار اور چمنستان شعرا سے ثابت ہے ۔ یہ شعر ولی کا نہیں بلکہ مضمون کی

لہ مخزن نکات ۔

شاعر کا ہے۔

کلشن گفتار سے ولی کا برہان پور جانا بھی ظاہر ہوتا ہے۔ گجرات کے بہت سے شہروں میں ولی کا ضرور قیام رہا ہوگا۔ خصوصاً سورت میں اُن کا قیام، تذکرہ چمنستان شعرا اور اس مثنوی سے بھی ظاہر ہے جو اس شہر کی تعریف میں لکھی گئی ہے۔ شفیق یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ ولی حج بیت اللہ و زیارت حرمین شریفین سے بھی مشرف ہوئے تھے۔

ولی کا سن وفات عام طور پر ۱۱۵۵ھ مشہور ہے۔ مولوی عبدالجبار خاں صوفی ملکاپوری نے مثنوی روضۃ الشہدا کے زمانۂ تالیف وغیرہ کا لحاظ کرکے قیاساً یہ سن اپنے تذکرۂ محبوب الزمن میں درج کیا ہے۔ لیکن کتب خانہ جامع مسجد بمبئی کے ایک قلمی نسخہ میں جو ۱۱۲۱ھ کا لکھا ہوا ہے یہ قطعۂ تاریخ مندرج ہے:-

مطلع دیوان عشق سید ابدال   والی ملک سخن صاحب عرفاں ولی

سال وفاتش خرد از سر الہام گفت   باد پناہ ولی ساقی کوثر علی

مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اُردو نے اِس قطعہ کی بناء پر ولی کا سن وفات ۱۱۱۹ھ قرار دیا ہے۔ ولی نے احمد آباد میں انتقال کیا اور وہیں نیلی گنبد کے قریب مزار موسیٰ سہاک اور شاہی باغ کے درمیان مدفون ہیں۔

یوں تو ولی کے بہت سے شاگرد ہونگے۔ اُن کے کلام میں بھی بعض لوگوں کے نام ملتے ہیں۔ لیکن اکثر و بیشتر تذکرے ان کے ذکر سے خالی ہیں۔ صرف گلشن گفتار میں ان کے دو شاگردوں اشرف اور رضی کا ذکر ملتا ہے۔ یہ دونوں گجرات کے باشندے تھے اور نواحِ گجرات میں ان کی شاعری کی بہت شہرت تھی۔ اس تذکرہ سے اشرف کا صاحب دیوان ہونا بھی ظاہر ہے۔ نموناً اِن دونوں کے جو اشعار دیے گئے ہیں وہ نہ صرف ایک ہی زمین میں ہیں بلکہ ایک دوسرے کے جواب میں ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ باہم حریف سخن بھی تھے۔

ولی کی تصانیف میں کلیات کے علاوہ جس میں ہر صنف سخن کا کلام موجود ہے۔ تصوف اور معرفت کا ایک رسالہ موسوم بہ نور المعرفت بھی مشہور ہے۔ اور بعض تذکرہ نویس

نے اس کا ذکر کیا ہے مگر یہ اس وقت تک نایید ہے۔ مثنوی "روضۃ الشہدا" کو جو ولی ویلوری کی تصنیف ہے ولی اورنگ آبادی سے منسوب کردیا گیا تھا اور اس کی وجہ سے اُن کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہوگئی تھیں۔ مگر اب یہ امر پایۂ تحقیق کو پہنچ چکا ہے کہ مثنوی روضۃ الشہدا اُن کی تصنیف نہیں۔

ولی کے کلام کی عالمگیر مقبولیت اور فنِ ریختہ گوئی میں اُن کی استادی کا اعتراف قدما میں سے بہت سے اساتذہ نے کیا ہے۔ حاتم کہتے ہیں

حاتم یہ فن شعر میں کچھ تو بھی کم نہیں
لیکن ولی ولی ہے جہان میں سخن کے بیچ

آبرو کا شعر ہے

آبرو شعر ہے ترا اعجاز
پر ولی کا سخن کرامت ہے

میر صاحب نے بھی ایک موقع پر اشارتاً ولی کی استادی کا اعتراف کیا ہے۔

ذیل میں چند مستند نقادِ سخن تذکرہ نویسوں کی رائے نقل کی جاتی ہے:-

۱- "کلامش از زبان سخن ربایندہ سے قابلیت کسب و دماغ اندیشہ اش ہوائے معنی رسیدہ۔ اشعار آبدارش زیب صفحۂ لیل و نہار است و اشعار در سخن سرایان روزگار" (تذکرہ فتح علی گردیزی)

۲- "سخن این بزرگ چنان حسنِ قبول یافت کہ ہر بیت دیوانش روشن تر از مطلع آفتاب گردیدہ و ریختہ از زبان فصاحت و بلاغت می گفت کہ اکثر استادان آن وقت زیادہ ہوش شعر ریختہ موزوں می نمودند" (مخزن نکات)

۳- "اگرچہ در زمانۂ ماضیہ موزونان این جا شعر را بزبان ریختہ گفتہ اند اما صاحب دیوانے باین متانت و فصاحت از کتمِ عدم نرسیدہ و شعرائے سلف چند طوطی شکر

مقال بوستان سخن دانی اند - سلیمان چنین ملبس بد داستان
بہ لوئش : رسید - آپ ولی ولایت نازل خیالی شہنشاہ
قلمروے خوش مقالی است " (چمنستان شعرا)

۴- " از مشاہیر ریختہ گویان او اول کسے است کہ دیوانش
در دکھن شہرہ و مدون گشتہ " (گلزار ابراہیم)

۵- " تعریفش از احاطۂ تحریر و تقریر بیرون است بنا ریختہ
را چنان مستحکم نمود کہ الحال از بلندی طاق سپہر افزون "
(تذکرہ میر حسن)

۶- " کلام نقش بر جملہ سخن پردازان ہندی زبان ثابت
است۔ سخن بر سخنش ابلیس منشی و شیطنت - بیہ خان
کمترین رہ خدائش بنام زد بسیار موقعہ و بجا گفتہ
کہ :-

ولی پر جو سخن لاوے اسے شیطان کہتے ہیں

قطع نظر از زبان دکھنی شعرش بمرتبہ اعلیٰ شاعری و سخنش
بدرجۂ علیائے سخنوری است "

(مجموعہ نغز قدرت اللہ خاں قاسم)

۷- " اول کسے کہ آئینہ سخن ہندی را بہ صیقل گری نظم
جلا بخشید و ریختہ را بہ گرمی بلاغت نشانید ہمین است
درین باب سرگروہ و مقدمۃ الجیش جمیع شاعران ہند و
گجرات است " (مخزن شعرا فائق)

۸- غزل گوئی کے اعتبار سے ولی اول درجے کے شاعر تھے۔
جو غزل گوئی کے تقاضے تھے اُن سے ولی کو پوری اطلاع
حاصل تھی - چنانچہ غزل گوئی میں حیثیت شاعری کا داخلی پہلو

پیش نظر رکھتے ہیں۔ اس لیے اُن کی غزل سادگی پر تاثیر نظر
آتی ہے۔ ولی کے کلام میں درد، سودا، میر، مصحفی،
ذوق، ناسخ، آتش سب کے رنگ بکثرت موجود ہیں
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ولی کس قدر قوی الدماغ شاعر
تھے۔ جو ہر فن کے کلام پر قدرت تامہ رکھتے تھے۔
حقیقت یہ ہے کہ مابعد کے جتنے متغزلین موجد سبک
کہلاتے ہیں درحقیقت اسی پیر طریقت کے مرید ہیں"
([illegible] الحقائق [illegible])

۹- شاعر بلند متقدم تھا اول زبان ہندی میں دیوان اس
نے جمع کیا ہے اور نظم ریختہ کو سرزمین دکن میں
واقع اس نے کیا ہے۔ شعرائے دکن میں مشہور و ممتاز
ہے اور اپنے معاصروں میں بلند و سرفراز۔
(گلشن ہند مرزا علی لطف)

۱۰- اگرچہ در زمانے او و در زمانہ ما در زبان
فرق خورشید و ماہ و شب و روز است کہ نمی
توان گفت۔ لیکن چہ در بیت زبان ریختہ را بہ ہمہ حال
حق استادی وے بر جمیع اہل نظم ریختہ ثابت باشد و محال
بعید۔ (گلشن بے خار شیفتہ)

۱۱- ان کی تصنیف باعتبار قدامت اردو کے غرض زبان
صنعت و ترتیب ہیں۔ عبارت آسان اور سہل ہے۔ شعرائے
مابعد نے ان کا تتبع کیا ہے اور ان کی شاعری سے شاعری
میں شعر کی بنیاد مضبوط ہوئی۔ سادگی، سلاست اور ترنم
ان کے کلام کے جوہر ہیں۔ اشعار میں روانی ہے خصوصاً

آمد ہے اور صفائی بہ اینت بکثرت نہیں ہیں ۔ بعض شعر تو ایسے
صاف ہیں کہ بالکل زمانۂ حال کے معلوم ہوتے ہیں"
(تاریخ ادب اردو سکسینہ)

وَلیؔ اورنگ آبادی

(از)

مولوی سید سکندر علی صاحب وجدؔ بی۔ اے (عثمانیہ) ایچ۔ سی۔ ایس [illegible]

اُلٹ دی گردشِ ایام نے بزمِ قطب شاہی
بجھا دی قصرِ تاناں شاہ کی شمعِ سحرگاہی

محبت سوگ میں تھی، حسنِ فطرت بے سہارا تھا
نظر گھائل ہوئی جاتی تھی وہ قاتل نظارہ تھا

گریباں چاک تھے گل، گرد آتشناک اُڑتی تھی
صبا مجروح تھی، سارے چمن میں خاک اُڑتی تھی

صدائے بربطِ دل کون سنتا زار نالی میں
کمالِ فن نگوں سر تھا عروجِ بے کمالی میں

فنائی گود میں سستا رہا تھا نغمۂ وجہیؔ
ڈبو دی چرخ نے بحرِ عدم میں فکرِ غواصیؔ

صدائے نُصرتیؔ کی گونج بھی گم ہو گئی آخر
جگایا نیند کے ماتوں کو اور خود سو گئی آخر

گلوں سے حالِ بلبل پوچھنے والا نہ تھا کوئی
محبت کی پہیلی بوجھنے والا نہ تھا کوئی

نہ تھا کوئی صبا سے حالِ دلبر پوچھنے والا
ہوا میں زلفِ مشکیں کا تعطر ڈھونڈنے والا

کوئی موتی لٹاتا تھا نہ اپنی چشمِ پرنم سے
کوئی لیتا نہ تھا افتادگی کا درس شبنم سے

ترے دم سے ولی باغِ سخن میں بہار آئی
خزاں منظر چمن میں گل کھلے با آبِ سبز آئی

تری آواز پر ہر اہلِ محفل سر کو دھنتا تھا
دکن کا ذکر کیا، ہندوستاں خاموش سنتا تھا

ترے شعروں میں گو نکہت بسی ہے موجۂ گل کی
کسک ہے ان میں پوشیدہ دلِ صد چاکِ بلبل کی

سنایا اپنی لے میں جب وفا کا تو نے افسانہ
بھگوئی شمع نے اشکوں سے شب بھر نالِ پروانہ

ترے نغمے نے پھر سے بزمِ اہلِ شوق گرما دی
تری میٹھی زباں نے عشق کی تقدیر چمکا دی

گرایا جس نے نظروں سے جمالِ ترک[1] شیرازی
"دکن کی[2] سانولی" نے سب کے دل کی بار دی بازی

[1] فارسی ۔ [2] اُردو ۔

حسه ون ومون

ہوئے تھے، عنفوانِ شباب میں تکمیلِ تعلیم کے لیے احمد آباد گئے تھے، ۱۱۱۲ھ میں شاہجہاں آباد کا سفر کیا اور ۱۱۱۹ھ میں احمد آباد گجرات میں انتقال کیا۔ لیکن حال ہی میں انجمن ترقی اُردو کی طرف سے (۱۹۳۳ء میں) گجرات کے اُردو شاعروں کا ایک تذکرہ مخزنِ شعرا شایع ہوا ہے جو اگرچہ وَلی کی وفات کے ڈیڑھ سو سال بعد لکھا گیا ہے لیکن اس کے مصنف نے جرات رندانہ سے کام لیکر وَلی کو گجراتی قرار دیا ہے اور اس کے ثبوت میں محض یہ لکھا ہے کہ:۔

محققان این فن را درحالِ او اختلاف است کہ آیا ولی از گجرات است ویا از دکھن۔ اما براقم اثم از زبانی ثقاتِ بلدۂ احمد آباد بہ ثبوت چنان پیوستہ کہ شاعر مزبور از بلدۂ مسطور بودہ، و سالہا بدکھن ہم گذرانید وخطا کردہ میر تقی میر کہ در تذکرۂ خود او را از اورنگ آباد نوشت۔ (مخزن شعرا صفحہ ۱۱)

اس کتاب کو انجمن ترقی اُردو کے مستعد معتمد اور اُردو زبان کے بڑے خدمتگذار مولوی عبدالحق صاحب نے مرتب کرکے شایع کیا ہے اور اپنی طرف سے اِس پر ایک دلچسپ مقدمہ بھی لکھا ہے۔ لیکن اس مقدمہ میں اس بحث کے متعلق کوئی قطعی رائے نہیں ظاہر کی گئی اور یہ لکھکر اس مسئلہ کو ادھورا چھوڑ دیا ہے:۔

"یہ اختلاف ایک مدت سے چلا آرہا ہے اور اس وقت اس کا قطعی فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے"
(مخزن شعرا صفحہ ہ)

ان دونوں بیانات کی وجہ سے اندیشہ پیدا ہوگیا کہ وَلی کے وطن کے متعلق کوئی غلط فہمی نہ رائج ہوجائے، اس لیے آج کی صحبت میں اس مسئلہ کی یکسوئی کی خاطر مختلف براہین وشواہد کے ذریعہ سے یہ ثابت کیا جائیگا کہ وَلی اصل میں اورنگ آباد کے رہنے والے تھے، آخر عمر میں احمد آباد میں قیام پذیر تھے اور وہیں وفات پائی اور مدفون ہوئے۔

اس مضمون میں سب سے پہلے وَلی کی طبیعت کے رجحان اور حالاتِ زندگی کو پیش نظر رکھ کر یہ بتایا جائیگا کہ وہ کیوں اور کس طرح اورنگ آباد کو چھوڑکر گجرات کے دلدادہ ہوگئے تھے۔ اور بعد میں عہد ولی کے شعرائے گجرات ودکن کے کلام نیز دیگر ذرایع سے ایسے قطعی شواہد پیش کیے جائیں گے جن سے واضح ہوگا کہ ولی دکنی شاعر تھے نہ کہ گجراتی، یہ اور بات ہے کہ وہ عرصہ تک گجرات میں رہے اور اُن کا یہ قیام وہاں کی بجھتی ہوئی شمع شعروسخن کو پھر سے کچھ عرصہ کے لیے روشن کرنے کا باعث ہوا۔ اس کو وَلی کی کرامت سمجھنی چاہیے کہ جہاں انہوں نے شمالی ہند کا سفر کرکے شاہجہاں آباد میں اُردو شعروسخن کی بناڈالی گجرات میں بھی انہی کی وجہ سے اُس گئے گذرے زمانہ میں اُردو شاعری ایک آخری بار چمک اٹھی۔

(۲)

وَلی کے کلام کا ایک سرسری مطالعہ بھی اس حقیقت کو بے نقاب کرنے کے لیے کافی ہے کہ وہ وسیع المشرب اور

سید ابوالمعالی ہی کو خصوصیت حاصل ہے۔ یہ گجرات کے مشائخ زادے تھے اور بڑے سخن فہم و سخن سنج۔ انہی کے ساتھ ولی نے شاہجہاں آباد اور سرہند وغیرہ کا سفر کیا تھا اور انہی کی وجہ سے وہ آخر کار احمد آباد ہی میں رہ پڑے۔ ان سے ولی کو جس درجہ تعلق خاطر تھا ان کی ان متعدد غزلوں سے ظاہر ہوگا جو اس نیک نہاد نوجوان کی فرشتہ خوئی، اور اوصاف حمیدہ کی تعریف میں لکھی گئی ہیں۔

غرض گجرات میں قیام پذیر ہونے کے اسباب خود ولی نے اپنے اشعار میں بیان کردیے ہیں۔ احمد آباد کی چہل پہل، وہاں کی دلچسپ صحبتیں، حضرت شاہ وجیہ الدین کی خانقاہ اور مدرسہ کی پُرسکون و حیات پرور فضا، ان کے وطن اورنگ آباد کی مرہٹوں کے ہاتھوں ویرانی اور وہاں کا خشک و ہولناک فوجی ماحول، گجرات کا حسن ملیح اور سب سے بڑھ کر سید ابوالمعالی کی رفاقت یہ سب چیزیں تھیں جنہوں نے ولی کو آخر کار وہیں رہنے پر مجبور کردیا۔ وہ اپنے محبوب کی گلی کے مقابلہ میں کشمیر اور کابل کے حسن زاروں اور شمالی ہند کے بارونق شہروں کو ہیچ سمجھتے ہیں محبوب کا خیال انہیں دو جگ سے بے نیاز کردیتا ہے۔ ان کے شعر ہیں:۔

ولی یوں دیکھ بولا تجھ گلی کوں — یہی ہے ہند اور کشمیر و کابل

دلدار کی گلی سوں کیوں جاسکوں ولی میں — لپٹا لپٹ ہے دل کوں جب چیرۂ زری سوں

اے ولی غیر آستانۂ یار — جبہ سائی نہ کر خدا سے ڈر

باغ ارم سے بہتر موہن تری گلی ہے — ساکن تری گلی کا ہر آن میں ولی ہے

دو جگ ہوئے ہیں دل سوں فراموش اے ولی — رکھتے ہیں جب سوں یاد سریجن کی من میں ہم

عالم کی دوستی سے ہے نفرت ولی کو نت — ہر آشنا کے دم سے گریزاں ہے جیوں چراغ

دوسرے ملکوں کی دلچسپیاں تو خیر کوئی ایسی اہمیت نہیں رکھتیں۔ ولی کا عقیدہ تو یہ ہے کہ اپنے دوست کی قیام گاہ کے مقابلہ میں اہل دل اپنے پیارے وطن کو بھی بھول جاتے ہیں۔ کیونکہ بغیر گل و گلشن کے بلبل کی زندگی ممکن نہیں اور جو راہ عاشقی کا سالک ہے اس کو وطن سے کیا کام! اس کی منزل وہی ہے جہاں محبوب ہوئے۔ ان اعتقادات کے تحت میں اگر ولی، اورنگ آباد کو چھوڑ کر احمد آباد ہی میں رہ پڑے تو کیا تعجب، وہ کہتے ہیں:۔

کیا دل نے تیری گلی کا مقام — کہ بلبل کوں دائم ہے گلشن وطن

میں دل کوں دیا بند کر اُس سریجن کوں — عشاق جسے دیکھ بسارے ہیں وطن کوں

عشق کی راہ میں مسافر کوں — ہر قدم تجھ گلی میں منزل ہے

گویا انہوں نے تصفیہ کر لیا تھا کہ اب میرا وطن اورنگ آباد نہیں ہے۔ عاشق کا وطن اصل میں محبوب ہی کی گلی ہے اور اس گلی کی یاد عاشق کا ایمان۔

یہ ممکن ہے کہ آخر زمانہ میں ولی کے سامنے انکے وطن کا ذکر کیا جاتا ہو یا اثنائے سفر میں لوگ ان کے وطن کے متعلق دریافت کرتے رہتے ہوں لیکن ان سب موقعوں پر اُن کے یہاں ایک ہی جواب تھا کہ:-

ہرگز ولی کے پاس تم بات وطن کی مت کہو   جو نیہ کے کوچہ میں ہے اسلوں وطن سے کیا غرض

ان کے نزدیک عشق و محبت سے بڑھکر کوئی چیز اہم نہیں اور وہ مال اور دولت، عزت اور وطن، اعزہ و اقارب غرض ہر چیز کو کھو دینے تیار ہیں مگر عشق کو کھونا نہیں چاہتے۔ رازِ عشق سے آگاہی اُن کے یہاں سب سے بڑا علم ہے اور سب سے بڑی اور اصلی دوربینی ان کے خیال میں اُس وقت تک حاصل نہیں ہوتی جب تک کہ محبوب کے پاؤں کی خاک کو سرمۂ چشم نہ بنالیا جائے۔ وہ کہتے ہیں:

ولی دل میں ہمارے [illegible]   بجز [illegible] رہزن کو رہزن کر نہیں کہتے

گر نہیں سرِّ عشق سوں آگاہ   فخر بیجا ہے فخر رازی کا

جو ہوا رازِ عشق سیں آگاہ   وہ زمانہ کا فخر رازی ہے

چاہو کہ ہو ولی کے نمط جگ میں دوربیں   انکھیاں میں سرمہ پیو کی خاکِ چرن کرو

اس انتہائی الفت پیشگی، آفاق، مستی اور ترک علایق کے باوجود ولی اپنے کلام میں اپنے وطن کا ذکر کیے بغیر نہ رہ سکے اور ممکن ہے کہ یہ بھی غیر ارادی طور پر ہو۔ اُن کے چند شعر جن میں انہوں اپنے کو دکنی کہا ہے یہ ہیں:-

ولی ایران و توراں میں ہے مشہور   اگرچہ شاعرِ ملکِ دکھن ہے

یو مکھ کی شمع سوں روشن ہے ہفت اقلیم کی مجلس   ولی پروانگی کرتا تری ملکِ دکھن بھیتر

دکھنی زبان میں شعر سب لوکاں کہے ہیں اے ولی   لیکن نہیں بولیا ہے کوئی اک شعر خوشتر زیں نمط

دکن کے اس تذکرہ کے علاوہ ولی نے دکن کے بعض شاعروں کا بھی اپنے کلام میں ذکر کیا ہے۔ اگر وہ گجراتی ہوتے تو یقیناً دکن کے شاعروں کے ساتھ ساتھ گجرات کے بھی قدیم اردو شعرا مثلاً بہاؤالدین باجن، خوب محمدؐ، شاہ علی گاؤں دھنی، اور امین وغیرہ میں سے کسی کا ضرور ذکر کرتے حالانکہ انہوں نے اپنی غزلوں میں (اور خاص کر شیخ المعالی کی مدحیہ غزل میں) فارسی کے بھی اکثر شاعروں کے نام لیے ہیں۔ دکن کے شعر میں ولی نے ملا خیالی، حسن شوقی، فراقی، آزاد، رنگین اور اشرف وغیرہ کا ذکر کیا ہے:-

اور باوجود کوشش کے کوئی ایسا شعر نہیں ملا جس میں کسی گجراتی شاعر نے اپنے کو دکھنی لکھا ہو۔ اس کے برخلاف جملہ گجراتی شعرا دکن اور دکنی شاعروں سے خود کو علیحدہ سمجھ کر خاص طور پر ان کے وطن کے ساتھ ان کا نام لیتے ہیں۔

ولی کا ایک گجراتی معاصر ہاشم علی بلند پایہ مرثیہ گو شاعر تھا۔ اس نے مراثی کا ایک ضخیم کلیات "دیوان حسینی" مرتب کیا تھا جو اس وقت موجود ہے۔ اس دیوان میں ہاشم علی نے اپنے دکنی دوستوں اور معاصرین مثلاً روحی، مرزا اور قادر وغیرہ کا اس طرح ذکر کیا ہے:-

ہزار حیف نہیں شاعران دکن	سو روحی و مرزا و قادر نہیں
ہاشم علی عجب نہیں یوں مرثیہ لو شکر	تجھ پر خلیفہ قادر تحسیں کرے دکھن میں

روحی اور مرزا کے کلام کی طرح خلیفہ قادر کا کلام بھی اس وقت موجود ہے۔ اور ان سب کے کلام کے نمونے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ ہاشم علی نے دکنی شاعروں کا ذکر عام طور پر بھی لیا ہے۔ وہ ایک مرثیہ کے ختم پر کہتے ہیں:

ہاشم علی لکھا توں بیکس دلہن کی ہاتاں	اس غم سے ہے جگر خوں اور چشم اشک ریزاں
گجرات میں پڑے جب یہ مرثیہ کو یاراں	سنا ر چلے ہیں روتے دکھنی دکھن کوں اپنے

ایک اور شعر ہے ؎

ہاشم علی لے آئے محبان نے یوں خبر	دکھن سے ہو کے تیرے سخن کربلا چلے

ہاشم علی کے علاوہ گجرات کے ایک اور بلند پایہ شاعر رضا کے کلام میں بھی دکھنی شاعروں کا ذکر ملتا ہے۔ یہ بھی بڑے مرثیہ گو تھے اور ان کے متعدد مرثیے اس وقت محفوظ ہیں۔ یہ اپنے ایک مرثیہ کے آخر میں فخر کرتے ہیں:-

اے رضا قاسم کے جلوہ کا بیاں کرتوں مدام	تجھ کوں محشر میں شفیع ہو کر چھڑاویں گے امام
مرثیہ تجھ کن لکھا کرلے گئے ہیں خاص و عام	لے گئے دکھنی دکھن کوں آج ہے قاسم کا بیاہ

جب عہد ولی میں دکن اور گجرات کے شاعر ایک دوسرے کو جدا جدا ملکوں کے رہنے والے سمجھتے تھے تو ان کے ڈیڑھ سو سال بعد کے ایک تذکرہ نگار کا یہ خیال کہ اس زمانہ میں کوئی امتیاز نہ ہوگا کس طرح صحیح سمجھا جا سکتا ہے؟

جہاں یہ ثابت کر دیا گیا ہے کہ ولی خود کو دکھنی شاعر کہتے ہیں آخر میں ولی ہی کی زبان سے اس امر کی بھی شہادت پیش کر دی جاتی ہے کہ وہ گجرات کے رہنے والے نہ تھے بلکہ وہاں بطور سیر و سیاحت گئے تھے۔ وہ اپنے عہد شباب کے سفر گجرات کے بعد جب اورنگ آباد واپس ہوئے تھے تو یہاں ان کا دل نہیں لگتا تھا۔ گجرات کی یاد رہ رہ کر ان کو تڑپا رہی تھی۔ اس عالم اضطراب میں انہوں نے ایک مثنوی "در فراق گجرات" لکھی تھی جو ان کے کلیات میں چھپ بھی

ہو چکی ہے۔ اس میں گجرات کی تعریف کے سلسلہ میں ولی نے لکھا ہے کہ:-

گجرات کے فراق سوں ہے خار خار دل — بے تاب ہے سینہ منیں آتش بہار دل
مرہم نہیں ہے زخم کا اس کے جہاں منیں — شمشیر ہجر سوں جو ہوا ہے فگار دل
اس سیر کے نشہ سوں اول تر دماغ تھا — آخر کوں اس فراق میں کھینچا خمار دل
سینے میں آکے چمن دیکھ عشق کا — ہے جوش خوں سوں تن میں مرے لالہ زار دل
حاصل کیا ہوں جگ میں سراپا شکستگی — دیکھا ہے مجھ شکیب سوں صبح بہار دل
ہے آشنا کی یاد کی گرمی سوں تن منیں — ہر دم میں بے قرار ہے مثل شرار دل
حاصل ہوا ہے مجھ کوں ثمر مجھ شکست سوں — پایا ہے چاک چاک ہو شکل انار دل
افسوس ہے تمام کہ آخر کو دوستاں — اس میکدہ سوں اٹھ کے چلا سدہ بسار دل

لیکن بہ ارشاد ولی حق کے فیض سوں
پھر اس کے دیکھنے کا ہے امیدوار دل

اس نظم میں سیر کے لفظ سے ثابت ہوتا ہے کہ ولی گجرات کو بطور سیر و سیاحت گئے تھے۔ ؎

اس سیر کے نشہ سوں اول تر دماغ تھا — آخر کوں اس فراق میں کھینچا خمار دل

وہاں کا متوطن بھی اس طرح نہیں لکھ سکتا۔ آخر میں انہوں نے یہ بھی کہہ دیا کہ اگرچہ ایک دفعہ دیکھ آیا ہوں لیکن

ع پھر اس کے دیکھنے کا ہے امیدوار دل

اس نظم کے علاوہ انہوں نے اپنے اس سفر کی یاد میں ایک دلچسپ مثنوی بھی لکھی تھی جس میں سورت کی سیر و سیاحت کا ذکر کیا ہے یہ بہت طویل ہے یہاں صرف چند شعر پیش کیے جاتے ہیں:-

عجب شہر اس میں ہے پر نور اک شہر — بلاشبہ ہے وہ جگ میں قدرت دہر
اہے مشہور اس کا ناؤں سورت — کہ جاوے اس کے دیکھے سب کدورت
جگت کی آنکھ کا گویا ہے یہ نور — اچھو اس نور سوں ہر چشم پر نور
شہر جوں منتخب دیواں ہے سب — ملاحت کی وہ گویا کان ہے سب
سرشت سوں آب اس کی جگ میں کانپا — سمندر موج زن رگ رگ میں کانپا
کنارے اس کے اک دریا ہے تپتی — کہ دنیا دیکھنے کوں اس کے تپتی

کھلے ہیں ہر طرف رخسار کے گل ہر اک گل کے نزک وہاں پہ ہے سنبل

جو کوئی دیکھا ہے اُن کا باغ رخسار ہوا اک دیدہ میں وہ محو دیدار

کہاں ہے ساقی اخلاص انگیز محبت کی کرے مے مجھ اُپر ریز

صفائی سوں کھلے مجھ جیو کا باغ کروں اس دُردِ مے کوں مرہم داغ

بھری ہے سیرت و صورت سوں سورت ہر اک صورت ہے وہاں انمول مورت

ہر اک کے لب ہیں جیوں یاقوت انمول کرے وہ بات جب میٹھے لباں کھول

وہ باتاں نہیں سراپا ہے مٹھا قند کہ جن باتاں اُپر ہے نیشکر بند

پڑا شیریں بچن سن کے اُن بس جو پھنسا اس شہد میں جا کر مگس ہو

ہوا اُسکوں نکلنا کام دشوار
رہا تا آخری دم لگ گرفتار

گویا اس آخری شعر میں ولی نے شیرین زبان ملیحان گجرات کے عشق میں گرفتار رہنے کی پیش گوئی کی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ جب دوبارہ وہ اپنے وطن سے نکلے تو آخری دم تک گجرات ہی میں گرفتار رہے۔

اس مضمون کو ختم کرنے سے قبل ہم ولی کے سب سے چہیتے گجراتی دوست سید ابوالمعالی ہی کے فرزند سے اس امر کی تصدیق کرا دیتے ہیں کہ ولی گجراتی نہیں تھے۔ یہ عجیب اتفاق کی بات ہے کہ سید محمد تقی ولد سید ابوالمعالی نے خود اپنے قلم سے ولی کے وطن کے متعلق ایک تحریر بطور سند چھوڑی ہے جو اس وقت تک محفوظ ہے۔ اس کو دیکھنے اور معلوم کرنے کے بعد گجرات کا کوئی قدردان ولی خواہ وہ تذکرۂ شعرائے گجرات کا مصنف ہو یا کوئی اور محب گجرات ولی کو گجراتی کہنے کی جرات نہیں کرسکتا۔ سید ابوالمعالی کے فرزند سید محمد تقی نے ۱۱۵۶ھ میں اپنے والد کے مشفق دوست کے دیوان کو خود اپنے قلم سے نقل کیا تھا اور اس کے آغاز و اختتام پر انہوں نے کتاب کا نام اور سن کتابت بھی درج کر دیا ہے۔

سید محمد تقی نے پہلے صفحہ پر کلام شروع کرنے سے قبل لکھا ہے:-

"تصنیف مغفرت پناہ میاں ولی محمد متوطن دکھن"

اور آخری صفحہ پر مرقوم ہے:-

"تمت تمام شد دیوان مغفرت نشان میاں ولی محمد متوطن دکھن بتاریخ دوئم شہر ذیقعدہ ۱۱۵۶ھ یازدہ ہزار و پنجاہ و شش ہجری بروز پنجشنبہ بوقت صبح تحریر یافت۔ مالک و کاتب این دیوان عاجز المذنب محمد تقی ولد سید ابوالمعالی است"

کسے دعوی کند باطل است "

دیوانِ ولیؔ کا یہ عجیب و غریب و تاریخی نادر قلمی نسخہ انڈیا آفس کے کتب خانہ لندن میں اس وقت محفوظ ہے جس کا نمبر ۵۰۱ ہے اور جس کے متعلق مزید تفصیلی معلومات رسالۂ معارف نمبر ۲ جلد ۲۵ سے بھی حاصل ہو سکتی ہیں۔

جگت پریم یا پیام شاعر

از

مولوی غلام طیب صاحب بی۔ اے بی ٹی لکچرار اُردو اورنگ آباد کالج

(۱) جلوہ گل چمن چمن۔ خنجر بے نیام ہے
غنچے میں ایک راز ہے پھول میں اک پیام ہے
ناز ہے مائل کرم دعوت قتل عام ہے
نبض کی جنبشوں میں دل طائر زیر دام ہے

(۲) پردہ شب میں جلوہ گر حسن کی اک برادری
زمزمۂ طیور میں داغ جگر کی روشنی
چاک سحر سے رونما۔ جام نشاط زندگی
پھول بھری ہیں ڈالیاں یا کہ بیاض شاعری

(۳) ذوق سرور چاہیے۔ مے کی یہاں کمی نہیں
بزم نیاز و ناز میں دھوم کہاں مچی نہیں
درد ذرا بھی ہو اگر۔ تلخ یہ زندگی نہیں
ایسے میں جو رکا رہے سنگ ہے آدمی نہیں

(۴) اہل نظر کو کائنات۔ حسن کا ایک جال ہے
دیکھ اسیر آرزو۔ کفر یہاں ملال ہے۔
عکس جمال یار سے روئے بہار لال ہے
گردش جام شوق سے سارا جہاں نہال ہے

(۵) کس کا ہوا وہ بے وفا۔ تیرا اگر ہوا نہیں
لذت غم تو ہے تیری۔ وصل اگر ترا نہیں
جو ہے خدائے ہر زمیں۔ کیا وہ ترا خدا نہیں
عشق کی انتہا نہ ہو کیوں۔ حسن کی انتہا نہیں

(۶) مہر کی ضو فشانیاں۔ سوز و وفا میں جلکے دیکھ
صبح و مسا کی کروٹیں موج فنا میں پلکے دیکھ
ماہ کی خوش خرامیاں کوچۂ دل میں چلکے دیکھ
ہے یہ طلسم دیدنی۔ دیکھ ذرا سنبھل کے دیکھ

(۷) نفس کی سازباز نے علم کو سم بنا دیا
ظلم کو توڑ موڑ کر رحم و کرم بنا دیا
عقل کو آب تاب دے برق ستم بنا دیا
بندۂ سوز و ساز کو تیغ دو دم بنا دیا

(۸) شمع ہوس سے دور رکھ شیشۂ نو بہار کو — دشمن آرزو بنا قلب جنوں شعار کو
رنگ خودی مٹا کے دیکھ صنعت کردگار کو — حسن کے آب و رنگ کو شوق کے کاروبار کو

(۹) بادِ صبا سے سیکھ لے طرز مدام رہروی — تار نفس سے مانگ لے خدمت شعلہ گستری
آئینہ بن کے چھین لے حسن کی شان دلبری — تاج صدف سے توڑ لے درِّ یتیم پروری

(۱۰) تیرے چمن کے پھول ہیں سارے جہاں کے پھول بن — روپ جدا جدا سہی سب پہ ہے یار کی پھبن
سارا جہاں ہے گلزمیں عشق بتانے کیوں وطن — دیر و حرم کو چھوڑ دے شمع کی ہے اگر لگن

(۱۱) ذرۂ دل کو پھینک دے ابر شرارہ دار بن — قطرہ کو دیکھتا ہے کیا موجۂ آبشار بن
پھولوں کو توڑتا ہے کیوں باغ سدا بہار بن — سبزہ کا ساتھ کیا بھلا رفعت کوہسار بن

(۱۲) نفس کی آندھیوں میں کیوں عقل تری دبنگ ہے — بادۂ نارسا نہ پی نشے کی گر امنگ ہے
تیری جبین ناز پر خون وفا کا رنگ ہے — کوئی نہیں عدو ترا تیری تجھی سے جنگ ہے

(۱۳) بیر کو دل میں جا نہ دے بیر سے کس کو کیا ملا — چاہیے ہر بشر کو یاں سب سے رہے ملا ملا
مجھ کو جگت کے پریم میں روح کا آسرا ملا — پریم ہے نور زندگی پریم ملا خدا ملا

وَلی کا سنِ وفات

—— از ——

جناب مولوی عبدالحق صاحب بی، اے پروفیسر اُردو جامعۂ عثمانیہ

وَلی کا سن وفات اب تک غیر منحقق ہے ۔ اُردو شعرا کے جس قدر تذکرے اس وقت تک دستیاب ہوئے ہیں وہ سب اس بارے میں خاموش ہیں ۔ البتہ مولوی عبدالجبار خاں مرحوم مولف تذکرہ شعراے دکن نے اس کا سن وفات (۱۱۵۵ھ) لکھا ہے لیکن کوئی حوالہ یا ثبوت پیش نہیں کیا ۔ بعض حال کے مصنفین نے اس کو صحیح سمجھکر نقل کردیا ہے بعض صاحبوں نے اس شعر سے ؎

دل وَلی کا لے لیا دلی نے چھین　　　جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

یہ استنباط کیا ہے کہ وَلی محمد شاہ کے زمانے میں تھا ۔ محمد شاہ کا سن جلوس (۱۱۳۱ھ) ہے لیکن یہ قطعی طور سے ثابت ہے کہ یہ شعر وَلی کا نہیں ۔ میرے پاس وَلی کے بارہ قلمی دیوان موجود ہیں ۔ ان میں کہیں یہ شعر نہیں اور نہ کسی اور دیوان (قلمی یا مطبوعہ) میں یہ شعر یا اس شعر کی غزل پائی گئی ۔ اور لطف یہ ہے کہ بعض مرتب دیوان جو اِس شعر کو سند میں پیش کرتے ہیں ۔ خود ان کے مرتب کردہ دیوانوں میں یہ شعر نہیں پایا جاتا ۔ اصل میں یہ شعر مضمون کا ہے اور تذکرہ گلشن گفتار[1] (۱۱۶۵ھ) اور چمنستان شعرا نے مضمون کے ذکر میں اِس طرح نقل کیا ہے ؎

اس گدا کا دل لیا دلی نے چھین　　　جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

اس قسم کی ایک دوسری غلط فہمی بھی ہوئی، جس سے وَلی کا محمد شاہ کے عہد میں ہونا ثابت کیا گیا ہے ۔ مصحفی نے اپنے تذکرے میں شاہ حاتم کی زبانی یہ بیان کیا ہے کہ " روزے پیش فقیر نقل می کرد کہ در سن دوم فردوس آرامگاہ دیوان ولی در شاہجہان آباد آمدہ و اشعار بر زبان خورد و بزرگ جاری گشتہ[2] " بعض اصحاب نے اِس بیان کو دیکھ کر غلطی سے یہ

---

[1] گلشن گفتار مرتبہ سید محمد صاحب ام ۔ اے ۔ [2] تذکرۂ ہندی صفحہ ۔

سمجھ لیا کہ ولی محمد شاہ کے عہد میں دلی گیا تھا۔ حالانکہ اس میں صاف طور پر دیوان کے پہنچنے کا ذکر ہے نہ کہ ولی کے جانے کا۔

یہ سب تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ ولی دلی گیا تھا۔ سوائے قائم کے کسی نے صحیح سن اس کے دلی جانے کا نہیں بتایا۔ قائم لکھتا ہے کہ وہ عالمگیر کے ۴۴ سن جلوس[1] (۱۱۱۲ھ) میں دلی گیا۔ اس کا دوبارہ دلی جانا جیسا کہ بعض صاحبوں نے بیان کیا ہے۔ ثابت نہیں ہوتا۔ غالباً اس شعر سے جو اوپر نقل کیا گیا ہے یہ غلطی پیدا ہوئی۔

ایک مدت کی جستجو کے بعد اب یہ امر پایۂ تحقیق کو پہنچا ہے کہ ولی کی وفات ۱۱۱۹ھ میں ہوئی۔ اس کی شہادت ہمیں ذیل کے قطعہ تاریخ سے ملتی ہے جو کتب خانۂ جامع مسجد بمبئی کے قلمی نسخہ دیوان ولی (نشان ۴۲۷۹) کے خاتمے پر درج ہے۔

مطلع دیوان عشق سیدا باب دل	دانی مکات سخن صاحب عرفان ولی
سال وفاتش خود از سر الہام گفت	بادشاہ ولی ساقی کوثر علی

اس دیوان کی کتابت ۱۲ سن جلوس محمد شاہی میں ہوئی اور کاتب کا نام شہسوار بیگ ہے۔

اس کے بعد اس امر کی مزید صحت و توثیق احمد آباد کے ایک خانگی کتب خانہ کی بیاض سے ہوئی اور اس اثنا میں یہ بھی معلوم ہوا کہ اس قطعہ کے مصنف مولوی حسن غنی ہیں۔ (اردو)

---

[1] تذکرۂ مخزن نکات صفحہ ۱۰

ولیؔ

از

مولوی مخدوم محی الدین صاحب ام ۔ اے (عثمانیہ)

جہانِ رنگ و بُو سے کھیلنے والا نہ تھا کوئی
زبانِ نغمہ بے تاثیر تھی مستی کی پیاسی تھی
ترانے حسن و دل کے گانے والا ہی نہ تھا کوئی
اِک اپنی ترجمانی چاہتے تھے راز فطرت کے
ابھی ناآشنائے لذتِ گفتار تھی دنیا
یکایک دہرِ تیرہ بخت کی قسمت بدلتی ہے
اُٹھے انگڑائیاں لیتے ہوئے بستر سے فوارے
وہ پیغام سحر آ ہی گیا زنجیرِ شب ٹوٹی
حجابِ تیرگی قدرت نے جب چُٹکی سے سرکایا
فضائیں؛ ختراماً سر پہ آنچل ڈال لیتی ہیں
صدا دی آسمانوں نے ستاروں نے وَلی آیا
وَلی وہ ہمدمِ فطرت، وہ پیکِ نور وجدانی
یقین بخشا زباں کو جس نے پہلے اُس کے جینے کا
دیے روشن کیے مندر میں کعبے کے چراغوں سے

شبِ ہجران کی سختی جھیلنے والا نہ تھا کوئی
پریشاں غمیت تھے گیتوں کے چہرے پر اُداسی تھی
حسیں فطرت کا جی بہلانے والا ہی نہ تھا کوئی
کسی داؤد کے محتاج تھے سب سازِ فطرت کے
اسیرِ خامشی تھی، بار تھی، آزار تھی دنیا
ہوا بھی زیرِ لب ہنستی ہوی اتراتی چلتی ہے
پگھل کر بہ چلے موسیقیوں کے منجمد دھارے
وہ ابھرا مہرِ لودہ زندگانی کی کرن پھوٹی
تو گہوارے میں اک ہنستا ہوا چہرہ نظر آیا
سحر کی بیٹیاں رنگینیوں کی ناؤ کھیتی ہیں
مبارک بادیاں گائیں بہاروں نے وَلی آیا
وہ جبریلِ سخن، وہ اولیں تلمیذِ رحمانی
وہ پہلا ناخدا ہندوستانی کے سفینے کا!
ہزاروں جنتیں آباد کر دیں دِل کے داغوں سے

وہ میراثِ جہاں وہ خلد کا پیغام آتا ہے
دکن کی سرزمین پر زندگی کا جام آتا ہے

شفق دو ہو میں ڈوبا سرسوں پگ تک — تو باندھا سرسوں جب چیرا گلالی
ہوا تیرے خیالاں سوں، سراپا — مرا دل مثلِ فانوسِ خیالی
تری انکھیاں دسیں مجھ یوں سیہ مست — پیا گویا شرابِ پرتگالی
تری انکھیاں میں دو ڈورے دیکھ کر سرخ — بنائی خلق نے ریشم کی جالی
ترے لب اور تیرے بردکے دیکھے — پڑھوں شعرِ زلالی و ہلالی

ولی تب سوں ہوا ہمکار فرہاد
سُنا جب سوں تری شیریں مقالی

بہرحال اس قبیل کے تمام اشعار سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ولی بے شک حسن پرست اور حسن کار تھا کیٹس (Keats) کی طرح اُس کے نزدیک بھی حُسن صداقت اور صداقت حُسن ہے حُسن حُسن کی خاطر، اور فن فن کی خاطر۔ یہ ہے ولی کا مشربِ حسن پرستی

(۲)

ولی کے مشربِ حسن پرستی سے کہیں زیادہ اہم اُس کا خالص ہندی تخیّل ہے جس نے اُس کے ملہاتِ شعری میں ایک خاص دلکشی پیدا کر دی ہی۔ یہ خالص ہندی رنگ ولی کے بعد کے شعرا میں کہیں نہیں پایا جاتا۔ اُن کی شاعری ایرانی آب و رنگ میں رنگی ہوئی نظر آتی ہے ہیں یہ ماننے کے لئے قطعی آمادہ نہیں ہوں کہ اُردو کے وہ شعرا جنھوں نے ولی کے بعد اُردو زبان میں نغمہ سرائی کی محض فارسی شعرا کے نقال تھے البتہ اتنا ضرور ہے کہ اُن کی شاعری فارسی کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے۔ اور اُن کی رنگ آمیزیوں میں ہندی احول اور ہندی خصوصیاتِ حسن کی جھلک نظر نہیں آتی۔ اس باب میں قدیم دکھنی شعرا بالعموم اور ولی خاص طور پر ہندیت کے علمبردار ہیں۔

آیئے اس نقطۂ نظر سے ہندی نسائیت کے چند دلکش مرقعوں کی بھی سیر کیجیے یہاں بھی شاعرانہ کیف و مستی اور حسن کارانہ سحر آفرینیوں کا وہی عالم ہے۔

گجرات کا حسن اور سورت کی مورت زبان زد خاص و عام ہیں۔ اس کی گہرائیوں میں ولی کے ترکِ وطن کا راز بھی پوشیدہ ہے بھلا ولی جیسے آزاد مشرب اور حسن پرست انسان کے لئے اورنگ آباد اور بالخصوص عالمگیری عہد کے اورنگ آباد میں دلچسپی کا کیا سامان ہو سکتا ہے اس کا دل تو حسن کی ہنگامہ زا فضا کے لئے بیتاب رہتا ہے وہ تو عبادت کے ساتھ کچھ نظارہ بازی بھی چاہتا ہے۔ اُس کی آنکھیں تو شعریتِ حسن کی متلاشی رہتی ہیں چنانچہ عالمگیری عہد کا یہ کنھیا شعریت کی تلاش میں گجرات کے مندروں، بنگلوں، اور زردشتی معبدوں کی بھی سیر کرتا نظر آتا ہے۔ دیکھئے نسوانی اور برہمنی حسن کی صداقت شعارانہ عکاسی ولی سے پہلے یا بعد اس تفصیل کے ساتھ اور بھی کہیں ملتی ہے جیسا کہ اس گجراتی پجارن کے سراپا میں پیش کی گئی ہے:۔

قلعہ گولکنڈہ (بھونگیر)

مقبرہ شاہان گولکنڈہ

ترے آنے کی بات اوپر بچھایا ہوں نکھاں اپنی — تو بیگی آ کر تجھ بن مجھ کوں یو گھر بن کر دیا

سہیلیاں جب تلک مجھ سوں نہ بولیں گی ولی آکر
مجھے تب لگ کسو سوں بات اور گفتار کرنا کیا

ایک اور مثال:- ہندی نسائیت اور حیا کی پیاری تصویر ہے!

جو تم مکھ تی اٹھو نقاب آہستہ آہستہ — کہ جیوں گل سوں نکستا ہے گلاب آہستہ آہستہ
ہر اک اہل حیا سوں تجھ نیر چھپے یوں کر — تاروں میں چھپے مہتاب جیوں آہستہ آہستہ
سلونے سانولے پیتم ترے موتی کی جھلکاں نے — کیا عقد ثریا کوں خراب آہستہ آہستہ

— —

نزاکت:- حیا کی تصویر تو آپ نے ابھی دیکھی۔ اس تصویر کا دوسرا رخ بھی ملاحظہ ہو۔

چلنے میں اے چنچل ہاتھی کوں لجاوے تو — بیتاب کرے جگ کوں جب ناز سوں آوے تو
یک بارگی ہونٹاں پر بے تابی مشتاقاں — جس وقت کہ غمزے سوں چھاتی کوں چھپاوے تو
گویا کہ شفق پیچھے خورشید ہوا ظاہر — جب اوس میں پٹکے کے چہرے کوں دکھاوے تو
ولی فلک کنہ میں انگشت تحیر ہے — جب پاؤں نزاکت سوں مجلس میں بچھاوے تو
اک تان سنانے میں جیو تان لیا سب کا — اب دل سوں گر رجاویں، گر بھاؤ بتاوے تو

تو باعث دانائی سوں شاید کہ کرے توبہ
اس وقت ولی کوں گر یک جام پلاوے تو

ایک آخری مثال:- یہ دیکھئے نسوانی حسن کی عام اور خاطر نشین ادائیں جو گجراتی اور ہندی خصوصیات سے گزر کر عام نسائیت کی آئینہ دار ہیں۔ غزل تمام و کمال پیش کی جاتی ہے تاکہ یہ نہ خیال ہو کہ شاید انتخاب سے کام لیا گیا ہے۔

ہوش کھوتی ہے نازنیں کی ادا — سحر ہے سرو گل جبیں کی ادا
گر ہو مطلوب تجھ کوں نقش مراد — دیکھ اس کی بھواں کی چیں کی ادا
ہوش میرا نہیں رہا مجھ میں — جب سوں دیکھی ہے نازنیں کی ادا
اے ولی دل کوں آب کرتی ہے — نگہ چشم سرمگیں کی ادا

اہے سورت جنت کی نشانی — کہ ہیں معمور واں اہل معانی
شرافت میں یہ ہی جیوں باب کعبہ — تو ہو سب ملک پر اس کا جو سکہ
اگر دیکھے ہیں لوگاں شام و تبریز — نہ دیکھا کوئی ایسا ملک خیز
باقی واتنی، آتش پرستاں کی ہے بستی — سکے مردود واں آتش پرستی
فرنگی اس میں اتنے ہیں کہ گلپوش — ملے وہاں جن کی گنتی میں ہی بیہوش
وہاں ساکن لتے ہیں اہل مذہب — کہ گنتی میں نہ آویں اُنکے مشرب
اگرچہ وہ ہیں سب ابنائے عالم — ولے بینش میں رکھتا رنگ عالم
بھری ہی سیرت صورت سے سورت — ہر اک صورت ہے واں انمول مورت
ختم ہے امرداں پر رو صفائی — ولے ہے بیشتر حسن نسائی
کسن کی گوپیاں کی نہیں ہے نسل — ہیں سب گوپیاں و نقل یہ اصل
نہ لینی وقت سوں کھینچے شوخ چنچل — وہ مکھ کے باغ کوں دیوے رانچل
نظر بھر کر دکھو ہر گل بدن کوں — کہ ہی پڑے سوں بے پرواہ من کوں
شہر بھیتر جو آوے نہان کا دن — ہندو کی قوم کے اشنان کا دن
ہر اک جانب دکھوں میں فوج در فوج — تجلی کے سمندر کی اٹھے موج

نین کی بیٹھ کشتی پر توں اے پاک
یہ طے کر سیج میں موج خطرناک

آخر میں ولی کی سہ نیانہ شاعری کے متعلق جس کا بعضوں نے اتنا بستار باندھا ہے، چند کلمات کہنے نا بیا بے محل نہ ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ ایسا شخص جو اتنا دل پھینک واقع ہوا ہو، بھلا اُس کی زد سے اللہ میاں بچ سکتے ہیں؟ لیکن اللہ میاں پر کبھی کبھار بھگو غلط انداز پڑ جایا کرتی ہے۔ ولی کی شاعری کا خاص رنگ یہ نہیں ہے۔ اس باب میں بعض قدیم تذکرہ نویسوں کی طرح "کلیات ولی" کے فاضل مرتب کو بھی دھوکا ہوا ہے کہ انھوں نے ولی ویلوری کی "دہ مجلس" (روضۃ الشہدا) کو ولی اورنگ آبادی سے منسوب کر کے اس غریب کو اچھا خاصا مذہبی، مرثیہ گو شاعر بنا دیا ہے۔ ولی اپنے رنگ میں بے شک ولی تھا لیکن تصوف کی ولایت سے اُسے یوں سرفراز کرنا سراسر زیادتی ہے۔

یوں (دوستاں کے ہجر میں داغاں) ہیں سینے پر ولی   (صحرا کے دامن کے اُپر) جیوں (نقش پے آہواں)

کیونکہ اسیری (ہو حسن) سوں تیرے   (دھوپ کھنے) سوں دپٹ بھڑتا ہے؛

اے ولی (شہر حسن) کے اطراف   (خطا) سوں حسن کے (حصے) اڑائے ہیں

مجھ سوں (وحشی) ہیں (گل رخاں) گویا   (نوخط) ہو ہیں (سبزہ) آیا ہے
(متوحش)

کہاں تک مثالیں دی جائیں۔ اس قبیل کے صدہا اشعار ولی کے دیوان میں موجود ہیں جو دیکھنے والے کے دامن توجہ کو اپنی طرف کھینچتے ہیں میں اب دوسری طرف متوجہ ہوتا ہوں۔

چند نمونے سہل ممتنع عبارت، اور اُس حلاوتِ خاص کے بھی پیش کروں گا جسے عام طور پر تغزلیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ دیکھئے تو ولی کے یہ اشعار کیفیت و مستی میں کس قدر ڈوبے ہوئے ہیں غزل میں سب کچھ ہو لیکن یہ نہ ہو تو کچھ نہیں۔

آشنائی نہیں تو جیتا ہوں   کیا کروں جی اداس ہوتا ہے
کیونکہ کپڑے رنگوں ترے غم میں   عاشقی میں لباس ہوتا ہے
تجھ جدائی میں نہیں اکیلا میں   درد و غم آس پاس ہوتا ہے

یک نگہ میں غلام کرتے ہیں   خوب رو خوب کام کرتے ہیں
دیکھ خوباں کوں وقت ملنے کے   کس ادا سوں سلام کرتے ہیں
کم نگاہی سوں دیکھتے ہیں ولے   کام اپنا تمام کرتے ہیں
کیا وفادار ہیں کہ ملنے میں   دل سوں سب رام رام کرتے ہیں

یہ مرا رونا کہ ہے تیری ہنسی   آپ بس نہیں پر بسی ہے پر بسی
رات دن جگ میں رفیق بیکساں   بے کسی ہے بے کسی ہے بے کسی

(۱)

معشوق عربدہ جو

شوخ نکلا جب قدم کوں تیز کر | حسن کے شبدیز کوں مہمیز کر
یک بیک آیا او اُٹھ مجھ طرف | ہر پلک کوں دشنۂ خونریز کر
میں کیا یوں عرض از روئے نیاز | مہربانی اُس کی دستاویز کر
کہا اپس کے نرگسِ بیمار کوں | عاشقاں کے خون سیں پرہیز کر
اے ولی آتا ہے تو وہ مقصودِ دل | خانۂ دل خون سوں رنگ آمیز کر

(۲)

سوال و جواب

جب سوں وہ نازنیں کی میں دیکھا ہوں چھب عجب | دل میں مرے خیال میں تب سوں عجب عجب
بے تاب ہو کے شکلِ گدایاں نزیک جا | بے باک ہو کے تب یو کیا میں طلب عجب
دو نین سوں ترے ہے دو بادام کا سوال | سن یو سوال دل میں ہوا پستہ لب عجب
بولیا تری نگاہ کی قیمت ہے دو جہاں (ق) | جس دیکھنے کوں دل میں ہے بے حد طلب عجب
اس دولتِ عظیم کوں یوں مفت مانگنا | لگتی ہے مجھ کو بات تری بے ادب عجب
کیتا میں اس سوال میں دوجا بھی اک سوال | کر بہرہ مند لب سوں کہ تیرے ہیں لب عجب
یکبار اُس سوال میں سن یو دوجا سوال | دل میں رہا اپس کے وہ شیریں لقب عجب
اوّل تو شوخ آ کے غضب میں غصہ کیا | سر تا قدم جو ناز اُٹھا وہ غضب عجب
آخر اپس کے ہمتِ عالی پہ کر نظر | شیریں لباں سوں اپنے چکھایا رطب عجب

(۳)

معشوق سے

چھوڑ اے شوخ طرزِ خودکامی | مت ہو ہر دیدہ باز کا رامی

تجھ لب و زلف کے تماشے کوں | چل کے آئے ہیں مصری و شامی
زلف تری ہوئی ہے چرب زباں | خندہ کر کر قصیدۂ لامی
باغ میں تجھ انکھاں سوں پایا ہوں | گل نرگس تخلص جامی
اے نگیں لب دکیا ہے حق نے تجھے | زنہاراں حسن میں نامی
چشم رکھتا ہوں اے سجن کہ پڑھوں | تجھ نگہ سوں قصیدۂ جامی
اے ولی غیر فن حرف دگر | پختہ مغزاں کنے ہے سب خامی

(۴)

زندگی

بے سکوں حاصل جگ میں ہو کیونکر فراغ زندگی | گردش افلاک ہے جس سوں ایاغ زندگی
ہے عزیزاں سیر گلشن بے گل داغ الم | جنت احباب ہے معنی میں باغ زندگی
آسماں میری نظر میں کلبۂ دود ہے | نہ دیکھوں تجھ رخ سے چشم و چراغ زندگی
جب سوں دیکھا نہیں نظر بھر کاکل مشکیں نہ | تب سوں جیوں سنبل پریشاں ہے دماغ زندگی
کیوں نہ ہووے اے ولی روشن شبِ قبرِ حیات | ہے نگاہ گرم گلرویاں چراغ زندگی

(۵)

عاشقی

(۱) یہی توانائی رکھے ہیں جو گزشتہ غزل میں آئے ہیں کیوں نہ ہو ولی جیسے عاشق مزاج انسان کے لیے زندگی عبارت ہے عاشقی سے عاشقی نغمۂ نشاط اور غزل حیات ہے۔

کیوں نہ آوے نشۂ غم سوں دماغ عاشقی | بادۂ حیرت سوں ہے لبریز ایاغ عاشقی
آب سوں دریا کے ہرگز کام نہیں عشاق کوں | گریۂ حسرت سوں ہے سرسبز باغ عاشقی
گر طلب ہے تجھ کوں راہ خانۂ دل بوجھیاں | آہ کی آتش سوں روشن کر چراغ عاشقی
دردمنداں باغ میں ہرگز نہ جاویں اے ولی | گر نہ دیوے نالۂ بلبل سراغ عاشقی

(۶)

سراپا شعر

(اس شوق کی آخری مثال۔ دیئے ہوئے اشارات سے آپ ہی بتائیے کہ آیا یہ وہ نہیں جو مدت العمر ولی کے قلب و دماغ میں بسا ہوا تھا؟ ایک ایک ادا کو شاعرانہ نام یا تخلص سے منسوب کیا ہے)

ترا لب مشرقی، حسن انوری، جلوہ جمالی ہے — نین جامی، جبین فردوسی و ابرو ہلالی ہے
ریاض فہم گلشن، طبع دانا، دل علی فطرت — زباں تیری فصیحی، و سخن تیرا زلالی ہے
نگہ میں فیضی و قدسی، سرشت طالب و شیدا — کمال تجرد اہلی و انکھیاں سو غزالی ہے
تو ہی ہے خسرو روشن ضمیر و صائب و شوکت — تری ابرو یہ مجھ بیدل اوپر طغرائے صالی ہے

ولی تجھ قد و ابرو کا ہوا ہے شوقی و مائل
تو ہر اک بیت عالی اور ہر مصرع خیالی ہے

ولی کی اس والہانہ سحرکاری کے آگے سعدی کا ع "آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری" بھی پھیکا پڑ گیا۔

میں اس سلسلہ انتخاب کو اب ختم کرتا ہوں۔ حق یہ ہے کہ ولی کا سارا کلام کیف و مستی اور جذبات میں ڈوبا ہوا ہے۔ یہاں وہ نشتریت بھی نہیں جو میر کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ سارا کلام ہموار اور گلے کی حمائل بنانے کے قابل ہے۔

"پستش بغایت پست و بلندش بغایت بلند" کا فتویٰ ولی پر صادق نہیں آتا۔ وہ ہر رنگ میں میر ہے اور میر صرف ایک رنگ میں۔ وہ تنوع جو ولی کے ہاں پایا جاتا ہے میر کے ہاں نہیں۔ ولی زندگی کے ہر پہلو کی ترجمانی کرتا ہے اور میر صرف ایک پہلو کی۔ میر سراپا قنوطیت ہوا اور ولی سراپا زندگی۔ اگر اب تک وقت نہیں آیا تھا، تو کم از کم اب وقت ہے کہ ع

ولی ایران و توران میں ہو مشہور
اگرچہ شاعر ملک دکن ہے

مطرب اوّلیں

(از)

مولوی محمد عبدالقیوم خاں صاحب باقی ام۔ اے (عثمانیہ)

یاد ایام کہ اس خاکِ وطن پہ کوئی — لذتِ دردِ محبت سے خبردار نہ تھا

صحنِ گلشن میں نہ تھی بلبلِ شیدا کی پکار — پھول کھلتے تھے مگر کوئی طلبگار نہ تھا

پتیاں غنچۂ نازک کی مچل جاتی تھیں — غم مگر سینۂ گلچیں میں بیدار نہ تھا

روز چلتی تھی مہکتی ہوئی گلشن میں نسیم — بوئے گل کا کوئی معصوم خریدار نہ تھا

آہ و فریاد سے مدہوش نہ رہتی تھی فضا — قفسِ تنگ میں اک مرغ گرفتار نہ تھا

گوشے گوشے سے چلی آتی تھی لیلیٰ کی صدا — گوشِ دیوانہ مجنوں پسِ دیوار نہ تھا

وائے ناکامیٔ تقدیر کہ ہر عاشق کے — درد تھا دل میں مگر قابلِ اظہار نہ تھا

خشک سینوں میں نہ تھی خارِ تمنا کی خلش — آنکھ پُر درد نہ تھی نالہ شرربار نہ تھا

ذوقِ نغمہ سے بہت دور تھے اہلِ محفل

کوئی اس جوہرِ قابل کے سزاوار نہ تھا

اے خوشا بخت کہ بیدار ہوئی محفل عشق — درد سینے میں اٹھا شوق کا آغاز ہوا!

گوش انساں نے سنی نے میں کہانی دل کی — نغمہ زن انجمن درد کا ہر ساز ہوا

نالۂ عشق جو سینہ میں چھپا رہتا تھا — آسمانوں کی طرف مائل پرواز ہوا

آنکھ میں حسن کے دیدار کی لذت ہی نہ تھی — اس کا ہر کرشمہ اب اک انجمن ناز ہوا

غنچۂ باغ نظر کھلنے لگا وقت سحر — بلبل گلشن دل زمزمہ پرداز ہوا

اشک آنکھوں میں جب آئے تو طبیعت مچلی — شور ہنگامۂ ہستی اثر انداز ہوا

جب اٹھا نالۂ دل درد محبت بن کر — ہر ستارہ شب غم گوش بر آواز ہوا

ہو گئیں سیکڑوں خاموشیاں صدقے اس پر — نالۂ شوق جو منت کش آواز ہوا

اے وکی سب تیری آواز سے بیدار ہوئے — فاش جب سارے زمانہ پہ ترا راز ہوا

آ تجھے نذر دوں اک نالۂ مضطر اپنا — کیونکہ نالے کا ترے عہد سے آغاز ہوا

نغمۂ عشق زمانے کو سکھایا تونے
ہائے کس شوق سے تو پہلے نوا ساز ہوا

چاہتا ہوں کہ تری طرح جگاؤں دل کو — نغمہ اب تک نہ سنا تھا وہ سناؤں دل کو

کیا تری بزم سے فریاد ملیگی کہ نہیں — آرزو کی مری کچھ داد ملیگی کہ نہیں

ولی کا اسلوبِ شعر
اور
جدید شاعری

از

مولوی محمد عبدالقیوم خان صاحب باقی ام اے (عثمانیہ)

یہ امر کتنا مسرت بخش ہے کہ ولی کے جشن کے چرچے اندرون و بیرون ملک جگہ جگہ ہو رہے ہیں ہمیں بڑی خوشی اس امر کی ہے کہ صرف اس جشن کے انعقاد ہی پر ہر طرف سے مبارکباد کی صدائیں آرہی ہیں، اگر اسکی ادبی کاوشوں اور علمی روداد کا بھی صحیح اندازہ کیا گیا تو یہ حقیقی معنوں میں قابل مبارکباد ہو جائیگا۔

اسی جشن کے متعلق ایک دن گفتگو ہو رہی تھی میرے ایک فاضل دوست کرسی پر دراز ہو کر کتاب کا مطالعہ فرما رہے تھے، کسی شائق علم نے اُن سے پوچھا "جناب والا" آپ فرمائیے ولی کا حقیقی وطن کونسا ہو سکتا ہے؟ یہ سوال موصوف سے اس لئے کیا گیا کہ اُن سے شمالی ہند کی پاک سرزمین کی ہمیشہ تعریف سنتے سنتے جی اکتا گیا تھا، اب آرزو تھی کہ دکن کے متعلق اُن کی کوئی رائے حاصل کیجائے۔ موصوف شاعر تھے سخن فہم تھے، اردو دانی کا انھیں ادعا بھی تھا۔ مشہور بھی تھے، ان کا عجیب و غریب جواب ہے جو میرے اس مضمون کا اولین محرک ہے، اس لیے عرض کرتا ہوں۔ آپ نے کچھ سوچ کر فرمایا! "بھئی بات یہ ہے۔ میر تقی میر نے اپنے تذکرے میں (یہ جملہ معترضہ۔ میر نے اردو شاعروں کا تذکرہ لکھا ہے!) صاف لکھا ہے کہ ولی جب دلی آئے تو میر نے ان سے کہا" آپ کی زبان درست نہیں ہے۔ اردوئے معلیٰ کی زبان لکھیئے" یہ مشورہ ان کے پسند آگیا، چنانچہ انھوں نے اسی دن سے دکن کی زبان ترک کر دی، اسی کا اثر ہے کہ ولی کی شاعری کا یہ معیار اور یہ رنگ ہے! یہ جواب جسقدر دلچسپ ہے اس کا آپ خود اندازہ فرمائیں۔ ادھر انکی

زبان سے یہہ جملہ ادا ہوا، اور میں نے چپ سی سادھی، اور غور کرنے لگا۔ آہ دکن، تیری بدنصیبی! اردو کا سب سے پہلا شاعر، تیری مبارک زمین سے اٹھا، دو سو برس کے بعد دنیا اسے بھی تجھسے اس طرح چھین لینا چاہتی ہے! پھر خیال آیا، یہہ اتنا آسان نہیں، جو دیوان، یعنی وہ پہلا مرقع جس میں ایک شاعر کے نقوش خیال، حسن ادا اور حسن تصور بنکر، دنیا کی آنکھوں کے سامنے پیش ہوا، دکن کے خیال اور زبان کا وہ مستقل خزانہ ہے جسے کوئی دوسرا ملک تاریخی حیثیت سے اپنا نہیں بنا سکتا اور نہ اسکا دعوی کرسکتا ہے دیوان ولی، ہمارے وطن کی پیداوار ہے اور جبتک ذوق ادب قائم ہے یہہ ہمیشہ اسکا ثبوت دیتا رہیگا۔

شاعر کی آفرینش حضرات! غور فرمایئے، کسی سرزمین پر، کسی قوم میں، ایک شاعر کا پیدا ہونا کوئی معمولی سی بات نہیں ہے جسے واہ واہ کرکے ٹالدیا جاسے۔ شاعری کی دیوی کے سچے پرستار **شیلے** نے کہا تھا "انسان کی آواز اور تکلم بھی شعر ہے"! اس جملے کے مفہوم سے زیادہ اس رنگین تصور، اس وجدانی خیال، اس ذوق نغمہ، اور اس بیتابی دل کی داد دیجئے، جسکی بدولت یہہ آٹھ لفظوں والا جملہ پیغمبرانہ پیام بنکر اسکی زبان سے نکلا، جب ہر انسان کی آواز اور تکلم بھی شعر ہے تو پھر شاعر کی آواز اور اسکے تکلم کا کیا عالم ہوگا!

ایک بے چین سرزمین، ایک مٹتے ہوئے تمدن، ایک سیاسی طوفان میں گھرے ہوئے ملک اور ایک مظلوم قوم کی حالت زار کا اندازہ کرنا دشوار ہے۔ ایسے وقت جبکہ سرزمین دکن کا ذرہ ذرہ، ایک آہ، ایک آنسو ہے، وہاں ذوق، نغمہ، حسن اور ترنم کو کیا دخل ہوسکتا ہے، تاہم قدرت کی عجب سادہ اور پرکار واقع ہوی ہے کہ بعض وقت بقول اقبال۔

تو جو چاہے تو اٹھے سینۂ صحرا سے حباب
رہرو دشت ہو سیلی زدہ موج سراب

وہ انسان کے آگے اپنے نت نئے کرشمے پیش کرتی رہتی ہے اور انسان انھیں دیکھ دیکھ کر حیران ہوتا رہتا ہے۔

یہی دکن میں ہوا، دیکھتے دیکھتے ساری زمین رنگین ہوگئی، ہواؤں میں مہک، پھولوں میں دلفریبی اور بلبل کی آواز میں درد پیدا ہوگیا، انسان کے آگے خیال کی موج، نغمے کے رنگ اور تصور کے جلوے، الفاظ اور رنگین الفاظ کے قالب میں بیتاب ہونے لگے۔ ماہتاب کو دیکھو تو ایسا معلوم ہوا گویا محبوب مسکرا رہا ہے، درخت پر نظر ڈالو تو شادابی بہار، اور صبح کی ٹھنڈی ہوائیں اس پر جھولا جھول رہی ہیں، ستارے گا رہے ہیں شفق آسمان کے چہرے پر غازہ مل رہی ہے، خاک کے فرش پر قدرت کی سب سے زیادہ پیاری صنعت یعنی ہمارے شاعر کے الفاظ میں "سجن" اس طرح قدم اٹھا کر چل رہا ہے جیسے تاروں کے جھرمٹ میں مہتاب (یہی وہ

تشبیہ ہے جو ہمارے شاعر نے اپنے ایک شعر میں لکھی ہے اور کل یہ شعر آپ کے سامنے پڑھا گیا تھا) اچھا تو گویا شاعر کیا پیدا ہوا، دل کی آنکھیں کھل گئیں، نگینوں نے دربار سجایا۔ غور فرمائیے، کیا یہ قدرت کی کوئی معمولی نعمت ہے؟

شعر اور تدوین اس سے ایک قدم آگے بڑھیئے تو شاعر نہ صرف ہمیں شعر کی دولت بخشتا ہے بلکہ اس دولت کو ایک جگہ اکٹھا کر کے قوم کے سپرد کرتا ہے تاکہ وہ اسے سنبھال کر رکھے، اور اُسے اپنی ادبی تونگری اور حسنِ کار سرمایہ کا جیتا جاگتا ثبوت بنا کر پیش کرتی رہے۔ یہ گویا ایک لازوال خزانہ ہے جس کا خرچ کرنا اسکی آمدنی بڑھاتا ہے!

نغمۂ عشق ایک قدم اور آگے چلئے تو معلوم ہوگا کہ ابھی انسان نے دیکھنا تو سیکھا، بولنا بھی سیکھا تھا، کونسی بولی؟ قدرت کی صنعتوں پر دیوانہ وار گرنے، اُن کی خوبیوں کے بیان پر ہونے کی بولی، دل کی بولی، آنکھ کی بولی، نغمے کی زبان اور ترنم کا پیرایۂ بیان۔ ایک انسان نے زمانے کو نغمۂ عشق سکھایا، دل کی نگینیوں کو زبان سے ادا کرنے، اور ذوقِ نظر کی لطافتوں کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے پاکیزہ شعروں کی صورت میں خوبصورت سانچے بنا دیئے۔ اگر ادب کے اس فیضِ اولین، اور کسی ادبی رہبر کے نقشِ اول کی تائید کا بغور مشاہدہ کیا جائے تو بعد آنے والے بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں کی حقیقت بہت کچھ بے نقاب ہو جاتی ہے اور انکی عظمت و شان کے حقیقی راز دنیا پر کھل جاتے ہیں۔ ادب درحقیقت ایک چراغ ہے، اور اسی دیات دوسرے دیئے جلتے رہے ہیں، بڑا محترم، بڑا بلند پایہ ہے وہ شخص جو پہلے ادب کا چراغ جلاتا اور ایک اندھیرے گھر میں اُجالا کرتا ہے!

تاریخ پر روشنی ڈالنے والے فاضل مقررین نے کل آپ کے سامنے کہا کہ ولی سے بہت پہلے کی شعرا اور صاحبانِ تصنیف کے دور گذر چکے ہیں لیکن خوبی یہی بات ہے کہ اہلِ تحقیق نے یہ تسلیم بھی کر لیا ہے کہ ریختہ کا پہلا بلند پایہ شاعر اور مکمل کلیات کا مرتب یہی ہے اور یہی دکن میں اس کا بڑا کارنامہ ہے!

کل کے مضمون میں ایک فاضل مصنف نے فرمایا کہ ولی بڑا حسن پرست تھا۔ اسمیں تعجب کی کیا بات ہے؟ ہر سچا شاعر حسن پرست ہی ہوتا ہے۔ مگر ایک عہد میں جبکہ اہلِ دکن کو حسن کی نہ پرستش کرنی آتی تھی اور نہ اُن کے ذوقِ نظر کی ترجمانی کے لئے زبان تھی، "ایک حسن پرست نے" ریختہ گوئی سکھائی، گویا اہلِ دل کو حسنِ مجاز کے تصورات اور اظہارِ خیال کے لئے مستقل سانچے بنا کر حق کے آسمانی رستے لگا دیا۔ اب ان سالکوں کا کام ہے

کہ وہ اس راستے پر حسن کا نظارہ کرتے ہوئے اپنے اپنے حوصلوں کے مطابق آگے بڑھتے جائیں۔ یہ ایک بدیہی امر ہے کہ ابتدائی سانچے خام اور بھونڈے ہوتے ہیں۔ مگر ہمارے شاعر نے وہ سانچے بنائے جو بالکل نئے پختہ، مستقل اور خوبصورت تھے اور اب تک بھی محبت بھری نظروں سے دیکھے جانے کے قابل ہیں! آئیے، ان سانچوں پر ایک نگاہ ڈالیں اور انکی خوبصورتی کا اندازہ کریں)

شعر کے سانچے پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمارے شاعر کے ہاں مختلف بحروں اور زمینوں کی اتنی کثرت پائی جاتی ہے جسے دیکھ کر پہلے ہی اسکے ذوق و نظر کی وسعت کا اندازہ ہونے لگتا ہے۔ دیوان (مطبوعہ انجمن ترقی اردو) شاہد ہے کہ اسمیں طویل اور مختصر بحروں کی کتنی رنگا رنگی موجود ہے۔ یہ گویا جذبات کے سانچے ہیں اور ان کا تنوع بتاتا ہے کہ اس مطرب اولین کے دل میں جذبہ اور تصور کتنی صورتیں اور قالب لیکر ابھرتے تھے۔ جذبات کا سانچہ بنانا حسن کاری کا ایک اہم مقدمہ ہے۔ اسمیں سجاوٹ، اور دلکشی پیدا کرنے کے لئے ایک اہل نظر اور صاحب دل کی ضرورت ہے۔

زبانِ نغمہ شعر جس طرح خیال کا عکس اور تصور کا آئینہ ہے۔ اسی طرح الفاظ کی زنجیر بھی ہے۔ ان الفاظ کی رگوں میں ضروری ہے کہ نغمے کا خون دوڑتا رہے۔ خیالات میں سمندر کی لہروں اور اسکی تہ کی طرح چمک اور چھاؤں پائی جائے

ولی کے جذباتی سانچے سمندر کی موج کی طرح چمکدار ہیں۔ ان میں الفاظ کی شیرینی ایسی ہے جیسے بہتے پانی میں ہلکا ہلکا ترنم۔ اپنے ایک شعر میں اپنے محبوب کو مخاطب کرکے کہتا ہے۔

(۱) آج گلگشتِ چمن کا وقت ہے اے نوبہار — بادۂ گلرنگ (سوں) ہر جام گل لبریز ہے

اسی طرح نزاکت خیال اور لطافت ادا دیکھئے، حسن کا شیریں نغمہ محبوب کی تعریف میں گاتا ہے۔

(۲) آغوش میں آنے کی کہاں تاب ہے اسکو — کرتی ہے نگہ جس قد نازک پہ گرانی
مت دور ہو اک آن ولی پاس سے ہرگز — اے باعثِ جمعیتِ ایامِ جوانی

ایسے دور میں جبکہ آواز انسانی سینوں کے اندر دفن اور گوش ذوق نغمے سے خالی تھے ہمارے شاعر نے ایک مکمل نغمہ سنایا۔ ایک "زندگی کا راگ" سناتا ہوں اور یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ ہمارے کان جدید طرز شعر گوئی سے واقف ہیں میں آپ کو اس قدیم نغمے کی صفائی اور ترنم کی طرف متوجہ کرتا ہوں۔

اسکو حاصل جگ میں ہو کیونکر فراغ زندگی — گردشِ افلاک ہے جسکو ایاغ زندگی
اے عزیزاں سیر گلشن ہے گل داغ الم — جنت احباب ہے معنی میں باغ زندگی
آسماں میری نظر میں کلبۂ تاریک ہے — گر نہ دیکھوں تجھکو اے چشم و چراغ زندگی

۲۔ سلطان جمشید قلی قطب شاہ سنہ ۹۵۰۔ سنہ ۹۵۷

۱۔ سلطان قلی قطب شاہ سنہ ۹۱۸ سنہ ۹۵۰

'' [illegible] ''

کیوں نہ ہووے اے ولی روشن شبِ قدرِ حیات — ہے نگاہ گرم گل رُویاں چراغ زندگی

غالب اور ولی

مرزا[1] غالب دلی کے وہ بڑے شاعر ہیں جنہوں نے قدیم طرز غزل گوئی کے قالب کو بدل ہی دیا۔ ہاں جس کمال سے بدلا وہ ہم میں سے ہر ایک صاحب ذوق جانتا ہے۔ آپ نے غور فرمایا ہوگا کوئی زمانہ سیکڑوں شاعر پیدا ہو رہے ہیں اور ان میں سے اکثر اسی سحار سخن کی معنی آفرینی اور طرز ادا کی پیروی کرنی چاہتے ہیں۔ مگر انھیں قدم قدم پر ناکامی ہوتی ہے۔ ہمارے شعر یا تو مہمل الفاظ کا مجموعہ ہوتے ہیں یا تشنگی اور بے کیفی کی تصویر۔ یہہ حال اُردو کے ایک ترقی پذیر دور کا ہے۔ ولی۔ غالب کی طرح اُردو کا اولین معمار ہے۔ ہم اس نقطۂ نظر سے جب اسکے کلام کو دیکھتے ہیں تو نہ صرف اسمیں بے عیبی کا جوہر پاتے ہیں بلکہ دور غالب کی پختگی اور ارتقاء کے بھی عمدہ نمونے دیکھتے ہیں۔ زبان، تشبیہات، استعارے، ترکیب لفظی اور معنوی نہایت شستہ، رفتہ، پُرلطف اور دلکش ہیں جنھیں دیکھکر ایک قسم کا استعجاب پیدا ہوتا ہے۔

قدرت سخن

قادر الکلامی ولی کی خاص صفت ہے۔ کہیں بندش میں کوئی اُلجھن یا ادائے خیالات میں کوئی تنگی نہیں پائی جاتی، الفاظ نہ سقیم ہیں اور نہ زائد۔ مشکل سے مشکل بحروں میں بھی اپنا مضمون اتنی خوبی اور پاکیزگی سے ادا کر جاتا ہے جس طرح بلبل شاخ گل پر بغیر کسی تکلف کے نغمہ سرا ہوتا ہے۔ زبان پر قدرت مسلّم استادی کی دلیل ہے، اسی قدرت کی جولانیوں نے ولی کے سامنے اصناف سخن کے بہت سے میدان کھولدیئے۔ قصیدہ رباعی، مثنوی، قطعہ، مستزاد، مخمس، اور چند دیگر اصناف اور صنعتوں میں اس نے حیرت انگیز طریقہ سے شعر اور مکمل شعر کہے ہیں۔

کمال شعر

شعر کی صفت یہہ ہے کہ وہ جس طرح اچھے خیال کا حامل ہو اسی طرح اچھے الفاظ کا قالب بھی اختیار کرے۔ ولی کے اولین نغموں میں متاخرین کا کمال اور پختگی پائی جاتی ہے۔ دیوان ان خوبیوں سے بھرا پڑا ہے۔ چند مختصر زمزمے آپ بھی سماعت فرمائیے۔

(۱) مسجود آفتاب شرف سے ہوا ہے آج — وہ نقش پا کہ زینت روئے زمین ہوا

(۲) ہزار بلبل مسکیں کا صید ہے باقی — مقیم ہے چمن حسن میں بہار ہنوز

ہوا نہیں وہ صنم صاحب اختیار ہنوز — بجائے خود ہے رقیباں کا اعتبار ہنوز

---

[1] (۱) دیوان ولی (مطبوعہ انجمن ترقی اردو) صفحہ ۲۴۳
(۲) ایضاً صفحہ ۲۲۳
(۳) ایضاً صفحہ ۲۲۵

ولی جہاں کے گلستاں میں آ، طرف ہے خزاں ۔۔۔ ولے بحال ہے وہ سروِ گلعذار ہنوز ؏

---

(۳) ہے سلک گیا خاطِ مشتاق باغ باغ ۔۔۔ آیا ہے التفات پہ وہ نوبہار آج

دامانِ آسماں کے بجز شفق نہیں ۔۔۔ تجھ نے ہوا کو کیا لالہ زار آج

روانی | شعر کی دوسری خوبی اسکی روانی اور سلاست ہے۔ ایسے دور میں جبکہ "گیسوئے اردو" ابھی منت پذیر شانہ" تھا، رواں شعر لکھنا گویا ایک معجزہ دکھانا ہے۔

(۴) پھر میری خبر لینے وہ صیاد نہ آیا ؏ ۔۔۔ شاید کہ "مرا حال" اسے یاد نہ آیا ؏

---

(۵) معشوق کو نہیں عاشق کی آہ سے ۔۔۔ بجھتا نہیں ہے بادِ صبا سوں چراغِ گل

زبان کی شائستگی | ہر بڑے شاعر کی طرح ولی ایک معمار زبان سخن بھی ہے۔ شعر کہنا خود ایک بڑی تعمیر ہے، اور کمال شعر کہنا مستقبل کی پیغمبری ہے۔ ولی کے کلام میں بعض ایسی خوبصورت ترکیبیں ملتی ہیں جنکی جدید شاعری کو سخت ضرورت ہے مگر ڈھونڈے نہیں ملتی۔ مثلاً

پردہ شناسانِ مدعا، سامانِ طغرائے نیاز، آتش سوار، برنا بار، رشتہ سیماب، نور کا فانوس، گوہر کانِ حیا، آئینہ معنی نما، پریشانی فروش، نقش مراد آئینہ آخری ترکیب کا مصرع ہے ؏ نقش مراد آئینہ تیرا خیال ہے

ترکیبوں کا حسنِ استعمال | ترکیبوں کی خوبصورتی اور بھی نمایاں ہوتی ہے جبکہ یہ شعر میں اس طرح بٹھائی جائیں جیسے انگوٹھی میں نگینہ۔ ولی کے اشعار اسی طرح قیمتی نگینوں کی انگوٹھیاں معلوم ہوتے ہیں جنکی قیمت آج کے بازار میں بھی انمول ہے۔

ولی کا شعر جدید لباس میں | اسی طرح زبان کی روانی کا یہ حال ہے کہ دیوان کے سرسری مطالعہ ہی سے ولی کے ذوق شعر کا اثر دل پر جادو کی طرح ہونے لگتا ہے۔ سیکڑوں اشعار ایسے ہیں جن میں سے اگر سوں، سنے، بولیا،

ط۱ (۱) ایضاً صفحہ ۴۶ ۔۔۔ (۴) ایضاً صفحہ ۸۸ یہ غزل کی غزل ایسی ہی صاف اور رواں ہے

(۲) ۔۔ صفحہ ۱۰۶ ۔۔۔ (۵) ۔۔ ۔۔ ۱۳۶

(۳) ۔۔ ۔۔ ۶۸

جیوں، دستائے، کون، وغیرہ جیسے قدیم دکنی الفاظ نکال دیے جائیں یا ان کی جگہ ایک آدھ جدید الفاظ مثلاً 'کون' کی بجائے 'کو'، 'سوں' کی بجائے 'سے' لکھ دیا جائے تو یہ اشعار ایسے معلوم ہونگے گویا اسی زمانے کے لکھے ہوئے ہیں دیوان کھولتے ہی غزل سامنے آتی ہے۔

اس سرو خوش ادا کوں ہمارا سلام ہے — [illegible] ب وفا کوں ہمارا [illegible]

لیتا نہیں سلام ہمارا حجاب سوں — اس صاحب حیا کوں ہمارا سلام ہے

ناز و ادا سوں دل کوں کیے مبتلا کیا — اس نازنیں پیا کوں ہمارا سلام ہے

آرام جان و دل ہے ولی جس کا دیکھنا — اس جان دلربا کوں ہمارا سلام ہے

اگر ان میں سے صرف 'سوں' اور 'کوں' کو 'سے' اور 'کو' سے بدل دیا جائے تو کون کہے گا کہ یہ اشعار دو سو سال پرانے ہیں۔

صنعتیں | ولی کی صنعتیں بعض اوقات بجائے خود ایک حالت حاصل کر لیتی ہیں۔ وہ حسن خوبی سے تشبیہ ... گویا حسن اور خیال کی تصویر لے رہا ہے۔

ولی اس گوہر کان حیا کی کیا کہوں خوبی — مرے گھر اس طرح آتا ہے جوں سینے میں [illegible]

آفتاب آتا ہے معلوم ہو کے تجھ کو چے طرف — صبح صادق اس سبب میں جامہ احرام ہے

شاعر کی اندرونی دنیا | حضرات! اب میں شاعر کی ان خصوصیتوں کی طرف آتا ہوں جن کا تعلق شاعر کے باطن سے ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ شاعری ایک قسم کی ساحری ہے [illegible] بنانا پڑتا ہے بعض جادو جگانا پڑتا ہے۔ اس کمال کے لئے دل کی آنکھ ہمیشہ کھلی رہنی چاہیئے۔ شاعر کی نظر میں کائنات ایک آئینہ ہے جس کا ذرہ ذرہ ذرے ذرے کو حیرانِ حسن اور گوشے گوشے کو جلووں سے منور دکھاتا ہے

قوت مشاہدہ | قوت مشاہدہ شاعر کی اولین ضرورت ہے یہ [illegible] سادہ سی سادہ چیز میں ایسی خوبیاں دیکھ لیتا ہے جن کا دوسرے کو گمان تک نہیں ہو سکتا۔ قواعد کی رو سے آپ تشبیہ اور استعارے کی کچھ بھی تعریف فرمائیں میں ان سب کی صنعتوں کو مشاہدے کی آزادی کہوں گا جس طرح ایک مصور کو قلمی نقش کے لئے رنگوں کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح خیال کے نقش کے لئے صنعتوں کی رنگ آمیزی ضروری ہے۔ مصور رنگ

دیوان ولی (مطبوعہ انجمن ترقی اردو) صفحہ ۲۸۹
ایضاً صفحہ ۲۰۲
" " ۲۳۶

ہونا قدرت سے سیکھتا ہے اور مشاہدے سے کام لیتا ہے، یہ حال شاعر کا نہیں ہے۔ وہ آسانی کے ساتھ کائنات کی لوح پر نقوش خیال میں رنگ بھرے ہوئے نہیں دیکھ سکتا، اُسے اپنی جدت طبع استعمال کرنے کی ضرورت پڑتی ہے اس طرح شاعر نہ صرف مصور ہے، بلکہ موجد اور مخترع بھی ہے۔

سادگی کا زیور صنعت گری شاعری کے لئے ہر وقت ضروری نہیں ہوتی۔ بعض وقت خود سادگی کو اسکا زیور بنانا پڑتا ہے۔ ولی کے ہاں کہیں سادگی خیال نے کرشمے ہیں کہیں سادگی زبان شوق کو جھولے جھلا رہی ہے نعت گوئی جیسے مشکل میدان میں شاعر کا یہ "گیت" ملاحظہ ہو۔

(۱) لامکاں پر بنا احمد جو بنا ٹھہلایا ؛ تب ملائک نے وہیں صل علیکم گایا
حور و غلماں نے ترانے سے وہ نغمے گائے ؛ قاب قوسین کا نغمہ ہے سبھی کو بھایا
تھے براتی وہاں آدم سے لگا تا عیسیٰ ؛ اور جبریل امیں گوندھ کے سہرا لایا
حق نے لولاک لما حق میں محمد کے کہا ؛ اُن سواکون سے مرسل نے یہ رتبہ لایا
مغفرت تیری ولی سہل بلاریب ہے کیوں ؛ نام احمد کا جو لب پر ترے ہر دم آیا

شعر کے جدید رُجحانات۔ شعر کے جدید رجحانات کے اعتبار سے قوت مشاہدہ اور قوت بیان شاعر کے لئے لازمی ہے قوت مشاہدہ ایک قسم کا الہام ہے، یہ آنکھ کا نغمہ اور دل کی آواز ہے، شاعر کا باطن اور اسکی وسعت اسی آئینہ میں جھلکتی ہے۔ قوت بیان کے ذریعے پیام دل سینے سے لبوں پر آتا ہے۔ اور بعض وقت الہامی نغمہ بنکر انسان کے لئے فردوس گوش بنجاتا ہے۔ آئیے ایک قصیدے کی تشبیب میں ولی کی ندرت تخیل اور مشاہدہ، اسکے ساتھ معجز بیانی کا کمال بھی دیکھیں۔ اور اگر نظم قابل داد ہو تو اسکی داد دیں۔

(۲) ہوا ہے خلق اُپر، پھر کہ فضلِ رحمانی ؛ کیا ہے ابر نے رحمت سے گوہر افشانی
تمام پات "یسبح بحمدہ" کے بہ حکم ؛ زبانِ حال سے کرتے ہیں ذکر سبحانی
ہر اک طرف جو ہوئی بسکہ ریزش باراں ؛ کیا ہے آج تفرج نے جوش طوفانی
اس آب رُوح فزا کے کمال لطف کو دیکھ ؛ چھپا ہے پردۂ ظلمت میں آبِ حیوانی
ہر ایک قطرۂ شبنم ہے غیرتِ گوہر ؛ ہر ایک پات پہ برسا ہے ابر نیسانی
زہے بہار حلاوت، زہے بہار طرب ؛ کہ بلبلاں نے لیا شیوۂ غزلخوانی

شہر سورت کی تعریف میں ولی کی ایک مشہور مثنوی ہے جس کا حوالہ کم و بیش جتنی بار اسکے ہر مقرر نے

دیا ہے۔ آب و ہوا کی تعریف میں شاعر کے دو شعر مجھ سے بھی سماعت فرمایئے۔

(۳) شبح سن آب اسکی، جگ میں کانپا — سمندر موج زن رگ رگ میں کانپا

کہ آب خضر کی ہے اس میں تاثیر — ہوا دیتی ہے اس کی یاد کشمیر

شیلے نے اپنی نازک ساعتوں میں کہا تھا۔

That Light whose smile kindles the universe.

اور شاعر کا یہ خیال کائنات کو تبسم ربانی کا ایک نور بنا دیتا ہے جس کے ذریعے ولی نے بھی یہ رفعت ایک رباعی میں حاصل کی ہے۔ کہتا ہے۔

* تجھ مکھ کا ہے یہ پھول، چمن کی زینت — تجھ شمع کا شعلہ ہے چمن کی زینت

فردوس میں نرگس نے اشارے سے کہا: — یہ نور ہے عالم کے نین کی زینت

تین مثالیں | شاعر کی نگاہ ایک شعلہ ہوتی ہے۔ شاعر کا دل کائنات کا سمندر ہوتا ہے۔ شاعر کی زبان زندگی کا پیام ہے۔ یہ شاعر اپنی زلف، اپنی زندگی کی حکایت اپنے شعلے، اپنا سمندر اور اپنا پیام بنا لیتا ہے۔ تین مثالیں ملاحظہ ہوں:-

شعلہ نگاہ - (۱) آفتاب آتا ہے محرم ہو کے تجھ کوچے طرف — صبح صادق اس نے بر میں جامۂ احرام ہے

(۲) اس کے مشتاق ہیں سب اہل زمیں اہل سما — شوق کا جس کے لیا چرخ پہ خورشید علم

دل سمندر (۳) ہوئے غوص میں دریا میں جن نے دیکھا — صدف دل ہے حقیقت سے گہر کی محرم

دل کے دریا کو ترقی کے اپر نت ہے نظر — اسکی نسبت ہے سمندر سے ہر اک آن میں کم

زندگی کا پیام (۴) بدخصلتی کے گل میں نہیں بوئے عافیت — گر عافیت کے ملک کی خواہش ہے سلطنت

خوش قسمتی کے ملک میں اے خوش خصال چل

کر مختصر جہان میں دنیا کی جستجو — اے بےخبر اگر ہے بزرگی کی آرزو

دنیا کی رہگزر میں بزرگوں کی چال چل

---

* دیوان ولی ایضاً صفحہ ۳۴۲ (۱) دیوان ولی صفحہ ۲۸۱ (۳) دیوان ولی صفحہ ۳۶۷

ایضاً " ۱۹۱ (۲) " ۳۶۷ (۴) " ۳۲۵

کہتے ہیں کھول پردہ شناسان مدعا   جو اوج میں ہوا کے اُڑے شاہباز ہے

زبان کی مشاطہ گری ولی نے کی۔ اور اس کمال سے کی کہ جو جو سامان آرائش اس نے استعمال کئے، وہی غازہ وہی رنگ، دیگر سخن آرایاں بدلے ہوئے انداز سے کام میں لائے۔ ولی کے مختصر گیتوں میں میر کی سخن آرائی کے لئے اس قسم کا سوز، چستی، گداز۔ اور اختصار پایا جاتا ہے۔ کہیں ذوق کے لئے قصیدہ گوئی کے نمونے ہیں، کہیں غالب کیلئے انکی خاص بندش اور معنی آفرینی کے نقوش، اور کہیں خود جا بجا نظم نگاروں کے لئے نظم لکھنے کے خوبصورت مرقعے!

میر کے لئے   مجھکو تجھ بن کسی سے کام نہیں   فکر ناموس و ننگ و نام نہیں
زندگی جام عشق ہے لیکن   فائدہ کیا اگر مدام نہیں
عشق اس کا ہے ناتمام جسے   پی کی خاطر کا اہتمام نہیں

غالب کیلئے (۱) درد مندوں کو سدا ہے قول مطرب دلنواز   گرمی افسردہ طبعاں شعلۂ آواز ہے
بزم کو رونق دیا ہے جب سے وہ عالی مقام   رشتۂ آہ دل بے تاب، تار ساز ہے
(۲) غیر حیرت ہے خبر اس آئینہ رو کی کسے   راز کے پردے میں جس کی خامشی آواز ہے
دیکھنا آئینہ رو کا امر مشکل نئیں ولی   سنگ راہ سینہ صافاں، طالع ناساز ہے

خاتمہ حضرات! مضمون طویل ہوتا جا رہا ہے۔ بہت کچھ کہنا ہے، بہت کچھ سُنانا ہے، کلام ولی ایسا نہیں کہ ایک مختصر مضمون میں اسکی ساری خوبیاں جاگر ہو جائیں۔ اسکے لئے مکمل ریسرچ اور ایک مبسوط تصنیف کی ضرورت ہے، کاش کسی کو توفیق ہو۔ آخر میں اتنا عرض کرونگا کہ ولی کی پختہ کاری ہمارے لئے بار بار نہ صرف حیرت کا باعث ہوتی ہے بلکہ اس کی اُستادی کا ڈنکا بجاتی ہے۔ ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں۔ نقش اول اور اتنا کامل! پہلا نغمہ اور اتنا بے نظیر! خصوصاً جبکہ ولی کی زبان ایسے دور سے متعلق ہو جس میں اُردو ہنوز عہد طفولیت میں تھی اور کسی کو شان گمان تک نہ تھا کہ یہ شوخ ایام جوانی میں شمالی ہندوستان جاکر زیور حُسن و خوبی سے آراستہ ہوگی۔ مگر اپنے قدیم عہد عافیت کو بُھلا دیگی۔ مبارک ہیں وہ ہاتھ جنہوں نے پہلے پہل اس دُلہن کو سجایا، اُسے پری پیکر بنایا اور ہندوستان کی سیر کے لئے سراپا شوق بنا کر دوسری طرف

(۱) ایضاً صفحہ ۲۷۰ (۲) ایضاً صفحہ ۲۶۹

بھیجا۔ ولی نے اپنے ایک قصیدے میں غلط نہیں کہا تھا۔

یقیں ہے مجھکو کہ گر یہ قصیدۂ رنگیں　　"سنیں تو وجد کریں، انوری و خاقانی"

میں قصیدے کی تخصیص نکال کر کسی قدر تبدیل کے ساتھ یہ عرض کرونگا۔

یقین ہے مجھکو کہ یہ خوش ادا کلام ولی　　سنیں تو وجد کریں، انوری و خاقانی!

ولیؔ دکھنی

— از —

مولوی بدؔ الدین صاحب شکیب بی ۔ اے ال ال بی (عثمانیہ)

جہاں میں زندۂ جاوید تیری دُر فشانی ہے
ترے اشعار سے رنگین اُردو کی جوانی ہے
دکن کے نام سے روشن جہاں میں نام ہے تیرا
زبانِ ریختہ کا عہدِ نو پیغام ہے تیرا
تیری طبع رواں پر شوخیٔ گفتار قرباں ہے
ترے طرزِ بیاں پر نطق گوہر بار قرباں ہے
تیری آواز اک بانگِ دراتھی کاروانوں کو
سخن آموز تھی تیری زباں سب بے زبانوں کو
تیری ہر سعی و کاوش میں تھا رازِ زندگی پنہاں
نقوشِ اولیں میں تیری سازِ زندگی پنہاں
ولیؔ! آدیکھ تیری ابتدا کی انتہا کیا ہے
ولیؔ! آدیکھ تیری داستاں کا ماجرا کیا ہے
ولیؔ! گہوارۂ علم و ادب ہے پھر دکن اپنا
ولیؔ! فردوس بر روئے زمیں ہے یہ چمن اپنا

۳۔ سلطان ابراہیم قلی قطب شاہ سنہ ۹۵۷ھ سنہ ۹۸۸ھ

۴۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ سنہ ۹۸۸ھ۔ سنہ ۱۰۲۰ھ

ولی اور اسکی شاعری

از

گارساں دتاسی

مترجمہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب ریڈر تاریخ کلیہ جامعہ عثمانیہ

ہر قوم میں شاعر نثر لکھنے والوں سے پہلے پیدا ہوتے ہیں۔ خیالات کی شوخی نظم ہی کے ذریعہ سے ظاہر کیجا سکتی ہے ردیف و قافیہ کی موزونی ان لوگوں کے لئے جو کم تعلیم یافتہ ہیں۔ یا جنھیں دماغ کاوی کی مشق نہیں ہے، باعث دلکشی ہوتی ہے۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ دنیا کی ہر قوم میں اعلیٰ درجہ کے شعرا کی قدر اسی قوم کے مورخوں یا فلسفیوں کی نسبت زیادہ ہوتی ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ اول الذکر کے کلام سے ہر شخص ناکس محظوظ ہو سکتا ہے، اور آخر الذکر کی تصانیف کو صرف وہی پڑھتے ہیں جنھیں مطالعہ کا شوق ہے۔

ہندوستان میں قدیم زمانے میں نیز عہد وسطیٰ و جدید میں یہ بات محسوس کیگئی کہ عوام الناس کو خطاب کرنیکا بہترین ذریعہ شاعری ہی ہے اسی سے ان میں اعلیٰ جذبات پیدا کئے جا سکتے ہیں اور اسی کے ذریعہ مذہب و تمدن کے خیالات قانون و فلکیات اور فرضیکہ ہر وہ چیز جس کا علم حاصل کرنا مفید ہو سکتا ہے، عوام کے سامنے پیش کئے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ قدیم ہند کی تمام سنسکرت کتب نظم میں ہیں۔ ہندوی (ہندوستانی) کی تمام کتب بھی نظم میں ملتی ہیں۔ یہ زبان ہندوستان کی مشترک زبان ہے اور اس زبان میں آپ کو ہندوستان کی جدید ادبیات ملیگی۔

مسلمانوں نے خاصکر اس زبان کی ترقی و اشاعت کے لئے بہت کچھ کیا ہے۔ انھوں نے اس زبان کی شاعری کے ذریعہ فلسفہ و حکمت کے مسائل عوام کے سامنے پیش کئے۔ انھوں نے اس زبان میں خدا کی حمد و ثنا کے گیت گائے۔ یہ حمد و ثنا اپنا ایک مخصوص انداز رکھتی ہے جو وید مقدس اور قرآن مجید کے انداز سے مختلف ہے۔ چنانچہ سودا نے کہا ہے

زاہد و پیر مغاں برہمن و شیخ اے یار ۔۔۔ دل میں کہتے ہیں ترے ہاتھ سے غم چار ہوں کے

یا جیسے ولی نے کہا ہے:-

ہوا تجھ غم سوں جاری شوق کا طومار ہر جانب ۔ ہوا ہے گرم تیرے عشق کا بازار ہر جانب
تماشا دیکھ اے لیلیٰ کہ تیرے غم کی گردش میں ۔ بگولے کی نمط پھرتا ہے مجنوں خوار ہر جانب

ولی جنت میں رہناں نہیں درکار عاشق کوں ۔ جو طالب آسماں کا ہے اُسے مسکن سوں کیا مطلب

ہو کے غواص میں دریا میں بدن کے دیکھا ۔ صدف دل ہے حقیقت سوں گہر کی محرم

اس شاعری کا مقصد انسان کو روحانی کیف سے آشنا کرنا ہے اور اسکو ذات حقیقی سے وابستہ کرنا ہے جو تنہا باقی ہے اور سب کچھ فانی ہے۔ جیسا کہ ولی نے کہا ہے:۔

جز اسکی ذات اور کسی کو نہیں ثبات ۔ ہے قابل ممات یہ جتنی ہے کائنات

ان حقایق کے ثبوت کے لئے علم ریاضی سے مدد نہیں مل سکتی بلکہ ان میں یقین حاصل کرنے کے دوسرے ذرائع ہیں۔ چنانچہ ولی نے کیا خوب کہا ہے:۔

حکمت عشق بوعلی سوں مت پوچھ ۔ نئیں وہ قانون شناس اس فن کا

حکمتاں کی سب کتاباں دھو بیٹھے یکبارگی ۔ گر فلاطوں تجھ دبستاں میں سبق خوانی کرے

عالماں سوں پوچھیا ہوں میں اکثر ۔ عقدۂ دل کوں نہیں کیا ہے حل

یہ شعرا ہمیں مجاز کے راستہ سے حقیقت کی طرف لیجاتے ہیں حسن مجازی کی جو تصویریں وہ ہماری آنکھوں کے سامنے لاتے ہیں وہ استعاروں کے رنگ روغن سے بنی ہوی ہوتی ہے۔ حسن ازل کبھی عورت کی صورت میں یا کبھی نوجوان لڑکے کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے جس پر جذبات کو ابھی غلبہ حاصل نہیں ہوا۔ جو سادہ اور معصوم ہے اور اسکی جبلت فطرت کی آغوش میں تربیت پائے ہوئے ہوتی ہے۔ اس نوخیزی کے زمانے میں اسکا جسم تندرست اور پاک ہوتا ہے۔ اس کی چہرے

ولی نے اور دوسرے شعرا کی طرح بہت زیادہ نہیں لکھا اور اس نے کسی وجہ حسن انداز سے بتائی ہے اسمیں خود نمائی کی جھلک ہے جو عام طور پر مشرقی شعرا میں پائی جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے۔

ولی دیوان میں میرے تو وہ ذقہ کی حاجت ہیں　　کہ مجھ دیوان میں ہر یک شعر سو دفتہ برابر ہے

کلکتہ میں اسی قسم کے تین دیوان شائع ہوئے ہیں۔ کلیات میر تقی، انتخاب سودا، اور دیوان سوز۔ اگرچہ ان کتابوں میں نہ تمہید ہے اور نہ حواشی ہیں۔ لیکن بایں ہمہ انکی خوب قدر ہو رہی ہے۔ مجھے پوری توقع ہے کہ ولی کے دیوان کو بھی ہندوستانی ادبیات کے شایقین ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔ جنکی کثیر تعداد فرانس اور انگلستان میں موجود ہے۔ اسکے ذریعہ سے اسلامی ہند کے ایک بڑے شاعر کے طرز نگارش سے لوگوں کو واقفیت حاصل کرنیکا موقع بہم پہنچے گا۔

ولی کا نام شاہ ولی اللہ تھا اور ولی تخلص۔ اسکے ہمعصر اسے ایک اعلیٰ درجہ کا شاعر مانتے ہیں اور اسے ہندوستانی شاعری کا آدم خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ "بابائے ریختہ" کے لقب سے مشہور ہے۔ چنانچہ اس نے خود کہا ہے:۔

ہوا جوں خاتم شاہ ولایت　　ولی ہی والیٔ ملک سخن ہے

فوقیت لے گیا ہوں بلبل سوں　　گرچہ منصب میں وہ ہزاری ہے

ولی غالباً سورت میں پیدا ہوئے جسے ہندوستان کے مسلمان باب المکہ کہتے ہیں۔ میں نے یہ قیاس اسواسطے قایم کیا کہ وہ شہر سورت کا محبت کے ساتھ ذکر کرتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی مثنوی میں اس شہر کی بہت تعریف کرتا ہے۔

اس کے کلام کا بیشتر حصہ سترھویں صدی کے وسط میں لکھا گیا۔ اسکا قیام کبھی سورت میں، کبھی گجرات کے دوسرے شہروں میں اور کبھی دکن میں رہا۔ چنانچہ اس نے اسکی نسبت یوں ذکر کیا ہے:۔

ولی ایران و توران میں ہے مشہور　　اگرچہ شاعر ملک دکھن ہے

یو مکھ کی شمع سوں روشن ہے ہفت اقلیم کی مجلس　　ولی پروانگی کرتا تری ملک دکھن بھیتر

شہر ستارا کا وہ اس طرح ذکر کرتا ہے:۔

لیا ہے گھیر تجھ زلفاں نے تیرے کان کا موتی
مگر یو ہند کا لشکر گیا ہے جا ستارے کوں

معلوم ہوتا ہے کہ ولی بنگال میں کچھ دنوں رہے۔ بنگال کا ذکر اس طرح کیا ہے:۔

ہوا ہے رنگ بنگالہ تیرے نرگس کے جادو سوں
معطر ہے سواد ہند تیری زلف کی بو سوں

ان انکھیاں ہور زلف کا دیکھیا ہے از بس جو طلسم
شعر تیرا اے ولی یو سحر بنگالہ ہے (۱)

غالباً ولی نے کچھ زمانہ دہلی میں بھی گذارا۔ اپنے بعض اشعار میں وہ جمنا کا ذکر کرتے ہیں اور دوسرے دریاؤں پر اسکو ترجیح دیتے ہیں۔

زلف تیری ہے موج جمنا کی
تل نزک اس کی جوں سناسی ہے

اپنے وطن گجرات سے دوری کا اس طرح شکوہ کیا ہے:۔

گجرات کے فراق سوں ہے خار خار دل
بیتاب ہے سینے میں آتش بہار دل

مرہم نہیں ہے اس کے زخم کا جہاں مینں
شمشیر ہجر سوں جو ہوا ہے فگار دل

لیکن ہزار شکر ولی حق کے فیض سوں
پھر اسکے دیکھنے کا ہے امیدوار دل

علی ابراہیم خاں نے اپنے تذکرہ گلزار ابراہیم میں ولی کی نسبت صرف چند سطریں لکھی ہیں۔ وہ لکھتا ہے: "شمس ولی گجرات کا باشندہ ہے اور دکن کے شعرا میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ عالمگیر کے عہد میں ہندوستان (شمالی ہند) آیا تھا اور عالمگیر نے اسکو نوازا تھا۔ ولی ہندوستانی زبان کا مشہور استاد ہے۔ وہ پہلا شخص ہے جسنے دکھنی زبان میں شعر کہا اور ایک دیوان چھوڑا جو قابل قدر ہے۔" اس مختصر ذکر کے بعد علی ابراہیم خاں نے ولی کے اشعار کے نمونے پیش کئے ہیں جو تین صفحات پر مشتمل ہیں (۲)۔ مصحفی نے اپنے "تذکرۂ شعرائے ہندی" میں "ولی" کا ذکر نہیں کیا۔ اور بینی نرائن نے اپنی کتاب "دیوان جہاں" میں ولی دکھنی کو اسکے ہم نام مرزا محمد ولی دہلوی سے گڈمڈ کر دیا ہے۔ اور ولی دکھنی کے اشعار کو ثانی الذکر کی طرف منسوب کیا ہے۔

جیسا کہ میں پہلے بھی کہیں ذکر کر چکا ہوں ولی نے عقاید کے اعتبار سے امامیوں اور سنت جماعتوں کے درمیان کی راہ اختیار کی تھی۔ وہ خلفائے راشدین کے متعلق جہاں ذکر کرتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ سنت جماعت سے تعلق رکھتا ہے

---

(۱) اس شعر سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ ولی بنگال میں رہے تھے۔ بنگال کے جادو کا عام طور پر شعرا کے ہاں ذکر ملتا ہے۔ (مترجم)

(۲) میرے ذاتی کتب خانہ میں ولی کے کلام کے دو نسخے موجود ہیں۔ ان میں سے ایک مسٹر شو ریکس کا ہے جنہوں نے شاہنامہ شایع کیا ہے اور دوسرا میرے عزیز دوست کپتان ٹرائیر نے میرے لئے نقل کروایا ہے۔

لیکن حضرت علی کرم اللہ وجہ کا جب کبھی وہ تذکرہ کرتا ہے تو اس کا انداز شیعوں یا امامیوں کی طرح ہوتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ ولی نے اہل علم کی طرح اپنی خودداری کو قایم رکھا اور اپنے اشعار کو والیان ملک کی تعریف سے ملوث نہیں کیا۔ اس باب میں وہ میر تقی، میر حسن اور سودا سے بالکل مختلف ہے۔ یہ تینوں شاعر ولی کے بعد بہت مشہور ہوئے انھوں نے شاہان دہلی، نوابان اودھ و بنگال کی تعریف میں جو قصیدہ خوانی کی ہے وہ مبالغہ سے مملو ہے۔

معلوم ہوتا ہے ولی کو اہل یورپ کی حسن کاری کے متعلق علم تھا۔ چنانچہ ایک موقع پر اس نے اس کا ذکر کیا ہے۔

ہوے ہیں رنگ تصویر فرنگ دیکھ　　　تری صورت کہ یو رنگ من ہے

ولی کے شاگردوں کا علی ابراہیم نے ذکر کیا ہے۔ انمیں سے ایک معز خاں تھے جن کا تخلص تمر تھا۔ موصوف دکن میں کسی اہم عہدہ پر ممتاز تھے اور اپنے ہمعصروں میں شاعر کی حیثیت سے بھی امتیاز رکھتے تھے۔

ولی کی شاعری میں تصوف کا رنگ پایا جاتا ہے۔ ہم اسے حافظ شیرازی سے مشابہ قرار دیسکتے ہیں۔ اسمیں حافظ کی خوبیاں اور نقائص دونوں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اسلامی صوفیا کے انداز میں شاہد و شراب کے ذکر میں وہ بڑے بڑے مسائل بیان کرجاتا ہے۔ مثلاً۔

رکھ دھیان کوں ہر آن تو معبود طرف　　　رکھ سیس کوں ہر حال میں مسجود طرف
معدوم کوں مسجود سوں کیا نسبت ہے　　　اولیٰ ہے کہ مائل ہو توں موجود طرف

پایا ہے جو کوئی دولت فقر؛　　　مشتاق نہیں سکندری کا
پھیکی لگے اس کوں شان دولت　　　چاکھیا جو مزا قلندری کا

بالخصوص نعت میں وہ تصوف کی باتیں بیان کرتا ہے:-

عشق میں لازم ہے اول ذات کو فانی کرے　　　ہو فنا فی اللہ دایم یاد یزدانی کرے؛
مرتبہ خلت پناہی کا وہ پاویگا جو کوئی؛　　　مثل اسمٰعیل اول جیو کی قربانی کرے؛
وہ چہ پاوے مطلب راضیۃ مرضیۃ　　　محض للہ جگ میں جو اعمال پنہانی کرے

اپنے اشعار کی نسبت خود اس کا یہ خیال ہے:-

پڑھتے ہیں ولی شعر ترا عرش پہ قدسی　　　باہر ہے تری فکر رسا حد بشر سوں

ولی کی مذہبیت اسکی پاک باطنی کی آئینہ دار ہے اس میں ریاکاری کو دخل نہیں۔ ولی کے کلام کا تین چوتھائی حصہ غزلیات پر مشتمل ہے۔ چند مستزاد، ترجیع بند، مثنویاں اور قصیدے بھی ہیں۔ اس نے مخمس اور رباعیاں بھی لکھی ہیں۔ اور الگ الگ ابیات بھی ملتے ہیں۔ ولی کا انداز تحریر سلجھا ہوا ہے۔ اسکے کلام میں صفائی اور روانی پائی جاتی ہے۔ دراصل اسکے بعد کے آنیوالے ہندوستانی شعرا نے بڑی حد تک اس کا تتبع کیا ہے۔ ولی کو اپنے کلام کی صفائی اور فصاحت کا ہمیشہ خیال رہتا تھا۔ چنانچہ ایک جگہ اشارۃً اس نے کہا ہے:-

اے سکندر نہ ڈھونڈ آب حیات　　　چشمۂ خضر خوش بیانی ہے

شروع میں میرا خیال تھا کہ ولی کے کلام پر لسانیاتی نقطۂ نظر سے حواشی لکھوں، اور ساتھ ہی ساتھ مشکل اشعار کی تشریح بھی کروں۔ لیکن ولی کے کلام کا مسودہ کئی سال سے طبع میں پڑا ہوا ہے۔ اب اگر اپنے ارادہ کی تکمیل کروں تو اور زیادہ تاخیر ہوگی۔ اسلئے فی الحال دیوان ولی کو شائع کرتا ہوں۔ باقی کام پھر دیکھا جائیگا۔ میرا خیال ہے اسکے کلام کی تشریح اور لسانیاتی حواشی کو علحدہ جلد میں اسی تقطیع پر بعد میں شائع کروں۔ تقطیع اور کاغذ وہی رہیگا جو دیوان ولی کا۔ تاکہ بعد میں جو کوئی چاہے ان دونوں جلدوں کو ایک ساتھ ملالے۔ ان حواشی میں ہر غزل کے ان غیر مانوس الفاظ کی تشریح کرونگا جو خالص دکنی ہیں اور جو ہندوستانی کی عام لغتوں میں نہیں ملتے۔ ساتھ ساتھ مشکل تشبیہوں اور استعاروں کی تشریح کردیگئی ہے۔ جہاں میں نے ضرورت سمجھی وہاں قلمی نسخوں کے حوالے بھی دیئے ہیں اور متن کے اختلافات بتلائے ہیں۔ میں نے ولی کے کلام میں سے صرف ان حصوں کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ پیش کیا ہے جنکے متعلق میں نے سمجھا کہ وہ ہمارے اہل ملک کی دلچسپی کا باعث ہوں گے مکمل ترجمہ اسلئے غیر مفید ہی تھا کہ ولی کے ہاں الفاظ کو بہ نسبت خیالات کے زیادہ اہمیت ہے۔ کسی یورپین زبان میں پورے کلام کا ترجمہ بیکار ہوگا۔ اسلئے کہ پڑھنے والا اس سے اکتا جائیگا اور بجائے لطف اندوز ہونے کے پریشان ہو جائیگا۔ اسلئے کہ مشرقی شعرا ایک ہی خیال کو مختلف اندازوں سے الفاظ الٹ پھیر کے بیان کرتے ہیں۔

میں نے حتی الامکان صحیح متن پیش کرنیکی کوشش کی ہے۔ صرف ان حصوں کو مقابلہ کر کے اس جگہ شائع کیا ہے جو مختلف قلمی نسخوں میں موجود تھے۔ اس کام میں میرے پیش نظر چھ مختلف قلمی نسخے تھے۔

ان چھ نسخوں کے علاوہ ایسٹ انڈیا ہاؤس لندن کے دو نسخے بھی میرے پیش نظر ہیں۔ بعض صورتوں میں مسٹر

شیکسپیر کے مشورہ سے بھی میں اسی ضمن میں مستفید ہوا۔

اس تمہید کو ختم کرنے سے قبل ہندوستانی ادب کے اُن شایقوں کی خدمت میں یہ عرض ہے کہ چونکہ انھوں نے ابتک شمالی ہند کے مصنفین کی کتابیں پڑھی ہیں۔ اسواسطے ممکن ہے کہ ولیؔ کے کلام کے دکھنی اور ہندی الفاظ انھیں غیر مانوس معلوم ہوں۔ ولیؔ کی زبان خالص ادبی نقطۂ نظر سے شمالی ہند کی زبان سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اگرچہ ہندوستانی ادب کے یورپین شایقین نے اسکی طرف ابھی توجہ کم کی ہے (مقدمہ دیوان ولیؔ مرتبہ دی تاسی)۔

ولی میر

(از)

مولوی ابوظفر عبدالواحد صاحب ام۔اے لکچرار اُردو سٹی کالج

[اس نظم کے مطلع میں ایک ایسے واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو جدید تحقیقات کے رُو سے اب معتبر نہیں رہا۔ لیکن ایک زمانے تک یہ مشہور تھا کہ میر تقیؔ کا مزار اودھ روہیلکھنڈ ریلوے کی نذر ہو گیا ہے۔ جامعہ ملیہ دہلی کے مطبوعہ "انتخاب میر" میں نورالرحمٰن صاحب نے بھی اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اکبر الہ آبادی (مرحوم) کے ایک شعر میں بھی اسی روایت کی جانب تلمیح ہے ؎

کہتے ہیں قبر میری ریل میں آجائیگی ۔۔۔ بیٹھا ہوں جو اسی راہ میں مدفن بھی ہی

میری شاعرانہ مصلحت نے اسی روایت کو مفید مطلب سمجھ کر داخل مطلع کیا ہے۔]

ریل کی پٹری کے نیچے میر گڑ کر رہ گیا ۔۔۔ اور ولی بیچارہ کھڑکی سے جھانکا کر رہ گیا

اِک دکن سے جاکے دہلی میں جگت اُستاد تھا ۔۔۔ لکھنؤ میں ایک دہلی چھوڑ کر آباد تھا

ہے وہ لایعقل جو منکر ہے دکن کے پیر کا ۔۔۔ آپ بے بہرہ ہے جو قائل نہیں ہے میر کا

یہ ولایت اور میری سب کو یاں بھتی نہیں ۔۔۔ لاکھ سودا ہو پہ مرزائی یہاں چلتی نہیں

جو قلم کا ہے دھنی اس کا جہاں زیر نگیں ہے ۔۔۔ خالی بیلی کی ولایت کل نہیں گر آج ہے

ہے زبان اُردو کی جب تک یہ رہیں گے سربلند ۔۔۔ گردش ایام انہیں پہنچا نہیں سکتی گزند

میرؔ ما جو ہے نہ ہے "ولی" اور جو ولی ہے "میر" ہے
میری نظروں میں برابر دونوں کی توقیر ہے

ہمارا قومی شاعر

(۱)

جناب مانک گرو داس سنگھ سہانی صاحب بی۔ اے۔ ام بی ایس ایس۔ ایف آر ایس اے

مترجمہ مولوی میر حسن صاحب ام اے۔ مددگار سٹی کالج

اردو زبان کے شاعر ولی کا کلام پہلی دفعہ جرمنی میں شائع ہوا۔ اس کئی سال قبل ڈاکٹر نکولاز پر نامی ایک ممتاز جرمن فلسفی کراچی میں مجھ سے ملنے کے لئے تشریف لائے تھے۔ ہم نے اسلامی فلسفہ، ہندوستان کے مسائل اور آجکل کی زندگی میں مذہب کے موقف پر گفتگو کی جسکا سلسلہ رات گئے تک جاری رہا۔ بس جرمن فلسفی نے کھڑکی میں سے چاند کی طرف نظر ڈالی اور پھر میری طرف پلٹ کر کہا:۔

"میری جیب میں ایک ایسے پرستار محبت کی چھوٹی سی کتاب ہر وقت رہتی ہے جسے ہماری قوم پوجتی ہے۔ میں جہاں جاتا ہوں یہ میرے ساتھ رہتی ہے"۔

وہ کتاب ایک دیوان تھا اور وہ پرستار محبت گوئٹے تھا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا کیا ہمارے ہندستان میں کوئی ایسا پرستار محبت نہیں پیدا ہوا، جس نے باعظمت ترانے گائے ہوں؟ لیکن کتنے افراد ایسے ہیں جن کے دلوں میں اس کی یاد محفوظ ہے۔ اہل اطالیہ کو بھی اپنے ایک پرستار محبت پر ناز ہے۔ ڈانٹے اطالیہ کا قومی شاعر ہے۔ انگلستان میں براؤننگ سوسائٹی اور شیلی انجمنیں قائم ہیں، لیکن ہمارے تعلیم یافتہ افراد میں سے کتنے ایسے ہیں جو ہمارے اردو شاعر ولی سے واقف ہیں۔

سطح مرتفع دکن کے ایک گوشہ میں جو آفتاب کی حدت کی وجہ سے ہمیشہ تپتا رہتا ہے۔ ہمارا وہ اردو شاعر پیدا ہوا۔ جس کی حیات اور نغموں نے اس کے نام کو مقدس بنا دیا ہے۔ لیکن کتنے اردو بولنے والے سندھی نہیں بلکہ ہندستانی اس سے واقف ہیں؟ یہاں کے کالجوں میں متعدد مضامین کی تعلیم ہوتی ہے لیکن نہیں ہوتی تو اردو ادب کی۔ یہاں کے ہر آدرد صوفی شاعر حافظ شیرازی اور مولانا روم کے کلام کا مطالعہ کیا جاتا ہے، لیکن ولی کا کلیات نہیں پڑھا جاتا۔ جامعوں میں متعدد مضامین کے لئے جدا جدا مستقل پروفیسر مقرر ہیں، لیکن اردو شاعری کا کوئی پروفیسر نہیں ہے (میری مراد جامعۂ بمبئی سے ہے) اس کے باوجود وہ ہمارے دلوں کا بادشاہ ہے۔

اندھیری رات میں ایک گہرے اور تاریک دریا کو عبور کرنا پڑتا ہے۔ ولی کا عشق صوفیوں کے عشق کی طرح گہرا ہوتا ہے۔ اپنے محبوب کی تلاش میں وہ خدا کو اپنا راہبر سمجھتا ہے، اور اس اعتقاد کی بنا پر کہ رنج و ملال بھی ایک آسمانی عطیہ ہے، اس کو رنج و مصیبت میں بھی ایک لطف آتا ہے۔ اس کی سرگردانیوں میں ایک ایسی کیفیت ہے کہ سچ پوچھئے تو مجھے یولیسس کی سرگردانیوں کی باعظمت داستان میں بھی نظر نہیں آتی۔ اس اردو شاعر نے اپنے افسانوں میں ایک ایسی محبت کے خواب بیان کئے ہیں جنکی تعبیر دنیا سے قطعی کنارہ کشی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے ولی کے حزنیوں میں سکون آفرینی پیدا ہوگئی ہے۔

اس کے کلام کی سب سے نمایاں خصوصیت توحید کے ایک اعلیٰ تصور کا الہام ہے۔ ولی ایک حقیقی صوفی ہے۔ وہ زندگی کے حزن و ملال، حسن و دلکشی، اور کشمکش اور ناکامیوں کو سمجھتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ ان تمام میں ایک روحانی قوت کارفرما ہے۔ ولی کی شاعری میں ایک صحیح روحانی تصور کی تجلی ہے۔ یہ ویدانت اور اعلیٰ اسلام کا تصور ہے۔ یہ ہندوستان کا تصور ہے، ایشیائی دنیا کا تصور ہے۔ یہ ہمہ اوست کا مسلک ہے۔ مشرق کو وحدانیت کے اس باعظمت علمبردار کے کلام کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ وہ سمجھتا ہے کہ مذہب دینی پیشواؤں کے حرص و آز اور فرقہ بندی سے بلند و بالا ہے۔ وہ محبت کے اعلیٰ تر مذہب کا حسن دیکھتا ہے جو تمام مذاہب کی تہ تک پہونچ جاتا ہے۔ میرے نزدیک ہندوستان کا یہ مسلم شاعر ایک رشی کی طرح محترم ہے۔ اس کی آنکھیں غیب کے جلوے دیکھتی ہیں، اس لئے وہ ہمارا "بادشاہ" ہے۔ ہمارا خسرو بے تاج۔ کیا غیب داں ہمارے حقیقی بادشاہ نہیں ہیں؟ سلطنتیں دنیا کی دوسری چیزوں کی طرح فنا ہو جائینگی لیکن حضرت ولی کا اقتدار قائم و دائم رہیگا۔ اس کی تعمیر مفلسوں کے دلوں میں تصور کی تخلیقی قوت سے ہوی ہے۔ اس اردو شاعر کے ان الفاظ میں ہندو مسلم اتحاد کا فلسفہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ فرقہ بندی کو ترک کردو اور عجز و انکسار سیکھو۔ میرے خیال میں اتحاد اور ترقی کے لئے ہندوستان کو آج ایسی ہی تعلیم کی ضرورت ہے۔

یہی وہ تعلیم ہے جو ولی کے کلام میں نغمہ کے روپ میں جلوہ گر ہوی ہے۔ سندھ، پنجاب، اور دوسرے صوبوں کے متعدد علاقوں میں جہاں مروجہ تعلیم نے چالاکی اور ہوسناکی کی وبا نہیں پہونچائی ہے، ولی کی نظموں نے ہندو مسلم اختلافات دور کردیئے ہیں۔ ہزارہا ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے یہ "شاعر صحرا" فی الواقع ایک مسیحا ہے۔ اور وہ اس کے گیت گانے کے لئے میلوں اور تیوہاروں میں یکجا ہوتے ہیں۔ ولی کے کلام میں میرے اکثر ہم وطنوں کو ایک ایسی دولت ملتی ہے جس کے مقابلہ میں دنیوی دولت بے حقیقت ہے۔ ایک حسن، دریا کنارے رنگ برنگ کے پھولوں کے مماثل۔ ایک مذہب جو بیسیوں سال سے مسلمانوں اور ہندوؤں کو ہمدموں کی طرح مل جل کر رہنے کی تعلیم دیتا رہا ہے۔ حضرت ولی کی نظموں میں نسلی، قومی اور ملکی اتحاد

ے ۔ ۔ ا جلوے ہیں۔

میرے لئے یہ امر باعث تعجب نہیں ہے کہ ہم دن بدن پستی، بربادی اور ابتری کی طرف جا رہے ہیں۔ ناقص تعلیم اور سیاسیات کے غلط مطالعہ نے نوجوانوں کے دلوں پر تقلید کے نقوش مرتسم کر دیے ہیں، اور تقلید اپنے نفس پر ظلم کرنے کے مماثل ہے۔ تم نے خود اپنی روایات اور تمدن کے تصور کو بے رحمی کے ساتھ روند ڈالا ہے، اور اب بھٹک رہے ہو۔ تم اپنی روح کی تربیت سے منہ موڑ کر ایک سیاست زدہ تمدن کی طرف متوجہ ہو گئے ہو۔ اس ناتمام تقلید میں تمہاری "تعلیم" ممکن ہے تمہیں "چالاک" بنا دے لیکن تمہیں خود اظہاری کی دولت اور ذہن سے سرفراز نہیں کر سکتی۔

اے نوجوانو! میں تم سے ولی کے کلام کے مطالعہ کی درخواست کرتا ہوں۔ تمام سندھی اور ایرانی اور اردو شاعروں نے جس حسن، اتحاد اور محبت میں اپنے گیت اور افسانے بنائے ہیں ان میں ان کے محاسن کے ایک جدید معیار سے مطالعہ کی اپیل کرتا ہوں۔ میرا ایقان ہے کہ ان کا کلام تمام قوموں کے لئے اپنے اندر ایک بشارت رکھتا ہے، وہ مذہب اور حسن کو ایک دوسرے میں سمونے میں مدد دینگے جس سے ہندوستان کے لئے ایک جدید تمدنی تہذیب کی ساخت وجود میں آئیگی۔ اور وہ قوم کے نونہالوں کو سمجھائیں گے کہ تعلیم چھپائی ہوئی پتیوں کو چھاٹنے کا نام نہیں، بلکہ علم کے درخت کی درخت کا نام ہے، جس کا ثمر نجات ہے۔

ولیؔ

از

صاحبزادہ میر محمد علی خاں صاحب سکینڈ ائیر (عثمانیہ)

اے دکن کی سرزمیں، اے قبلۂ ہندوستاں
تیرے ذرّے مہر ہیں، تیری زمیں ہے آسماں

عظمتِ ماضی کا دل افروز نظارہ ہے تو
مشرقی تہذیب کا پاکیزہ گہوارہ ہے تو

تیرے ہر پہلو میں ہیں احساس کی بیداریاں
تیرے ہر منظر میں ہیں جذبات کی سرشاریاں

ہے خزاں نا آشنا تیرے گلستاں کی بہار
تجھ پہ ہے سایہ فگن، آمرزشِ پروردگار

تیرا دریائے کرم کرتا ہے گوہر بیزیاں
تیرے خطّے سے ہوا کرتی ہیں مردم خیزیاں

جو، جواہر تو نے چمکائے ہیں اپنی خاک سے
ان کا سینہ بھر دیا ہے جلوۂ ادراک سے

وہ ولیؔ، تیرا ہی اک فرزند ہے خاکِ وطن
جس کے ہونٹوں نے کیا اُردو میں آغازِ سخن

روحِ مئے جس نے بھری اُردو کے خالی جام میں
اک حدیثِ کیف ہے جس کے ہر اک پیغام میں

دامنِ اُردو کو جس نے کر دیا گلشن بدوش
جس کے اعجازِ بیاں سے جاگ اٹھے اربابِ ہوش

اک حیاتِ نو عطا کی جس نے موجودات کو
اک نئی روحِ طرب دی جس نے محسوسات کو

اس فضائے آب و گِل کو نور جس نے کر دیا
ذرّہ ذرّہ کو جوابِ طور جس نے کر دیا

سوز کی رنگینیاں برسائیں جس نے ساز سے
جگمگا اٹھے ستارے جس کی ہر پرواز سے

جس کے نقشِ پا کا ہر ذرّہ منور ہو گیا
جس کے ہر آنسو کا قطرہ رشکِ گوہر ہو گیا

نقطۂ انجام جس کا مرکزِ آغاز تھا
جس پہ تجھ کو ناز ہے اور تجھ پہ جس کو ناز تھا

ولی کی اہمیت

از
مولوی شیخ چاند صاحب مرحوم ایم اے۔ ایل ایل بی ریسرچ اسکالر

اس مضمون کا صرف ابتدائی حصہ [illegible] ولی کے لیے لکھا تھا [illegible] ایسی علالت [illegible] کی وجہ سے اس کو نامکمل چھوڑ گئے [illegible] اردو کے [illegible] کی ذات [illegible] دوسرے تحقیقاتی کاموں کے سلسلے میں انھوں نے [illegible] بصیرت پیدا کرلی تھی [illegible] کا نقصان پہنچا [illegible] مضمون [illegible] مرحوم کے اپنے [illegible] آخری یادگار [illegible] اس مجموعے میں [illegible] کیا جاتا ہے۔

کس دور کا شاعر ہے؟ ولی اردو شاعری کے متوسط دور کا سب سے بڑا اور واجب التعظیم علمبردار ہے۔ دور متوسط سے ہماری مراد دور ثانی سے ہے جو انتزاعِ دولِ دکن (فتح گولکنڈہ ۱۰۹۸ھ) سے شروع ہوتا ہے اور محمد شاہ کی تخت نشینی (۱۱۳۱ھ) پر ختم ہوتا ہے۔ عہد محمد شاہی کے آغاز سے اردو شاعری میں ایک نئے دور کی بنا پڑتی ہے جو ایہام گوئی کا دور ہے۔

بہرحال ۱۰۹۸ھ سے لے کر ۱۱۳۱ھ تک کا جو زمانہ ہے وہ تاریخ ادبیات اردو میں ایک خاص اور نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ اس وقت تک نہ صرف دکن کی تہذیب و تمدن اور شعر و سخن میں انقلاب پیدا ہو گیا تھا بلکہ دکن کے تمام جنوبی علاقے اور گجرات میں مغلوں کی فتوحات نے شمالی ہند کی تہذیب و معاشرت کو پھیلا دیا چنانچہ ان علاقوں کے بڑے بڑے شہروں کی نسبت پر [illegible] نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ یہ شمالی ہند کی بستیاں ہیں اور دہلی کے تمدن و معاشرت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کی قدیم ہیئت تبدیل ہو گئی۔ برہان پور، اورنگ آباد، احمد آباد، اور سورت وغیرہ میں اس کے نمایاں آثار اب تک پائے جاتے ہیں۔

معاشرت اور تمدن کے گوناگوں شعبوں پر نظر ڈالنا ہمارے موضوع بحث سے خارج ہے۔ ہمارا مبحث شاعری ہے۔
اس دور میں گجرات اور دکن کے بڑے شہروں کی زبان اور شمالی ہند کی زبان میں نیا باریک فرق تھا۔ اس کو اس مختصر مضمون میں واضح طور پر دکھانا دشوار ہے۔ لیکن اس زمانہ کی شمال و جنوب کی تصانیف کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قواعد زبان، محاورات اور روزمرہ بلکہ لب لہجہ کا جہاں تک تعلق ہے دونوں مقاموں کی زبانوں میں کوئی فرق نہیں۔

برہان پور کا علاقہ ایک مدت قبل قلمروئے مغلیہ میں داخل ہو چکا تھا۔ اسلئے وہاں شمالی ہند کی آبادی حکمرانی و جہانبانی کے سلسلے میں منتقل ہو چکی تھی اور اسی لئے وہاں کی زبان پر دہلی کے بیّن اثرات پڑ چکے تھے۔ گجرات بھی بہت قبل مفتوح ہو چکا تھا اور وہاں کے بڑے شہروں خصوصاً احمد آباد اور سورت میں یہ اثرات نمایاں تھے۔ دکن بعد کو فتح ہوا لیکن چونکہ اورنگ زیب نے بعہد شہزادگی اورنگ آباد کو اپنا صدر مقام ۱۰۶۰ھ میں قرار دیا تھا اور بیجاپور و گولکنڈہ کی تسخیر کے عزم سے تقریباً تمام مدت حکومت اورنگ آباد کو پورے ہندوستان کا پایۂ تخت قرار دے رکھا تھا اسلئے اسکے ساتھ ہندوستان کی کثیر آبادی اورنگ آباد اور اسکے قرب و نواح میں بس گئی تھی۔ معتبر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ لشکر سمیت دس لاکھ کی آبادی اورنگ زیب کے ساتھ آئی تھی۔ اس کثیر آبادی نے اورنگ آباد کی قدیم دکھنی زبان کو مٹا دیا۔ اور اس پر تسلط پا کر شمالی ہند کی زبان کو عام کر دیا۔ نہ صرف زبان بدل گئی بلکہ تہذیب و معاشرت کے تمام شعبے متاثر ہو گئے۔ اس وقت یہ کہنا دشوار تھا کہ اورنگ آباد دکھن کا شہر ہے بلکہ شمالی ہند کی بستی معلوم ہوتا تھا۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ شمالی ہند کی منتقل شدہ زبان میں شاعری کا آغاز دکن میں کیونکر ہوا؟ دکن میں مدتوں قبل قدیم اردو میں شعر و شاعری کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس زبان میں کیفیت و کمیت کے لحاظ سے اتنا ادب اب بھی دستیاب ہوا ہے کہ اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور بعض اعتبارات سے اس کا درجہ تمام ادبیات اردو میں نہایت بلند ہے۔ دکھنی سلطنتوں کے تاجداروں اور اہل دل صوفیوں اور بزرگوں نے اس میں طبع آزمائی کر کے اسکو مقبول عام بنا دیا تھا۔ جب دکھنی سلطنتیں مفتوح ہوئیں تو اس کے چرچے عام تھے۔ صاحب کمال شاعروں نے اس میں مغلوں کے ابتدائی عہد میں طبع آزمائی کی۔ چنانچہ اس دور کے بعض شاعروں کے کلام اب بھی دستیاب ہوتے ہیں مثلاً قادر وغیرہم۔ لیکن ان کی شاعری کو زیادہ فروغ اور شہرت نہ ہوئی۔ البتہ ولی کے کلام نے غیر معمولی شہرت و مقبولیت حاصل کی اور وہ کرامت دکھائی کہ اس کو مقبول خاص و عام کر کے انتہائی وسعت کے ساتھ رواج دیا۔

اُردو ادبیات میں اہمیت ولی کو اردو ادبیات کی تاریخ میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ جب جنوب میں دکھنی شاعری کی شمع ٹمٹمانے لگی تو اور دکھنی زبان کی جگہ ایک دوسری زبان نے لی تو اس نئی زبان میں بعض شاعروں نے قدیم

دکھنی شاعروں کے چربے سے متاثر ہو کر طبع آزمائی شروع کی۔ ان میں ولی کو ممتاز درجہ حاصل ہے۔ اسکی شاعری کی مقبولیت دکن و گجرات تک محدود نہ تھی بلکہ اس نے شمالی ہند اور خصوصاً دہلی میں ہلچل ڈالدی۔ چنانچہ وہ مستند اساتذہ جنھیں اپنی زبان میں طبع آزمائی کرنے کا کبھی خیال بھی نہ آیا تھا اور جو فارسی گوئی کو کمال جانتے تھے۔ اور اس زبان میں استادانہ مہارت اور عام شہرت رکھتے تھے وہ بھی ولی کے کلام سے متاثر ہوئے اور انھوں نے اس زبان میں طبع آزمائی شروع کی۔ حضرت بیدل اپنے وقت کے امام فن اور مجتہد سخن تھے۔ دہلی کے تمام شعراء ان کی شاگردی کا دم بھرتے تھے۔ ان کے دل میں بھی ولی کے کلام نے تڑپ پیدا کر دی۔ چنانچہ بقول قائم نہ صرف وہ بلکہ اس وقت کے اساتذہ اس طرف مائل ہو گئے۔ قائم کی اصل عبارت یہ ہے:-

"ولی کے دیوان کی یہ بیت مطلع آفتاب سے زیادہ روشن ہو گئی۔ وہ ریختہ کو اس قسم کی فصاحت و بلاغت کے ساتھ کہتا تھا کہ اس وقت کے اکثر اساتذہ از راہ ہوش ریختہ موزوں کرنے لگے تھے۔ چنانچہ قدوۃ السالکین و زبدۃ العارفین مرزا عبدالقادر بیدل رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ایک غزل اس زبان میں کہی ہے جس کا مطلع اور مقطع یہ ہے:-

مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے ہم میں — اس جنس بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم میں

جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا — پردے سے یار بولا بیدل کہاں ہے ہم میں"

ولی کا کلام زبان و بیان اور عروض و قواعد کے اعتبار سے اس قدر مکمل ہے کہ اس پر اب تک کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی۔ اور اس کی زبان شمالی ہند کی زبان سے اس قدر ملتی جلتی تھی کہ قائم نے بیدل کے متعلق لکھا ہے کہ "اس زبان" میں ایک غزل کہی ہے اس سے ظاہر ہے کہ زبان کا فرق نہ تھا اگر یہ فرق ہوتا تو شمالی ہند کے شعراء کبھی ولی کے کلام کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہ دیکھتے۔ اس کی تقلید میں شعر کہنا تو بہت دور تھا۔ ہم پہلے حصے میں جو بیان کر آئے ہیں کہ اورنگ آباد اور شمالی ہند اور خصوصاً دہلی کی زبان میں کوئی نمایاں فرق نہ تھا اس کی تائید اوپر کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔

• شمالی ہند اور خصوصاً دہلی میں اردو شاعری کے آغاز کی تاریخ ...... صفحہ ۲۳ ۔ ۲۴ ۔ اس کا ایک شعر ہے

حاتم یہ فن شعر میں کچھ تو بھی کم نہیں — ولی ولی ہی ہے جہاں میں سخن کے بیچ

آبرو کا ایک شعر ہے:-

آبرو شعر ہے ترا اعجاز — گو ولی کا سخن کرامت ہے

ان تمام بیانات پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ولی نے شمالی ہند میں اردو شاعری کو روشناس کرایا اور وہاں کے شاعروں میں ہلچل ڈالدی۔ اپنے کلام کے ذریعے ان کو ریختہ گوئی کی طرف مائل کیا اور اس طرح بنا ڈالی۔ اس لحاظ سے اس کو ریختہ کا باوا آدم اور بانی ریختہ کہا جاتا ہے جو حقیقت و صداقت پر مبنی ہے۔

عہد ولی کی سیاسی اور تمدنی حالت

(از)

مولوی عبد المجید صاحب صدیقی ایم۔ اے (عثمانیہ) ال ال بی

اگرچہ ابتک دکن کے شاعر ولی کی پیدائش اور موت کی قطعی تاریخیں نہیں معلوم ہوسکیں لیکن اس کی ادبی زندگی کے عام بہاؤ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دکن کے ایک بہت ہی مضطرب زمانہ کی پیداوار ہے۔ اس قدر یقینی ہے کہ وہ سترہویں اور اٹھارہویں صدی کے آخری اور ابتدائی عشرات میں شعر وسخن کی خدمت کرتا تھا۔ غور سے دیکھا جائے تو یہ دکن کا عہد اضطراب ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ مغلوں کے سیلاب سے دکھنی سلطنتوں کی تمام دیواریں منہدم اور تمدن کی تمام شمعیں خاموش ہورہی تھیں۔ وہ علمی صحبتیں جن کے پرکیف نغمے تمام ہندوستان کو گرویدہ کئے ہوئے تھے سونی تھیں۔ شاہزادہ اکبر کے الفاظ میں جس نے ہندوستان کو خیرباد کہتے ہوئے اپنے باپ کو ایک باغیانہ خط میں لکھا تھا "افسوس دکن کی وہ شاداب وسیع وادیاں جو ایک زمانہ میں فردوس بریں معلوم ہوتی تھیں اب خشک اور بے چراغ پڑی ہوئی ہیں"[1] غالباً ان سلطنتوں کے خاتمہ سے مغل فاتح کا مقصد بھی پورا نہیں ہوا۔ یہ سلطنتیں اپنی تمام شگفتہ روایات کے ساتھ فنا تو ہوگئیں لیکن مغلوں کے اصل دشمن اپنی جگہ برقرار رہے اور مغل حکومت کا چراغ ٹمٹماتا رہا۔ گولکنڈہ اور بیجاپور کا خاتمہ تو کوئی خلاف قیاس چیز نہ تھی۔ اس کے آثار اس وقت سے پیدا ہوچلے تھے جبکہ دکن کے سرپرست ملک عنبر۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی اور سلطان محمد قطب شاہ دنیا سے رخصت ہوگئے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ یہ تین شخصیتیں جو دکن کی تینوں سلطنتوں کی رہنمائی کرتی تھیں ایک ساتھ راہی عدم ہوگئیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ تین شخصیتیں قدرت کی طرف سے دکن کی حفاظت کے لیے ودیعت کیگئی تھیں۔ ان کے مرنے سے دکن کا کوئی سرپرست باقی نہ تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغلوں نے احمد نگر کا خاتمہ کرکے بیجاپور اور گولکنڈہ کو اپنے زیرنگین کرلیا۔ اگرچہ بیجاپور اور گولکنڈہ کی سلطنتیں سترہویں صدی کے آخری عشرہ تک باقی تھیں اور سلطنت بہمنی کی یاد تازہ کرتی تھیں لیکن مغلوں کی زنجیروں میں مقید جکڑی ہوئی تھیں کہ

---

[1] سفرنامہ منوچی جلد چہارم صفحہ ۱۷۵

ان کا دم گھٹا جاتا تھا ان کی سیاست خشک اور تدبر رائگاں ہو رہا تھا۔ ایک طرف ان سلطنتوں کی دولت نقد و جواہر کی شکل میں مغلوں کے ہاتھ میں کھچی جا رہی تھی۔ دوسری طرف ان کی ترقی کے تمام راستے مسدود تھے۔ چنانچہ گولکنڈہ کا ذکر کرتے ہوئے فرانسیسی سیاح برنیر لکھتا ہے کہ "گولکنڈہ میں اورنگ زیب کا حاجب احکام جاری کرتا ہے۔ پروانے دیتا ہے۔ عوام کے ساتھ بدسلوکی کرتا ہے اور ان کو دھمکیاں دیتا ہے۔ مختصر یہ کہ اس کے افعال اور اقوال خود مختارانہ ہوتے ہیں جیسے ایک مطلق حکمراں کے"[1]۔ ان حالات میں کسی علمی اور تمدنی ترقی کی کیا توقع کی جا سکتی ہے لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ ان سلطنتوں نے اپنے آخری دم تک علمی اور تمدنی خدمت کی۔ سچ تو یہ ہے کہ مغل سیادت کی مجبوریوں کے باوجود ان سلطنتوں کا علمی اور تمدنی خدمت کرنا دکن کا ایک معجزہ ہے۔ غالباً ان سلطنتوں میں پچھلی روایتوں کا اثر تھا۔ ایک طرف بیجاپور کے جگت گرو کی قوت عمل کام کر رہی تھی تو دوسری طرف گولکنڈہ کے والی محمد قلی قطب شاہ اور سلطان محمد کے پاکیزہ ذوق اور خدمات اپنا عکس ڈال رہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس فرسودہ ماحول میں بھی تمدنی ترقیاں ہوئیں اور اچھے شاعر پیدا ہوئے۔ اگر تھوڑی دیر کے لیے ان سلطنتوں کی قوت مدافعت، علمی پیداوار اور عام تمدنی ترقیوں کا مطالعہ کیا جائے تو اس کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان سلطنتوں نے اپنی آخری سانس تک خاطر خواہ عمرانی خدمات انجام دیں۔ اگرچہ سیاسی اعتبار سے یہ بے دست و پا تھیں لیکن تمدنی اعتبار سے یہ اپنے پورے عروج پر تھیں۔

اگر بیجاپور پر سرسری نظر ڈالی جائے تو مغلوں کے سیلاب کے مقابلہ میں اس جنوبی سلطنت کی کشمکش حیات اپنی جگہ بڑی دلچسپی رکھتی ہے۔ ان حالات میں جبکہ ہر طرف زوال چھا رہا تھا اور سلطنت کے ہر گوشہ میں کمزوری نمودار تھی اس کا پرجوش مقابلہ اس سلطنت کا بڑا سرمایہ حیات ہے۔ سب جانتے ہیں کہ ۱۶۶۶ء میں اورنگ زیب کے مشہور جنرل جے سنگھ کو بیجاپور کی دیواروں کے سامنے ایسی شکست ہوئی تھی کہ وہ اسی شرم کے مارے راہیِ عدم ہو گیا۔ اس کے چند سال کے بعد بہادر خاں کوکلتاش اور دلیر خاں نے کوشش کی لیکن وہ بھی بری طرح ہزیمت اٹھا گئے اور پھر حملہ کرنے کی جرأت نہیں کی اور جب بیجاپور کا آخری محاصرہ ہوا تو بیجاپور کے مشہور جنرل شرزہ خاں اور عبدالرؤف خاں نے مغل فوجوں کا اس قدر دل کھول کر مقابلہ کیا کہ مغل عاجز آ گئے تھے اور مغلوں کی عزت اور ناموس کا سوال پیدا ہو گیا تھا۔ کہ شہنشاہ نے غازی الدین خاں فیروز جنگ کو امداد کے لیے بھیجا اور وہ کمک پہنچانے میں کامیاب ہو گئے تو شہنشاہ نے کہا تھا کہ حق سبحانہ تعالیٰ از تردد خان فیروز جنگ شرم و ناموس اولاد تیموریہ نگاہ داشت[2]۔ لیکن جب تک شہنشاہ بذات خود

---

[1] سفرنامہ برنیر ص ۱۹۵

[2] خافی خاں جلد دوم ص ۳۱۴ و ص ۳۱۰

محاصرہ کے لیے نہیں آئے بیجاپور کی تسخیر ناممکن معلوم ہوتی تھی۔ بالآخر شہنشاہ اپنی تمام طاقت کے ساتھ بیجاپور کی دیواروں کے پاس آگئے یعنے بیجاپور کے ایک مورخ کے الفاظ میں "سلطنت تمامی ہندوستان بہ آں سروسامان بر سر کاوش و کاہش یک شہر غریب اپرساں کہ عبارت از بیجاپور است شد[1]" اس کے باوجود بھی محاصرہ نے طول کھینچا اور پیہم شورشوں کے بعد اس وقت فتح ہوا جب کہ اہل بیجاپور نے اپنی حمیت و خودداری کا تمام سرمایہ ختم کرلیا۔ اگرچہ بیجاپور فتح ہوگیا لیکن اس کی حمیت اور خودداری کے افسانے اپنی تمام دلسوزیوں کے ساتھ اب بھی تازہ ہیں۔ اہل بیجاپور کو ابتک وہ المناک نظارہ یاد ہے جبکہ سکندر عادل شاہ کی بہن شہر بانو جو اپنی رعایا میں پادشاہ بی بی کے ہر دلعزیز لقب سے یاد کیجاتی تھی عادل شاہی خاندان کی عزت و ناموس کے لیئے اپنے وطن مالوف کو خیرباد کہہ رہی تھی۔ یہ دکن کی دوسری چاند بی بی تھی اور بیجاپور کا مورخ زبیری کہتا ہے کہ گو اس کی عمر ۱۶ سال تھی لیکن "معاملات ملک رانی خوب فہمید۔ مہمات را بر وجہ شایستگی سرانجام میداد[2]" مغل اس کو جانتے تھے اور مصالحت کی یہ شرط قرار دی کہ اس کو مغل سلطنت کے حوالہ کیا جائے۔ بیجاپور کے ارباب سیاست مجبور ہوگئے۔ اور ملک میں بڑا سماں برپا ہوگیا جب شاہزادی نے دیکھا کہ ملک کا بچاؤ اس کی قربانی پر موقوف ہے تو وہ فوراً وطن کو خیرباد کہنے کے لیے تیار ہوگئی جس وقت یہ شاہزادی بیجاپور سے جارہی تھی اہل بیجاپور اس کے آخری دیدار کے لیے راستوں پر بیجا کھچ جمع ہوگئے اور اکثر دردمند دل ڈھاڑیں مار کر رو رہے تھے۔

اس زمانہ کی علمی پیداوار بھی کچھ کم نہیں ہے۔ ان تمام اہل علم کی جن میں ادیب، شاعر شامل ہیں ایک بڑی فہرست تیار ہوسکتی ہے۔ مثال کے لیے علی عادل شاہ ثانی کے عہد کا ملک الشعرا ملا نصرتی اپنے تمام ادبی سرمایہ کیساتھ تنہا اس روبہ زوال زمانہ کی نمایندگی کرسکتا ہے۔ اس کے کلام کی ادبی لطافت اور معنی آفرینی کے علاوہ اس میں ایک اور جاذبیت ہے اس کی شاعری میں حسن و عشق یا گل و بلبل کی خرافات تو بہت کم ہیں لیکن وہ ان کی بجائے جنگ و جدل کی ولولہ انگیز تصویریں کھینچتا ہے۔ اہل بیجاپور کو مغلوں کی حرص و آز اور دست درازیوں سے شرماکر جنگ آزادی کا سبق دیتا ہے۔ علی نامہ اور خاور نامہ اصل میں دکن کے رزم نامے ہیں جو بیجاپوریوں کی صحیح زندگی اور قومیت کا پتہ دیتے ہیں[3] اور زوال کے زمانہ میں ان کا لکھا جانا حیرت انگیز ہے۔

بیجاپور کی عام تمدنی حالت کا اندازہ اس کی عمارتوں سے ہوسکتا ہے۔ ان عمارتوں کی تو بہت بڑی تعداد ہے

---

[1] خافی جلد دوم صفحہ ۳۱۱ [2] بساتین السلاطین صفحہ ۵۳۹ [3] بساتین السلاطین صفحہ ۴۳۸

جو اس سلطنت کے دو سو سالہ دور میں تیار ہوئی ہیں لیکن آخری زمانہ کی عمارتوں کو دیکھا جائے جبکہ یہ سلطنت روبہ زوال تھی تو وہ اپنی عظمت میں بہت بڑھی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ محمد عادل شاہ کے عہد کی بنی ہوئی عمارتیں آثار محل اور آئینہ محل مع اپنی شان و شوکت اور گلکاریوں کے غایت درجہ جاذب نظر ہیں۔ اور گول گنبد تو آج دنیا کی عجائبات میں شمار کیا جاتا ہے۔ اور تعجب ہوتا ہے کہ یہ چیزیں اس زمانہ میں کس طرح تیار ہوئیں جبکہ اس ملک کے توائے ذہنی اور جسمانی مضمحل ہو چکے تھے اور سلطنت کا سفینہ حیات ڈوب رہا تھا۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی کے عہد کے متعلق ایک شاعر کا یہ راگ گانا تو سمجھ میں آتا ہے کہ

گر اکسیر سرور و سوز سازند　　　ز خاک پاک بیجاپور سازند

لیکن اس آخری زمانہ کے متعلق شاہزادہ اکبر کا یہ کہنا کہ "ہندوستان کا ایک ہیرا تھا"[۱] بہت حیرت انگیز ہے۔

جہاں تک گولکنڈہ کا تعلق ہے عبداللہ قطب شاہ اور ابوالحسن قطب شاہ کا عہد سیاسی اعتبار سے بہت بہت شکن معلوم ہوتا ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو اس میں مغلوں کی استشہار بازی کو زیادہ دخل تھا۔ واقعات بتاتے ہیں کہ خود گولکنڈہ کے ارباب سیاست نے اپنے سیاسی فرائض میں کوئی کوتاہی نہیں کی اور ان کی کارکردگی میں کوئی نقص نہ تھا اور جو کچھ کام خراب ہوا اس کے باعث خود مغل تھے جو جا و بیجا مداخلت کرتے تھے۔ اگر عبداللہ قطب شاہ میں حکومت کی اہلیت نہیں تھی تو اس کی ماں حیات بخشی بیگم اس کی تلافی کر رہی تھی۔ سلطان محمد کے انتقال کے بعد اسی خاتون نے ۴۵ سال تک گولکنڈہ کی سیاسی خدمت کی اور گرتی ہوئی سلطنت کو بچایا۔ جب ۱۶۵۶ء میں اورنگ زیب کی فوجوں نے گولکنڈہ کا محاصرہ کر لیا اور تمام ارباب سیاست بے دست و پا ہو گئے تو گولکنڈہ کی یہ ہیروئن اورنگ زیب کے کیمپ میں آگئی اور محاصرین سے مردانہ وار گفتگو کر کے بیچ بچاؤ کیا۔ گولکنڈہ کی قوت مدافعت بیجاپور سے کہیں زیادہ تھی جب ۱۶۸۷ء میں گولکنڈہ کا آخری محاصرہ ہوا تو قطب شاہی سلطنت نے نہ صرف خاطر خواہ مدافعت کی بلکہ اپنی روایتی خودداری اور اولوالعزمی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ مغل افواج کے مقابلہ میں اہل قلعہ نے اس قدر دل کھول کر مدافعت کی کہ شہنشاہی طاقت کے باوجود قلعہ کی تسخیر کیلئے آٹھ مہینوں سے زیادہ لگ گئے اور تسخیر بھی اس طرح ہوئی تھی کہ چند بیوفاؤں نے قلعہ کے دروازے کھول دیے تھے۔ لیکن اس حوصلہ فرسا ماحول میں بھی گولکنڈہ میں اکثر ہستیاں ایسی بھی تھیں جنہوں نے سچی وفاداری کا ثبوت دیا اور جان سے بھی دریغ نہیں کیا۔ گولکنڈہ کے محاصرہ کیساتھ دکن کے ہیرو عبدالرزاق لاری کا نام ہمیشہ یادگار رہیگا جس نے اپنے بادشاہ کیلئے ہر قسم کی قربانی کی رات کی تاریکی میں جب دشمن قلعہ میں گھس آئے تو عبدالرزاق دیوانہ وار دشمن کی تلوار سے گر گیا۔ جب تک اس کے ہوش و حواس برجا تھے "تا جان دارم نثار راہ ابوالحسن خواہم نمود" کی دل ہلا دینے والی آواز بلند

---

[۱] سفرنامہ منوچی جلد چہارم صفحہ ۱۵

ب سنائی دیتی تھی اور سب سے زیادہ حیرت انگیز چیز یہ ہے کہ اس اثناء میں جبکہ قلعہ کے اندر سخت بدحواسی طاری ہو گئی بوالحسن قطب شاہ کا اطمینان قلب ایک حیرت انگیز واقعہ ہے۔ جب شہنشاہی افسر روح اللہ خاں اور اعتبار خاں اس کو گرفتار کرنے کیلئے شاہ نشین کے پاس آ گئے تو انھوں نے حیرت سے دیکھا کہ ابوالحسن اپنی شاہی نشست پر اطمینان سے بیٹھا ہوا ہے اور اس سے ذرہ برابر پریشانی ظاہر نہیں ہوتی تھی۔ پوری دلجمعی کے ساتھ گفتگو کی۔ اپنے تمام معمولات پورے کئے اور اتفاق سے اسی اثناء میں جب کھانے کا وقت آگیا تو حسب عادت کھانا میں شرکت کی گئی اور دسترخوان پر دوست و دشمن سب بٹھائے گئے۔ گفتگو کے دوران میں ان مغل افسروں نے پوچھا کیا بات ہے کہ آپ اس قدر خاطر جمع معلوم ہوتے ہیں۔ ابوالحسن نے کہا کہ پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ خدا نے مجھے یہ عزت دی تھی اب وہ اس کو واپس لینا چاہتا ہے۔ قدرت کے اس فیصلہ کے مقابلہ میں ہر شخص کو سر تسلیم خم کرنا چاہیے۔ اگرچہ ان مغل افسروں نے ہندوستان میں ایسے بیشمار بدقسمت تاجداروں کو گرفتار کیا تھا لیکن یہ بلند کردار سوائے گولکنڈہ کی دیواروں کے کسی جگہ نہیں پائے گئے۔ جس طرح سلطنت گولکنڈہ کی تاسیس بلند پایہ اخلاق کی روشنی میں ہوئی تھی اسی طرح اس کا خاتمہ بھی خودداری اور اولوالعزمی کا سچا مظاہرہ تھا۔

گولکنڈہ کی علمی پیداوار میں اپنی جگہ بڑی تفصیل کی طالب ہیں۔ محمد قلی قطب شاہ اور سلطان محمد قطب شاہ کی علمیت اور علمی سرپرستی تو ایسے واقعات ہیں کہ ان پر گولکنڈہ کو ناز کرنا چاہیے۔ ان عہدہائے حکومت میں تاریخیں لکھی گئیں۔ شاعروں نے دواوین مرتب کیے۔ مدرسے قائم ہوئے اور حکومت سے ان کی ہمت افزائی ہوئی لیکن اس سلطنت کا آخری دور بھی علم و فن کا حقیقی مرکز تھا۔ عبداللہ قطب شاہ خود عالم اور شاعر تھا اپنے بزرگوں کی طرح اس نے فارسی اور دکھنی دونوں زبانوں میں دیوان چھوڑے ہیں۔ اس کے عہد کا مورخ نظام الدین احمد لکھتا ہے کہ عبداللہ کے عہد میں فارسی اور اردو شاعری کی خوب گرم بازاری تھی کبھی رات رات بھر شعر و سخن کی محفلیں گرم رہتی تھیں۔ اب بھی گولکنڈہ کی در و دیوار میں غواصی قطبی جنیدی اور ابن نشاطی کی نغمہ سرائیاں سنائی دیتی ہیں۔ غواصی عبداللہ کے دربار کا ملک الشعرا تھا۔ طوطی نامہ اور سیف الملوک نظم کے کئی مجموعے اس وقت موجود ہیں۔ اگرچہ ابوالحسن قطب شاہ کو صرف پندرہ سال حکمرانی کے ملے تھے لیکن اس قلیل مدت میں بھی علم و فن کی بہت کچھ سرپرستی کی گئی۔ یہ خود بھی شاعر تھا۔ فائز، لطیف، نوری اور غلام علی اس عہد کے شاعر ہیں جنہوں نے اردو ادب میں بڑا ذخیرہ چھوڑا ہے[1]

قطب شاہوں کے عام تمدن کا اندازہ ان کے بنائے ہوئے شہر و عمارات سے ہو سکتا ہے۔ حیدرآباد زمانہ وسطیٰ کا عظیم الشان شہر تھا۔ جس وقت اس شہر کی تعمیر ہو رہی تھی اور اس میں تمام عمرانی ضروریات بہم پہنچائی گئی تھیں تو مورخ فرشتہ

---

[1] ماخوذ از اردو شہ پارے ڈاکٹر زور

نے لکھا تھا "شہرے کہ تمامی ہندوستان شرقاً غرباً، جنوباً و شمالاً مثل آن لطافت و صفا ہرگز یافت نمی شود"[1] حالانکہ یہ اکبر و جہانگیر کا عہد ہے جبکہ آگرہ اور لاہور جیسے شہنشاہی شہر اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود تھے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو خیز شہر بھاگ نگر ان سے کہیں بڑھا ہوا تھا تعجب کی بات یہ ہے کہ زمانہ انحطاط میں بھی اس شہر کا تمدن بڑھتا گیا اور اپنے آخری زمانہ میں اتنا بڑھا کہ باہر کے لوگ حیران رہجاتے تھے ۔ خافی خاں جو عہد عالمگیری کا بڑا مورخ ہے کہتا ہے کہ "خوبیہائے آن شہر لطافت آب و ہوائے آن سرزمین چشمہائے نمکین آن سبز فام و سیر حاصلی آن مزبوم اگر پردازم از سررشتہ سخن باز می مانم"[2] شہنشاہ اورنگ زیب کا خاص مورخ محمد ساقی جو گولکنڈہ کی تسخیر کے وقت یہاں موجود تھا حیدرآباد کی ان الفاظ میں تعریف کرتا ہے "آرامگاہے است بر قطعہ زمین بہشت، راحت جسم و آرام جان آبادی وسیع تر از احاطہ خیال، عمارات وسیع تر از پایہ اندیشہ، رطوبت ہوا، عذوبت و روانی چشمہا شادابی سبزہ بہ مرتبہ کہ پنداری گل و سبزہ این سرزمین را آب و رنگ ز مرو لعل است"[3] حالانکہ عالمگیری عہد میں ہندوستان کے شہنشاہی شہروں کی جو حالت تھی وہ سب جانتے ہیں ۔ آگرہ اور لاہور کے علاوہ شاہجہاں آباد کی دنیا میں شہرت تھی ان مورخوں کا جو شاہجہاں آباد میں رہ آئے تھے حیدرآباد کو سراہنا اس شہر کی عظمت کا سچا ثبوت ہے اور واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ خود اہل حیدرآباد بھی اپنے شہر کے مقابلہ میں شہنشاہی شہروں کو قابل وقعت نہیں سمجھتے تھے اور حیدرآباد کی تعریف میں بجائے دہلی و پیش کرنے کے ایرانی شہروں کی مثال دیتے تھے چنانچہ سلطان محمد قطب شاہ کی تخت نشینی کے وقت حضرت مومن استرآبادی نے جو سلطنت کے پیشوا تھے اپنے قصیدہ تہنیت میں لکھا تھا ؎

چو صفاہاں نو شد از شاہ جہاں عباس شاہ ۔۔۔ حیدرآباد از تو شد شاہا صفاہاں نوی

قطب شاہی عمارتوں کی بہت بڑی تفصیل ہے ۔ ان محلات کے علاوہ جو گولکنڈہ میں بنائے گئے تھے حیدرآباد میں علحدہ قصر بنائے گئے ۔ داد محل کی شان و شوکت تو اب بھی بہت سوں کو یاد ہے اور باہر کے سیاح بڑے لطف کے ساتھ اس کا ذکر کرتے ہیں ۔ چار محل، ندی محل اور گوشہ محل آخری زمانہ کی یادگاریں تھیں لیکن زمانہ کی ستم ظریفی اور مغل فاتحوں کی بیدردی سے ان کا خاتمہ ہوگیا جس وقت یہ موجود تھے، قطب شاہی عظمت کو ظاہر کرتے تھے ۔ خود مغل بھی جو شاہجہانی عمارات میں رہکر آئے تھے ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے گولکنڈہ کی تسخیر کے بعد جب شاہنشاہ اورنگ زیب حیدرآباد میں داخل ہوئے تو قطب شاہی محلات کی رفعت اور ذوق تعمیر کو دیکھکر بڑی حیرت کا اظہار کیا تھا ۔ نعمت خاں عالی نے جو شہنشاہ کے ہمراہ رکاب تھا، فی البدیہ کہا "دو بلند ہمت بودند ۔ عمارت ہائے بلند ساختند" شہنشاہ کی حیرت اور نعمت خاں کا جواب قطب شاہی عظمت کو ظاہر کرنے

---

[1] تاریخ فرشتہ روضۂ چہارم صفحہ ۱۰۲ [2] خافی خاں جلد دوم [3] ماثر عالمگیری صفحہ ۳۰۱

بکے لیے کافی ہے۔ جب شہنشاہ اورنگ زیب کا چھوٹا بیٹا کام بخش حیدرآباد کا گورنر بنایا گیا تو اس نے قطب شاہی محلات کو چھوڑ کر اپنے لیے علیحدہ محل کی تعمیر کرلی تھی جس کو شہنشاہ اسراف سمجھتے تھے۔ لیکن شاہزادہ نے جواب دیا تھا کہ قطب شاہی محلات میں رہنا اس سے زیادہ اسراف ہے۔ قطب شاہی محلات اس قدر وسیع اور پر عظمت ہیں کہ ان کی پوری دیکھ بھال تو کجا ان میں چراغ جلانا مشکل ہے۔ یہ اسی شاہزادے کے الفاظ ہیں جو شاہجہانی محلات کا رہنے والا تھا۔

صحیح علم نہیں ہوتا۔

جو مواد ہمارے پاس موجود ہے اس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ جس زمانہ میں حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز اپنی روحانی قوت کا سکہ بٹھا رہے تھے، اس وقت اردو میں یہ سکت پیدا ہو چکی تھی کہ سلوک و اخلاق کے بعض ابتدائی مسایل اس میں نظم کئے جا سکیں۔ ۸۲۵ھ میں خواجہ بندہ نواز داخل جنت ہو گئے۔ ۸۶۵ھ میں جب نظام شاہ بہمنی اپنے ظالم باپ ہمایوں کے بعد آٹھ سال کی عمر میں تخت و تاج بہمنی کا وارث ہوا تب بہمنی سلطنت میں امن و امان کا دور تھا، بادشاہ کی ماں نرگس بانو، خواجہ جہاں اور محمود گاواں کی تدبیر و دانش اور خیر خواہی و قابلیت سے بہمنی قلمرو میں ہر جانب اطمینان اور فارغ البالی کا دور دورہ تھا۔ اسی لئے ادب اور شاعری کا بھی خوب چرچا رہا۔ اس دور کے ایک شاعر نظامی ہیں جو بہت مشہور ہیں۔ ان کی دکنی مثنوی ہماری نظر سے گزری ہے۔

خواجہ بندہ نواز اور نظامی کے کلام پر نظر ڈالی جائے تو بیک نگاہ واضح ہو جاتا ہے کہ زبان کے ارتقا کے مدارج طے کرنے میں دوسری اور ہستیوں نے بھی پوری سرگرمی سے حصہ لیا ہوگا، نہ صرف خواجہ صاحب سے پہلے بلکہ خود ان کے زمانہ میں اور بعد میں بھی۔

بہر حال نظامی کی مثنوی دکنی عشقیہ شاعری کے قصر بلند بام کی بہت ہی مضبوط بنیاد ثابت ہوئی۔ اس ابتدائی مثنوی کو چھوڑ کر غزل، قصیدے یا مرثیے کا اس زمانہ کا کوئی نمونہ موجود نہیں ہے۔ عشقیہ شاعری کے اس ابتدائی نقش کے سوا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے کسی اور پہلو کی ابھی تک باقاعدہ شعر میں ترجمانی نہیں کی گئی تھی۔

اب وہ زمانہ آ جاتا ہے جبکہ بہمنی عظمت و شوکت کا تار و پود بکھر گیا۔ پانچ حکومتوں کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔ اب اگرچہ بہمنی سلطنت کی عظمت خواب و خیال ہو گئی لیکن ان پانچوں حکومتوں نے پوری کوشش کی کہ بہمنی سلطنت کے علمی وقار اور ادبی سرپرستی کی اعلیٰ روایات اپنی قدیم رونق و شان کے ساتھ باقی رہیں۔

سنہ ۹۰۰ھ سے سنہ ۱۰۰۰ھ تک پورے سو سال کی ادبی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو ہمیں سوائے میراں جی شمس العشاق، برہان الدین جانم اور فیروز و محمود کے کسی اور کا نام معلوم نہیں ہوتا۔

میراں جی شمس العشاق اور شاہ برہان الدین جانم نے بیجاپور کی خاک پاک میں جنم لیا تھا، فیروز اور محمود نے گولکنڈہ کی فضا میں پرورش پائی۔ میراں جی اور شاہ برہان الدین جانم کا تو خیر کچھ حال معلوم ہے اور کچھ کلام بھی موجود ہے، لیکن فیروز اور محمود کا نہ تو کچھ حال معلوم ہے اور نہ ان کے کلام کا کوئی نمونہ دستیاب ہوا ہے۔ وجہی اور ابن نشاطی جیسے باکمال شاعروں نے فیروز و محمود کا جو ربا مانا ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ زبان کو صاف کرنے اور اس کو ترقی دینے میں فیروز و محمود نے کوشش و سعی کا پورا حق ادا کیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں مثنوی سے گزر کر غزل اور قصیدے کے میدانوں میں بھی جولانی شروع ہو چکی تھی۔ شاعری کے حلقہ میں عشق اور تصوف و سلوک کے علاوہ فخریہ، مرثیہ، اور اخلاقی نظموں کی کڑیاں بھی داخل ہو چکی ہوں گی، زمانہ مابعد کے جو نمونے ہماری نظر سے گزرے ہیں وہ کسی ابتدائی بنیاد کے بغیر مرتب نہیں ہو سکتے تھے۔

ان دو ابتدائی صدیوں کے بعد اب ہم اس زمانہ میں پہنچ جاتے ہیں جبکہ شاعروں اور نظم نگاروں کے ٹھٹ کے ٹھٹ پیدا ہو گئے۔ اور شمع سخن اس شان سے فروزاں ہوئی کہ پہلی کوششیں ماند پڑ گئیں۔ خوش قسمتی سے اس زمانہ کی کوششوں کا ثمرہ دست بردِ زمانہ سے محفوظ ہے۔ اس کے بعض پاکیزہ نمونے سمندِ پارینہ واقف لوگوں کی حفاظت اور نگرانی میں موجود ہیں۔

دکنی شاعروں کا فکر و تخیل اب عشق اور تصوف کے دائرے سے نکل کر زمینہ تاریخی بیچل اور دوسری تمام اصناف سخن میں پرواز کرنے لگا خصوصاً ان میں مثنوی کا پایہ بہت بلند ہو گیا ہے۔ اس کے لحاظ سے ہم ان سب اصناف پر قدرے تفصیل سے نظر ڈال سکتے ہیں۔

بیت اور قافیہ کی سہولت کی بنا پر مثنوی کی صنف سخن نے جو عام قبولیت حاصل کی اور فارسی میں اس کی وجہ سے جو اعلیٰ ادب فراہم ہو گیا وہ دکنی شعرائے لئے ایک عمدہ نمونہ ثابت ہوا۔ دکنی مثنویاں اردو ادب کے لئے ایک گراں بہا ذخیرہ ہیں۔ زیادہ تر اسی صنف سخن میں دکنی شاعروں نے اپنے فکر و تخیل کی داد دی اور قلمبندی کی ہیں۔ اس دور کے جتنے بھی شعرا کا علم حاصل ہے ان سب نے بجز چند شاذ و مستثنیٰ صورتوں کے ایک یا ایک سے زیادہ مثنویاں لکھی ہیں۔ یہ مثنویاں یا تو طبع زاد ہیں یا فارسی سے ترجمہ۔

دکنی شعرا نے اپنے کلام میں زندگی کے ہر پہلو کی تصویریں پوری کامیابی سے کھینچی ہیں۔ چاہے اخلاق و موعظت ہو یا فلسفہ و تصوف، چاہے عشق کی موشگافیاں ہوں یا جنگ و پیکار کی خون آشامیاں، چاہے تمدن و زندگی کی پرکیف رعنائیاں ہوں یا مناظر قدرت کی سحر طرازیاں، تاریخ و سوانح کو بھی ان قادر الکلام شاعروں نے نظم کا جامہ اس عمدگی سے پہنایا کہ شاعری ساحری ہو گئی۔

عاشقانہ شاعری پہلے عاشقانہ شاعری پر قدرے تفصیل سے نظر ڈالنی مناسب معلوم ہوتی ہے۔ تدریجی ارتقا کے سلسلہ کا بھی ساتھ ساتھ علم ہو جائیگا نظامی کی مثنوی کے بعد[٥] بلحاظ تاریخ تصنیف جو مثنوی نظر آتی ہے وہ وجہی کی قطب مشتری ہے ۱۰۱۸ھ۔ پھر غواصی کی سیف الملوک و بدیع الجمال ۱۰۳۵ھ اور طوطی نامہ (۱۰۴۹ھ)، احمد کی لیلیٰ مجنوں (۱۰۵۵ھ)، مقیمی کی چندر بدن و مہیار (۱۰۵۵ھ)، صنعتی کا قصہ تمیم انصاری (؟ھ)، ملک خوشنود کی جنت بہشت اور یوسف زلیخا (۱۰۵۶ھ)، جنیدی کی ماہ پیکر (۱۰۶۴ھ)، ابن نشاطی کی پھول بن (۱۰۶۶ھ)، نصرتی کی گلشن عشق (۱۰۶۸ھ)، طبعی کا قصہ بہرام و گل اندام (۱۰۸۱ھ)، فائز کی رضوان شاہ و روح افزا (۱۰۹۴ھ)، ہاشمی کی یوسف زلیخا (۱۰۹۹ھ) وغیرہ۔

ان مثنویوں میں قطب مشتری، چندر بدن و ماہ پیکر خود دکنی شاعروں کی تراوش فکر کے نمونے ہیں باقی فارسی سے ترجمہ۔

ان مستقل مثنویوں سے قطع نظر سلطان قلی قطب شاہ، سلطان محمد قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ، اور علی عادل شاہ ثانی شاہی کے کلیات میں بعض مختصر مثنویاں ایسی موجود ہیں جن میں عاشقی کی کتھا بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

نظامی کی مثنوی کے بعد ان مثنویوں پر نگاہ دوڑائی جائے تو بیک نگاہ واضح ہو جاتا ہے کہ نہ صرف اسلوب بیان بلکہ زبان کی سلاست نے بھی اب ترقی کی کئی منزلیں طے کر لیں۔

---

٥ جشن دلی کے موقع پر جو نمائش مخطوطات قائم ہوئی تھی اس میں ایک مثنوی موجود تھی جس کی تاریخ تصنیف ۱۰۱۲ھ ہے۔

ان تمام مثنویوں پر تفصیلی تبصرہ کافی وقت کا محتاج ہے۔ ان کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کے لئے صرف اس قدر بیان کرنا کافی ہوگا کہ قطب مشتری میں خود بادشاہ وقت سلطان قلی قطب شاہ کی رومانی محبت کو شاعری کے قالب میں ڈھالا گیا ہے جو بھاگ نگر کی ایک حسین رقاصہ بھاگ متی کے عشق کا نتیجہ تھا۔

غواصی کی مثنویاں سیف الملک و بدیع الجمال اور طوطی نامہ کو ایک کامیاب ترجمہ قرار دینے میں کوئی امر مانع نہیں ہے۔ غواصی نے ہندی لفظ کو بڑی عمدگی سے دکنی زبان میں آمیز کیا ہے۔ کلام بہت سادہ اور تصنع و آورد کی قیود و بند سے آزاد ہے۔

غواصی سے گزر کر ابن نشاطی کی پھول بن پر نظر ڈالیں تو پچیس تیس سال کے اندر ایک بڑا انقلاب نظر آتا ہے۔ جذبات کی حقیقی تصویر لفظی اور معنوی صنائع بدائع کے پردوں میں چھپ جاتی ہے۔ پوری مثنوی مرصع ہے۔ لیکن واقعی یہ اعجاز سخن ہے کہ سلاست اور روانی بڑی کوشش سے برقرار رکھی ہے۔

اسی زمانہ کی ایک دوسری مثنوی گلشن عشق نصرتی کے سحر نگار قلم کی ایک دائمی یادگار ہے۔ اس مثنوی میں انسان کے حقیقی جذبات کو جس خوبی سے قلم بند کیا ہے اس کی کہیں اور نظیر نہیں ملتی۔ کلام کی رنگینی اور تشبیہ و استعارات کی ندرت واقعی قابل داد ہے۔

عاشقانہ جذبات کا اظہار صرف مثنوی کی حد تک ہی نہیں رہا بلکہ اس کا اثر غزل کی لطیف تر زمین پر بھی بہت جلد پڑ گیا۔

سعدی اور حافظ کی فارسی غزل گوئی کے بعد ہندوستان میں غزل نگاری نے جو رنگ اختیار کیا، خسرو، حسن، ظہوری اور کلیم نے جو زمزمہ خوانی کی اُس کی آواز بازگشت میں دکنی شعراء نے بھی اپنا زور قلم صرف کیا اور داد سخنوری دی ہے۔ جو مواد ہمارے پیش نظر ہے اس کے ملاحظہ سے بظاہر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ولی سے پہلے اس میدان میں دکنی شعراء اپنی یادگاریں بہت کم چھوڑی ہیں۔ دکنی شاعری کے سلسلہ میں جو عظیم الشان ذخیرہ مثنوی اور مرثیہ کی صورت میں دستیاب ہوا ہے اس کے مقابل غزلوں کی مقدار بہت کم ہے۔ سلاطین گولکنڈہ و بیجاپور کے سوا دوسرے نامور شعراء، وجہی، غواصی، نصرتی، شوقی، ہاشمی وغیرہ کی جو غزلیں ہمیں معلوم ہیں ان کی تعداد نہایت قلیل ہے۔ اس امر کے باور کرنے کے لئے نہایت قوی ثبوت ہے کہ رستمی، نصرتی، غواصی وغیرہ جیسے قادر الکلام شعراء نے اس صنعت میں بھی کافی ذخیرہ چھوڑا تھا۔ مگر افسوس اب ناپید ہے۔ صرف سلاطین گولکنڈہ اور علی عادل شاہ شاہی اور ہاشمی وہ خوش نصیب شعراء ہیں جن کی سینکڑوں غزلیں ان کے کلیات میں محفوظ ہیں۔

غزل گوئی کا اصل موضوع محبوب ہے۔ لیکن فارسی شاعری میں اور اس کے بعد خود اردو شاعری میں محبوب کی جو درگت بنی وہ ہمارے ادب کا ایک افسوس ناک پہلو ہے۔ مگر دکنی غزل نگاروں نے عربی اور ہندی شعراء کی طرح واقعیت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ سلاطین کا بالخصوص محل سراؤں اور شاہی کوشکوں میں خوبی اور رعنائی کے مجسم پیکروں کے دیکھنے میں سارا وقت صرف ہوتا تھا اور رخساروں کی گلگونی اور کرشمہ و ادا کی سحر آفرینی سے آنکھوں پر لطف اندوز ہونے کا پورا سامان مہیا تھا، اور پھر چونکہ سلطان قطب شاہ باوجہ اس کے کہ خود ایک عاشق مزاج اور سوختہ دل شاعر کی حیثیت رکھتا تھا، اور بھاگ نگر کی پری صفت اور حور وش معشوقوں کے زلف گرہ گیر کا اسیر تھا

معاشرتی شاعری

معاشرتی موضوعات کسی خوش فکر شاعر کے لیے بہت ترغیب دہ میدان کھولتے ہیں۔ روزمرہ کے حالات، دلگد
از واقعات کو شاعری کا لباس پہنا کر لطیف اور پاکیزہ جذبات کا مرقع بنا دینا کوئی معمولی کام نہیں ہے۔

سنترے فروخت کرنے والیوں کی آوازوں کو جہاں ایک دلی عصری شاعر نے ایک انگریزی شعر کا ایک لطیف موضوع بنا ڈالا، وہاں قدیم دکنی شاعروں نے عید، نوروز، شب قدر، ولادت، سالگرہ، شادی بیاہ، ضیافت، محرم وغیرہ جیسے پامال موضوعات میں حسن زیبائی پیدا کردی۔ قطب شاہ، ظل اللہ، عبداللہ، شاہی، نصرتی، شوقی، وغیرہ کی تراوش فکر نزاکت اور لطافت کو پوری طرح نمایاں کرتی ہے، نیز اس وقت کے رسم و رواج، طور طریق، عادات و اطوار کو کافی طور سے واضح کرتی ہے غرض معاشرت کا ہر پہلو صاف طور سے پیش نظر ہو جاتا ہے

نیچرل شاعری

شمالی ہند میں غزل گوئی کی زمین جس طرح پامال ہوئی اور وہاں کے شعرا کی فکر زلف و گیسو میں جس طرح الجھ گئی اس کی بنا پر عام طور پر یہ خیال ہے کہ اردو شاعری نیچرل شاعری کے بازار میں تہی مایہ ہے، اور اب عام خیال یہ ہے کہ جدید دور شعرا نے اس موضوع میں جو ساز چھیڑا ہے وہ دراصل مغربی مضراب کا ہی ایک ثمر ہے۔

لیکن یہ قصہ بھی اب ایک تقویم پارینہ کا مصداق ہے دکنی شعرا کی مشق سخن اس موضوع میں بھی کسی طرح شرمندہ نہیں ہے مناظر قدرت سے طبیعت میں جو سرور پیدا ہوتا ہے وہ اگر کسی اچھے نظم نگار کی نظم میں منعکس نہ ہو تو تعجب کا مقام ہوگا۔

سلاطین گولکنڈہ اور بیجاپور کے کلیات میں پھول پھل، ترکاری، باغ، حوض محل، چاندنی رات وغیرہ جیسے حالیہ موضوعات پر کئی مثنویاں اور قطعے موجود ہیں، اور یہ کسی طرح پست معیار کے نہیں ہیں۔ نصرتی کا قصیدہ جو موسم سرما پر لکھا گیا ہے۔ ہر طرح قابل ستائش ہے اسی طرح دھوپ کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ نصرتی کی قادر الکلامی کا شاہد ہے

صوفیانہ شاعری

کسی اسلامی قوم کی زبان میں شعر لکھے جائیں تو اس میں تصوف و سلوک کو بھی ایک خاص موضوع قرار پانا، اب نہیں تو پہلے بہت ضروری تھا، دکنی زبان کے ارتقا کی ایک خصوصیت امتیازی یہ ہے کہ افراد مشائخ طریقت نے بھی اس کی غور و پرداخت میں اپنا وقت صرف کیا ہے، لامحالہ خود دکنی شاعری میں تصوف و سلوک بھی ایک خاص موضوع قرار پاگیا۔ خواجہ بندہ نواز، میراں جی شمس العشاق شاہ برہان الدین جانم، امین الدین اعلیٰ، قادر، شاہ من عرف وغیرہ جیسے صاحبان طریقت نے اپنے کلام میں سلوک اور تصوف کے کئی دقیق مسائل حل کیے ہیں۔

قصائد

انسان کے جذبۂ شکرگزاری نے شاعری کی زبان میں اپنی جو روداد بیان کی ہے، وہ ہر زبان کے ادب کا ایک زیور ہے دکنی قصائد بھی دکنی ادب کا ایک قابل قدر سرمایہ ہیں۔ اس بات کا کافی ثبوت موجود ہے کہ کئی شعرا نے قصائد لکھ کر اپنا زور بیان دکھایا۔ مگر افسوس ہے کہ جس ذخیرہ کا ہم کو اب تک پتہ چلا ہے اس میں صرف چند ہی ایسے خوش نصیب شعرا قطب شاہ، ظل اللہ، عبداللہ شاہی اور نصرتی ہیں۔ ان میں سے پہلے تین شعرا کے قصیدے عام طور سے دستیاب نہیں ہو سکتے۔ البتہ علی عادل شاہ شاہی اور

نصرتی کے قصیدے قابل ذکر ہیں۔

یہ قصائد فارسی قصیدوں کی طرز پر لکھے گئے ہیں، وہی تشبیب، وہی گریز، وہی مبالغہ آمیز مدح ممدوح اور وہی دُعا، لیکن ہر شاعر نے دکنی ماحول کے لحاظ سے کچھ نہ کچھ جدت ضرور پیدا کی ہے۔ شاہی کے قصائد کا زور بیان، الفاظ کی شوکت، شاہانہ طمطراق داد کے قابل ہے نصرتی نے جس خوبی اور عمدگی سے قصیدہ کے پیرایہ میں واقعہ نگاری کا حق ادا کیا ہے وہ تعریف سے مستغنی ہے، اور پھر جوش خیالات کی جدت، تشبیہ اور استعارات کی ندرت یہ سب حق یہ ہے کہ زندگی بقائے دوام کے مستحق ہیں۔

مرثیہ — شاعروں کے جذبات شکر گزاری نے جس طرح قصیدہ کی صورت اختیار کی اسی طرح حسرت اور غم نے مرثیہ کا ڈھنگ اختیار کیا، دکنی مراثی آج بھی دل ہلا سکتے ہیں۔ افسوس ہے کہ چند مرثیوں کے علاوہ اس صنف ادب پر بھی اب تک تاریکی چھائی ہوئی ہے قدیم سے قدیم جو مرثیہ ہم کو دستیاب ہوا ہے وہ وجہی کا ہے۔ شعرائے گولکنڈہ کے بعد قطب شاہ، ظل اللہ، عبداللہ، وجہی، غواصی لطیف، سیوا، مرزا وغیرہ کے مرثیے دستیاب ہو چکے ہیں، اور شعرائے بیجاپور کے بعد شاہی، نصرتی، ہاشمی اور مرزا وغیرہ کا نام مرثیہ نگار کی حیثیت سے قابل تذکرہ ہے۔ ہم نے کئی مضامین کے ذریعہ اس صنف ادب پر بحث کی ہے، اب یہاں اس کا اعادہ غیر ضروری ہے

دکنی شاعری کے خصوصیات

اس سارے سروے کے بعد دکنی شاعری کی بعض خصوصیتوں پر سرسری طور سے کچھ کہنا ضروری ہے۔

یہ سب کو معلوم ہے کہ بارھویں اور تیرھویں صدی ہجری میں شمالی ہند کی شاعری کا موضوع زیادہ تر صرف حسن و عشق، شاہد و ساقی گل و بلبل کے محدود دائرے میں گھوم کر رہ گیا لیکن ہماری دکنی شاعری نے صرف حسن و عشق کی داستان نہیں بیان کی بلکہ جہاں اس نے حسن و عشق کے بہترین جذبات اور خیالات کے موتی پروئے وہیں اخلاق اور تصوف کا گراں بہا سرمایہ بھی مہیا کیا اگر ایک طرف رزمیہ شاعری اور تاریخی واقعہ نگاری کا ذخیرہ موجود ہے تو دوسری طرف مرثیہ گوئی اور مناظرہ زندگی کا وافر مواد موجود ہے، معاشرت اور تمدن کے متعلق بھی یہ ان خالی نہیں ہے مضامین کی یہ گوناگونی دکنی شاعری کی اولین خصوصیت ہے

دوسری خصوصیت زبان کی سادگی اور عام فہمی ہے۔ دکنی شاعری کو شروع سے آخر تک دیکھ جائیے مشکل اور ثقیل لغات اس میں نہیں دیئے گئے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ہمارے لفظی خزانہ کو ایک گنج نادر و کی صورت حاصل تھی۔

قدیم دکنی شاعری کی تیسری خصوصیت اس کے عمدہ تشبیہات اور لطیف استعارات میں، بڑی بات یہ ہے کہ تشبیہہ اور استعارے سب زیادہ تر اپنے ماحول سے ماخوذ ہیں۔

خاتمہ — یہ خصوصیات ہم اور قابل ذکر ہیں، ان کے علاوہ دیگر خصوصیات بھی ہیں جن کا انحصار تواتر کا موجب ہوگا۔

گو یہ صحیح ہے کہ اس زمانہ میں ہمارے اسلامی علوم اور آداب میں انحطاط شروع ہو چکا تھا، امارت کمزور ہونے کا نوبت پڑ چکا تھا شروع

اور حاشیہ کی گردش میں ارباب علم و فن سرگرداں تھے، قومیت یا اخلاق کے بلند اور اعلیٰ جذبات کی نشوونما اس زمانہ کی شاعری کی دسترس سے بالکلیہ باہر تھی، اس لئے اس وقت کی شاعری میں اس امر کی تلاش کہ انھوں نے زندگی کی سدھار اور اخلاق عامہ کی بہتری اور زندگی کے لئے کوئی اعلیٰ نصب العین مقرر کرنے میں کیا نقطۂ نظر قایم کیا تھا تو محض فضول ہے۔

اس زمانہ میں کسی شاعر کو بلند پایہ قرار دینے کا معیار غالبًا صرف یہ ہو سکتا ہے کہ اس نے اپنی محدود چار دیواری میں کس حد تک کامیابی حاصل کی اور فن کے پرکھنے کے جو ظاہری اور رسمی قواعد مقرر ہو گئے تھے ان پر اس کا کلام کس حد تک پورا اترتا ہے۔

اس اصول کے تحت اگر ہم قدیم دکنی شاعری کا جائزہ لیں تو ہم کو ناکامی نہیں ہوتی، بیسیوں شاعروں کا کلام بلاشبہہ اقران و امثال میں بہت بلندی پر نظر آتا ہے۔ فقط

یاد ایام ولی

(از)

محمد عبدالعزیز صاحب غوثی متعلم سال سوم جامعۂ عثمانیہ

یکایک کشتیٔ ملک دکن منجدھار میں آئی
سپاہ فوج "عالمگیر" جب رفتار میں آئی

غلامی آگئی حصے میں، آزادی ہوئی رخصت
تجمل ہی رہا باقی نہ حریت نہ شعریت

پرندے اڑ گئے باغ ادب کی ڈالی ڈالی کے
مسرت سو گئی اور بھاگ جاگے بے کمالی کے

دکن کی شش جہت میں "فاتحوں" کا بول بالا تھا
گلا اردو کا مغلوں کی چھری سے کٹنے والا تھا

زبان فارسی اترا رہی تھی کامرانی پر
لگائے آنکھ، بیٹھی تھی، دکن کی حکمرانی پر

تری ہستی سے اردو نے ولی پھر زندگی پائی
زبان فارسی کے راج نے شرمندگی پائی

اسیر دام پیری ہو گیا تھا شعر کا پیکر
رگوں میں تو نے دوڑایا جوانی کا لہو یکسر

سخن تھا منہ چھپائے زیر دامان گرانخوابی
جلائی نیند کی تاریکیوں میں تو نے مہتابی

ہویدا تو نے کر دی حسن کے چہرے کی رنگینی
دہان شاہد الفت میں بھر دی تو نے شیرینی

پجاری تھا دل بے تاب تیرا حسن فطرت کا
ہوس نا آشنا تھا فلسفہ تیری محبت کا

ترے نغموں میں ہے عریاں ترنم موج کوثر کا
ترا ہر لفظ اک ترشا ہوا ٹکڑا ہے جوہر کا

تری غزلوں میں ٹھنڈک چاندنی کی محسوس ہوتی ہے
ہر اک آواز تیری حسن میں ملبوس ہوتی ہے

ترا ہر شعر ہے تشریح راز فطرت انساں
جھلکتا ہے تری میٹھی زباں میں چشمۂ حیواں

ترا دیوان ہے یا قسمت عاشق کی تفسیریں
تری غزلیں نہیں، خواب محبت کی ہیں تعبیریں

وَلی کے تلامذہ کا دَور

(۱)

مولوی عبد القادر صاحب سروری ایم اے۔ ال ال بی۔ لکچرار اردو جامعۂ عثمانیہ

دکن کی اردو شاعری کا وہ دور، جسے " وَلی کے تلامذہ کے دور " سے موسوم کیا گیا ہے، کئی حیثیتوں سے دلچسپ اور اہم ہے۔ دوسرے ادوار کے مقابلے میں اسکی چند نمایاں خصوصیات ہیں اور کچھ ایسے اثرات، جو عہد آفریں ثابت ہوے۔ یہ دور، وَلی کے انتقال کے زمانے سے لیکر کم و بیش نصف صدی کی شعری پیداوار پر حاوی ہے۔ اسکو درحقیقت " قدیم دکھنی شاعری " کا دور آخر سمجھنا چاہیئے کیونکہ، تاریخی اعتبار سے یہ ایسے زمانہ پر حاوی ہے، جسمیں دو مختلف شایستگیوں کا تصادم واقع ہوتا ہے۔ وہ دکنی معاشرت اور ادبی شایستگی جو دو سال کے طویل عرصہ تک، بیجاپور اور گولکنڈے کے علم دوست حکمرانوں کی سرپرستی میں نشو و نما پاتی رہی تھی، اب اسکے تار و پود بکھرنے کا وقت آگیا تھا، اور اسکے اجزا سے ایک نیا عہد تعمیر پانے کو تھا، جسمیں اردو شاعری کے، دو دور افتادہ دبستانوں کا ملاپ ہوتا ہے۔ اس زمانے کے شعری مذاق اور روایت کو بنانے اور ترقی دینے میں زیادہ تر ایسے شعرا کا حصہ ہے، جنھوں نے ریختہ کو، وَلی سے سیکھا تھا اور اسی کے قائم کئے ہوے نہج پر چلتے تھے۔ انمیں سے بعض تو ایسے تھے، جو وَلی کی شہرت کو عروج پاتے دیکھ چکے تھے، اور اسکے وجد آفریں نغموں سے متاثر تھے چند کو اس استاد عصر سے تلمذ کا شرف بھی حاصل ہو چکا تھا۔ لیکن ایک بڑی تعداد ایسی تھی، جو معناً اس سے مستفید تھی۔

مغلوں کی فتح دکن، اور بیجاپور اور گولکنڈے کی سلطنتوں کی تباہی کے بعد سے دکن کی قدیم اردو شاعری کی ترقی مسدود ہوگئی۔ جنگ کی تباہ کاریوں نے، عوام اور خواص سب کو حیران و پریشان کر رکھا تھا، بیچارے شاعروں اور انشاپردازوں کی کیا حقیقت تھی وہ اپنی بساط علم و ہنر سمیٹے ادھر۔ اُدھر مارے مارے پھر رہے تھے۔ اس دور تباہی کا ایک خاص واقعہ قابل ذکر ہے۔ قاضی محمود بحری، جو بیجاپور کے مشہور شاعر اور " من لگن " ۔ " عروس عرفاں " اور " بنگاب نامہ " وغیرہ کے مصنف ہیں، بیجاپور کی تباہی کے بعد، قدردان اور سرپرست کی تلاش، اور یاران ہم مذاق کی صحبت کی جستجو میں اپنی اُجڑی نگری کو ہمیشہ کیلئے خیرباد کہکر نکلے۔ گولکنڈے پر ابھی بُرے دن نہیں آئے تھے۔ اسکی ادب نواز فضا میں، دل کی حسرتیں پوری کرنے کا خیال ذہن میں لیکر اس طرف کو راہی ہوے۔ لیکن رستے میں قزاقوں نے اُنھیں لوٹ لیا، اور مال و اسباب کے

کے ساتھ شعر و سخن کا بہت سا سرمایہ بھی دستبرد میں آگیا۔ خود "بہ ہزار خرابی" گولکنڈہ پہنچے۔ اور سمجھتے تھے کہ اب ساری کلفتیں ختم ہو گئیں۔ لیکن، بمشکل سے سال ڈیڑھ سال اطمینان سے بسر کرنے پائے ہونگے، کہ وہی آسمان یہاں بھی پیدا تھا۔

گولکنڈہ پر جب تباہی نازل ہوی، دکھنی شعرا کے لئے دنیا تنگ تھی بیسیوں باکمال شاعر خانماں برباد ہو گئے۔ جن میں کچھ سکت رہ گئی تھی، وہ کرنول، سدھوٹ اور ارکاٹ کی طرف کوچ کر گئے۔ سنہ ۱۱ھ میں جب دہلی تباہ ہوی، تو یہاں کے باکمالوں کا بے خانماں ہو جانا، اور تلاش روزگار میں فیض آباد اور لکھنو پہنچنا، اس طرح کے سانحہ کا ایک دوسرا اگر، کم درد ناک نمونہ ہے۔ کیونکہ دہلی کے شعرا کیلئے اب بھی توقعات باقی تھیں۔ لیکن دکھنی شعرا کا روزگار اب ختم ہو چکا تھا۔ اورنگ زیب، اور ان کے ہمراہ شمال سے جو لوگ دکن آئے تھے، وہ، انکو غنیم کے ملک کے افراد سمجھتے تھے۔ اور یہ لوگ انھیں، اپنا اور اپنے بہی خواہوں کا دشمن، اور ان کی طرف رُخ کرنا نمک حرامی تصور کرتے تھے۔ پھر یہ لوگ جو شمال سے، یہاں پہلے پہل وارد ہوے تھے۔ زیادہ تر فارسی کے دلدادہ تھے، دکھنی ادب اور شاعری کا انھیں شغف نہیں تھا۔ خود عالمگیر، طبیعتًا اور ضرورتًا، کاروباری وضع کے انسان تھے۔ انھیں شعر و سخن سے زیادہ واسطہ نہیں تھا۔ یہ ایسے واقعات تھے، جنہوں نے مل جل کر دکھنی شعرا کی تباہی کا سامان فراہم کر دیا تھا۔ ولی کے، اپنے وطن سے دل برداشتہ ہونے میں بھی، ان اتفاقات کو دخل تھا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شعر و سخن کا وہ ذوق، جو سالہا سال کے عرصہ سے، دکن کے مختلف مرکزوں میں نشو و نما پا رہا تھا، یک لخت مردہ تو نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ وہ باقی رہا۔ مگر شعرا کے مطمح نظر بدل گئے۔ اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ اس زمانے کے شعرا کی ایک بڑی تعداد ایسی تھی۔ جو اپنے ذوق کی تشفی کے لئے مذہب اور تصوف کی پناہ ڈھونڈنے لگی تھی۔ بغداد کی اسلامی سلطنت کی تباہی کا بھی، فارسی شعرا پر یہی اثر ہوا تھا۔ دکھنی شعرا کے رجحانات میں یہ تبدیلی، ولی کے آخری ایام ہی سے شروع ہو چکی تھی۔

گولکنڈے کی شکست و ریخت کے بعد، جو شاعر بچ رہے تھے، ان میں اکثر ایسے تھے جو، ایک چھوڑ، دو دو سلطنتوں کے چراغ، اپنی نظروں کے سامنے گل ہوتے دیکھ چکے تھے۔ ان کے دوست احباب اور عزیز و اقارب، ان کے روبرو، تہ تیغ کئے گئے۔ اور ان کے سرپرست اسیر کر لئے گئے۔ اس طرح کے دردناک واقعات دیکھنے کے بعد، دنیا اور اسکے جاہ و مرتبہ کی ناپائداری کا اثر انسان کے دل پر جس قدر بھی گہرا ہو، کم ہے۔ ایسی حالت میں اسکے لئے صرف ایک سہارا باقی رہ جاتا ہے، اور وہ، مذہب اور تصوف ہے۔

یہ غور کرنے کا واقعہ ہے کہ وہی سرزمین جہاں اس سے پہلے، عبداللہ، حسن شوقی، رستمی، نصرتی، وجہی، محمد قلی، غواصی اور ابن نشاطی، جیسے حیثیت ادبی مذاق رکھنے والے شاعر پیدا ہو چکے تھے، اس زمانہ میں بحری، وجدی

ولی ویلوری، محمد علی عاجز، ضعیفی، اور ذوقی جیسے مذہب پرست شعرا کو نشو و نما دیتی ہے۔ یہ سب کے سب مذہبی موضوعات یا تصوف پہ لکھنے والے شاعر تھے۔ اور اردو کی بڑی بڑی متصوفانہ مثنویاں، جیسے "من لگن" "پنچھی باچھا" "روضۃ الشہدا"، "چت لگن" وغیرہ اسی زمانے میں لکھی گئیں۔ اس زمانہ کے جو کارنامے، ادبی معلوم ہوتے ہیں، ان میں بھی مذہبی پہلو غالب ہے، مثلاً محمد علی عاجز نے جو قصے لکھے وہ درحقیقت مسائل فقہ کی توضیحات ہیں۔

مذہبی شاعری کی ایک دوسری صنف، مرثیہ ہے، جسکو اس زمانے میں خاص عروج ہوا۔ شہدائے کربلا کے المناک واقعات لکھنے کے لئے، اس زمانے کے شاعر خاص طور پر موزوں تھے۔ اور اسی لئے انکی مرثیہ نگاری کی شہرت اطراف و اکناف میں پھیل چکی تھی۔ چنانچہ گجرات کے ایک مشہور مرثیہ نگار ہاشم علی نے اس کا تذکرہ اپنے مرثیوں میں کیا ہے۔

مرثیہ نگاروں میں عشرتی، مرزا، قادر، سیدن، امامی، قابل ذکر ہیں۔ ان کے مرثیے اس میں شک نہیں کہ انیس اور دبیر کے بسیط اور ادبی مرثیوں سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے، لیکن "مرثیت" جو ان کا اصل اصول تھا، اس کے پیدا کرنے میں انھیں خاصی مہارت تھی۔ بعض موقعوں پر، خصوصاً، جہاں حضرت علی اصغر کی شہادت، یا امام قاسم اور حضرت فاطمہ بی بی کی شادی کے حالات بیان کئے گئے ہیں، جذبات کی فراوانی نے، ان مرثیوں میں ادبی خوبیاں پیدا کر دی ہیں۔ روحی اور سیدن کے مرثیوں میں کچھ جدتیں بھی نظر آتی ہیں، مثلاً روحی نے غزل کے انداز میں ایک مرثیہ لکھا ہے، جس کے چند شعر یہ ہیں:-

آج غمناک ہیں چمن کے گل — بلکہ دل چاک ہیں، سمن کے گل
غم زدہ، سینہ داغ، حیراں ہیں — نرگس و لالہ، یاسمن کے گل
یوں نہ لالے شفق کے دستے ہیں — لہو میں ڈوبے ہیں سب گگن کے گل
نقش پا دیکھ، دل ہوس رکھتا — سر پہ رکھنے کو تجھ چرن کے گل

سیدن نے اپنے بعض مرثیوں میں عجیب جدت دکھائی ہے۔ ایک مرثیہ میں انھوں نے حضرت فاطمہ صغرا کی شادی کا واقعہ بیان کیا ہے، اور اس کے لئے استعارے اور کنائے سب حزنیہ استعمال کئے ہیں۔ اسکے صرف دو شعر یہاں نمونتہً پیش کئے جاتے ہیں:-

ماہ محرم میں دیکھو، چندا، ہو مالی آیا — تارے گگن کے گوندہ کر سہرا جو شہ کن لائیا
کنگنا ستم کا باندہ کر، دکھ کے ابٹنا کوں لگا — حیرت کی چوکی کے اوپر، انجھواں سیں تن نہلائیا

اس عصر کا ایک تیسرا حلقہ "مکتب ولی" کے شعرا کا ہے۔ اس میں وہ تمام سخن پرداز شامل ہیں، جو ولی کے انداز پر شعر کہتے تھے۔ خواہ انھوں نے براہ راست استفادہ کیا ہو یا بہ واسطہ۔ ولی کے تلامذۂ خاص کا پتہ چلانا، آسان کام نہیں ہے، کیونکہ اول تو ولی کے زمانہ میں تذکرہ نگاری کا شوق پیدا نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ ولی کے زمانہ کے بعض شعرا کا حال تذکرہ نگاروں کو خود ولی کے کلام سے معلوم ہوا، دوسری بات یہ ہے کہ ولی کسی مقام پر جم کر نہیں رہے۔ ان کی حالت ایک تابندہ سیارے کی سی تھی، جس کا راستہ تو معین کیا جا سکتا ہے، لیکن جس کا قیام ہر وقت ایک نئے مقام میں رہے۔ کبھی وہ اورنگ آباد میں طلوع ہوئے تو کبھی احمد آباد اور سورت میں چمکے۔ کبھی دہلی کی محفلوں کو گرمایا، تو کسی وقت پھر اورنگ آباد لوٹ آئے۔ اور یہاں کے حلقہ شعرا کے لئے رونق بزم بنے۔ اس طبیعت کے انسان سے یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ کسی مقام پر رہ پڑے، اور نوجوان شعرا کی تربیت کے لئے وقف ہو جائے۔ چونکہ ان کی زندگی کا آخری زمانہ زیادہ تر گجرات میں بسر ہوا، اس لئے یہ بات ضرور قرین قیاس ہے، کہ ان کے دوست، سید ابو المعالی جیسے کئی نوجوان شاعر، ان کے گرد جمع رہے ہونگے، اور ان میں سے کچھ مشق سخن بھی کرتے ہونگے۔ چنانچہ خواجہ حمید اورنگ آبادی نے، اپنے تذکرے "گلشن گفتار" میں ایسے دو شعرا کا حال لکھا ہے جو ولی کے شاگرد سمجھے جاتے تھے۔ یہ اشرف اور رضی ہیں۔ حمید، اشرف کو "بلا واسطہ شاگرد ولی" بتلاتے ہیں۔ خود ولی نے بھی اپنے کلام میں ان کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

اشرف کا یو مصرع، ولی مجکوں ہے دلچسپ
اُلفت ہے دل و جاں کو مرے، پیم نگر سوں

رضی کے متعلق حمید لکھتے ہیں۔ "متوطن احمد آباد، از شاگردانِ رشید ولی محمد"۔ ان کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اشرف میں اور ان میں مقابلے رہا کرتے تھے۔ ہر ایک، دوسرے سے بڑھ چڑھ کر رہنا چاہتا تھا۔ ایک دفعہ اشرف نے، کسی زمین میں ایک غزل حسب ذیل کہی تھی:۔

ہوا ہوں بستۂ زلفِ سجن، شکن کی قسم
ہوا ہوں صید رم منہرن، ہرن کی قسم

پتنگ وار ہے، دل، جب سے شمع رُو پہ فدا
اگن میں شوق کے جلتا ہے تن، لگن کی قسم

پیا، دیکھا جو ترے جام چشم کی گردش
ہوا ہوں شوق کی مئے سے مگن، نین کی قسم

پڑا ہے خاک تمن، جو برہ کے کوچے میں
ہے پائمال ترا، اے سجن، چرن کی قسم

یہ شعر سُن کے کہے ہیں صد آفریں اشرف
تمام شاعر ملکِ دکن، سخن کی قسم

رضی نے بھی اسکے جواب میں ذیل کی غزل لکھی۔ اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ وہ کسی طرح اشرف سے کم نہیں ہیں۔

خراب نرگسِ مستانہ ہوں، نین کی قسم
برنگ بلبل دیوانہ ہوں، چمن کی قسم

جمالِ انجمن آرائے شمعِ رُخ پہ ترے | شب وصال میں پروانہ ہوں، لگن کی قسم
عذاب روزِ قیامت سیں کچھ نہیں پروا | شہیدِ غنچۂ جانانہ ہوں، کفن کی قسم
پیا کی چشم کی وحشت کوں دیکھ، جیوں مجنوں | شکارِ دامن ویرانہ ہوں، ہرن کی قسم
دیکھا ہے جب سیں رضی پیچ و تابِ طرۂ یار | مزارِ خاک سیں جیوں شانہ ہوں، شکن کی قسم

ایک اور شاگرد، شیخ ثناء اللہ، ثنا کا ذکر، فائق نے اپنے تذکرہ میں کیا ہے، جو احمد آباد کے رہنے والے اور مولانا نورالدین حسین صدیقی سہروردی کے مرید تھے۔ فائق کے قول کے مطابق، ثنا، ولی کے "اجلِ تلامذہ" میں شمار ہوتے تھے۔

مذکورۂ بالا، بلا واسطہ شاگردانِ رشید کے علاوہ، کچھ شاعر ایسے بھی ہیں، جن کے متعلق، صاف طور پر یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ ولی سے حقیقی تلمذ رکھتے تھے یا معنوی۔ شفیق اورنگ آبادی نے "چمنستان شعرا" میں آزاد اور داؤد کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ وہ ولی کے شاگرد معلوم ہوتے ہیں۔ آزاد کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ "اپنے آپ کو ولی کا شاگرد سمجھتے تھے"۔ خود ولی نے بھی آزاد کے ایک مصرع کی تضمین اس طرح کی ہے:۔

آزاد سے سُنیا ہوں یو مصرعِ مناسب | جس سے کہ یار ملتا ایسا ہنر نہ آیا

آزاد کا پورا شعر یہ ہے:۔

آئیں، جہاں کی ساری، آزاد، صنعتیں پر | جس سے کہ یار ملتا ایسا ہنر نہ آیا

آزاد، دکن کے رہنے والے تھے اور ان کا نام محمد فاضل تھا۔

داؤد، اورنگ آباد کے قابلِ اعتبار شعرا میں شمار ہوتے تھے۔ اور صاحب دیوان تھے۔ ان کے فرزند، جمال اللہ عشق، بھی اچھے شاعر گذرے ہیں۔ شفیق نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ "در ریختہ اکثر تتبع ولی می نماید"۔ اور اسکے ثبوت میں خود ان کے یہ دو شعر پیش کئے ہیں:۔

سند یو بس ہے تجھے مصرعِ ولی داؤد | کہ تجکوں شورِ قیامت سیں بے نیاز کیا

کہتے ہیں سب اہلِ سخن اس شعر کوں سُن کر | تجھ طبع میں داؤد، ولی کا اثر آیا

آزاد، اور اُنکی طرح بہت سے ایسے شعرا کے متعلق جو ولی کی تقلید کرتے تھے، یہ تصفیہ کرنا دشوار ہے کہ ان میں سے کتنوں نے ولی کے سامنے زانوئے شاگردی طے کیا اور شعر و سخن حاصل کیا۔ لیکن یہ پوشیدہ بات نہیں ہے کہ بڑے بڑے شاعر، اپنے آپ کو اس خدائے سخن کے ساتھ، کسی نہ کسی طرح، وابستہ کرنے اور اُسکی تقلید کرنے کو، باعثِ عزت سمجھتے تھے۔ میر تقی میر کے بعد کے شعرانے بھی، اُن کی تقلید کو فخر سمجھا۔ تقریباً ہر اُستادِ عصر اور عظیم المرتبت شاعر کا یہی حال ہے۔ متاخرین اُن کے اتباع کو، سند تصور کرتے ہے۔ ولی کی اُستادی کے آگے، اُن کے زمانے سے لے کر اس وقت تک تمام شاعر، سرِ تسلیم خم کرتے آئے ہیں۔

ولی کے بعد، قدیم دکنی شاعری کے سب سے بڑے استاد سید شاہ سراج الدین، سراج اورنگ آبادی مانے گئے ہیں۔ تقریباً تمام تذکرہ نگاروں نے انھیں ولی کا جانشین تسلیم کیا ہے۔ شفیق نے لکھا ہے کہ ولی کے بعد، دکن میں، ریختہ کی گرم بازاری، اور رونق انھیں کے دم سے قائم ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ اورنگ آباد میں، نہ صرف دکن کے بڑے بڑے شاعر جمع تھے، بلکہ شمالی ہند کے شعرا اور علما کی بھی، کافی تعداد موجود تھی۔ جن میں شاہ غلام [illegible]، عبد القادر مہربان، میر غلام علی آزاد، اور عبد الولی عزلت خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ سب، اساتذہ کا رتبہ رکھتے تھے۔ اور ان کے گرد، شعر و سخن کا ذوق رکھنے والے نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد جمع رہتی تھی۔ شفیق، آزاد کے شاگرد رشید، اور معتقد تھے۔ اور اپنے اُستاد کے علم و فضل کے مقابلے میں کسی اور کا ذکر بھی گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ جب ہم ان کی زبان سے، سراج کے متعلق مذکورۂ بالا الفاظ سنتے ہیں، تو سراج کا پایہ ہماری نظر میں اور بھی بلند ہو جاتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ ولی کے بعد، قدیم دکنی شاعری میں سراج کے رتبہ کا کوئی دوسرا شاعر پیدا نہ ہو سکا۔ اس حقیقت کا اظہار سراج نے بھی اپنے ایک شعر میں کیا ہے:

تجھ مثل اے سراج، بعدِ ولی   کوئی صاحب سخن نہیں دیکھ

سراج کی شاعری، سوز و گداز اور لطافت اور سادگی کا دلنواز مجموعہ ہے۔ اُن کی یادگار سے ایک ضخیم دیوان، اور ایک نفیس مثنوی، "بوستان خیال" باقی ہے۔ دیوان کے چند شعر اقتباس کر کے یہاں پیش کئے جاتے ہیں، جن سے اُن کی اور اُن کے زمانہ کی شاعری کا تھوڑا بہت اندازہ ہو سکیگا۔ ایک غزل کے چند شعر یہ ہیں:

گر آرزو ہے تجکوں، تالاب کا تماشا   کشتی میں چشم کی آ، دیکھ آب کا تماشا
ہر قطرہ اشک میں ہے ظاہر جمالِ مہرو   پانی میں جیوں عیاں ہے مہتاب کا تماشا

اے قبلۂ دل وجاں! تری بھنووں کے دیکھے　　زاہد کوں خوش نہ آوے محراب کا تماشا

حیات انسانی کی سبک روی اور ناپائداری کو ان دو شعروں میں ظاہر کیا ہے:۔

آبِ رواں سے ہے حاصل عمرِ شتاب رو　　لوحِ فنا میں نقش نہیں ہے ثبات کا

روشن ہے اے سراج کہ فانی ہے سب جہاں　　مطرب غلط ہے، جام غلط، انجمن غلط

ایک جگہ معشوق کی زلف کی تعریف کرتے ہیں:۔

کہتے ہیں تری زلف کوں دیکھ اہلِ شریعت　　قربان ہے اس کفر پر ایمان ہمارا

سراپا کی تعریف میں یہ شعر ملاحظہ ہو:۔

ناز کے دیوان میں اے مطلعِ حسن وجمال　　قد ترا ہے مصرعہ، وابرو ہے فرد انتخاب

ایک عام خیال کو کس عمدہ پیرایہ میں ادا کیا ہے:۔

یا تو گلزار آپ ہو جانا　　یا کسی گلبدن سے کے ہو رہنا

اپنے زمانہ کی حالت ایک غزل میں یوں بیان کی ہے:۔

عالم کے دوستوں میں مروت نہیں رہی　　شرم وحیا و مہر وشفقت نہیں رہی

ظاہر میں کیا رفیق کہاتے ہیں آپ کوں　　لیکن انھوں کے دل میں محبت نہیں رہی

ملتے ہیں راستی سیں، جو کوئی کچھ نظر ملے　　خوبوں میں پاکباز کی حرمت نہیں رہی

نالایقوں میں عمر کوں کرنا عبث تلف　　ہم صحبتی کی اُن میں لیاقت نہیں رہی

بھولے میں ہر صنم کے کرشمے پہ ہوش کوں　　ان زاہدوں میں کشف وکرامت نہیں رہی

سفلے ہوے عزیز، عزیز اب ہوے خراب　　بے جوہروں میں قدرِ شرافت نہیں رہی

مت ہو بہارِ گلشنِ دنیا کا عندلیب   اس پھول بن میں بوئے رفاقت نہیں رہی

سراج کی شاعری کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ان کی اکثر غزلیں شمالی ہند تک پہنچ گئی تھیں، اور لوگوں کی ورد زبان تھیں۔ بعض تذکرہ نگار، ان کے اشعار کو کسی دوسرے شاعر سے بھی منسوب کر دیا کرتے تھے۔

سراج جو ولی کے خلیفہ اول تھے، وہی خلیفہ آخر بھی ثابت ہوئے۔ انھیں پر دبستانِ قدیم کے، عظیم المرتبت شعرا کا خاتمہ ہو گیا۔ کیونکہ، ایک طرف تو وہ فضا اب سونی ہو چکی تھی، جس میں دکنی شعر و سخن کی پرورش ہوئی تھی، دوسرے اورنگ آباد میں، جو اب دکن کا پایۂ تخت تھا، شمالی ہند کے شعرا خاصی تعداد میں آنے لگے تھے۔ تو مختلف دبستانوں کے میل جول اور اختلاط سے ایک نئے اسلوب کا فروغ پانا ضروری تھا۔ یہ نیا اسلوب جو پیدا ہوا، شمال اور دکن کے روز مرے اور محاورے پر مشتمل تھا۔ چنانچہ سراج کے بعد جو شاعر پیدا ہوئے وہ اسی جدید اسلوب اور زبان کے شاعر تھے۔ درگاہ، شاہ تجلی وغیرہ اسی مخلوط زبان میں شعر کہتے رہے۔ نغمۂ جدید کا یہ سلسلہ نواب میر نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے آخر عہد میں انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ چنانچہ، تجلی کے شاگرد رشید، شیخ محمد خاں ایمان، جو اپنے زمانے میں، شمالی ہند اور دکن، دونوں جگہ کے شاعروں کے ہاں استاد کا درجہ رکھتے تھے۔ اسی زبان میں شعر سر انجام کرتے تھے جس میں دہلی کا کوئی استاد شعر کہتا تھا۔

از

مرزا باقر علی صاحب زاہد متعلم سٹی کالج

اے ولیؔ باکرامت شاعرِ شیریں بیاں — مانتا ہے شاعرِ اعظم تجھے ہندوستاں

تجھ سے پہلے بھی کئی شاعر دکن میں تھے ولے — جو ذہانت تجھ میں تھی اوروں نے وہ پائی کہاں

تو اگر دعویٰ کرے اپنی زباں کا ہے بجا — وہ سلاست، وہ لطافت، اور وہ تیری زباں!

آج بھی اردو تری شرمندہ احسان ہے — تو دکن میں شاعری کا مدتوں تھا پاسباں

مثنوی اور مرثیے کا رنگ پھیکا پڑ گیا — دیکھ کر صنفِ غزل میں تیرا سحرِ آگیں بیاں

دو صدی کے بعد بھی بھولے نہیں اہلِ دکن — تو نے بعدِ مرگ پائی ہے حیاتِ جاوداں

تھا سٹی کالج میں برپا جشن تیری یاد میں
نام تیرا تھا ولیؔ ہر اک کی وردِ زباں

اُردو شاعری میں وؔلی کا رُتبہ

از

جناب محمد عبد الحکیم صاحب متعلم ام۔ اے ابتدائی شعبۂ اُردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

عنوان بالا پر جامعات ہند کے پوسٹ گریجویٹ اور انڈر گریجویٹ طلبہ سے مسابقتی مضامین لکھائے گئے تھے۔ ممتحنین نے ذیل کے مضمون اور زین العابدین صاحب کے مضمون کو علی الترتیب پوسٹ گریجویٹ اور انڈر گریجویٹ کے حصۂ انعامات [illegible] اور [illegible] کا مستحق قرار دیا ہے۔

نیرنگیٔ دہر کی اعجوبہ کاریوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آج جو چیز سب سے زیادہ مشہور و معلوم، روشن اور واضح ہے، یقیناً اس کے آغاز و ابتدا پر گمنامی اور تاریکی کے اتنے تہ در تہ پردے پڑے ہوئے ہیں کہ ایک کے بعد دوسرا اٹھاتے جائیے لیکن مقصود کی جھلک بمشکل نظر آئے گی۔ چاہ بابل، مار ضحاک، جوئے شیر، کوہ بیستون، دیوار قہقہہ اور جام جم دنیائے ادب کے مسلمات سے ہیں لیکن جہاں تک ان کی پیدائش و آغاز کا تعلق ہے ہماری معلومات کا دامن خالی ہے اور تاریخ تو سرے سے ان کے وجود ہی کا انکار کرتی ہے۔ انسانی زندگی کے عموماً تین دور مانے گئے ہیں طفلی، شباب اور پیری لیکن ہم میں سے کون ہے جو اس لمحے کا تعین کر سکے جب وہ عہد طفلی ختم کر چکا اور جس کے بعد اس نے دائرۂ شباب کے اندر قدم رکھا۔ یا اس وقت کا نام لے سکے جس پر اس کے عہد شباب کا خاتمہ ہوا تھا۔ صبح اپنی ساری نور افشانیوں کے ساتھ روز آتی ہے اور شام کا جلوۂ محبوب کس دن ہماری آنکھوں سے نہیں گذرتا لیکن ہے کوئی جو اس ساعت کو متعین کر دے جس سے صبح کا آغاز یا شام کی ابتدا ہوتی ہے۔ ٹھیک یہی حال زبان اردو کا ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس کا آغاز کب سے ہوتا ہے۔ علمائے لسانیات آج تک جو کچھ کر سکے ہیں وہ یہ ہے کہ ابتدائی دور کے بعض بعض فقرے پیش کر دیئے ہیں اور بس۔ زبان اُردو کے پہلے فقرے کے نام سے آج تک کوئی چیز پیش کی جا سکی۔ اور نہ آئندہ اس کا امکان نظر آتا ہے لیکن جب روشنی کا غلبہ تاریکی پر ہو جاتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ صبح ہو گئی ہے، اور جب تاریکی روشنی پر غالب ہو چکتی ہے تو ہم کہتے ہیں کہ شام ہو گئی ہے۔ ٹھیک اسی طرح جب وؔلی کا

کلام شعرائے دہلی اور دکن کو اپنا گرویدہ اور فریفتہ بنا لیا ہے تو اردو کی ادبی اور لسانی حقیقت مسلّم ہو جاتی ہے بالکل ویسے ہی جیسے صبح کی نورافشانی شام کی ظلمت خیزی اور شفق کی خونبابہ فشانی معلوم اور مسلّم ہے اور دلیل و ثبوت سے قطعاً بے نیاز۔

ولی سے قبل دکنی لٹریچر پر ایک نظر

مولانا آزاد کے مشہور تذکرہ آبِ حیات کی سند پر مدت سے یہ خیال چلا آتا تھا کہ ولی اردو زبان کا پہلا شاعر ہے لیکن بعد کی تحقیقات سے اس خیال کی غلطی ظاہر ہو گئی۔ اور اب ہمارے سامنے ولی سے قبل کے شعرا کی ایک پوری صف موجود ہے۔ دکن میں قطب شاہی سلطنت کا مشہور فرمانروا محمد قلی قطب شاہ (۱۵۸۰ء تا ۱۶۱۱ء) ایک صاحب دیوان شاعر گزرا ہے جس نے ولی سے مدتوں پہلے اپنے دیوان کی ترتیب و تدوین کی تھی۔ صاحب تاریخ ادب اردو کی رائے میں "سادگی شیرینی ان کے کلام کا جوہر ہے، تصوف اور عاشقانہ رنگ بھی ان کے کلام میں پایا جاتا ہے" مگر ان کی بعض خصوصیات ایسی ہیں جن کے سبب اردو شعر و شاعری کے نقطۂ نظر سے ان کے کلام کو صاف اور شیریں نہیں کہا جا سکتا۔ محمد قلی قطب شاہ کا زمانہ ایسا زمانہ تھا جب دکنی زبان پر بھاشا، سنسکرت اور فارسی کا اثر بہت زیادہ پڑ رہا تھا اس لئے کبھی تو ان کے کلام میں ہندی الفاظ، ترکیبوں اور بندشوں کی ایسی بھرمار ہو جاتی ہے کہ اشعار اردو زبان کی بجائے بھاشا کے اشعار معلوم ہونے لگتے ہیں مثلاً

ہے چندنی میں جب تک پیو ہمارا — او تن کاس دیسی چندر تمن تارا
لبے جن بہایں پرت ہم سجن کی — میں اس کی پرت کچ نہیں اوس پایا
چھبیلی سوں لگیا ہے من ہمارا — کہ اس میں نہیں ہمن تک دل قرارا (ماخوذ از شعر الہند)

ایسے اشعار ہیں جن کی زبان کو اردو کے بجائے ہندی کہنا زیادہ موزوں ہے۔ قطب شاہ کے اکثر اشعار ایسے ہیں جو ہندی بحور و اوزان میں کہے گئے ہیں جنھیں ہم کسی طرح اردو کا نام نہیں دے سکتے۔ بعض جگہ جہاں انھوں نے فارسی کا تتبع کیا ہے۔ وہاں فارسی الفاظ کی ایسی کثرت ہو گئی کہ اشعار تقریباً فارسی ہی کے معلوم ہوتے ہیں مثلاً

اے صبا کہ کل جو کیا تازہ لے صنم — او غمزہ تازہ تازہ ترا عاشقانہ کر
ہاتف ندا کرے کرولے زمزم صبوح — میرے دلم میانہ رمز نہانہ کر
بیداریم تن سوں ہمارے کہاتی ہے — او چشم عاشقانہ ترا تو نہانہ کر
پیوستہ با تو بادہ معانی عروس عیش — قلقل کی صوت بجتی ہے صورت بہانہ کر (شعر الہند ص ۲۵)

غرض یہ ہے کہ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلام میں بھاشا اور فارسی کا گوارا، لطیف اور معتدل امتزاج کم ملتا ہے وہ فارسی کی طرف جب جھکتے ہیں تو ایک دم فارسی ہی کہنے لگتے ہیں اور جب بھاشا کی طرف توجہ کرتے ہیں تو کبت۔ دوہے اور گیت کہنے لگتے ہیں لیکن بعض بعض جگہ ان کا کلام ضرور صاف ہو گیا ہے جیسے:۔

دل مانگ خدا کن کہ خدا کام دے گا — نمن کو مرادوں سے بھرے جو مردے گو

گولکنڈہ اور بیجاپور کے بادشاہ خود اہل ذوق تھے اور شعرا اور باتمیز درباری اہل فن کی قدر کرتے تھے۔ ان کی سرپرستی و قدر دانی کی وجہ سے دکن میں اردو شعر و شاعری کی تربیت و ترقی شمالی ہند سے بہت پہلے ہوئی۔ ان شعرا کی ایک طویل فہرست ہے جو ان سخن شناس اور علم پرور بادشاہوں کے دامن دولت سے وابستہ تھے۔ ان میں سے ہر ایک کا نام گنانا تو ممکن ہے اور نہ ضروری۔ چند مشہور شعرا جن کا تعلق دربار گولکنڈہ سے تھا، یہ ہیں: غواصی، ملا قطبی، ابن نشاطی، اجنیدی، طبعی، نوری، فائز، شاہی، مرزا، شوقی، بیجاپور، طالب اور مومن۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے بعد اس کا بھتیجا سلطان محمد قطب شاہ سریر آرائے سلطنت ہوا۔ یہ دونوں بادشاہ چونکہ مذہباً شیعہ تھے لہذا ان کے اثر سے دکنی شاعری میں مرثیہ اور تصوف کا اضافہ ہوا۔ بہت سے مرثیے اور قصائد اہل بیت کرام و ائمہ عظام کی شان میں لکھے گئے اور دکنی شاعری کا ذخیرہ بڑھتا گیا لیکن زبان ان ساری نظموں کی بوجھل اور ثقیل ہے۔ صفائی اور شیرینی ابھی تک پیدا نہ ہو سکی تھی۔ غزل لکھنے کا رواج بھی اس عہد میں ہو چلا تھا لیکن غزلوں میں عموماً ہندی کے تتبع میں عشق کا اظہار عورت کی جانب سے کیا جاتا تھا۔ اس عہد کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ فارسی اور عربی کے وہ الفاظ جو دکنی روزمرہ میں غلط بولے جاتے تھے شعرا اپنے کلام میں بھی ویسے ہی لاتے ہیں خواہ اس سے کہ لغت کے لحاظ سے وہ صحیح ہوں یا غلط۔

یہ امر حیرت انگیز ہے کہ قطب شاہی سلاطین کے دور میں دیگر اصناف سخن کی نسبت مثنوی کو بہت ترقی ہوئی۔ [illegible] دور کے شعرا میں سے بہتوں کا نام تاریخ ادب میں صرف اس لئے زندہ ہے کہ چند مثنویاں ان کی یادگار ہیں۔ مثنوی کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کا سبب غالباً یہ ہو کہ دوسرے اقسام نظم کے مقابلہ میں اس میں وسعت زیادہ ہے۔ مثنوی میں یہ ضروری نہیں ہے کہ ابیات باہم متفقہ و مردف ہوں۔ ہر بیت قافیہ و ردیف کے اعتبار سے اپنے سابق و لاحق ابیات سے قطعاً جداگانہ ہوتی ہے۔ قافیہ اور ردیف کی وہ پابندیاں جن سے غزل، قصیدہ وغیرہ کا میدان نہایت تنگ ہو جاتا ہے مثنوی کی رو سے ختم ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شاعر کو مثنوی کے اندر زور تخیل کی نمائش اور جولانی طبع کے اظہار کا نہایت عمدہ موقع ہاتھ آتا ہے۔ مثنوی کی وسعت اور ہمہ گیری کے سبب سے اس میں ہر قسم کے مضامین فلسفہ، پند و نصیحت، اخلاق، عشق و محبت، رزم و بزم، سوانح، مناظر قدرت، تاریخ وغیرہ بڑی آسانی اور زور و جوش کے ساتھ بیان کئے جا سکتے ہیں۔ پس قطب شاہی دور میں مثنوی کی اس درجہ مقبولیت کا سبب اس کی ہمہ گیری اور وسعت ہی کو کہہ سکتے ہیں۔ غواصی جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے دربار گولکنڈہ کا شاعر تھا۔ مشہور مثنوی سیف الملوک اسی کی یادگار ہے۔ اس مثنوی میں اس نے سیف الملوک شہزادہ مصر اور بدیع الجمال شہزادی چین کی باہمی محبت کا قصہ نظم کیا ہے۔ مثنوی کی داستان الف لیلہ سے ماخوذ ہے۔ غواصی نے خود بھی اس کا اعتراف کیا ہے۔ مثنوی پھول بن ابن نشاطی کی تصنیف ہے۔ مثنوی کا ہیرو [illegible] پھول بن کے نام پر اس کا نام رکھا ہے۔ اس مثنوی میں طلسماتی دنیا کے عجائب و غرائب دکھلائے گئے ہیں جہاں انسان بے تکلف جانوروں کی صورت میں جلوہ گر ہوتے ہیں اور جہاں لقمان و سکندر جیسے ذوق الفطرت اشخاص کے پند و نصائح سے استفادہ کو ترجیح دی جاتی ہے۔ [illegible] مثنوی کامروپ و کلا مصنفہ تحسین الدین کا خاص طور پر ذکر کرنا ہے۔ یہ وہ مثنوی ہے جسے مشہور جرمن شاعر گوئٹے نے ترجمہ کرانے کے بعد بہت محظوظ ہوا۔ کامروپ

شاہ اودھ کا بیٹا ہے اور کلا قصہ کی ہیروئن لنکا کے بادشاہ کی بیٹی ہے دونوں خواب میں ایک دوسرے پر عاشق ہو جاتے ہیں۔ یہ مثنوی ۱۰۳۶ھ میں محمد اسماعیل ہاشمی کے اہتمام سے شائع ہوئی ہے۔ دربار گولکنڈہ کے آخری شعرا جنیدی، طبعی اور فائز ہیں۔ جنیدی نے اپنی مثنوی ماہ پیکر ۱۰۶۴ھ میں تصنیف کی۔ طبعی اور فائز دونوں گولکنڈہ کے رہنے والے تھے۔ طبعی نے ایک مثنوی تیرہ چودہ سو اشعار کی "بہرام و گل اندام" کے نام سے لکھی ہے قصہ نظامی کی مثنوی ماہ پیکر سے لیا ہے اس کا سنہ تصنیف ۱۰۸۱ھ ہے، فائز نے ۱۰۹۴ھ میں فارسی قصہ رضوان شاہ و روح افزا کا ترجمہ نظم دکنی میں کیا۔

دربار بیجاپور کے مشہور شعرا رستمی، نصرتی، شاہ ملک، امین، شیوا، مومن، ہاشم، اور مرزا ہیں نصرتی علی عادل شاہ ثانی (۱۶۵۶ء تا ۱۶۷۲ء) والی بیجاپور کے عہد میں کرناٹک سے بیجاپور آیا، بادشاہ نے ازراہ قدردانی اُسے اپنا مصاحب خاص بنایا اور ملک الشعرا کا خطاب عطا فرمایا صاحب تاریخ ادب اُردو لکھتے ہیں کہ ابراہیم زبیری نے نصرتی کے کلام کی بہت تعریف کی ہے۔ اس کی مضمون آفرینی، زور طبع اور اوج تخیل کو خاقانی کے ہم پایہ قرار دیا ہے۔ ممکن ہے کہ زبیری نے اپنے بیان میں کچھ مبالغہ سے کام لیا ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ نصرتی نہایت پرگو اور بلند پایہ شاعر تھا۔ تین مثنویاں اس کی یادگار ہیں پہلی مثنوی علی نامہ ہے اسی کے صلے میں اُسے ملک الشعرا کا خطاب ملا۔ اس میں علی عادل شاہ کے سوانح زندگی، فتوحات، داستان عیش و طرب بیان کی گئی ہیں درمیان میں کہیں کہیں مدحیہ قصائد بھی آگئے ہیں۔ یہ پہلی مثنوی ہے جس میں ایک بادشاہ کی مدح کی گئی ہے۔ اس کے قبل ہمیں کسی بادشاہ کی تعریف میں کوئی مثنوی نہیں ملتی۔ نصرتی کی دوسری مثنوی گلشن عشق ہے لیکن اس میں بھی وہی عیب ہے جو سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ بعض اشعار تو صاف ہیں لیکن بہتیرے نہایت ادق مشکل اور پیچیدہ ہیں کہیں عربی و فارسی الفاظ و تراکیب کی کثرت ہے تو کہیں بھاشا و سنسکرت کی۔ نصرتی کی تیسری مثنوی گلدستۂ عشق ہے اس نے قصیدے اور غزلیات کے دو مجموعے بھی چھوڑے ہیں۔ دکنی لٹریچر میں خاص اہمیت کی چیز چھ ہزار ابیات کی ایک مثنوی یوسف زلیخا نام کی ہے اس کا مصنف مشہور نابینا شاعر ہاشمی ہے اس نے اپنا دیوان بھی مرتب کیا تھا جس میں قصائد، غزلیں، مرثیے، قطعے اور رباعیاں سب کچھ تھیں اس کے کلام کی چند خصوصیات ہیں۔ غزلوں کا حصہ ریختہ کی بجائے ریختی میں کہا گیا ہے۔ قدیم بھاشا کا رنگ پورے مجموعہ کلام پر چھایا ہوا ہے ایہام کی بھی کثرت ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہندی شاعری کی تقلید میں ان کے یہاں بھی عشق کی ابتدا عورت ہی کی طرف سے ہوتی ہے۔ ایک اور مشہور شاعر کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے یہ قاضی محمود متخلص بہ بحری ہیں کہا جاتا ہے کہ ان کے اشعار کی تعداد پچاس ہزار تھی ان کی ایک مثنوی "من لگن" نام کی تصوف میں ہے یہ ۱۱۱۲ھ میں تمام ہوئی۔ زبان اس کی مشکل اور ادق ہے۔

ولی کے قبل دکنی لٹریچر کا یہ ایک مختصر خاکہ ہے اس کی زبان، خصوصیت، معنویت اور اس کے عام میلان کا ذکر جستہ جستہ اوپر کی تحریر میں کر دیا گیا ہے لیکن یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مجموعی حیثیت سے بھی ایک نظر اس لٹریچر پر ڈالی جائے سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اب اس کی زبان یکسر مہجور و متروک ہے شمالی ہند کے اہل زبان کا تو کیا ذکر خود اہل دکن بھی بدقت تمام اس دور کی شعر و شاعری کو

سمجھ سکتے ہیں۔ زبان کا چونکہ ابتدائی دور تھا اس لئے کوئی خاص اصول یا ضابطہ لوگوں کے پیش نظر نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مذکر کو مونث اور مونث کو مذکر لکھنا اس زمانہ کی عام خصوصیت ہے۔ خیالات و جذبات میں عموماً رکاکت، ابتذال، سطحیت، عامیانہ پن اور سوقیت ہے۔ معدودے چند کو چھوڑ کر عمق اور معنویت سب کے یہاں مفقود ہے۔ چنانچہ میر تقی میر نکات الشعرا میں فرماتے ہیں "مخفی نماند کہ احوال بعضے از یں شاعران سمت دکن کہ پُر بے رتبہ اند مگر بعض چنانچہ ولی سید عبد الولی سراج و آزاد کہ معاصر ولی بود، سر رشتہ ربط گوئی بدست ایشاں یافتہ می شود باقی سرفہ کلانہ داشت" غواصی، ہاشمی، اور نصرتی مشہور شعرا ہیں لیکن جہاں تک زبان کا تعلق ہے ان میں سے کوئی بھاشا اور فارسی کے امتزاج کا نقطۂ معتدل نہ دریافت کر سکا۔ سب کے یہاں افراط و تفریط ہے ہمیں اس اعتراف میں کوئی تامل نہیں کہ زبان کی ابتدائی تاریخ کے نقطۂ نظر سے ان تمام شعرا کا کلام ایک خاص اہمیت رکھتا ہے لیکن فارسی میں بھدے اور ثقیل سنسکرت یا بھاشا کے الفاظ کی پیوند کاریاں اور بھاشا میں غیر موزوں عربی و فارسی کے الفاظ و تراکیب کے جوڑ بند نہایت بدنما معلوم ہوتے ہیں یہ حالت وہ مدت تک قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ اور ہوا بھی ایسا ہی کہ ولی کے ظہور کے بعد عالم شعر و شاعری میں ایک زبردست انقلاب رونما ہو گیا۔ ولی کے ابتدائی کلام کو زبان کی حیثیت سے کوئی خاص امتیاز حاصل نہیں ہے لیکن دوسری دور سے انھوں نے ایک ایسی شاعری کی بنیاد رکھی جو میر و سودا ورنہ غالب و ذوق کے زمانے میں پروان چڑھی اور جس کی مقبولیت ہر دلعزیزی اب بھی ہندوستان میں بولی جانے والی ہر زبان سے کہیں بڑھی ہوئی ہے۔

ولی کی امتیازی شان فطرت کا یہ اصول ہے کہ اپنے انعامات و احسانات کی بارش کے لئے انسانی بھیڑوں سے صرف چند کو چھانٹ لیتی ہے اور انھیں مخصوص شرف و امتیاز کا مالک بنا کر لوگوں میں معزز و مفتخر کر دیتی ہے تاریخ ان بزرگ ہستیوں کے ناموں کو اپنے زرین اوراق کی زینت سمجھتی ہے اور آنے والی نسلوں کے سامنے فخریہ پیش کرتی ہے۔ قطب شاہی دور سے لے کر ولی کے ظہور تک سیکڑوں شعرا اور ادیب پیدا ہوئے سب نے اپنی اپنی بساط کے مطابق اپنا فرض انجام دیا، اور سب کے لئے ہمارے دلوں میں وقعت ہے لیکن جس مبارک ہستی نے (ایم مہدی حسن مرحوم کی زبان میں) "ایک نوخیز بازاری یعنی کل کی چھوکری کو جس پر انگلیاں اٹھتی تھیں آج اس لائق کر دیا کہ وہ اپنی بڑی بوڑھیوں اور ثقہ بہنوں یعنی دنیا کی علمی زبانوں سے آنکھیں ملا سکتی ہے" وہ ولی کی ذات اور صرف ولی کی ذات ہے یہ شرف ازل ہی سے ولی کے لئے مخصوص ہو چکا تھا کہ بھاشا اور فارسی کا خوشگوار لطیف اور شیریں امتزاج ولی ہی کی ذات سے رونما ہو گا اگر ولی کا ظہور نہ ہوا ہوتا تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ کتنی مدت تک اور ہمارے شعرا دکنی زبان کی ناہمواریوں اور بھاشا و فارسی کی غیر فطری آمیزش کے الجھاؤ میں گمراہ رہتے۔ یہ صرف ولی کا کارنامہ ہے جس نے ایک ایسے ادب کی بنیاد رکھی جس میں ہر نوع کے مضامین تاریخ، فلسفہ، شریعت، تصوف، اخلاق اور جمالیات کی سمائی نیز نازک سے نازک حیات، واردات اور کیفیات کی عکاسی کی قدرت ہو، جو اتم موجود ہے ولی نے آنے والی نسلوں کے لئے ایک صاف سیدھی اور کشادہ شاہراہ تیار کر دی اور انھیں قلیق زبان کی دشوار گذار راہوں اور ان کے مصائب سے نجات بخشی۔

ولی کے مختصر حالات

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ولی جیسے بلند پایہ شاعر کے حالات زندگی تفصیل سے تو کیا اجمال کے ساتھ بھی نہیں معلوم ہوسکے ہیں۔ یہ شخص اگر یورپ میں پیدا ہوتا، تو اس کی زندگی کے تمام شعبوں پر اس کثرت سے کتابیں لکھی جاتیں کہ ایک پوری لائبریری ان سے تیار ہوسکتی اور واقعات و سوانح کا ہر باب ولی کی تصویر کے خد و خال تک کو روشن اور اجاگر کر دیتا۔ لیکن ہماری غفلتوں اور بے نیازیوں کا یہ حال ہے کہ آج ہم ولی کا صحیح نام بھی تحقیق نہ کرسکے، نہیں کہا جاسکتا کہ ولی محمد، ولی الدین، حاجی ولی، شمس الدین اور شمس الحق میں سے کون سا ان کا حقیقی نام تھا اکثر شعراء اپنے نام پر تخلص بھی اختیار کرتے ہیں اس سے خیال ہوتا ہے کہ ولی محمد، ولی الدین، یا حاجی ولی میں کوئی ان کا نام ہوگا لیکن یہ بھی قیاس ہے بہرحال اس بحث کو طے کرنے کا یہ موقع نہیں۔ ولی ۱۰۷۹ھ مطابق ۱۶۶۵ء اورنگ آباد میں پیدا ہوئے بعض تذکرہ نویسوں نے غلطی سے انھیں احمد آبادی اور گجراتی بتلایا ہے لیکن یہ صحیح نہیں ولی کا اورنگ آبادی ہونا ہر اعتبار سے پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے۔ البتہ وہ عرصہ تک طالب علمی کے سلسلے میں احمد آباد میں مقیم رہے اور ۱۱۵۵ھ مطابق ۱۷۴۲ء میں ان کا انتقال بھی ہوا اور دریا خاں کے گنبد کے سامنے دفن ہوئے۔ سورت میں بھی عرصہ تک ان کا قیام رہا ایک مثنوی سورت کی تعریف میں لکھی ہے۔ احمد آباد میں انھیں شاہ وجیہ الدین قدس سرہٗ سے بیعت تھی۔ ولی نے دلی کا سفر بھی دو مرتبہ کیا اور کچھ عرصہ وہاں بھی مقیم رہے۔ شاہ سعد اللہ گلشن دہلوی سے ولی کو ایک خاص عقیدت تھی شاہ صاحب نے ہی ولی کو مشورہ دیا تھا کہ "ایں ہمہ مضامین فارسی کہ بے کار افتادہ اند در ریختہ خود بکار ببر، از تو کہ محاسبہ خواہد گرفت"۔ اور تذکرہ قدرت میں ہے کہ انھوں نے یہ الفاظ کہے "ایں زبان دکنی را گذاشتہ ریختہ را موافق اردوئے معلیٰ شاہجہان آباد موزوں بکنید کہ تا موجب شہرت و رواج قبول خاطر صاحب طبعان عالی مزاج گردد"۔ غرض شاہ صاحب کے مشورے کے موافق زبان اور مضامین ہر لحاظ سے ولی نے اپنی شاعری میں اصلاح کی اور فارسی خیالات و مضامین کی گنجائش کے لئے ریختہ میں تغیر و تبدل کئے، یہاں تک کہ ریختہ کی وہ قدیم ناہمواری اور درشتگی کا خاتمہ ہوگیا اور ایک فصیح، سلیس اور رواں زبان تیار ہوگئی۔ اب ہم یہاں ولی کی شاعری پر ایک تفصیلی نظر ڈالنا چاہتے ہیں اور پھر ولی کے کلام کی خصوصیات سے بحث کریں گے۔

ہمیں مولانا احسن مارہروی کا ممنون ہونا چاہئے کہ انھوں نے دو سال کی پیہم جستجو اور جگر کاوی کے بعد "کلیات ولی" کا نہایت صحیح ایڈیشن ایک فاضلانہ تبصرہ کے ساتھ شائع فرمایا۔ اس ایڈیشن میں مولانا کے بیان کے مطابق چار سو بائیس غزلیں، سات مستزاد، بارہ مخمس اور ترجیع بند چھ قصائد، دو مثنویاں، چھبیس رباعیاں، چھ قطعات اور چالیس مفردات شامل ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ ولی کو ہر صنف کلام پر کیسی حیرت انگیز قدرت حاصل تھی اور یہ کہ وہ کتنے پرگو شاعر تھے۔

ولی کی غزلیں

غزل ابتدا میں محبت اور داستان محبت کے لئے مخصوص تھی لیکن فارسی شعرا نے اس کی وسعتیں بے پایاں کردیں کیفیات محبت کے علاوہ جو غزل کا حقیقی عنوان تھا۔ فلسفہ، اخلاق، تصوف، تاریخ، معاشرت ہر قسم کے مضامین غزل ہی میں لکھے گئے لیکن یہ بات البتہ تعجب انگیز ہے کہ باوجود غزل کی وسعت ہمہ گیری اور ہمہ آمیزی کے اپنے اصلی مرکز سے غزل بہت کم ہٹی ہے یعنی اس

---

[1] تذکرہ شعرائے دکن عبدالجبار خان

دمیت کئے مگ اُسے گیان تھا   اسے ملک فرزند کا دھیان تھا
اجل آئی تو چھوڑا سا ر گیا   اجل کا نہیں کوئی چیتا را کیا

(ماخوذ از مثنوی بعنوان شاہ)

محبوب کی تعریف :۔

کیوں نہ ہر ذرہ رقص میں آئے   جلوہ گر آفتاب سیما ہے

محبوب کی تعریف مشرقی شاعری کا ایک غیر مختتم باب ہے ۔ شاعر عشوہ و ترکانہ اور غمزۂ بے باک کی داستان غارت گری نسروہ بناتا ہے زلف چلیپا، گلاب افشاں جبیں، نرگس بیمار، عارض روشن، لب لعلیں، رخ سیمیں، سلک گہر، سینۂ شفاف، کمر رتیں، ساق بلوریں، اس باب کے مستقل عنوانات ہیں اور مجھے یقین ہے کہ اگر شعرائے اردو کے دواوین کا مطالعہ کیا جائے تو ان میں سے ہر عنوان کے تحت ایک اچھا خاصا لٹریچر جمع کیا جا سکتا ہے لیکن فی الحال ہمیں اس زحمت کشی کی ضرورت نہیں ۔ دیکھنا یہ ہے کہ ولی نے اپنے محبوب کی کیا تعریف کی ہے ۔

فرماتے ہیں ؎   کیوں نہ ہر ذرہ رقص میں آئے   جلوہ گر آفتاب سیما ہے

اس شعر کی ساری خوبی اس کی سادگی اور بے تکلفی میں پنہاں ہے جس زمانے کی زبان کا نمونہ اوپر دیا جا چکا ہے اس عہد میں ایسے صاف اشعار کہنا بجائے خود ایک بڑا کمال ہے لیکن ولی نے اس اجمالی تعریف پر اکتفا نہیں کی ہے آگے فرماتے ہیں ؎

سواد خط خوباں دلکشی میں   بہار گلشن ریحاں ہوا ہے
ترا قد اے بہار گلشن ناز   مثال سرو زیب صد چمن ہے
ترے لب پر جو خط عنبریں ہے   خط یاقوت سوں نقش نگیں ہے
چمن آرائے باغ خوش ادائی   نہال قد سرو گل جبیں ہے

ان اشعار میں ولی نے اپنے مطالب کو روانی و سلاست سے نہایت سادے انداز میں پیش کیا ہے باریکی، پیچیدگی اور نازک خیالی کا شائبہ تک نہیں ملتا ہے ۔ اصل وجہ یہ ہے کہ تکلف و تصنع، باریک بینی اور دقت نظری کسی زبان کے ابتدائی دور میں پیدا نہیں ہو سکتیں بے تکلفی اور بے ساختگی ابتدائے زبان کی خصوصیات ہوتی ہیں ۔ جو خیال جس صورت سے ذہن میں وارد ہوتا ہے شاعر ٹھیک اسی طرح الفاظ کے جامے میں اُسے جلوہ گر کر دیتا ہے عام طور پر نکتہ آفرینی اور دقیقہ سنجی ایسے موقعہ پر ناممکن ہے کیونکہ زبان ابھی ان چیزوں کی متحمل نہیں ہو سکتی ۔ تاہم ولی چونکہ آپ اپنی دنیا کا پروردگار ہے وہ شعرا کی عام صفوف سے ممتاز ہے اس کے یہاں امتیاز کا استثنار کی حیرت انگیز مثالیں ملتی ہیں اور وہ مضامین جو میر و سودا کے زمانے میں شعرا کے مطلوب ہیں الہام ہوئے ولی کے معمولی اور پیش پا افتادہ مضامین ہیں ۔ ولی فرماتے ہیں ؎

کیا ہو سکے جہاں میں ترا ہمسر آفتاب   تجھ حسن کی اگن کا ہے یک اخگر آفتاب

ساری عمر کام کاج، کنگھی، چوٹی، انگیا، کرتی کو بنا لیا تھا۔ اے کاش اردو نظم کے ابوالآباء کی جذباتی شاعری جس کی دلآویزی، شیرینی، بے تکلفی اور لطافت آج بھی ہمارے لیے سبق آموز ہے، شعرائے لکھنؤ کے سامنے ہوتی کہ محبت کی کتنی سادہ اور معصوم تفسیر ہے جو ولی کا یہ شعر پیش کر رہا ہے۔

ہر اک وقت مجھ عاشق زار کوں
پیارے تری بات پیاری لگے

وقت و زمانے کا کوئی تعین نہیں تم خوش ہو، خفا ہو، ناراض ہو، تیوری پر بل ہوں، یا لبوں پر مسکراہٹ، ہر حال میں تمہاری باتیں دل کو بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ نہ کوئی تشبیہ ہے نہ استعارہ۔ الفاظ صاف، سلیس، شستہ، موتی کی طرح منسلک رکھے ہیں۔ شعر کی قدر کرنا چاہو تو نہیں ہو سکتی۔ ولی کا یہ شعر میر تقی میر کے مشہور شعر

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

سے ٹکر کھاتا ہوا معلوم ہوتا ہے

بے کسی کے حال میں یک آن تنہا نہیں
غم ترا سینے میں میرے ہمدم جانی ہوا

دنیا یہ سمجھتی ہے کہ ولی کو دنیا نے یکہ و تنہا بنا دیا۔ وہ دکھ کا مارا ہوا ہے لیکن اسے کون سمجھائے کہ تیرا درد، تیری محبت میرے سینے میں مصروف غمگساری و دلنوازی ہے اور میں اپنی ساری بدحالیوں اور شکستہ سامانیوں کے باوجود ایک لمحے کے لئے بھی تنہائی و مہجوری کا غم محسوس نہ کر سکا۔

مندرجہ ذیل اشعار ولی کی سادہ جذباتی مصوری کا اندازہ پیش کرتے ہیں

شراب شوق سے سرشار ہیں ہم
کبھی بے خود کبھی ہشیار ہیں ہم

بے منت شراب ہوں سرشار انبساط
تجھ نین کا خیال مجھے جام جم ہوا

اے صنم تیرے دہن کے شوق میں
ہر کلی میں نعرۂ ناقوس ہے

عشق مجازی اور ولی

ولی کے سوانح زندگی کی اکثر و بیشتر حقیقتیں ہماری نگاہوں کے سامنے نہیں ہیں۔ ہم یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ ولی عشق مجاز کے لذت آشنا تھے یا نہیں تھے لیکن اتنا تو بہرحال مسلم ہے کہ ان کے کلام میں چند ایسی غزلیں ملتی ہیں جو کسی طرح روحانیت کے دائرے میں نہیں آسکتیں اور وہ شدید تعلق خاطر اور اس کی نوعیت جو ان غزلوں کے حرف حرف سے ظاہر ہے بتلاتی ہے کہ ولی کا محبوب اسی دنیا کا بسنے والا ہے۔ ایک غزل ملاحظہ ہو

مت غصے کے شعلے سوں جلتے کوں جلاتی جا
ٹک مہر کے پانی سوں یہ آگ بجھاتی جا

تجھ چال کی قیمت سوں نہیں دل ہے مرا واقف
اے ناز بھری چنچل ٹک بھاؤ بتاتی جا

اس رین اندھیری میں مت بھول پڑوں تس سوں
ٹک پاؤں کے بچھووں کی آواز سناتی جا

مجھ دل کے کبوتر کوں پکڑا ہے تری لٹ نے
یہ کام دھرم کا ہے ٹک اس کوں چھڑاتی جا

تجھ مکھ کی پرستش میں گئی عمر مری ساری — اے بت کی پوجن ہاری اس بت کو پجاتی جا

تجھ عشق میں جل جل کر سب تن کو کیا کاجل — یہ روشنی افزا ہے انکھوں کو لگاتی جا

تجھ عشق میں ساجن کر جوگی کی لیا صورت — یک بار ارے موہن چھاتی سے لگاتی جا

تجھ گھر کی طرف سندر آتا ہے ولی دائم

مشتاق ہے درشن کا ٹک درس دکھاتی جا

اس غزل کے ہر شعر میں جو رنگ ہے، اور جذبہ لطیف اور آرزو پنہاں ہے وہ صاف طور پر ولی کی دل پذیری کا اعلان کر رہی ہے۔ ممکن ہے بعض لوگوں کو مثلاً ایسی قسم کی غزلیں مخرب اخلاق اور حیا سوز ہوتی ہیں ان کو نظر انداز کر رہا ہوں۔ لیکن میں یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ نفس شاعری کو اخلاقی معاملات سے بہت کم تعلق ہے اور کسی شاعر کے کلام پر تنقید کرتے وقت صحیح معیار شعر و نقطہ کا ہے نہ کہ اخلاقی زاویہ نگاہ۔

تصوف

ولی کے کلام میں تصوف کے مضامین کی کثرت ہے۔ ولی سلسلہ سہروردیہ میں حضرت شاہ وجیہ الدین قدس سرہ سے بیعت ہونے کی وجہ سے حضرت شاہ صاحب سے خاص خلوص و عقیدت رکھتے تھے۔ ولی کے متصوفانہ میلانات خاطر نے حقیقت سے بھی کافی روشنی پائی ہے کہ جب وہ دلی میں آئے تو اگرچہ انھیں یہاں بہت دنوں رہنے کا اتفاق نہیں ہوا لیکن ولی سب سے زیادہ متاثر حضرت سعد اللہ شاہ گلشن سے ہوئے ان سے تصوف و معرفت کی تعلیم پائی اور ان کی صحبت میں داخل تھے۔ فرماتے ہیں

ہر ایک سوں متواضع ہو سر بسری یہ ہے — سنبھال کشتی دل کو قلندری یہ ہے

خیال فکر فاتر سوں جام جم کا خیال — صفا کر آئینہ دل سکندری یہ ہے

خیال یار کو رکھ اپنے دل میں محکم کر — کہ ماہ تعال کے نزدیک شیشہ پری یہ ہے

بساط بزم میں تجھ مکھ کے قوت بہت — [illegible]

شعر صاف و پختہ ہوتے ہیں یعنی بیان کرنے کی ضرورت نہیں البتہ شعر میں دنیا ضروری ہے یعنی یہ بے رنگی دنیا کی جگہ ہر کا بہ دو ختہ حال سے قدم نہ بڑھا۔ دنیوی آلائشات سے دامن بچائے اور واضح تعبیر سے خوبی کے ساتھ شعر دل کے جذبات کی کی ہے وہ اور طرح ممکن نہیں آگے فرماتے ہیں۔

پایا ہوں ولی سلطنت ملک قناعت — تب تخت و چتر حق میں مرے ارض و سما ہے

منازل تصوف چار ہیں شریعت۔ طریقت۔ معرفت اور حقیقت منزل شریعت میں سالک خود کو عبادات و ریاضت کے لئے وقف کر دیتا ہے یہاں تک کہ وہ طریقت کی منزل میں پہنچ جاتا ہے اور عبادات جسمانی سے نجات حاصل کرتا ہے تب یقین ہے حضرت باری تعالیٰ کا ہر وقت اور ہر گھڑی دل میں رکھتا ہے گویا زندگی کا ہر لمحہ عبادت و ریاضت ہی میں بسر کرتا ہے اب اس کے دل پر ذات الہٰی کی تجلیات منعکس ہونی شروع

ہوتی ہیں۔ یہی منزل معرفت کی منزل ہے اس کے بعد حقیقت کی منزل آتی ہے جہاں پہنچ کر سالک ہمہ تن نظارۂ انوار خدا میں محو ہو جاتا ہے یہاں تک کہ خود اپنی حقیقت بھی فراموش کر دیتا ہے لیکن اس منزل پر پہنچ کر سالک کی حیرت انتہا تک بڑھ جاتی ہے اور نہیں جانتا کہ کن الفاظ میں اپنے محبوب کی ثنا بیان کرے۔ ولی اسی منزل پر پہنچ کر فرماتے ہیں۔

اے ولی تعریف اس کی کیا کروں | جو صریح مستغنی از اوصاف ہے

یوں تو خداوند تعالیٰ کی حمد و ثنا میں بہت سے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں جو اس کی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں لیکن واقعہ یوں ہے کہ وہ ہر طرح تعریف و توصیف سے بالا تر ہے وہ حمد و ثنا سے بے نیاز و مستغنی ہے یہ نکتہ ہر شخص پر نہیں ظاہر ہوتا اس نکتے کو وہی خوب جانتا ہے جو مشاہدۂ جمال میں ہمہ تن مصروف ہے ولی کے اس شعر میں لفظ ولی نے ایک خاص زور اور معنویت پیدا کر دی ہے۔

دو چار شعر اور ملاحظہ ہوں

جس کوں تجھ حسن کی نہیں ہے خبر | بے گماں وہ جہاں میں غافل ہے

خودی سے اولاً خالی ہو اے دل | اگر اس شمع روشن کی لگن ہے

شاعرانہ تعلی

شعرا کا عام دستور ہے کہ اپنے کلام میں خود کہیں کہیں فخر و تعلی سے کام لیتے ہیں اور اپنے کلام کے حسن و خوبی کی طرف خود ہی اشارہ کرتے ہیں یہ دستور برا نہیں ہے بشرطیکہ واقعی وہ صحیح خوبیاں گنائی جائیں البتہ جب مبالغہ جھوٹ اور بے سر پا باتوں سے کام لیا جاتا ہے تو یہ شاعرانہ تعلی خود شاعری کی ہجو بن جاتی ہے۔ فارسی شعرا میں جس نے فخر و تعلی کے مضامین کو ایک مستقل صورت بخشی وہ عرفی ہے۔ عرفی نے پوری پوری غزلیں اور قصیدے اسی مضمون کے تحت لکھ ڈالے ہیں اور اس کی حد سے بڑھی ہوئی خود ستائی، مردم گریزی اور رفعت تخیل نے ان قصیدوں اور غزلوں میں ایک خاص شکوہ اور تمکنت پیدا کر دی ہے۔ حق یہ ہے کہ عرفی کے محاسن شاعری کے لحاظ سے یہ تعلیاں اس پر پھبتی بھی ہیں۔ ولی نے یقیناً صفائی، چستی، متانت اور وسعت پیدا کی اور لفظی و معنوی ہر لحاظ سے مستقل اضافے کئے اپنی ان خدمات کا انھیں پورا احساس تھا چنانچہ انھوں نے بھی فارسی شعرا کی طرح فخر و ناز کے مضامین باندھے ہیں فرماتے ہیں۔

ولی ایران و توران میں ہے مشہور | اگرچہ شاعر ملک دکن ہے

بسا ہے دل سوں اپس کے تریاد خاقانی | ولی کو دیکھ کر بے شک انوری یہ ہے

اے ولی لگتا ہے ہر دل کوں عزیز | شعر تیرا بسکہ شوق انگیز ہے

تھوڑے سے تفحص و جستجو سے کلیات ولی میں سے فخریہ اشعار نکالے جا سکتے ہیں لیکن اس کی ضرورت نہیں ہے مقصود صرف اتنا تھا کہ ولی کے کلام سے اس قسم کے چند اشعار پیش کر کے یہ بتلا دیا جائے کہ ولی کو خود اپنی خوبی و کمال کا پورا احساس تھا اور اس قسم کے جو اشعار ان کے کلام میں ملتے ہیں وہ واقعیت اور حقیقت پر مبنی ہیں۔

آسماں اوپر نہ پوچھو چادرِ ابرِ سفید ۔۔ جانمازِ زاہدِ عزلت نشیں برباد ہے

آسمان پر پھیلے ہوئے ابر کے ٹکڑوں کو زاہد کی بچھی ہوئی جانماز کی دھجیاں کہنا ایک ایسا مضمون ہے جس میں ندرتِ خیال اور شوخیِ تشبیہ کی اعلیٰ شانیں موجود ہیں۔ یہ حقیقت یاد رکھنے کی ہے کہ ولی کے دیوان میں فقط تمسخر و استہزا کی چوٹ نہیں ہے بلکہ اس میں بہت سی کام کی باتیں بھی ملتی ہیں اور اخلاق پند و نصائح کی طرف مخصوص اشارات پائے جاتے ہیں۔

قصیدہ ولی نے قصائد کم لکھے ہیں اس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ ان کی طبیعت فقر و قناعت، عزلت و گوشہ نشینی، صبر و شکر اور تسلیم و رضا کی جانب زیادہ مائل تھی۔ انہیں دنیاداری، خوشامد پسندی، شوکت و حشمت اور نمود سے جتنا نفرت تھی اس کی وجہ سے وہ زیادہ قصیدے نہ لکھ سکے۔ ایران میں اور خود ہندوستان میں قصیدہ گوئی کو ترقی اس وقت زیادہ ہوئی جب بادشاہوں کی دھوم تھی اور شعراء انعام و اکرام کی چاٹ میں بادشاہِ وقت کی مدح میں قصائد لکھ لکھ کر لے جاتے اور صلہ سے فیضیاب ہو کر واپس آتے۔ عرفی نے اکبر کی مدح میں نہایت زوردار قصیدہ لکھا ہے جس میں نرگس ردیف قرار دی ہے یہ قصیدہ عرفی کے تخیل کی حیرت کاری کی ایک نادر مثال ہے نظیری نے جہانگیر کی مدح میں جب یہ شعر لکھا۔

اے خاکِ درت صندلِ سرگشتہ سراں را ۔۔ باد و شہ و جاروب جبت تاجوراں را

تو جہانگیر نے نظیری کو تین ہزار بیگھہ زمین انعام میں دی اسی طرح شاہجہاں نے ایک شاعر کو سونے میں تلوایا تھا۔ مسلمان سلاطین کی شعر نوازی اور ان کے انعام و اکرام، داد و دہش کے اس امڈتے ہوئے دریا نے چمنستانِ شاعری کو سرسبز و شاداب بنا رکھا تھا اور خصوصیت کے ساتھ قصیدہ گوئی کو جو ترقی اس زمانے میں ہوئی وہ آج تک نصیب نہ ہو سکی۔

ولی کے دور میں اورنگ زیب فرمانروائے سلطنت تھا۔ وہ شعر و شاعری اور موسیقی کو ایک بیکار شغل سمجھتا تھا اس لئے اس دربار میں شعر کی قدر نہ ہوتی تھی اور اس کے بعد سلطنتِ مغلیہ کے اچھے دن ختم ہو گئے۔ چنانچہ ولی نے جتنے قصیدے کہے ہیں ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے جو سلاطین امراء یا رؤسا کی مدح میں کہا گیا ہو کیونکہ خوشامد و تملق سے ان کی طبعی نفرت اور کچھ حوالے کے اثر نے انہیں موقع ہی نہیں دیا کہ وہ کسی امیر یا رئیس کی شان میں قصیدہ کہیں۔ ان کے تمام قصیدے نعت، منقبت یا اپنے مرشدوں کی تعریف و توصیف میں ہیں لیکن ایک سرسری مطالعہ سے معلوم ہو جاتا ہے کہ قصیدہ گوئی میں ولی کو خصوصیت سے کمال حاصل تھا۔ ہم جب مولانا احسن مارہروی کی یہ رائے "ولی غزل کی طرح قصیدے میں کوئی خاص امتیازی حیثیت نہیں رکھتے" پڑھتے ہیں تو سخت تعجب ہوتا ہے اور نہیں سمجھتے کہ جس کے دیوان میں یہ قصیدہ: ؎

ہوا ہے خلق اوپر پھر کے فضلِ سبحانی ۔۔ کیا ہے ابر نے رحمت سے گوہر افشانی

موجود ہو اس کی قصیدہ گوئی اور علو خیالی سے کون انکار کر سکتا ہے۔ ولی نے یہ قصیدہ وجیہہ الدین علوی گجراتی کی مدح میں لکھا ہے اس کے بعض بعض شعر درج کئے جاتے ہیں۔

تمام پات تسبیح بحمد و شکر بہ حکم — زبان حال سے کرتے ہیں ذکر سبحانی
قطار قطرۂ شبنم سے آج سبزۂ خضر — لے سبحہ ہاتھ میں کرتا ہے ورد خوانی
اس آب رنگ فوارے کی کمال لطافت دیکھ — چھپا ہے پردۂ ظلمت میں آب حیوانی
چمن میں اس کے کرم نے دیا ہے حکمت سے — ہر ایک پھول کی پکھڑی کو رنگ گلجانی

پھر شاہ صاحب کے روضے کے چراغوں کے متعلق فرماتے ہیں

چراغ یاں کے تماشے انجمن میں گردانت — دیئے ہیں چرخ کو تعلیم سبو گردانی
نئے قلم ہے مرا نیشکر سے شیریں تر — کیا ہوں بسکہ حلاوت سے شکر افشانی

قصیدے میں چار عناصر ہوتے ہیں تشبیب، گریز، مدعا، دعا۔ ابتدائی حصے کو تشبیب کہتے ہیں اس حصے میں عشق و محبت، بہار، آشوب زمانہ، شکایت فلک، اسی قسم کے اور مضامین نظم کیے جاتے ہیں۔ گریز میں شاعر ایک نہایت لطیف پیرائے و حسن انداز کے ساتھ غرض یعنی ممدوح کی مدح و ثنا کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ گریز کا مقام بہت نازک ہوتا ہے یہ دو مختلف مضامین کو ایک ایسے مرکز پر لاتا ہے کہ دونوں میں ربط قائم ہو جائے اور کہیں ناہمواری یا بے ربطی نہ معلوم ہو۔ ولی نے مندرجہ بالا قصیدے کی ابتدا بہار سے کی ہے اور بہار کا ذکر اس انداز سے کرتے جاتے ہیں کہ ذہن آہستہ آہستہ خود ان کے مدعا کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور گریز کا کمال یہی ہے کہ اس میں آورد نہ ہو بلکہ یہ بھی نہ معلوم ہو کہ تشبیب کہاں ختم ہوئی اور گریز کہاں سے کیا اور مطلب کس جگہ سے شروع ہوا۔ ہم یہاں گریز کے موقع کے دو تین شعر درج کرتے ہیں اس سے ولی کی استادی کا حال معلوم ہوگا

تمام ملک ہوا حق کے فضل سے آباد — رہا نہیں ہے جگت میں نشان ویرانی
زہے بہار حلاوت زہے بہار طرب — کہ بلبلوں نے لیا شیوۂ غزل خوانی
چراغ گہ پہ روضے کے جو ہوئے روشن — ہر اک چراغ ہے جیوں آفتاب نورانی

بہار کا ذکر اس انداز سے کرتے ہیں کہ بزم عیش و نشاط، موسم بہار کی طرب افشانی، عنادل کی نغمہ پردازی، پھولوں کی عنبر بیزی اور جلسہ ہائے طرب کی مدہوشی وغیرہ۔ یہ تمام سرور افزا سماں کے مناظر ایک ایک کرکے ذہن کے سامنے آتے جاتے ہیں اور اسی کے ساتھ وہ روضے کے چراغوں کی نور افشانی کی بھی تصویر کھینچ دیتے ہیں۔ پورا قصیدہ پڑھ جائیے کہیں ناہمواری یا بے ربطی یا خلا کا نام و نشان نہ ملے گا گریز کی اس درجہ چست اور موزوں مثالیں کم ملتی ہیں۔

مثنوی مثنوی کی وسعت و ہمہ گیری، مقبولیت و ہر دلعزیزی سے متعلق یہ اجمالی بحث اسی تحریر میں کسی جگہ کی جا چکی ہے اسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ مثنوی میں ولی کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ افسانوی عشق و محبت، جن و پری کے قصے اور مافوق الفطرت داستانوں سے پرہیز کرتے ہیں۔ مثنوی دجھن جو ان کے نام سے منسوب کی جاتی ہے وہ ان کی نہیں ہے بلکہ ولی ویلوری کی ہے۔

ولی کی مشہور مثنوی وہ ہے جو انھوں نے سورت کی تعریف میں لکھی ہے یہ مثنوی اپنی مختلف خصوصیات کے باعث اس قابل ہے کہ وہ اردو

کی جدید مثنویوں کے مقابلے میں بلا تامل پیش کی جا سکتی ہے۔ ولی کے ماقبل اور معاصر شعرا کا یہ حال ہے کہ محبت و الفت کے بے مزہ یا غیر ممکن الوقوع افسانے جن میں مبالغہ کا عنصر مضحکہ انگیز حد تک بڑھ گیا ہے بہت سلیقہ اور انہماک سے بیان کرتے ہیں ان کے مقابلہ میں جب ہم ولی کی مثنوی سورت پر نظر ڈالتے ہیں تو لامحالہ ان کے تجدد اور امتیاز کا قائل ہونا پڑتا ہے اور یہ جو کہا گیا ہے کہ شعرا تمام قدامت پرست ہیں تو اس کی تصدیق ولی کے کلام سے پوری طرح ہوتی ہے۔ انھوں نے ہر موقع پر اپنی ایک جدید راہ پیدا کی اور اردو شاعری میں زندگی و نشوونما کے سارے خصائص مہیا کر دیے۔ یہ حقیقت ہے کہ اردو شعرا اس تجدد کی نکالی ہوئی راہ پر آگے چلتے تو لکھنو اور دلی کے دو الگ اسکول نہ پیدا ہوتے اور اردو شاعری میں جو تکلفات میں جو ابتذال اور سطحیت آ گئی تھی اس کی نوبت نہ آتی اور اب تک ہماری شاعری ترقی کی دوڑ میں بہت آگے نکل چکی ہوتی۔ جو کام اب ہو رہا ہونا تھا وہ ہو کر رہتا۔ ہمیں اس موقع پر مثنوی میں ولی کے امتیاز پر گفتگو کرنی ہے۔ مثنوی سورت کے چند ابیات درج ذیل ہیں:

عجب شہروں میں ہے پر نور اک شہر — بجا ہے گر کہوں عالم میں مقصود دہر

ہے مشہور اس کا نام سورت — کہ جاوے غم کے دیکھے سب کدورت

کنارے اس کے اک دریائے تپتی — کہ دنیا دیکھنے کو اس سے تپتی

عجب قلعہ ہے واں ایک بر قرینہ — انگوٹھی میں دنیا کی جیوں نگینہ

نزاکت کے باغ لگا ہے واں — کہ دام گلرخاں کی پشت ہے واں

رہت ان حاشیے پر بات آرام — طلسمی باغ واں ہوتا ہے ہر شام

کہ اس بہتر کئے ایسے ہیں جھجا — کہ قادر کو نزاکت ان کے بنیں با

ان اشعار میں ولی نے سورت کی تجارت، دولت اور حسن کا ذکر کیا ہے۔ دراصل یہ چیزیں آج بھی سورت کی خصوصیات ہیں۔ سورت کئی ہزار دولت میں مشہور ہے۔ حسن و جمال کے لحاظ سے بھی سورت کے مرتبہ کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ولی اپنی مثنویوں میں واقعیت اور حقیقت پر زور دیتے تھے اور انہیں کو موضوع شاعری قرار دے کر ان میں شاعرانہ لطافتیں، آرائش اور حسن پیدا کرتے تھے۔ درحقیقت شاعری حقائق، واقعات اور تخیل کے ایک شیریں، موزوں اور دلاویز امتزاج کا نام ہے۔ تنہا خیال پردازی اور مبالغہ بدمزہ، بے معنی اور شاعری کے لئے رسواکن چیزیں ہیں جن سے ولی کا کلام بڑی حد تک پاک ہے۔ ہم کو حیرت ہوتی ہے کہ جدیدیت کا رنگ کیسی ہمہ گیری کے ساتھ ہمارے اس قدیم شاعر پر چھایا ہوا تھا۔

رباعی ولی نے رباعیاں بھی کہی ہیں اور فارسی شعرا کی مکمل پیروی کی ہے۔ رباعی چونکہ صرف چار مصرعوں کی ہوتی ہے اس لئے اس میں متعدد اور الجھے ہوئے خیالات کی گنجائش نہیں ہوتی۔ عموماً رباعی میں کوئی ایک خیال لے لیا جاتا ہے اور چوتھے مصرعے پر ایک خاص جدت اور ندرت کے ساتھ اس کی تکمیل کر دی جاتی ہے۔ ولی کے کمال کی سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ انھوں نے ہر صنف سخن پر اظہار خیال کیا ہے

اور کئی بہت عمدہ ہیں۔ آگے میں نمونتاً دو ایک رباعیاں درج کی جاتی ہیں

رکھتا ہوں میں دل میں [illegible] جو نگاہ ہنوز ہے شوق میں تیرے [illegible] بے نگاہ ہنوز
تجھ غم سے ہیں اگرچہ [illegible] تب لے سینے میں جو ہے [illegible] ہنوز

دنیا کی بے ثباتی اور ترک دنیا کی ترغیب

یہ ہستی موہوم سے تجھ کو سراب پانی کے نقش ہے یہ مثل حباب
بے نقش یہ دل کو [illegible] ہر نب پس کو نہ گزر [illegible] سے خانہ خراب

تاثیر، دل نشینی اور سبق آموزی ولی کی رباعیات کا طرۂ امتیاز ہیں اور ان خصوصیات کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ رباعیوں میں بھی اپنا درجہ ولی نے قائم رکھا ہے

ولی نے مخمس، مستزاد اور قطعات بھی کہے ہیں جیسا کہ اس سے قبل ذکر کیا جا چکا ہے لیکن مستزاد و قطعات غزل اور مثنوی کے ضمن میں آ جاتے ہیں اس پر الگ بحث کرنا طوالت کا باعث ہوگا لہٰذا یہ چیزیں نظر انداز کی جاتی ہیں۔

تشبیہ و استعارہ

تشبیہ و استعارہ ولی کے کلام میں اگر سلیقے سے انہیں استعمال کیا جائے تو کلام حسن و اثر کا مرکز ہو جاتا ہے تشبیہ و استعارہ کی مدد سے ایسی [illegible] بھی جو لفظوں میں بیان نہیں کی جا سکتی ہیں چند جملوں یا لفظوں میں آسانی سے بیان کی جا سکتی ہیں۔ ولی فرماتے ہیں۔

آسمان اوپر نہیں ہے چادر آبگینہ [illegible] صورت نشیں پردہ ہے

جاناں کی دیکھیوں کے انتشار کو بیان کرنے کا اس سے بہتر اور پرلطف طریقہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ انہیں [illegible] آبگینہ [illegible] ولی کی تشبیہ میں عموماً تازگی، شگفتگی اور جدت ہوتی ہے۔ دوسری جگہ کہتے ہیں۔

عجب کچھ ہے ولی کی بات زرینہ انگوٹھی میں دنیا کی جیوں نگینہ

شہر سورت کے قلعے کی تعریف کر رہے ہیں۔ دنیا کو ایک عظیم الشان انگوٹھی فرض کیا ہے اور سورت کے قلعے کو اس انگوٹھی کا نگینہ قرار دیا ہے تشبیہ کی یہ ایک عمدہ اور شگفتہ مثال ہے

ہوا معلوم تجھ زلفاں سے تو [illegible] کہ شاہ حسن پر ظل ہما ہے

چونکہ استعارہ شاہ حسن سے کیا ہے اور پھر زلف کو ظل ہما سے تشبیہ دی ہے۔ مثل مشہور ہے کہ جس کے اوپر ہما کا سایہ پڑ جائے وہ بادشاہ ہو جائے گا۔ ولی کو اس کا تو یقین ہے کہ محبوب حسن کی دنیا کا بادشاہ ہے اس مناسبت سے ظل ہما کا خیال پیدا ہوتا ہے اور زلفوں کی سایہ فگنی کو دیکھ کر یہ یقین ہو جاتا ہے کہ یہ زلفیں نہیں ظل ہما ہے۔ مضمون منطقیانہ ہو جاتا ہے لیکن کیف سے خالی نہیں ہے۔

رُخِ زمیں کا خال ہو زینت ہے اے صنم   تیرا جو مثلِ نقشِ قدم پائمال ہے

محبوب کے نقشِ قدم کو روئے زمین کے خال سے تشبیہ دینا ندرتِ خیال کی نہایت اعلیٰ مثال ہے۔ ولی کے یہاں عام اور پامال تشبیہیں نہیں ہیں ان کی تشبیہوں میں کیف، حسن اور دلآویزی پائی جاتی ہے۔ تھوڑی سی جستجو سے اس قسم کی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں۔

صنائع و بدائع

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم فرماتے ہیں۔ "قابلِ نفرت ہیں وہ تمام فضلاء جنھوں نے علمِ صنائع اور بدائع کو فروغ دیا ہو لیکن اگر ان کی تمام کتابیں جلادی جائیں تو شعرا کا ذرا بھی نقصان نہیں اور یہ بدی الفادی کا قول ہے کہ کسی نازنین کی زلف عنبریں جو شانوں پر بکھری ہوئی حسنِ انتشار کے ساتھ کمر سے نیچے جا پڑی ہو کیفیت سے خالی نہیں ہوتی لیکن گرہ شب یعنی جوڑے کی بندش اس سے زیادہ دلکش اور خوش ترکیب ہوتی ہے"۔ ڈاکٹر مرحوم جس چیز کے خلاف ہیں بارہا اشارۃً وہ اُسے سرمایۂ دلکشی تصور کرتا ہے اور ہمارا بھی یہی خیال ہے کہ صنعتوں میں اگر شائبۂ تکلف نہ پایا جائے۔ بے ساختگی اور آمد ہو تو اریب وہ گرہ شب سے کم دلکش نہیں صنائع و بدائع کو اصل مقصود سمجھ لینا اور ان کی خاطر مضامین کا خون کر دینا ایسا ہی ہے جیسے دلہن کو زیورات کی کثرت سے اس طرح ڈھک دینا کہ حسنِ فطری روپوش ہو جائے لیکن یہی چیز اگر سلیقے سے استعمال ہوئی ہوتی تو فطری دلآویزی و دلکشی جو اصل مقصود ہے کہیں بڑھ جاتی۔ ولی نے صنعتوں سے ضرور کام لیا ہے لیکن آورد اور بدسلیقگی کے ساتھ نہیں۔ ایہام کا ان کے ہمعصر شعرا کے کلام میں زور ہے اور عجیب تر یہ کہ شعرا سے ما بعد بھی صنعتِ ایہام کے زلیفتہ تھے درانحالیکہ وہ خود کو ولی کا متبع و مقلد بتلاتے تھے اور ولی کے یہاں یہ چیز ان کے ماحول کو دیکھتے ہوئے حیرت انگیز طور پر کم ہے۔ ولی نے چند گنی چنی صنعتیں استعمال کی ہیں اور اس طرح استعمال کی ہیں کہ ان سے مضمون کی وضاحت اور حسنِ کلام میں اضافہ ہو جاتا ہے

حسنِ تعلیل ؎

اِس آبِ روح فزا کے کمالِ لطف کو دیکھ   چھپا ہے پردۂ ظلمت میں آبِ حیوانی

آبِ حیواں، زندگیٔ جاوید بخشتا ہے اس وصفِ خاص میں اُس کا ہمسر کوئی نہیں لیکن بارانِ رحمت نے دنیا کے ذرے ذرے کو اس طرح سیراب و شاداب کر دیا ہے کہ آبِ حیوان نادم ہو کر رہ گیا اس لئے کہ فیوض و برکات میں وہ بارانِ رحمت کا حریف نہیں بن سکا۔ چنانچہ احساسِ ندامت سے وہ پردۂ ظلمت میں روپوش ہے۔ ولی نے اس تعلیل میں واقعیت اور خیال آفرینی دونوں کو بکمالِ استادی برقرار رکھا ہے۔

تعلیل کی دوسری مثال ؎

آج تیری نگہ نے مسجد میں   ہوش کھویا ہے ہر نمازی کا

نماز جب خشیت اور حضوریٔ قلب کے ساتھ ادا کی جائے تو نمازی پر کیف و محویت کی حالت طاری ہو جاتی ہے اور وہ دنیا کی ہر چیز سے بے خبر ہو جاتا ہے اس کے تصورات کا مرکز صرف ایک ذات ہوتی ہے۔ اکثر ایسا ہوا کہ صحابہ کرام نماز میں اس درجہ محو ہو گئے کہ جو اٹک پرندوں نے بے ضرر اور بے جان سمجھ کر ان پر بیٹھ گئے ولی اس محویت کو ہوش کھو جانے سے تعبیر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ اس لئے کہ آج تو مسجد سے گذرا

چناں گرفتہ جا بمیان جان شیریں
نتواں ترا و جاں را زہم امتیاز کردن

جوں کا توں ترجمہ اردو میں کیا ہے

کیا بسا ہے آ کے تیرا خیال جیو میں
مشکل ہے جیو سوں تجھ کو اب امتیاز کرنا

اس ترجمے کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ اس وقت لگایا جا سکتا ہے جب ولی سے قبل کے شعرا کے ترجمے پیش نظر ہوں اور باہم موازنہ و مقابلہ کیا جائے۔ حافظؔ کا مشہور شعر ہے ؎

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو
کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت این معما را

سلطان محمد قلی قطب شاہ نے اس کا ترجمہ کیا ہے لیکن اس طرح کہ صورت و سیرت ہر لحاظ سے شعر مسخ ہو کے رہ گیا ہے فرماتے ہیں۔

دنیا کا حکمت نہ بوجھیں ہور جگ کیاں علم وں
کا ڈتر نا عیش کا نس دن پیالے نام پر

ولی کے ترجمے میں اصل شعر کی موسیقیت اور روح پوری طرح جلوہ گر ہے اس سے قطع نظر زبان بھی انھوں نے وہ اختیار کی ہے جو ان کی تربیت، اضافہ اور اصلاح کے بعد سارے ہندوستان کی ادبی زبان ہونے والی تھی ترجمے کی یہ خصوصیات سلطان محمد قلی کے شعر میں نہیں ہیں بلکہ بحر و طرز ادا کے لحاظ سے بھاکا ایک شعر ہو کے رہ گیا ہے۔

نظیری کی غزل سامنے رکھ کر ولی نے یہ شعر کہا ہے ؎

ہے ناز میں صنم کو انصاف دراز کرنا
فتنہ کا ہے نشاں پر دروازہ باز کرنا

لیکن اسلوب بیان اور مضمون ہر دو نقطۂ نظر سے اردو میں مستقل اضافہ تھا

امیر خسرو کا مشہور شعر ہے۔

جاں زتن بردی و در جانی ہنوز
دردہا دادی و درمانی ہنوز

ولی نے بھی انہیں عروقوافی میں شعر کہے ہیں اور فارسی کے انداز اور خیال کا چربہ اردو میں اتارا ہے۔

تو ہے رشک ماہ کنعانی ہنوز
تجھ کو ہے خوباں میں سلطانی ہنوز

اردو زبان کی وسعت و ترقی کے سلسلے میں ولی کی یہ خدمات ہمیشہ وقعت کی نگاہوں سے دیکھی جائیں گی۔

خاتمہ | اب جب کہ ولی کی شاعری کے تقریباً تمام پہلو سامنے آگئے یہ آسان ہے کہ ہم مجموعی حیثیت سے ان کے متعلق کوئی رائے قائم کریں ولی سے قبل کے دکنی ادب پر ایک نگاہ ڈالی جا چکی ہے اس کی نوعیت اور حیثیت سے بھی بحث ہو چکی ہے۔ اس کے مطالعہ کے بعد ہر شخص ولی کے شرف و امتیاز خصوصیت و انفرادیت کا اندازہ بآسانی کر سکتا ہے لیکن گذشتہ صفحات پر جو مباحث پھیلے ہوئے ہیں انھیں سمیٹنے کے لئے ضروری ہے کہ یہاں چند باتوں کی طرف اشارہ کر دیا جائے۔ پہلی بات اس سلسلے میں یہ کہنی ہے کہ جہاں تک زبان کی پاکیزگی لطافت اور وسعت کا تعلق ہے ولی کی خدمات اس وقت تک

پتہ چلتا ہے اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ باوجود اس کے کہ اردو شعر و شاعری پر مختلف دور گزر چکے ہیں اور ہر دور میں اردو شاعری برابر اپنا قالب بدلتی رہی ہے۔ پھر بھی مندرجہ بالا عنوانات کی اہمیت جوں کی توں قایم ہے تو ہمیں بے اختیار ولی کو اردو شاعری کا ابوالآبا تسلیم کر لینا ہوتا ہے۔ قصیدہ اور مثنوی پر تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے ان اصناف میں بھی ولی نے اپنا رتبہ قایم رکھا ہے۔

نیز بچپن کی عمر میں تحصیل علوم کے شوق نے اُبھارا۔ اُس زمانہ میں احمد آباد دارالعلوم تھا خصوصاً مولانا وجیہہ الدین علوی گجراتی المتوفی ۹۹۹ھ کا مدرسہ مشہور تھا یہاں ولی ایک سال تک علوم ظاہری و باطنی کی تحصیل میں مشغول رہا۔ پھر علوی خاندان کے سجادہ نشین سے طریقہ قادریہ شطاریہ کے مطابق بیعت کی اور اپنے اصل وطن اورنگ آباد واپس آئے۔ پیدائش ۱۶۹۶ء وفات ۱۷۴۴ء

(بحوالہ کلیات ولی، مرتبہ احسن مارہروی)

مندرجہ بالا حالات سے ہم یہ استنباط کر سکتے ہیں کہ ولی کی شخصیت تصوف میں رنگی تھی۔ اس زمانہ میں تصوف کا چرچا بھی عام تھا شعرا اور مشائخین میں اس کی خاص قدر تھی۔ اس کے علاوہ ولی کی نشو و نما ایسے ماحول میں ہوئی جبکہ بادشاہان وقت علم و ہنر کے بڑے قدردان تھے قطب شاہی اور عادل شاہی خاندان کے حکمراں اپنی ادب نوازی کے لئے اردو میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ ان کی قدردانی نے ابتدائی دور اردو کو مختلف اصناف سخن سے مالا مال کر دیا۔ یہ مسلمہ ہے کہ ہر شاعر اپنے متقدمین اور ہمعصر شعراء سے ضرور متاثر ہوتا ہے۔ ان کی طرز نگارش جیبوں کی ساخت یا خاص خاص محاورات و تراکیب کا تتبع قابل فخر ہوتا ہے لیکن قوت فیصلہ کی پختگی کے ساتھ بالکل اس روش کو ترک کر کے اپنی شاہراہ الگ بناتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ولی اپنے متقدمین اور ہمعصر شعراء کے کہاں تک ممنون ہیں۔ اس کے لئے ہمیں ان کے کلام کا مختصر جائزہ لینا ہے

ولی سے قبل دکنی شاعری

قدیم دکنی ادب میں زیادہ حصہ مثنوی کا ہے۔ اس زمانے میں یہ صنف اس سے مرغوب تھی کہ شعراء عموماً ہر قسم کے مضامین زیادہ پسند کرتے تھے اس کے علاوہ یہ ادب کے ابتدائی دور میں معانی اور قصہ کو زیادہ پسند کیا جاتا ہے اس لئے دکنی میں مثنوی کو فروغ ہوا جو مسلسل داستان کے لئے بہترین صنف ہے۔

اس زمانہ کی دکنی اس قدر پیچیدہ اور غیر مانوس ترکیبوں سے بھری ہے کہ موجودہ زمانہ کے دکنی بھی اس کو نہیں سمجھ سکتے ابتدا ہی میں جو اسلوب اختیار کیا وہ بے حد ادق اور ناقابل فہم ہے خصوصاً شمالی ہندوالوں کے لئے یہ حصہ کوئی دلچسپی نہیں رکھتا صرف اسی سے اردو کے ابتدائی مدارج کا اندازہ ہو جاتا ہے شعراء کا قاعدہ تھا کہ اشعار میں ہندی الفاظ و تراکیب کا استعمال بہت زیادہ کرتے تھے بعض جگہ طرز میں دلکشی پیدا کرنے کے لئے فارسی کا جوڑ لگاتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک مصرع ہندی کا اور ایک فارسی کا۔

ہندی کے اس قدر استعمال سے ظاہر ہے کہ یہ لوگ دیسی زبان کے دلدادہ ہو چکے تھے۔ ان کی از حد کوشش یہی تھی کہ فارسی سے قطع تعلق کر کے دیسی زبان کو اظہار خیال کا ذریعہ بنایا جائے۔ غرض اس زمانہ کی دکنی اردو زبان کے زمانہ طفلی کی تصویر کے علاوہ کچھ نہیں اور تصویر بھی ایسی کہ اس سے استفادے کی اجازت بمشکل ملتی ہے مثلاً محمد قلی قطب شاہ المتوفی ۱۰۲۰ھ کا یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

بکھی تو ہر گھڑی مجھ پر نہ کر غیظ ، محبت پر نظر رکھ کر بسر غیظ

محمد قطب شاہ کا بیٹا عبداللہ قطب شاہ المتوفی ۱۰۸۳ھ جو فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتا تھا اس کا دیوان بھی موجود ہے

نقص بعد کے زمانے میں سمجھے گئے۔ بہر حال ولی کا کلام اس عیب سے پاک ہے۔ اُن کی ہر غزل شروع سے آخر تک مرصع اور دلپذیر ہے، کہیں بھی کوئی جھول محسوس نہیں ہوتا۔ اگر چہ اشعار پڑھنے کے بعد جی چھوڑ دے گوارا نہ ہو، آخر ختم کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

۴) فضول مبالغہ آمیزی سے اُن کو نفرت تھی اُن کے کلام میں تصنع یا بناوٹ کا شائبہ بھی نہیں۔ البتہ بکمال شعر کی خوبی کی خاطر مبالغہ کہیں کہیں موجود ہے جس سے شعر کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے جو بجائے خود عیب بھی نہیں۔

ولی کی شاعری | کسی شاعری کی نسبت رائے قائم کرنے کے لئے اس کے کلام میں دو چیزیں خاص طور پر دیکھنی چاہئیں۔ اول یہ کہ شعر کی ساخت کیسی ہے یعنی الفاظ کی موزونی ان کا برمحل استعمال فصیح محاورے اور مرصع تراکیب اور تشبیہات، استعارات استعمال کئے ہوں، نحوی، عروضی اور بیانی خصوصیات کا بھی خیال رکھیں۔ سننے یا پڑھنے میں ترنم ریز ہو۔ اس کی شکل کو دیکھ کر وجدانی کیفیت پیدا ہو۔ اگر شعر میں یہ خصوصیت ہوں تو اس کی ساخت اعلیٰ درجہ کی ہے۔ لیکن اگر شعر کی ظاہری صورت ایسی ہے کہ اس کے مطالعہ سے طبیعت منغص ہو تو ایسے شعر کو بلند مرتبہ بھی حاصل نہیں ہوگا۔ اس کے بعد شعر کے معنوی محاسن کو پرکھا جائے۔ خیالات کی نوعیت اور ان کا احول سے تعلق۔ اگر فلسفہ یا حکمت نظم ہو تو وہ شاعر کے ذاتی تجربات و مشاہدات کا نتیجہ ہے یا دوسروں کے نظریوں کو نظم کر دیا ہے؟ اس کا فلسفہ کہاں تک زندگی سے قریب تر ہے؟ اس کے مطالعہ سے قاری زندگی سے تعلق پیدا کرتا ہے؟ شعر کا تعلق شاعر کی ذات سے کیا ہے؟ اور اس کی ذات کہاں تک شعر میں جلوہ گر ہے۔

بہت کم شاعر ایسے ہوتے ہیں جو غیر ملکی ادبیات سے واقف نہ ہوں اس لئے ہر شاعر کو بیش غیر ملکی اسالیب بیان و خیالات کو اپنی زبان کے سانچے میں ڈھالنا چاہتا ہے لہٰذا یہ معلوم کرنا چاہئے کہ وہ غیر ملکی ادبیات کا کہاں تک ممنون ہے؟ اردو شاعری کا تر اسی قسم کی ہے۔ عربی، فارسی، ہندی اور انگریزی اس کے زیادہ تر ماخذ ہیں۔ اب ہم ولی کے کلام پر اسی معیار سے تنقید کریں گے

ظاہری ساخت

صفائی وسادگی | جہاں تک ظاہری شکل کا تعلق ہے ولی کا کلام متقدمین اور ہمعصروں پر فوقیت رکھتا ہے انھوں نے خیالات کو نہایت ایسے فصیح اور مترنم الفاظ میں ادا کیا کہ ہر مسلم الثبوت استاد نے اُن کا لوہا مانا۔ فارسی تراکیب اور ہندی الفاظ کی برمحل دروبست سے کلام حسن کاری کا بہترین نمونہ ہو گیا۔ جس طرح ان کے خیالات میں رنگینی اور شگفتگی ہے اسی طرح اشعار کا ہر ہر لفظ مسرت بخش ہے۔ ان کے بعض اشعار ایسے ہیں کہ ان پر موجودہ زمانے کے کلام کا دھوکا ہوتا ہے ؎

گر ہوا ہے طالب آزادگی — بند مت ہو سبحہ و زنار کا
مسند گل منزل شبنم ہوئی — دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا

تشبیہات | ولی کو تشبیہات کا بلا مبالغہ بادشاہ کہا جا سکتا ہے انھوں نے ایسی اچھوتی اور نادر تشبیہیں استعمال کی ہیں کہ قارئین ان کی ندرت اور لطافت سے بے حد لطف اندوز ہوتے ہیں، اُن کے ذہن کی رسائی پر تعجب ہوتا ہے کہ انھوں نے ایک چیز کے لئے ہر موقع پر نئی تشبیہیں استعمال کی ہیں وہ بھی ایسی نادر گویا ہر بار آسمان سے تارے توڑ کر جڑ دیئے ہیں بعض تو عدیم النظیر ہیں۔ یہی حال استعاروں کا ہے تشبیہ اور استعارے کی یہ فراوانی یقین دلاتی ہے کہ اُن کا دماغ حسین الفاظ کا ایک بے پایاں ذخیرہ تھا۔ یہاں اتنی گنجائش نہیں کہ ہر چیز کی تشبیہ کی مثال پیش کی جائے اس لئے صرف زلف اور خال کے لئے جو تشبیہات استعمال کی ہیں وہ پیش کی جائینگی۔

زلف

زلف تیری ہے موج دریا کی   پاس تل اس کے جوں سناسی ہے

یہ سیاہ زلف تجھ زنخداں پہ   ناگنی جیوں کنوئیں پہ پیاسی ہے

پیستم کی زلف بیچ دیسا مجھ سواد ہند   اس راہ مار پیچ میں اے دل سنبھال چل

کفار فرنگ کوں دیا ہے   تجھ زلف نے درس کافری کا

دیکھا ہوں قد و زلف و دہن جب سے پیو کا   کرتا ہوں تب سے ورد الف لام میم کا

کرتا ہے اس کی زلف کی تعریف ولی   جو ہے مرید سلسلۂ مستقیم کا

یہاں یہ ممکن نہیں کہ تمام تشبیہات کی مثال کے لئے اشعار پیش کئے جائیں اس لئے اختصاراً صرف ان تشبیہوں کو لکھا جاتا ہے جو ولی نے مختلف مواقع میں زلف کے لئے استعمال کی ہیں۔

دیجور کا تماشا، سنبل، باسک، سانپوں کا بادشاہ، دود چراغ گل، کالا ناگ، کالے بھجنگ، تمس۔ ایک جگہ زلف کے ابرو کو اسلام کے "ل" پر فوقیت دی ہے۔ فتنہ، شب کا سفر، ظلمات، ایک جگہ زلف کے خیال کو رشک مشک کہا ہے، دوسری جگہ زلف اور خال کو دغا دینے میں یک رنگ کہا ہے، زنجیر عاشقی ہند (کہ جیسے ہند کے بہتر گلیس دیوے دیوالی میں)، برہمن، سلاسل، موج چشمۂ خورشید، ظل ہما، سحر بنگال، ایک جگہ لٹکتی ہوئی زلف کو رغبت صیاد کہہ کر یاد کیا ہے، موج جمنا، پیاسی ناگن، پٹا، نستعلیق کا لام، ہم دوش مصرع قد وغیرہ۔

زلف کو پیاسی ناگن تصور کرنا، یا باسک قرار دینا، یا دود چراغ گل سمجھنا ایسی ٹھیٹ تشبیہات ہیں کہ لکھنؤ جہاں سراپا لکھنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگائے گئے وہاں بھی اس قسم کی تشبیہات نہیں ملیں گی، وجہ یہ ہے کہ اس میں سے بہت سے الفاظ مثلاً کالے بھجنگ، باسک، دیجور کا تماشا وغیرہ ولی کے ساتھ ہی ختم ہو گئے اس لئے یہ امتیاز ہمیشہ کے لئے ولی سے مخصوص ہو گیا۔

دہلی والوں نے جب دکنی زبان کی ادبی حیثیت دیکھی تو رشک کرنے لگے اور فارسی گوئی کو خیرباد کہہ کر اپنی بول چال کی زبان میں

شاعری کو فروغ دیا لیکن اپنی خود داری کو قائم رکھنے کے لئے دکنی زبان میں بہت سی کانٹ چھانٹ کی اور اپنی زبان کو خس و خاشاک سے صاف کر دیا۔ انھوں نے یہ بھی گوارا نہ کیا کہ ہندی الفاظ کا زیادہ استعمال کیا جائے حالانکہ ولی کے کلام سے ظاہر ہے کہ دکنی زبان میں ٹھیٹ ہندی الفاظ زیادہ مستعمل تھے۔ دہلی والوں نے فارسی الفاظ سے رنگینی پیدا کی اس لئے اردو زبان ہندی کی نازک اور نادر تشبیہات سے محروم رہ گئی۔

اب خال کے لئے جو تشبیہات استعمال کی ہیں وہ ملاحظہ ہوں ؎

وہ دل کہ تھا جو سوختۂ آتشِ فراق　　پہنچا ہے مکھڑے پہ سجن کے بہ رنگ خال

لب پہ دلبر کے جلوہ گر ہے جو خال　　حوض کوثر پہ جیوں کھڑا ہے بلال

یک نقطہ ترے صفحۂ رخ پہ نہیں بیجا　　اس کو کہ ترے مصحف قرآں سے کہوں گا

ترے لب میں بظاہر حوضِ کوثر مخزنِ خوبی　　یہ خال عنبریں تس پر بلال آسا کھڑا دستا

نقطہ پہ تیرے خال کے باندھا ہے حرف دل　　وہ دائرۂ عشق میں ثابت قدم ہوا

زلف تیری ہے موج دریا کی　　پاس تل اس کے جوں شناسی ہے

ان کے علاوہ تل کو سپند، جیم کا نقطہ، زنگی، بیت الشعر کا نقطہ وغیرہ تشبیہوں سے یاد کیا ہے۔ دورِ حاضر کے ایک جدید شاعر نے خال کے مضمون کو نظم کیا ہے۔ اس مثال سے موازنہ مقصود نہیں بلکہ دکھانا ہے کہ زبان اور خیالات میں بہ نسبت اس زمانے کے بہت وسعت ہو گئی ہے ؎

ازل کے روز تیری شکل جب بنائی تھی　　بنانے والے کو اتنی پسند آئی تھی

کہ دیر تک اسے دیکھا کیا تھا حسرت سے　　نظر جمائی تھی رخسار پہ محبت سے

نظر نے اپنا کیا کام ایک مرکز پر　　سیاہ نشان بنایا نگاہ نے جم کر

خبر بھی ہے تجھے یہ نقش ناز ہے جو ابھی

سمجھ رہا ہے جسے خال یہ نشان ہے وہی

(جوش)

نظم میں بہ نسبت غزل کے ایک خیال کو ادا کرنا آسان ہے کیونکہ غزل میں ہر خیال کو دو مصرعوں میں ادا کرنا پڑتا ہے اور نظم میں شاعر جس قدر چاہے خیال کی وضاحت کر دے۔

... ولی نے غزلیات میں خال کی جو دلپذیر اور بہترین تشبیہات استعمال کی ہیں وہ آج تک قابلِ رشک ہیں۔ ان کی بعض تشبیہیں

پامال بھی ہیں لیکن ان میں بھی لطافتِ بیان سے زورِ بیان میں بھی جدت کا رنگ جھلکتا ہے دراصل اس قسم کی آسان اور وجد آور تشبیہات
ہر شخص کے ذہن میں نہیں آسکتیں یہ صرف شاعر کا حصہ ہے جو اپنے فن کو قوت بخش شاعری کی صورت دینا چاہتا ہے اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس
میدان میں ولی کی یکتائی مسلّم ہے۔

ولی نے استعارات اور کنائے بھی ایسے بلیغ استعمال کئے ہیں کہ ان کی زبان کو ان پر ہمیشہ ناز رہے گا۔ وہ کسی چیز کا بیان کرتے ہیں اس کے
سے آراستہ۔ وہ کنایہ تو بلیغ خواص اور حرکات ایسے پیرایہ میں کہ مصرعوں میں کھینچتی ہے کہ قاری کے سامنے اس چیز کا بے حجاب نقش
آجاتا ہے۔ ولی کے ہاں بلاغت اور استعارے کا یہ عالم ہے کہ قارئین کے تخیل بالکل ان کے قابو میں ہوجاتے ہیں۔ ناممکن ہے کہ قاری اس
کیفیت کے غالب وجود کو محسوس کرانا چاہتے ہیں دوسری کا۔ ابھی خیال کرے کسی شاعر کی عظمت قائم کرنے میں تشبیہ و استعارے کی
تنقید نفس طور پر اپنی جا ہے۔ ایک معمولی شاعر میں اتنی قدرت نہیں ہوتی کہ وہ قارئین کے تخیل کو محاکات کے ذریعہ اپنے بس میں کرلے لیکن بلند
پایہ شاعروں میں یہ خوبی فطری ہوتی ہے۔ ولی نے اس میدان میں بھی غیر فانی گل افشانی کی۔

"معنوی محاسن"

تصوف | تصوف ہماری ادبیات کے علاوہ زندگی کے ہر شعبہ میں داخل ہوگیا ہے اس کی ایسی گت بنائی کہ مسلمانوں کو غیر معلوم طریقہ پر بہت
نقصان پہنچا۔ عشق مجازی سے عشق حقیقی کا حصول صوفیائے کرام کا متبرک اصول تھا صوفی شعراء نے اس کو سراہا لیکن عوام پر اس کا ایسا غلط
اثر پڑا کہ آج تک اس کے صدمے سہنے پڑتے ہیں۔ امرد پرستی کو فروغ ایسی ہی شاعری سے ہوا۔ لازمی بات ہے کہ جب شعر پڑھتے وقت کوئی حسین
برہمن یا ترکی لڑکے کا تخیل دماغ میں ارتعاش پیدا کرے تو خواہش انسانی اس کو عملی جامہ پہنانے کی ضرور کوشش کرے گی چنانچہ یہی ہوتا ہے
لیکن جو لوگ حقیقی معنی میں صوفی تھے ان کی شاعری سے اردو زبان کو بڑی خدمت ہوئی۔ ولی کی شاعری بھی اسی قبیل کی ہے۔ انھوں نے کئی
جگہ اعتراف کیا ہے کہ عشق حقیقی عشق مجازی کی بدولت حاصل ہوتا ہے۔ ہم آگے بیان کرچکے ہیں کہ ولی نے علوی خاندان میں بیعت کرلی تھی۔ اس
کے علاوہ دراصل حقیقت میں حصول کمال کے لئے عشق مجازی بھی کیا اس سلسلے میں ایک گجراتی سید زادہ ابوالمعالی کا نام لیا جاتا ہے۔ ولی کو اس سے
بے انتہا محبت تھی ہر وقت سایہ کی طرح ساتھ رہتا تھا۔ ابوالمعالی کے علاوہ بعض اور لوگوں سے محبت تھی۔ جن کے ذکر میں انھوں نے
باقاعدہ نظمیں لکھی ہیں لیکن یہ واضح رہے کہ ولی کوئی نام نہاد صوفی نہیں تھے اس لئے ان کی امرد پرستی قابل اعتراض نہیں پھر بھی ہم یہ ضرور کہیں گے
کہ مسلمانوں کی مجموعی قوت کو جو نقصان پہنچا اس میں ولی کی شاعری کا بھی حصہ ہے۔

ولی فقیر دوست اور توکل پسند تھا۔ جب دہلی آئے تو سعد اللہ گلشن کی جو مشائخ نقشبندیہ میں ایک بڑے بزرگ تھے۔ ان کی
خدمت میں حاضر ہوئے اور فیض باطنی حاصل کیا۔ انہی کے فرمانے سے ولی نے اپنے کلام کو روزمرہ کی بول چال کے مطابق کیا اور بہت سے

فارسی خیالات کو اردو میں منتقل کیا یہی وجہ ہے کہ ولی کے قلمی نسخوں میں متعدد جگہ اختلاف ہے۔
ولی کے صوفی المشرب ہونے کی بڑی دلیل ایک یہ بھی ہے کہ جب ان کا۔ ولی کا مرتب دیوان دہلی پہنچا تو دہلی والوں نے اس کو کرامت سمجھا۔ اب ہم اس کے کلام سے چند صوفیانہ اشعار پیش کرتے ہیں۔

پایا ہے جو کوئی دولت فقر ـــــ مشتاق نہیں سکندری کا

زلیخا مجھے بولیا کہ توں واقف نہیں عشق حقیقی سوں ـــ تو بہتر یوں ہے جا دامن پکڑ عاشق مجازی کا

سنیا ہوں جب سے یہ نکتہ ولی شیریں سخن سیتی ـــ گیا ہے تب سوں شیوہ چھٹ کر اس کے عشق بازی کا

عیاں ہے ہر طرف عالم میں حسن بے حجاب اس کا ـــ بغیر از دیدۂ حیراں نہیں جگ میں نقاب اس کا

نہ پاوے دین کی لذت جسے دنیا کی خواہش ہو ـــ قفل ہے لذت دنیا حقیقت کے خزانے کا

ہر صبح گل کے جوہر اس بیسے سخن ہوں جلوہ گر ـــ از بسکہ دست شعر بی سوں دل میرا دریا ہوا

دیکھا ہے یک نگہ میں حقیقت کے ملک کوں ـــ جب بیخودی کی راہ میں دل نے سفر کیا

غفلت میں وقت اپنا نہ کھو ہوشیار ہو، ہوشیار ہو ـــ کب لگ رہے گا خواب میں بیدار ہو بیدار ہو۔

ـــــــ ـــــــ

نقش دنیا کا کھینچ مت دل پر ـــ دشمن ہوش ہے محبت زر

عشق کی راہ میں قدم کوں دھر ـــ دل سوں اپنے نکال وہم و خطر

راہ سیدھی ہے رہنما کی قسم

یہ تسلیم شدہ ہے کہ لٹریچر مصنف کی شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے ولی کی شاعری داخلی ہونے کے باعث اس کی شخصیت کا نقش ثانی بن گئی ہے مگر ہمیں ولی کے متعلق مطلق علم نہ ہو تب بھی ان اشعار سے ہم اس کی زندگی کی ایک مکمل تصویر دیکھ سکتے ہیں۔ مندرجہ بالا اشعار سے ظاہر ہے کہ ولی قناعت پسند، دولت دنیا سے متنفر اور صوفی المشرب تھے۔ کائنات کے ہر ذرہ میں خدا کا وجود دیکھتے تھے، اپنے میں شہرت واضح ہے کہ وہ صلح کل کے حامی تھے، ان کی نظر میں ہر مذہب و ملت کی یکساں وقعت تھی۔ تعصب سے قطعی بری اور ہر انسان کو ان آنا بندہ تصور کر کے مساوات پر عامل تھے ان کا عقیدہ تھا کہ دنیا میں انسان کی پیدائش کا مقصد حرکت و عمل ہے ان کی تلقین تھی کہ یہاں جمود و سکوت آفرینش انسانی کے منافی ہے۔

ولی کی صوفیانہ فطرت کا ثبوت اس کی شاعری میں اکثر جگہ ملتا ہے۔ قدوۃ العارفین شاہ وجیہ الدین کی مدح میں ترجیع بند اور حضرت میراں محی الدین قدس سرہ کی مدح میں قصیدہ دونوں ان کی عقیدتمندی ثابت کرتے ہیں بعض تذکرے ولی کے کلام کی رنگینی سے غلطی نظر

والوں کو عام عشق کی جھلک دکھائی دیتی ہو لیکن ایک صاحب نظر کو اس مجازی پردے میں حقایق و معارف نظر آتے ہیں۔ تضحیک واعظ و محتسب، کیفیات حسن و عشق وغیرہ کا بیان کسی دنیاوی رغبت کے باعث نہیں بلکہ یہاں بھی مجازی الفاظ میں حقیقی معنی کا لطف مضمر ہے ملاحظہ ہو ؎

چھپا ہوں میں صدائے بانسلی میں　　کہ تا جاؤں پری رو کی گلی میں

عاشقاں عاشقی کے دعوے پر　　آہ و زاری کوں دو گواہ کرو

بالی میں از زمین کی رہتا ہوں رات اور دن　　مدت ستی ولی کا ہو کر پران موتی

میں اپنی آنکھوں کو وا شُدہ فرش خاک کرُوں　　گزر جو میری طرف کوں وہ شہسوار کرے

خدا نے کم پہ تیرے باب حُسن ناز کیا　　قد بلند کوں تیرے تمام ناز کیا

ان اشعار کی رنگینی سے لکھنوی رنگ کا دھوکا ہرگز نہیں ہو سکتا بلکہ بہ امعان نظر دیکھنے سے زمین و آسمان کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ لکھنو کی رنگینی میں ابتذال کا عنصر غالب تھا وہاں کا معشوق ہرجائی، بیوفا، سنگدل، مردہ جو اور اس پر ذلیل ترین اتہام لگانا طرۂ امتیاز تھا برخلاف اس کے ولی نے جہاں بھی معشوق کا ذکر کیا ہے اس کے ہر لفظ سے محبت آمیز احترام اور پاس ادب ٹپکتا ہے، ابتذال و رکاکت تو کجا وہ یہ بھی گوارا نہیں کر سکتے کہ ان کے معشوق کو دوسرے دیکھ سکیں ؎

کیا ہوں ترک نرگس کا تماشا　　طلب گار نگاہ باحیا ہوں

ظاہر ہے کہ جو شخص نرگس کے نظارے سے اس لئے پرہیز کرے کہ اس کی آنکھ ہر وقت کھلی رہتی ہے اور وہ ہر راہرو کو دیکھتی ہے کیونکر برداشت کرے گا کہ اس کے محبوب کا نظارہ عام ہو۔ اسی خودداری نے ولی کو عمومیت سے ممتاز کر کے دنیا کے خواص میں جگہ دلائی۔

کلام کی صفائی شاعر کی عظمت کے لئے ابدی ہے لیکن تنہا حسن الفاظ کبھی بقائے دوام کا ذمہ دار نہیں ہو سکتا۔ ظفر کی محاورہ بندی اور داغ کی صفائی کا کون قائل نہیں لیکن ان کے کلام میں باطنی محاسن کا شائبہ بھی نہیں، اس میں ہر چیز سطحی نظر آئے گی، حسن خیال کی ان لوگوں نے کبھی پروا نہیں کی، برخلاف ان کے ہر باکمال شاعر ظاہری محاسن پر باطنی حسن کو ترجیح دیتا ہے، مرزا غالب کی مثال لیجئے، معترضین نے کیا کچھ نہ کہا۔ یہاں تک کہ شہنشاہ سخن میر تقی کو بھی نہ چھوڑا ؎

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے　　مزا کہنے کا جب ہے ایک کہے اور دوسرا سمجھے

زبان میر سمجھے یا کلام میرزا سمجھے　　مگر اپنا کہا آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

یار ام پور میں مرزا کو " روغن گل اور بھینس کے انڈے " والا شعر سنایا گیا تھا لیکن ان لوگوں نے کبھی مخالفین کی پروا نہیں کی بلکہ غالب تو تنگ آکر چلا اٹھا ؎

" گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی "

اس سے ثابت ہوا کہ معنوی حسن، حسن الفاظ سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اب ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ ولی بھی میر اور غالب ہی کی سی طبیعت رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے زمانہ کی عام فضا کی کچھ پروا نہیں کی جو اقلیم سخن کی اس چوٹی پر اپنی نشست بنائی جہاں ہمعصروں کی کبھی رسائی نہیں ہوتی۔ انھوں نے ایک عالی دماغ شاعر کی طرح محسوس کر لیا کہ شعر کی جان معنوی خوبی ہوتی ہے۔ چنانچہ انھوں نے کئی جگہ اس کا اعتراف کیا ہے ؎

منطق و حکمت و معانی پر — مشتمل ہے کلام تجھ لب کا

گرچہ پابند لفظ ہوں لیکن — دل میرا عاشق معانی ہے

لذت معنی نہیں کچھ لذت ظاہر سے کم — حرف بامعنی ہے جیسے بوسۂ خوباں لذیذ

غالب عاجز ہو کر چلا اٹھا تھا ؎

گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

ولی بھی یہی شکوہ کرتے ہیں ؎

ولی تیرے سخن یاقوت سوں رنگیں ہوئے لیکن — خریداران جہاں بہتر کہاں ہیں آج جوہر کے

ان چند شعروں سے ولی کی زبردست عظمت تسلیم کرنے میں پس و پیش نہیں۔ بتا معنوی حسن کے اس احساس نے ان کو اردو شاعری کی اولین صف میں جگہ دلا دی۔ انگریزی ادب میں شیکسپیر کی غیر فانی عظمت معنوی محاسن کے باعث ہمیشہ کے لئے مستند ہو گئی۔ اب ہم چند شعروں کے ذریعہ ولی نے طرفگی خیال سے جو لطافت معنوی پیدا کی ہے دکھائیں گے ؎

حسن تخیل:

مند گل منزل شبنم ہوئی — دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا

ہر تار میں زلف کے تری سیر جا کروں — باد صبا کوں ساتھ لیا ہوں چمن میں جا

ابرو کی کشتی ست چھپا اس قرت لے دریائے حسن — تجھ نین کی گردش ستی عالم منے طوفاں ہوا

عجب نہیں جو فلک پہ خط شعاعی کھینچ — اگر ورق پہ سورج کے تیری لکھیں تعریف

اے شمع رو روشن کیا جب انجمن گل — اپنے گل کا تصور کر پایا چمن گل

تیرے وصل میں اس قدر ہے نشاط — کہ مشکل کوں راحت سوں اٹھے ہم خواب

عیاں ہے ہر طرف عالم میں حسن بے حجاب اس کا — بغیر از دیدۂ حیراں نہیں جگ میں نقاب اس کا

تخیل انسانی قوٰی کی مجبوریوں کا کفارہ ہے۔ اس کی مدد سے انسان فضائے بسیط کے ان حصوں کی سیر کر لیتا ہے جہاں قوٰی اس کو نہیں پہنچا سکتے۔ اس عطیہ کا استعمال شاعر کی فطرت پر منحصر ہے۔ اگر فطرت جذباتی کیفیت پر مائل ہے تو کلام میں مومن اور جرأت

کی سی نگینی ہوگی، اگر ذہنی محبت کی پرستار ہے تو ولی، درد، میر اور غالب کی سی شگفتگی ہوگی۔ حسن تخیل کی تنقید میں یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ شاعر کا تخیل اس کی قوت ممیزہ کے بس میں ہے یا نہیں، اگر قوت ممیزہ کا محکوم ہے تو حسن استدلال قایم رہے گا ورنہ نہیں، اب ولی کے پہلے شعر کو لیجئے۔ اس میں نزاکت تخیل کے ساتھ زبردست فلسفہ بھی ہے۔ آگے عرض کیا جا چکا ہے کہ ولی جمود و سکوت کو انسانی زندگی کے لیے سم قاتل تصور کرتے ہیں، اس فلسفہ کو ولی نے ندرت تخیل سے اس قدر دلکش بنا دیا ہے کہ اردو شاعری اس شعر پر ہمیشہ ناز کرے گی، اس میں ایسا فلسفہ نظم ہے جو انسانی زندگی پر منطبق ہو سکتا ہے۔ دوسرے شعر میں معشوق کی زلفوں کی سیر کرنے کے لئے ایک اچھوتی ترکیب سوچی ہے، رسائی کا بہترین ذریعہ ہوا ہو سکتی ہے کوئی معشوق اتنا بدگمان نہیں ہوگا کہ ہوا سے گریز کرے اس لئے شاعر کے دماغ میں یہ بات پیدا ہوئی کہ معشوق کی زلفوں کی سیر کرنے کے لئے ہوا کو ساتھی بنانا چاہئے۔ نزاکت تخیل اس سے اور بھی بڑھ گئی کہ ہوا کے چلنے سے زلف کا ہر تار الگ ہوگا، اسی طرح آخری شعر معرکۃ الآرا چیز ہے اس میں تخیل کی مدد سے ایک حقیقت نظم کی ہے۔ غرض ولی نے تخیل کی مدد سے اپنے کلام میں وہ نزاکتیں پیدا کی ہیں جو اپنی نظیر آپ ہی ہیں اور لطف یہ کہ اُن کا تخیل کبھی ابتذال کی طرف مائل نہیں ہوا۔ پورے کلیات میں ایک ایسا شعر نہیں ملے گا جس سے ذوق سلیم مجروح ہو۔

اختراع و ایجاد | جدت پسند طبائع کا خاصہ ہے کہ وہ اپنے خیالات کی مکمل ادائی کے لیے نئے الفاظ اور تراکیب خود ڈھالتی ہیں۔ ان کے زمانہ کی زبان میں اتنی وسعت نہیں ہوتی کہ حسب منشا اظہار خیال ہو سکے، اُردو میں مومن، غالب وغیرہ نے نئی تراکیب ایجاد کیں، ولی کی طبیعت بھی جدت پسندی میں رنگی ہوئی تھی، اس پر فکر ایسی گہری کہ فلسفہ کی گہرائیوں کی سیر ان کو خاص طور پر مرغوب تھی اس لئے یہ کیونکر ممکن ہو سکتا تھا کہ اپنے زمانہ کی بے بضاعت زبان پر اکتفا کرتا۔ لہٰذا اصول مقررہ کے مطابق ادائی خیالات کے لئے نئی تراکیب ایجاد کیں ان میں سے چند ہم یہاں پیش کرتے ہیں

،، رحم بے جا، موج بے تابی دل، حرف دانا پسند، دیدہ حیراں، جنت احباب، وفا دشمن، سکوت بے معنی، منزل شبنم، کوہسار خاموشی، برگ یاقوت، دل بے دل وغیرہ،

ولی کی یہ تراکیب ان کے بعد رائج نہیں رہیں۔ یہی حال ہر شاعر کی تراکیب کا ہوا، انگریزی میں ورڈسورتھ ([illegible]) کی مثال دیکھئے اُردو میں مومن کی،

ولی کے متعلق بعض اعتراضات | ولی کے متعلق اکثر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ انھوں نے بہت سے متحرک الفاظ کو ساکن اور ساکن کو متحرک کر دیا ہے۔ مثلاً کوی کو (کئی) نین کو (نَین) فکر کو (فکَر) رین کو (رَین) زلف کو (زلَف) وہ وزن شعر میں بعض حروف کو گرا دیتے ہیں مثلاً گئی کی جگہ گی) ہوئی کی جگہ ہُی) اے کی جگہ (اَ)، انکھیاں کی جگہ (اکھاں، صفحہ کی جگہ (صفا، اس طرح کی چیزوں کو سمجھنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ ولی کے زمانے میں یہ جس طرح بولے جاتے تھے، انھیں اسی طرح لکھا ہے زبان کی ترقی کے ساتھ بعض الفاظ کے بولنے اور لکھنے کا طرز بدلتا گیا۔

اس قسم کی چیزیں ہوں کے بعد تک کے زمانہ میں عام تھیں چنانچہ سراج الدین علی خاں آرزو جن کی علمی قابلیت کا ہر شخص قائل تھا ان کے ہاں بھی اس قسم کی اغلاط موجود ہیں ۔

دو دسے مجھے شب فراق جوں سپند ہم نے | کیا نعل قیمتی دکھو جھوڑ نکل گیا

شاہ حاتم جن کی استادی کا سکہ بیٹھا تھا جنھوں نے اردو زبان کی فصاحت کو دلپذیر بنانا چاہا ان کا شعر ملاحظہ ہو ۔

گئی میں تجھ ستمگر کی عجب مجلس میں غم گزرا | شمع رو رو کے ساری رات سرتا پا کھڑی جلیاں

مومن اور آتش کا زمانہ دیکھئے اور یہ مصرع ملاحظہ ہو ۔

یہ محب جبین کا او . دل رکھے شمر کا سا ۔

بعض لوگوں کا یہ خیال کہ ولی کی عروضی معلومات کم تھیں ان کے اشعار کی فرنگی خیال تازگی مضامین اور لطافت تخیل کو دیکھ کر خود بخود رد ہو جاتا ہے ۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ایک معمولی بساط کا شاعر ایسی لطیف تشبیہات ، نادر استعارے اور بلیغ کنائے جن میں رکھتا ہوگا ؟ کیا جذبات کی ایسی موثر نقاشی کوئی معمولی استعداد کا آدمی کر سکتا ہے ؟ زندگی اور کائنات کے ایسے باریک نکات کسی معمولی شاعر کی زبان سے نکل سکتے ہیں ؟ غرض ولی کی یہ اغلاط ثابت کرتی ہیں کہ ولی دنیا کے اُن معزز مصنفین میں سے ہیں جن کی اغلاط زبان کی کم مائیگی یا لطافت معنوی کے خیال سے ہو جاتی ہیں ۔

شاعرانہ تعلی شاعرانہ اظہار فخر اردو شعرا کا عام وتیرہ رہا ہے ۔ بہت سے تو مسلم الثبوت استادوں کو بھی نظر میں نہیں لاتے بعض اپنے درجے کو پہچانتے ہوئے مشاہیر کی عظمت کا بھی اعتراف کرتے ہیں ، اوّل الذکر میں مومن کو لیجئے جو سعدی کے نام پر ناک بھوں چڑھاتے تھے ۔ ان کی تعلی دیکھئے جو افلاطون اور ارسطو کو کچھ نہیں سمجھتے ۔

ایک طفل دبستاں ہے فلاطوں مرے آگے | کیا منہ ہے ارسطو جو کرے چوں مرے آگے

مستی سے ہوں میں سرخوش صہبائے شاعری | ناداں ہے جس کو مجھ سے ہے دعوائے شاعری

موخر الذکر گروہ میں سنجیدہ لوگ ہیں جنھوں نے دوسروں کے کمال کو سراہا ، غالب کی تعلی دیکھئے ۔

ریختہ کے تمھیں استاد نہیں ہو غالب | کہتے ہیں اگلے زمانہ میں کوئی میر بھی تھا

طرز بیدل میں ریختہ لکھنا | اسد اللہ خاں قیامت ہے

مرزا نے اپنے رقیبوں تک کے کمال کو سراہا ، ذوق اور مومن کے اس شعر پر سر دھنتے تھے ۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے | مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا | جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

اثر کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

تم ہی نہیں ہو میر اثر اس دیار کے ۔۔۔ ناسخ بھی تیر وقت کبھی تھے بہار کے

ولی بھی اس میدان میں کسی سے پیچھے نہ رہے انکی جگہ اپنے موجد ہونے کے احساس اور شاعرانہ عظمت کو فخریہ ظاہر کیا ہے ؎

یو شعر تیرے اے ولی مشہور ہیں آفاق میں ۔۔۔ مشہور ہے جیوں کر سخن اس بلبل تبریز کا

یہ ریختہ ولی کا جاکر اسے سنا دو ۔۔۔ رکھتا ہے فکر روشن جو انوری کی مانند

ہم پاس بات آکے نظیری کی مت کہو ۔۔۔ رکھتے نہیں نظیر اپس کے سخن کی ہم

تیرے اشعار ایسے نہیں نظر آتی ۔۔۔ کہ جس پہ رشک آوے گا ولی کوں

ولی ایران و توران میں ہے مشہور ۔۔۔ اگرچہ شاعر ملک دکن ہے

ان اشعار کے علاوہ کلیات ولی صفحہ ۲۹۴ کی غزل میں ولی نے انوری، جامی، فردوسی، غزالی، صائب، بیدل وغیرہ کی تمام صفات کو خود میں بتایا ہے، مندرجہ بالا اشعار کے پہلے دو اشعار میں انھوں نے متقدمین کا اعتراف کیا ہے لیکن تیسرے اور چوتھے اشعار میں شاعرانہ تعلی ہے۔

ولی کا سفر ہم بیان کر چکے ہیں کہ بیس برس کی عمر میں جب ولی کو اعلیٰ تعلیمی مدارج طے کرنے کا شوق ہوا تو احمد آباد آئے۔ جہاں مولانا وجیہہ الدین کا مدرسہ تمام ہندوستان میں مشہور تھا۔ یہاں چند سال ولی ظاہری و باطنی فیض حاصل کرتے رہے اور گنگ باد گئے دوسری مرتبہ پھر احمد آباد اور سورت آئے، اس مرتبہ اپنا ترتیب وار دیوان بھی ہمراہ لائے، لوگ اس دیوان کو دیکھ کر بہت محظوظ ہوئے اور ولی کو باکمال شاعر تسلیم کرلیا، چونکہ ولی صوفی المشرب تھے اس لئے بعض تو اس ترتیب کو کرامت سمجھنے لگے۔ اس دفعہ دہلی کا بھی رخ کیا جہاں اردو شاعری کا اس قدر چرچا نہ تھا۔ فارسی گو شعرا محض تفنن طبع کے لئے اردو شعر کہا کرتے تھے، ولی نے دہلی، سورت، اور احمد آباد کی تعریف میں جو شعر موزوں کئے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک صاحب نظر شاعر تھے۔ دوسرے شہروں کی معاشرت اور ماحول نے انھیں متاثر کیا چنانچہ انھوں نے ان کے خوب نقشے دکھائے ہیں۔

اس سفر کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ خود ولی اور شمالی ہندوستان پر ایک دوسرے کا اثر ضرور پڑا ہوگا، دوسرے شہروں کی معاشرت جدا، وہاں کی صحبتیں مختلف، آداب و اطوار دوسرے علمی مذاق میں بھی تفریق تھی، شاعر چونکہ سب سے زیادہ فعال اور زود حس ہوتا ہے اس لئے ولی کے کلام پر بھی اس سفر کا اثر پڑنا لابدی تھا، ولی کو دہلی اس قدر پسند آئی کہ تین دفعہ سفر کیا لیکن طبیعت نہ بھری بالآخر شاعرانہ شکوہ کرکے دل بہلایا ؎

دل ولی کا لے لیا دلی نے چھین ۔۔۔ جا کہو کوئی محمد شاہ سوں[۱]

۱۔ یہ شعر مضمون کا ہے۔ تذکرہ ولی کا دیکھو گلشن گفتار مرتبہ ستہ ؟

ولی کے کلام میں دہلی کی اس آمد و رفت سے بڑی تبدیلیاں ہوئیں۔ سید سعد اللہ شاہ گلشن مشائخ نقشبندیہ میں سے ایک بڑے بزرگ تھے۔ ولی کو جب ان کی حضوری میں شرف باریابی حاصل ہوا تو انھوں نے ولی سے کہا کہ اپنے کلام کو روزمرہ کی بول چال میں ختم کرو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ولی صوفی المشرب تھے۔ اس لیے سید صاحب نے اس تبدیلی کی فرمائش کی تھی کیونکہ صوفی شعرا اپنے خیالات کو روزمرہ کی زبان میں ادا کرتے تھے اس لیے ولی کو بھی یہی چاہیے کہ وہ بھی سادہ اور آسان زبان میں اظہار خیال کرے۔

یہ تو عام دستور ہے کہ جب کسی غیر قوم سے دوستی ہوتی ہے تو اس کی زبان اور آداب کی نقل کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ دوست کی تفریح طبع کا باعث ہو اسی طرح دہلی کی محبت میں ولی کی جو دھوم تھی انھیں فرما اس طرف۔ ممکن یہ ہوگا کہ وہ کچھ نہ کچھ دہلی والوں کے مذاق کو مد نظر رکھیں اور ان کے الفاظ و محاورات بھی استعمال کریں۔ اس پر شخصی حکومت کا زمانہ جہاں بادشاہ کی مرضی رسم و رواج اور عوام کا مذاق تو کجا مذہبی روایت پر بھی غالب آجاتی ہے اس سے اس کے زمانے میں دہلی کے شعرا ان کے کلام پر ضرور ولی کا رنگ چڑھا ہوا ہوگا۔ اب مناسب یہ ہے کہ دہلی میں اردو شاعری کی جو حالت تھی اس پر ایک اجمالی نظر ڈالی جائے تاکہ ولی کے کلام کی عظمت اور فصاحت آشکارا ہو جائے۔

عہد ولی اور دہلی میں اردو شاعری

شمالی ہندوستان میں اورنگ زیب کے زمانے کو اردو شاعری کا رواج ہو گیا تھا۔ لیکن اہل علم یہاں کے شعرا اس کی زبان کو معراج کمال سمجھتے تھے۔ اردو میں جو کچھ اشعار اس زمانہ میں کہے گئے ہیں وہ محض تفریح طبع کو نتیجہ ہیں خود غالب و مومن کے زمانے تک فارسی میں جوہر طبع دکھانا باعث فخر تھا۔ غالب و مومن دونوں کا فارسی دیوان بھی موجود ہے غالب نے کہہ دیا تھا کہ

فارسی بین تا ببینی نقش‌ہای رنگ رنگ　　　بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است

ایسی صورت میں یہ کیونکر ممکن تھا کہ اردو شاعری یہاں عہد فروغ پاتی۔ اورنگ زیب کے زمانے میں چند ایسے شعرا گذرے ہیں جنھوں نے اردو میں شعر کہے۔ ان میں سے بعض سے قدر متعلق دہ چند ہیں کہ تذکرہ نویس انھیں شاعری میں شمار نہیں کرتے۔ ذیل کی مثالیں اس زمانہ کی اردو شاعری پر کافی روشنی ڈالیں گی۔

برہمن کی بیٹی نے مری آنکھ توڑ دی　　　غصہ کیا اور گالی دیا اور گزر گئی　　　(نواب ... خان آزاد)

زلف سیاہ تو بلا دم بدم پڑی ہے　　　در خانۂ آئینہ کیا جوم پڑی ہے　　　(مرزا ... خان معرفت)

یہ شعرا فارسی گو تھے اردو صرف تفریح کا مشغلہ تھا۔ جعفر زٹلی کے نام سے کون واقف نہیں، یہ اورنگ زیب ہی کے زمانے میں گذرے ہوئے لیکن ان کا کلام زیادہ تر فحش ہے پھر بھی بعض اشعار ایسے مل جاتے ہیں جو مثال کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں اورنگ زیب کی مدح میں لکھا ہے۔

زہے مالک اورنگ شاہ ولی | در اقلیم دکھن پڑی کھل بلی
دریں پیر سالی و ضعف بدن | پچھاڑی دہاچو کراہی درد کھن
نہے شاہ شاہاں آگاہ دغل | نہ بلد نہ ٹلد نہ جنبد زجاے
ہما سوز جو دھا بلی بے بدل | چو البرز قائم چو پربت اٹل

اورنگ زیب کی وفات کا مرثیہ ؎

اکل بے کل ہوا سنسار سارا | بخون تیار شد مریخ تارا
کہاں اب پائیے ایسا شہنشاہ | مکمل اکمل و کامل دل آگاہ
صدائے توپ بندق است ہر سو | چھما چھٹ دھما دھٹ است ہر سو
بہر سو مار مار و دھاڑ ہا است | اچل چال و تیر خنجر گذار است

(از رسالۂ اردو اپریل ۱۹۲۹ء)

شمالی ہند میں اردو شاعری کا یہ حال تھا دکن اس کے مقابلہ میں کہیں آگے تھا، اب ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ ولی کی شاعری کا شمالی ہند کے شعرا پر کیا اثر پڑا۔

ولی کا اثر شمالی ہند پر

اس اثر کا پتہ لگانے سے قبل شمالی ہند میں جو ادبی فضا تھی اس کا ایک مختصر خاکہ پیش کرنا یہاں از حد ضروری ہے، یہ واضح ہو گیا کہ فارسی گوئی یہاں طرۂ امتیاز تھا لیکن اورنگ زیب کا زمانہ شمالی ہند میں فارسی کے خلاف بغاوت کا زمانہ کہا جا سکتا ہے جس کے اسباب حسب ذیل ہیں۔

شعرا نے محسوس کیا کہ خیالات کا ہو بہو اظہار بول چال ہی کی زبان میں ہو سکتا ہے۔ فارسی غیر ملکی زبان تھی جس پر قدرت حاصل کرنا آسان نہیں تھا، اس پر دوسری مشکل یہ تھی کہ اہل ایران ہندوستانیوں کی فارسی دانی کے قائل نہیں تھے۔ سوائے چند کے یہاں کا کوئی باکمال ان کی نظر میں نہیں سماتا تھا، حقیقت بھی یہ ہے کہ ہر زبان کا مخزن اس کا ملک ہوتا ہے ادب پر ماحول اور روایات کا بہت اثر پڑتا ہے انگریزی میں اگر ہم ایڑی اور چوٹی کا بھی زور لگائیں تب بھی زبان کی اصلی نزاکتوں سے مکمل واقفیت حاصل نہیں کر سکتے۔ غرض شمالی ہندیوں کو ایرانیوں کا یہ رویہ ناگوار گذرا انھوں نے روزمرہ کی زبان کی طرف رغبت کی اور خصوصاً جب یہ دیکھا کہ اہل دکن نے اس کم مایہ زبان میں اپنے گلہائے شگفتہ کھلائے ہیں تو ان کی آتش رشک بھڑکی اور اس زبان کو جو بازاروں میں ماری ماری پھرتی تھی سر آنکھوں پر رکھا اور اپنے دماغی جواہر سے اس کو آراستہ و پیراستہ کیا۔

اورنگ زیب کے بعد کوئی ایسا طاقتور حکمراں نہیں ہوا جو عنان حکومت کو سختی سے قابو میں رکھتا، ملک میں بدامنی اور بغاوت کا دور

مصحفی نے اپنے تذکرے میں خود حاتم کا قول نقل کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ولی کا کلام دہلی میں بے حد مقبول ہو چکا تھا وہ کہتے ہیں:-

"ذہنے پیش فقیر نقل می کرد کہ در سنہ دوم فردوس آرامگاہ دیوان ولی در شاہجہان آباد آمدہ و اشعارش بر زبان خرد و بزرگ جاری گشتہ۔ با دوسہ کس کہ مراد از ناجی و مضمون و آبرو باشد بنائے شعر ہندی را بایہام نہادہ داد معنی یابی و تلاش مضامین تازہ می دادیم۔"

(بحوالہ اردو۔ اپریل ۱۹۲۹ء)

ان اقتباسات سے ولی کا اثر شعرائے شمالی ہند پر ظاہر ہو گیا۔ مضامین، طرز بیان، زبان وغیرہ میں ولی کا تتبع فخر سمجھا جاتا تھا گویا شمالی ہند کی ابتدائی شاعری کی تشکیل ولی ہی کے ہاتھوں ہوئی۔ زبان اردو اور خصوصاً شمالی ہند کی شاعری پر ان کا جو احسان ہے وہ قیامت تک نہیں اتر سکتا۔ یہ ولی ہی کی ذات ہے جس نے شمالی ہند کے شعرا کی فارسی شاعری کے خلاف بغاوت میں رہنمائی کی لیکن دکنی زبان کی بھی جلد ہی مخالفت شروع ہو گئی کیونکہ یہ بھی ادائے خیال کے لئے مغلق اور پیچیدہ معلوم ہوئی اس لئے جلد کاٹ چھانٹ کا سلسلہ شروع ہو گیا جس کی ابتدا مظہر سے ہوئی، میر، سودا اور ناسخ وغیرہ کے زمانہ میں ریختہ کی صورت عام ہو گئی تھی دکنی کو غیر فصیح سمجھنے لگے تھے ؎

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ ایک بات لچر سی بزبان دکنی تھی

وہ جو کہے کہ ریختہ کیونکر ہو رشک فارسی گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کر اسے سنا کہ یوں

ولی کی عظمت کا راز ولی کے متعلق تذکرہ نویسوں کی آرا سے ثابت ہو چکا کہ وہ ایک مسلم الثبوت استاد تھے۔ ان کے تخیل نے اردو جیسی زبان کو کہیں سے کہیں پہونچا دیا۔ اب ہم یہ معلوم کریں گے کہ اس عظمت کا راز کیا ہے؟

میر، غالب اور اقبال اردو شاعری میں محض نفس شعر کے لحاظ سے وقیع نہیں بلکہ وہ بلند شخصیت کے مالک بھی ہیں ان کا کلام ان کی شخصیت کا پرتو ہے۔ ولی کے کلام میں بھی یہ خوبی بدرجہ اتم موجود ہے۔ ہر شعر ان کی فطرت اور ظاہری شخصیت کا آئینہ دار ہے۔ شخصیت سے مراد جذبات و احساسات اور خیالات و ادراک وغیرہ ہیں جو شاعر زیادہ سے زیادہ اپنے جذبات کی ترجمانی کرے گا اتنی ہی اس کی شخصیت نمایاں ہو گی ذوق، آتش اور ناسخ وغیرہ نے اپنی شخصیت کی تصویر کشی نہیں کی بلکہ خارجی اثرات کے دکھانے میں کمال پیدا کرنا چاہا اس لئے ان کے کلام سے نوع انسان کو کوئی فائدہ نہیں پہونچا۔ برخلاف ان کے ولی نے غالب وغیرہ کی طرح اپنے ذاتی مشاہدات کو شاعرانہ پیرایہ میں نہایت خوش اسلوبی سے پیش کیا چونکہ ان کی شاعری وہبی تھی اس لئے تخیل کی بلند آفرینیوں نے تمام شعری محاسن کو قائم رکھا غرض ولی کا درجہ مقرر کرنے میں ان کی شخصیت کے مطالعہ سے بہت مدد ملتی ہے۔

صوفی المشرب، آزاد منش، اور قانع ہونے کے باعث ان کی شخصیت سے نفس شعر میں بڑی ترقی ہوئی۔ ولی پہلے شاعر تھے جنہوں نے رنگین مضامین باندھے لیکن اس پردے میں انھوں نے اصلی روحانی واردات کو قلمبند کیا ہے۔ فلسفۂ زندگی سے ان کو خاص لگاؤ تھا

اس نے زندگی کے بعض حقائق اور رموز کی خوب تشریح کی لیکن ماننا پڑے گا کہ فلسفی شاعر کی طرح ان کے کلام میں بے لطفی نہیں۔ ہر حکیمانہ خیال ایسے دلکش پیرایہ میں بیان کیا ہے کہ اس سے نفسِ شعر کے علاوہ معلوماتِ عامہ میں بھی کافی اضافہ ہوتا ہے

فلسفہ اور شعر کی آمیزش کے خلاف ہمیشہ یہ اعتراض رہا کہ اس قسم کی شاعری میں شعریت نہیں بچتی۔ فلسفہ کی خشکی حسنِ شعر زائل کر دیتی ہے۔ اس کے متعلق دو گروہ ہیں ایک کا یہ عقیدہ ہے کہ شعر آرٹ ہے جس کا منشا مسرت دینا ہے اس کے سوا کچھ اور نہیں۔ برخلاف اس کے دوسرا گروہ معترف ہے کہ فلسفہ شعر کی جان ہے۔ ان کا خیال ہے کہ شعر تفسیرِ زندگی ہونے کے سبب زندگی ہی کی میت ہے اس لیے شعر کی عظمت مسائل زندگی کے پرجوش اور دلپذیر پیرایہ بیان میں ہے۔ اس سے یہ حل ہو جائے کہ زندگی کس طرح گزاری جائے۔ وہ شعر جس میں اخلاق و نیکی کی مخالفت ہو زندگی کا مخالف ہوگا۔ کالرج کا مقولہ ہے۔ عظمت کے لیے فلسفیانہ دماغ ضروری ہے۔ ایمرسن (Emerson) کا نظریہ ہے کہ شاعر کی عظمت مقرر کرنے کے لیے یہ دیکھنا چاہیے کہ اس کا کلام دماغ میں کس قسم کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ لینڈر (Landor) کہتا ہے شاعر کی عظمت زندگی کے عمیق مسائل بیان کرنے میں ہے۔ براؤننگ (Browning) کے نزدیک اول فلسفہ دوم شاعری۔ لاویل (Lowell) کا فتویٰ ہے۔ ہر شاعری کی شعر کی وقعت نہیں ہوتی جب تک اس میں کسی قدر نفسیاتی باریکی نہ ہو۔ ان مقولوں سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ شعر بہ مقصد فلسفہ کی گتھیوں کو سلجھانا ہے بلکہ یہ مراد ہے کہ شعر کے تمام محاسن کو قائم رکھتے ہوئے جس قدر بھی فلسفہ ہوگا شعر کی عظمت میں اضافہ ہوگا۔

اب ہم چند اشعار سے یہ ثابت کریں گے کہ ولی نے فلسفۂ زندگی و حسن کا کیسی متانت سے بیان کیا ہے اور اشعار کس خوبی سے نقل کیا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ ولی نے غالب کی طرح اپنی فلسفیانہ شخصیت کو ہو بہو پیش کر دیا ہے۔ غالب کی طرح ان کی اکثر صورت جس کی نسبت کہا گیا ہے کہ ... ان کے شعر نفس خوب ہے۔ کہ مسائل بیان کرنے میں خاص دلچسپی ہے ۔

پایا ہے جو کوئی دولتِ فقر ۔۔۔ مشتاق نہیں سکندری کا

رہتا ہے طالبِ آزادگی ۔۔۔ بند مت ہو سیم و زر کا

اسی مضمون کو غالب نے بیان کیا ہے ۔

زنار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال ۔۔۔ رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

منزلِ گل منزلِ شبنم ہوئی ۔۔۔ دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا

میاں ہے ہر طرف عالم میں حسنِ بے حجاب اس کا ۔۔۔ بغیر از دیدۂ حیراں نہیں جگ میں نقاب اس کا

غالب کا شعر ملاحظہ ہو ؎

واقف نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا　　　یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

ہیں صلح کل کے جوہراں میرے سخن سوں جلوہ گر　　　از بسکہ وسعت مشربی سوں دل میرا دریا ہوا

اس شعر سے اگلے صوفیا کی راست بازی کا پتہ چلتا ہے۔ ان کی خواہش تھی کہ ہندوستان کے ہندو اور مسلمانوں میں اتفاق ہونا چاہئے۔ اسی مسلک کا شعر غالب نے بھی کہا ہے ؎

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم　　　ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

یو بات عارفاں کی سنو دل سے سالکاں　　　دنیا کی زندگی ہے یو وہم و گماں محض

غالب کا شعر سنئے ؎

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد　　　عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

ہو بہو یہی خیال ملٹن (Milton) کا ہے ؎

"Life is a dream, World is a delusion

عمر جو یاد میں گزرے سو غنیمت سمجھو　　　سو گیا عیش میں پھر اس کا جگانا مشکل

حسن تھا پردۂ تجرید میں سب سوں آزاد　　　طالب عشق ہوا صورت انسان میں آ

ولی زندگی کو شوپنہار یا میر کی طرح مثنیت کا ستم نہیں سمجھتے بلکہ اُن کے خیال میں یک جام عیش ہے جس کی مختصر میعاد بھی حکمت سے خالی نہیں ؎

زندگی جام عیش ہے لیکن　　　فائدہ کیا اگر مدام نہیں

ولی گوئٹے Goethe کی طرح دنیا کو صرف تماشا ہی نہیں دیکھتے بلکہ وہ اس کے آلام کا علاج بھی تجویز کرتے ہیں ؎

کر مختصر جہاں میں دنیا کی آرزو　　　اے بے خبر اگر ہے بزرگی کی آرزو

ولی نظیر اکبرآبادی کی طرح روز مرہ کے معمولی واقعات میں ہمت کر کے ایک عمیق شاعر کی طرح جو کچھ دل پر گزرتی ہے اس کو نظم کر دیتے ہیں جس طرح نظیر خواص و عوام کے شاعر ہیں اسی طرح ولی بھی۔ سورت اور احمد آباد کی مثنویوں کے علاوہ یہ شعر ملاحظہ ہوں ؎

اُردو شاعری میں ولی کا رُتبہ

از

جناب سید کوثر رضا صاحب متعلم بی۔اے فائنل ہندو کالج دہلی

حضرت ولی اللہ عارف باللہ کا رتبہ اُن کے نام کی طرح "ہنوز ایک راز ہے"۔ ذمہ داری کے خیال نے مؤرخین کے لبوں پر مہر سکوت لگا دی ہے اور شعرا کی تحقیق زیادہ تر حسن تعلیل کے نمونے پیش کر رہی ہے۔ جناب احسن مارہروی کی تحقیقات اس سلسلے میں مستحسن سمجھی گئی ہیں۔ اور درحقیقت ہیں بھی۔ کم و بیش سات نام لکھ کر فرماتے ہیں کہ "یہ سب نام ایک مسلمان کے ہو سکتے ہیں اور چونکہ شعرا عام طور پر اپنے نام اور اُس کی مناسبت سے تخلص کا استخراج کیا کرتے ہیں۔ اس لئے یہ زیادہ قرین قیاس ہے کہ ان کے نام میں لفظ ولی شامل ہو اور ولی الدین، ولی محمد اور ولی اللہ زیادہ قرین قیاس ہے"۔

مگر ہمیں ان کے نام سے کام نہیں البتہ کام سے بحث ہے۔ ولی اردو کے اولین صاحب دیوان شاعر کہلاتے ہیں اور اردو کی دنیائے شاعری کے باوا آدم سمجھے جاتے ہیں۔ ابتدائے دنیا اور حضرت آدم کے متعلق بحث الٰہیات کا وظیفہ ہے اور ابتدائے شاعری و آدم الشعرا کی تحقیق اُردو ادبیات کا جزو لاینفک۔ ہماری شاعری کی ابتدا کے متعلق مختلف روایات ہیں۔ اگر عام روایات کو درخور اعتنا سمجھ لیا جائے تو اردو شاعری کی ابتدا اُس زمانے میں ہوئی جب اورنگ زیب نے دکن پر فوج کشی کی اور افواج عالمگیری نے دکن میں قیام کیا۔ اسی وقت میں اس لشکر (اُردو) کی بہترین صنف (یعنی شاعری) نے بھی پہلے پہل مظاہرہ کیا اور ولی اس کے جلوس میں نظر آئے۔

مولوی محمد حسین آزاد جو سر سید، نذیر احمد، حالی و شبلی کی طرح اُردو ادبیات کے عناصر خمسہ میں سے ہیں، ان کے نزدیک اُردو کی ابتدا ہی شاعری سے ہوئی اور دلیل اس کی یہ ہے کہ اُس زمانے کی نثر کا کوئی نشان نہیں ملتا اور نظم موجود ہے۔ آب حیات میں ولی کو نہ صرف جام خالی تفویض ہوا ہے بلکہ اُن کو پہلا ساقی سمجھا گیا ہے۔ حالانکہ تذکرۂ مذکور میں احمد گجراتی۔ سعدی دکنی۔ خسرو۔ سیوا۔ اور نوازؔ کا ذکر بھی موجود ہے جو ولی پر تقدم زمانی رکھتے ہیں مگر آزاد کا معیار تقدم بالشرف تھا۔ اسی لئے انہوں نے ان شعرا کا کلام غلیمت۔ طرز ادا و ترتیب سے معرا دیکھا

تو فارسی نے آہنگ سمجھا اور ولی ہی کو پہلا شاعر مانا۔ جیسا کہ آب حیات میں لکھا ہے کہ ولی کو ہندوستان کی نظم میں وہی رتبہ ہے جو انگریزی کی نظم میں چاسر کو اور فارسی میں رودکی کو اور عربی میں مہلہل کو۔

دیگر محققین کے نزدیک اردو شاعری کی ابتدا ولی سے ایک مدت پہلے ہو چکی تھی اور متعدد شعرا گزر چکے تھے۔ اور یہ ولی کا محض تفوق تھا جس نے انھیں ممتاز کیا اور اردو شاعری کا موجد مشہور کر دیا۔ چنانچہ نواب مصطفیٰ خان اپنی کتاب گلشن بے خار میں لکھتے ہیں:

مشہور است کہ وی اول کسیکہ بہ ریختہ سخن کردہ است یعنی ولی، با پیشتر ہم کہ در این زبان شائع بود
بہ تحقیق انتہی رسیدہ، قول سبقت بتحقیق نرسیدہ، شاید کہ بہ رتبہ او نرسیدہ و منسوب بگفتنش بحت
نیست باشد

صاحب جلوۂ خضر یعنی صفیر بلگرامی بھی اس خصوص میں نواب مصطفیٰ خان کے ہمنوا ہیں۔ صفیر صاحب کی رائے ہے اور یقیناً صائب ہے کہ اردو زبان مدت سے دکن میں موجود تھی۔ اس لئے لازمی طور پر پہلے نثر ہی نے جلوہ دکھایا ہوگا اور پھر نظم و نسبتاً یا ہوگا۔ ان کے قول کے مطابق پہلے امیر خسرو کی گنگا جمنی غزلوں کی نسبت نقل ہوتی ہوگی اور بیسیوں نے پہلے پہل بہت لوگوں کو کم بنیاد بنا دیا ہوگا اور چونکہ ولی کا کلام صاف و شستہ بھی ہے اس لئے ہرگز ابتدائی نہیں بلکہ ترقی یافتہ ہے۔ صفیر صاحب کے بیان کی تصدیق ان دکنی شعرا کے کلام سے ہو جاتی ہے جن میں ولی کی سی صفائی و شستگی نہیں بلکہ امیر خسرو کی تقلید معلوم ہوتی ہے۔

مگر صاحب جلوۂ خضر کی یہ تحقیق شاعرانہ منطق کی ایک دلیل کا مصرع اولیٰ ثابت ہوئی یعنی ان سرد و گم حالات میں جب اردو شاعری کے اصل موجد کا سراغ نہ لگا تو انھوں نے یکایک اولیت کی دستار سعدی دکنی کے سر پر رکھ دی اور اس شرف ارزانی میں سعدی دکنی ہی کے ایک شعر کو اس کے اول اردو شاعر ہونے کی سند تصور کیا۔ وہ شعر یہ ہے ؎

سعدی غزل انگیختہ شیر و شکر آمیختہ　　در ریختہ در ریختہ ہم شعر ہے ہم گیت ہے

صفیر صاحب نے اس شعر سے یہ معنی پیدا کئے ہیں کہ یہ شعر دکنی زبان میں ہونے کی وجہ سے گیت کہا گیا اور فارسی محاورے میں ہونے کے سبب شعر۔ "شیر و شکر آمیختہ" دکنی اور ایرانی زبان کے مشترک اور ایک نئی زبان جن کو ریختہ کہلانے پر دلالت کرتا ہے اور "سعدی غزل انگیختہ" سعدی کے موجد غزل ہونے کا اظہار کرتا ہے۔

مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ شعر کن آفات ارضی و سماوی سے اس طرح منقلب ہو گیا۔ حالانکہ اکثر کتب میں اس کی صورت یہ دیکھنے میں آتی ہے ؎

سعدی بگفتا ریختہ در ریختہ در ریختہ　　شیر و شکر آمیختہ ہم ریختہ ہم گیت ہے

اور اگر فی الامر محال اس شعر کا کوئی رکن سعدی غزل انگیختہ ہو بھی تو کون وثوق سے کہہ سکتا ہے کہ اس میں شاعرانہ تعلّی کا احتمال نہیں ہے

اور پھر شاعرانہ تعلّی نہ بھی ہو تو اس سے صرف غزل کے موجد کا کچھ سراغ ملتا ہے باقی اصنافِ سخن کی ایجاد پھر بھی سرِ دَر گُم رہے گی۔
منیر صاحب نے اپنی تحقیق سے نہ صرف اردو شاعری ہر دو اصناف شعر کی ابتدا قطب شاہیوں کے عہدِ حکومت میں ثابت کی ہے اور اس کے بعد میری کتاب "نکات الشعراء" کے حوالے سے اُس دور کا آغاز دکھایا ہے جس میں فراقی۔ احمد گجراتی۔ سراج۔ ضیائی وغیرہ ولی کے معاصرین ہوتے ہیں۔ اب اگرچہ یہ حوالہ بھی پادر ہوا ہے تاہم یہ امر مسلمہ ہے کہ ولی کے زمانے میں شاعروں کا ایک گروہ موجود تھا صاحب شعر الہند نے بھی اس کی تصدیق کی ہے اور سب سے بڑا ثبوت ولی کے وہ اشعار ہیں جن میں انھوں نے اس عہد کے شاعروں پر چوٹیں کی ہیں۔ کہتے ہیں ؎

تیرے اشعار ایسے نہیں فراقی	کہ جس پہ رشک آویگا ولی کو
لگتے ہیں حاسدوں کے یوں دل میں بیت میرے	سینے میں دشمناں کے جیوں ذوالفقار آوے

ایسے اشعار بھی ہیں جو فخریہ کہے گئے ہیں۔ اور ارباب خبر سے یہ امر پوشیدہ نہیں ہے کہ ایسے مضامین صرف نوک جھونک کی غرض سے باندھے جاتے ہیں۔ اور نوک جھونک ہمیشہ معاصرین ہی سے ہوا کرتی ہے۔ ولی کے ہاں فخریہ شعر موجود ہیں مثلاً

پڑھتے ہیں ولی شعر ترا عرش پہ قدسی	باہر ہے تیری فکر سا حدِّ بشریت
ہے سخن جگ منے عدیم المثال	جز سخن نہیں دوجا جواب سخن
عرفی و انوری و خاقانی	مجھ کو دیتے ہیں سب حساب سخن

مندرجہ بالا بیانات، اقتباسات و دلائل سے ولی کے دکنی ہمعصر شعرا کا وجود ثابت ہے پھر دلی میں بھی ان کے دور سے قبل شعرا کا پایا جانا ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے چنانچہ میر حسن نے بھی ایک ایسے شاعر کا ذکر کیا ہے جو ولی سے پہلے دہلی میں تھا اور اس کا تخلص خاکی تھا۔ میر حسن لکھتے ہیں۔

"مردے بود درویش از شاہجہاں آباد در عہد جہانگیر احوالش معلوم نیست از یک مرد پیرے یک شعرش بگوش خورد ؎

ٹھانی ہی اپنے من میں اتجے یہی تر بجن	تجھ پیم کی گلی میں خاکی کو خاک ہونا

اس نقطۂ نظر سے تو ولی یقیناً نہ اول شاعر ہیں اور نہ اول صاحب دیوان۔ مگر اس دکنی پھیکی بے معنی ولایت یعنی سرزمین کی اردو شاعری سے قطع نظر جو نہ پڑھی جائے اور نہ سمجھ میں آئے۔ اصل اردو (وہ اردو جو آج ہم بولتے ہیں) اس کی ولایت تمام تر ولی ہی کے زیرِ نگین نظر آتی ہے اور وہی اس کے موجد معلوم ہوتے ہیں۔ دہلی میں بھی صرف انہیں کے دم سے یہ گہما گہمی ہوئی اور دکن میں بھی سر براہِ شعر و سخن رہے جیسا کہ خود فرماتے ہیں ؎

جوں گل شگفتہ رو ہیں بیاضِ سخن کے چمن میں ہم | جوں شمع سربلند ہیں ہر انجمن میں ہم

یہ عام رنگ ہے۔ صرف انہی کا کلام ہے جو ہر صنفِ سخن میں موجود ہے۔ ان کی خصوصیات اور ان کی طرزِ نگارش نے انہیں ایسا ممتاز کیا کہ وہی اردو شاعری کے موجد سمجھے گئے۔ وہ درحقیقت موجود و رنگِ تغزل کی ندرت و ابتدا کے ساتھ ساتھ قافیہ بھی ہے۔ اور یہ بھی۔ قصیدہ بھی تشبیب و گریز و خاتمہ، مثنوی ہر طرح مکمل اور کیا نہیں: رباعی، قطعہ، مستزاد، مخمس۔ سب اسلوب و اسباب یہیں کے لیے چھوڑ گئے تھے۔ تمام و کمال ولی کا مرہونِ منت ہے۔ اور ان معنوں میں یقیناً ان کی یاد و وہ موجودہ اردو شاعری کے مظہر بلکہ آدم الشعراء۔

امیر خسرو اور دوسرے ہندیوں کا کلام جو طبع ہوا یا نہ ہو سکا بجا تھا۔ فارسی کی اکثر بے جوڑ ترکیب کی بدولت نامطبوع رہا۔ آج اس کا پڑھنا اور سمجھنا کوہ کندن و کاہ برآوردن سے کم نہیں۔ ذیل میں ایسے شعرا کا کلام مشتے از خروارے پیش کیا جاتا ہے تاکہ ولی کے کلام سے مقابلہ کیا جا سکے اور زمین و آسمان کا فرق واضح ہو جائے

خسرو: زحالِ مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں | کہ تابِ ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

سعدی دکنی: قصہ چو دیدم بر رخت گفتم کہ یہ کا دیت ہے | گفتا کہ در جو بارے اس شہر کی یہ ریت ہے

قائم: عزمِ سفر چوں کردی ساجن منیوں مینہ آوے جی | قدرِ وصالت نہ دانستم تم بن برہ ستاوے جی

امیر۔ یہ ایرانی تھے مگر اردو بھی کہتے تھے۔ فرماتے ہیں

بامن کی بیتی آج رہی کہہ موں پری | غصہ کیا و گالی دیا اور دگر ری

گوالکی کے دیوان میں بھی چند خمیر میں ہمیشہ دکنی زبان میں نظر سے گذرے ہیں مگر ترکیب کا التزام قافیہ کی بدولت وہ بھی پھر ایسی ہی رنگ نہیں معلوم ہوتیں۔ ولی کے معاصرین یا متقدمین کے کلام آج دھندلے اور خود ولی کی سچائی پر دلالت کر رہے ہیں اور ولی کا کلام آج بھی مقبولیت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ بعض اشعار میں تو ایسی زبان صرف کی گئی ہے کہ دو سو سال بعد بھی محاورے میں ڈوبے ہوئے نظر آتے ہیں اور جہاں تک تمام کلام کا تعلق ہے۔ الفاظ کا تلفظ بدل جانے کا خاص سبب یاد کریں گے وہ طرز جس کی بنیاد ولی نے ڈالی آج تک جاری ہے اور معلوم ہوتی ہے۔ چند اشعار لکھے جاتے ہیں۔

شاخِ گل ہے یا نہالِ ناز ہے | سرو قد ہے یا سراپا ناز ہے

جب نقش اس صنم کا نقاش کھینچتا ہے | بازو کے کھینچنے میں وہ ہاتھ کھینچتا ہے

تا چند کہوں بات تیری خوش شکلی کی | اے شوخ ترے غمزۂ شوخ کی نوبلی کی

مذہبِ عشق میں تیری صورت | دیکھنا ہم کو فرضِ عین ہوا

صنم کے لعل پر وقتِ تکلم | رگِ یاقوت ہے موجِ تبسم

کیونکہ سیری ہو حسن سے تیرے	دھوپ کھانے سے پیٹ بھرتا نہیں
سن تو دل کیوں تڑپا اس بت حیا کے ہاتھ	کوئی آتا ہے بھلا اپنے ستمگار کے ہاتھ
پھر میری خبر لینے وہ صیاد نہ آیا	شاید کہ مرا حال اُسے یاد نہ آیا
لام نستعلیق کا ہے اُس بت خوشخط کی زلف	ہم تو کافر ہیں اگر بندے نہ ہوں اسلام کے

ظاہر ہے کہ یہ زبان نہایت فصیح ہے۔

ولی کا رتبہ سمجھنے کے لئے اس مقام پر ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ آب حیات اور دیگر کتب میں ولی کو اعلیٰ علم اور فن عروض سے نابلد کہا گیا ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ معترضین ولی کے اشعار کی تقطیع کرتے وقت موجودہ تلفظ کرتے ہیں اور شعر بحر سے گر جاتے ہیں مگر یہ بڑی غلطی ہے۔ ولی کی نہیں بلکہ معترضین کی۔ واقعہ یہ ہے کہ اُس زمانہ اور اس زمانہ کے تلفظ میں زمین آسمان کا فرق ہے مثلاً اُس وقت نہیں کا تلفظ "نیں" تھا۔ ولی نے جہاں کہیں "نہیں" باندھا ہے اکثر "نیں" ہی تلفظ کیا ہے۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل اشعار کی تقطیع سے ثابت ہوتا ہے۔

چار دن کے	حسن پر مت	کر غرور	
حسن کر دا	ئم بقا نہیں[1]	الغیاث	
فاعلاتن	فاعلاتن	فاعلات	(یہ بحر رمل مسدس مقصور ہوا اور شعر بالکل درست)

اسی طرح اس شعر میں نہیں کا تلفظ "نیں" ہی ہے۔ "نہیں" پڑھنا شعر کو ناموزوں کرے گا۔

جو کہ تجھ پر نگاہ کرتا نہیں	وہ اپس کی خودی بسرتا نہیں

علم کے متعلق یہ ہے کہ ولی کا کلام تو یہی بتاتا ہے کہ وہ اعلیٰ قابلیت کے مالک تھے۔ مندرجہ ذیل اشعار کے تیور دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں

زلف و رخ ہے ترا جو لیل و نہار	مجکو واللیل والضحیٰ کی قسم
مضطرب عشق سے ہوں مجکو ملامت نہ کرو	تپش دل نے دیا رشتۂ سیماب مجھے
جس نے پکڑا اگر رشتہ آزادگی	اس کو موج بوریا شمشیر ہے
تمام پات تسبیح محمد وکے بہ حکم	زبان حال سے کرتے ہیں ذکر سبحانی
حسن تھا پردۂ تجرید میں سب سوں آزاد	طالب عشق ہوا صورت انسان میں آ

---

[1] اس نہیں کو "نیں" پڑھئے جب "تیں" کے موافق ہوگا۔ اور یہی سمجھ کر ولی نے باندھا ہے۔

وحدۃ الوجود صوفیہ کے عقاید سے سب اور اسی سے واقفیت ولی کی اصلی قابلیت پر دال۔

ولی کا رتبہ دکھانے کے لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے کلام کی خصوصیات، اصناف سخن کے نمونے اور بحث کلام کی توضیح کی جائے

اصنافِ سخن اور ولی

ولی نے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ غزل، قصیدہ، مستزاد، مثنوی، رباعیات، قطعات، مخمس، ترجیع بند اور مفردات غرض سب قسم کے نمونے موجود ہیں۔ یہاں ایک ایک صنف کو تفصیل وار ذکر کیا جاتا ہے تاکہ کلام کی نوعیت معیار کلام کا درجہ اور بحث کلام سے مراد وہ افکار ہیں جو شاعر کے ذہن میں آئے اور کسی نہ کسی صورت میں سلسلہ نظم سے منسلک ہو گئے

غزل

شروع شروع کی غزلیں نہایت سادہ ہیں ولی شاید فہم و تفہیم کی سہولت کے خیال سے ردیف کا التزام نہیں کیا۔ اور اگرچہ غزل میں متعلقہ مضامین ہی بیان کرتے چاہییں اور ولی نے زیادہ تر یہی کیا بھی ہے لیکن بعض غزلوں میں متفرق مضامین پر مشتمل اشعار بھی ہیں اور یہی تنوع اور رنگارنگی شعرا دور حاضرہ کی غزلوں میں بھی کارفرما ہے اس ضمن میں یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ مسلسل غزل جو زمانہ موجودہ کی ایجاد سمجھی جاتی ہے اور جس پر سیماب اکبرآبادی، ڈاکٹر اقبال اور خصوصاً جوش ملیح آبادی بہت زور دیتے ہیں، ولی کے دیوان میں بھی موجود ہے مسلسل غزل کے تمام اشعار ایک ہی مضمون کی کڑیاں ہوتے ہیں کہ اگر ایک شعر بھی نکال دیں تو غزل کا مضمون خبط ہو جاتا ہے حالانکہ عام غزلوں میں یہ نہیں ہوتا کیونکہ ان کا ہر شعر بجائے خود ایک پورا مفہوم رکھتا ہے۔ ذیل میں ایک غزل، ایک مسلسل غزل اور بحث کلام پر روشنی ڈالنے کے لئے غزلوں کے مختلف اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

غزل

پڑی جو نظر چشم دلبر طرف — ہوا ہوش کیا بے دلی بر طرف
اگر آبرو تجھ کو درکار ہے — نہ جا خوبرویاں کے کوچہ طرف
کھلے دیکھ تجھ لب کوں آب حیات — رہے یک نظر آ تو شکر طرف
زبس تجھ ملاحت کا مشتاق ہوں — پڑا شور تجھ حسن کا ہر طرف
ولی کو نہیں مال کی آرزو — محبت نہیں دیکھتے زر طرف

مُسلسل غزل

اسکال پہ بنا احمد جو بنا بٹھلایا — تب ملک نے وہیں صلوا علیکم گایا
حوریاں نے ترانے سوں دو نغمے گائے — تاب قوسین کا رشتہ ہے تو سب کو بھایا
تھے براتی وہاں آدم سے لگا عیسے — اور جبریل ہیں نوشہ کے سہرا لایا

حق نے تو اک لاتق میں محمدؐ کے کہا　　اُن سوا کون سے مرسل نے یہ رتبہ پایا

مغفرت تیری ولیؔ سہل بلا ریب ہے کیوں

نام احمد کا جو ہر دم ترے لب پر آیا

یہاں کیوں کی ترکیب بھی غور طلب ہے یہ چیزیں غالب کا حصہ سمجھی جاتی ہیں اور ہیں بھی۔

کہتے ہیں ؎　کیوں اندھیری ہے شبِ غم ہے بلاؤں کا نزول　　آج اُدھر ہی کو رہے گا دیدۂ اختر کھلا

یا یہ شعر ؎

لوکا ہے اُٹھا شانہ بکلیں کے گلے کر　　یہ ظلم تو دیکھو

مشکل سے ہوئی ہوگی مگر تن میں جدائی　　کیوں ؟ کند تھا خنجر

گر ولی کا کلام دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ وہ زمانہ اور یہ اسالیبِ نگارش :

متفرق اشعار و مبحث کلام

جسے عشق کا تیر کاری لگے　　اُسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے　(زرانہ لی)

ہم پاس آکے بات نظیری کی مت کہو　　بکتے نہیں نظیر ایس کی سخن میں ہم　(فخریہ)

موج دریا کی دیکھنے مت جا　　دیکھ اُس زلف عنبری کی ادا　(عاشقانہ)

ولی رکھتا ہوں سینے میں ہزاروں گوہر معنی　　دکھاؤں اپنے جوہر کو اگر کئی جوہری ہووے

(شکوۂ ناقدریٔ ابنائے زماں)

عجب نہیں جو حقیقت پہ آفریں بولے　　ولی جو کوئی سُنے اِس وضع کی تصنیف　(موجد ہونے کا احساس)

بات کہنے کا کبھی جب وقت پاتا ہے غریب　　بھول جاتا ہے وہ سب کچھ دیکھ صورت یار کی　(عاشقانہ)

یہ وہی رعب حسن کا مضمون ہے جو طرح طرح سے بندھتا چلا آتا ہے۔ غالب کہتے ہیں ؎

آج ہم اپنی پریشانیٔ خاطر اُن سے　　کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھیے کیا کہتے ہیں

معشوق کو ضرر نہیں عاشق کی آہ سے ——— بجھتا نہیں ہے بادِ صبا سے چراغِ گل　(تخیل)

کیا بات ہے ایسے مضامین تو آجکل بھی کم سننے میں آتے ہیں۔

کچھ بھلا نہیں رقیب کو تکتا　　ایک پاپوش خوب لگتی ہے　(ظرافت)

یوسف زلیخا تصنیف ہاشمی بیجاپوری کا ایک صفحہ

سیہ روئی نہ لے جا حشر میں دنیا سے فانی سوں — یہ نامہ کو دھولے بے خبر انجھواں کے پانی سوں
صحف کُھ ترا ہے سورت فجر — بجوں انجم اور ہوا کی قسم

صحف کُھ کی اضافت پر نہ ہنسنا چاہیے یہ آج سے دو سو سال قبل کی زبان ہے مضمون کو دیکھئے اور شاعر کے مذاق اور بلند پروازی کی داد دیجئے۔

او سیدات یاراں میرا سلام کہنا — ہوں یاد میں تمہاری میں صبح و شام کہنا
اور مجھ پاس کیا ہے دینے کوں — دیکھ کر تجھ کو رو دیتا ہوں

اس شعر پر میرزا غالب یاد آجاتے ہیں اُن کے شعر بھی ملاحظہ ہوں۔ صاحبانِ نظر ہر دو جواہر کو آنکیں مگر زمانہ کا خیال رہے۔ ولی دو سو سال پہلے کے شاعر تھے۔

غالب کہتے ہیں ؎

ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے — بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اُٹھا بھی نہ سکوں
زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ستمگر ورنہ — کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

(ولی) کیا سہم ہے آفات قیامت سُتی اُس کوں ——— کھایا ہے جو کوئی تیر تجھ ابرو کی کماں کا (عشق حقیقی)
دل کو گر مرتبہ ہے درپن کا — مفت ہے دیکھنا سجن کا (مطالعہ نفس)

اشارہ ہے من عرف نفسہٗ فقد عرف ربہٗ کی طرف

مت ارد لی کو میراں اتنا تو کہا کر — یہ ناز ترا جگ میں اٹھا کون سکے گا (مجاز) (عاشقانہ)
شیخ یاں بات تری پیش نہ جائیگی کبھی — زہد کو چھوڑ کے مت مجلس رندان میں آ
نہ کر سکوں ترے اک تار زلف کی تعریف — کروں ہزار کتب تجھ ثنا میں گر تصنیف (ہجو)
قسمت تری ہو حق پہ نہ ہو نا امید یہاں — نہیں اس قفل کوں غیر توکل کلید یہاں (پند۔ توکل علی اللہ)
طمع ال کی سربسر عیب ہے — خیالات گنج جہاں سر سے ٹال (موعظہ)

مستزاد

مستزاد دو قسم کے ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ غزل کے ہر مصرع پر ایک فقرہ نثر بڑھایا جائے جس کا مفہوم مصرع سے چسپاں ہو جائے۔ اور دو لخت نہ معلوم ہو۔ ایسے مستزاد فارسی میں اکثر دیکھنے میں آتے ہیں اردو میں نہیں۔ دوسری قسم کے مستزاد ایسے ہوتے ہیں کہ بجائے فقرہ نثر کے دو رکن ہر مصرع پر بڑھا دیئے جاتے ہیں۔ اس طرح کہ مضمون [illegible] مل جائے اور یہ رکن پھر الگ کے الگ رہیں یعنی غزل کے مصرع اور بڑھائے ہوئے ٹکڑے میں وہی تعلق ہو جو ہر دو متصل مصرعوں میں ہوتا ہے

انشا اور مصحفی کے مستزاد مشہور ہیں۔ ولی کے مستزاد کا نمونہ لکھا جاتا ہے۔

بے تاب کیا شوق نے مجھ دل کو بدن میں   گل پیرہناں کا
جیوں غنچہ کیا بند محبت کے چمن میں   رنگیں دہناں کا

لاگی ہے لگن تم سوں چھڑا کون سکے گا   ہے کس میں یہ قدرت
اب نکلوں وطن اپنے لجا کون سکے گا   کر دل سوں رفاقت
مت مار ولی کوں میں یہ کہتا ہوں "کہا" کر   سن بات ہماری
اس ہجر کے طومار کو پا کون سکے گا   بن غمزہ و ظرافت

قصیدہ | ولی نے اپنی عمر میں کسی بادشاہ یا امیر کی مدح نہیں کی اس لئے قدرتی طور پر قصائد جو درباروں اور سرکاروں کی زینت ہیں ولی کے یہاں نہ ہونے چاہیئے تھے۔ مگر ولی اپنے نام کے ولی تھے حمد خداوندی، نعت رسول مقبول و مدح بزرگان دین میں قصیدے لکھے اور خوب لکھے۔ یہ قصیدے ہر طرح مکمل ہیں تشبیب و گریز و خاتمہ سب کچھ ہے مگر خیالات زیادہ تر دکنی ہیں۔ بہرطور شوکت الفاظ و رفعت تخیل جن میں قصیدہ کی برتری کا راز مضمر ہے ولی کے ہاں موجود ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار لکھے جاتے ہیں

ہے زباں پر تو اول اول   نام پاک خدائے عز و جل
ایک حمد نہیں ہے اس بن اور   اس اوپر متفق ہیں اہل ملل

اس قصیدے میں قطعہ بند بھی ہیں اور درمیان میں غزل بھی شروع ہوتی ہے کہتے ہیں ؎

دیکھ تیری یہ چشم شنگ غزال   مدح تیری میں یہ کہا ہوں غزل
تے یہ تیرے نین ہیں دو چنچل   دیکھنے جن کو خلق آوے چل

قصیدہ در نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم

عشق میں لازم ہے اول ذات کوں فانی کرے   ہو فنا فی اللہ دائم یاد یزدانی کرے
یاد کے گلزار پر دو نین کر ابر بہار   پیچ کھا سینے میں دل کوں سنبلستانی کرے
مرتبہ خلت پناہی کا وہ پاوے گا جو کوئی   مثل اسمٰعیل اول جی کوں قربانی کرے

ترجیع بند ترجیع بند میں غزل کی طرح ایک مطلع اور چند اشعار رکھ کر ایک بیت کی جس کا قافیہ ازی ہو، پہلے اشعار سے مختلف ہو، گرہ لگائی جاتی ہے۔ یہ بیت بدستور قدیم رہتی ہے اور اس طرح کہ ہر بند کے آخر میں آتی ہے۔ ولی کا ایک ترجیع بند لکھا جاتا ہے

بزور نزاکت بزور ادا   صف گرخاں کا ہے تو مقتدا
مرد گار تھا جب تمک بخت سعد   نہ رہتا تھا اک آن تجھ سوں جدا
یکایک ترے ہجر نے اے صنم   کیا محو سب عشرت ابتدا
کروں تجھ سے کیوں آرزو جواب   سدا کوہ تمکین ہے بے صدا
ترے غم سوں پھٹتی ہے چھاتی مری   ہے اشک سوں دو نین زہر آ
بجا ہے سنو گر مرا التفات   کہ سنتے ہیں شہ عرض حال گدا
تغافل کرت کام فرما سجن   مری بات سن کر برائے خدا

شب بی خبر سے کہ بے تاب ہوں
ترے عشق میں بے خور و خواب ہوں

مخمس کسی شعر پر تین مصرع لگانا اس طرح کہ یہ تینوں مصرعے شعر کے پہلے مصرع کے ساتھ ہم قافیہ ہوں اور معنی کے اعتبار سے مربوط بھی ہوں تخمیس لکھنا کہلاتا ہے مخمس دوسروں کے اشعار پر بھی لکھے جاتے ہیں اور اپنے اشعار پر بھی اردو کے مصرعے لگا دیتے ہیں۔ مگر ولی نے صرف اپنے ہی اشعار پر مخمس کہے ہیں معلوم ہوتا ہے فارسی اشعار کو اس نے تخمیس نہیں کیا کیونکہ ان کی توجہ تمامتر اردو کو بنانے اور ترقی دینے میں مصروف تھی اور وہ صرف اسی میں کوشاں تھے۔ اور دوسرے اردو شاعروں کے اشعار پر اس لئے کوئی مخمس نہیں لکھا کیونکہ ولی تخمیس خاطر میں نہ لاتے تھے۔ ان کے کلام کو اردو ہی نہ سمجھتے تھے۔ اور وہ ایسا کرنے میں یقیناً حق بجانب تھے۔ ولی کے مخمس کا نمونہ حسب ذیل ہے

(۱) عشق کے درس کا ہوں میں استاد   طفل مکتب ہے مجھ کنے فرہاد
بندہ تیرا ہوں گرچہ ہوں آزاد   بسکہ رکھتا ہوں تجھ قدم کی یاد
دل ہوا خوں مرا حنا کی طرح

(۲) زندگی تیرے لب کی مسیحا پہ لکھا ہوں   افسون سبب جنوں نسخہ دیا پہ لکھا ہوں
ہر چند دفتر کوں دل رسوا پہ لکھا ہوں   تصویر تری جان مصفا پہ لکھا ہوں
جو نقش پری پردۂ مینا پہ لکھا ہے

قطعہ | غزل یا قصیدے کا ٹکڑا جو کسی پورے اور مسلسل معنی کا حامل ہو قطعہ کہلاتا ہے۔ قطعہ میں کم سے کم دو شعر ہوتے ہیں ایک شعر پر قطعہ کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ اس میں مطلع ضروری نہیں اور اکثر نہیں ہوا کرتا۔ اس میں ولی کا رنگ حسب ذیل ہے

قطعہ

حسن دلبر کا خواب میں دیکھا   نور حق تھا حجاب میں دیکھا
خود فنا ہو کے ذات میں منا   یہ تماشا حجاب میں دیکھا

اس قطعہ سے بھی ولی کا ترفع خیال و مذاق تصوف ظاہر ہوتا ہے۔

رُباعی | مجمع الصنائع میں ہے کہ رباعی منسوب بہ رُباع ہے۔ چونکہ رباعی میں چار مصرع ہوتے ہیں اس لئے اس کو رُباعی کہتے ہیں اور اسی لئے اس کا نام چار مصرعی اور دوبیتی بھی ہے۔ مگر یہ امر مسلمہ ہے کہ صرف چار مصرعوں سے رباعی نہیں ہوتی اس کے اوزان مقرر ہیں جو چوبیس[۲۴] بتائے جاتے ہیں اور رُباعی ہمیشہ بحر ہزج میں آتی ہے۔ رُباعی کا مشہور وزن لاحول ولا قوۃ الا باللہ ہے۔ ولی کی بعض رُباعیاں اس وزن پر پوری نہیں اُترتیں اس لئے انھیں قطعہ ہی کہا جا سکتا ہے۔ اگر رباعی کے چاروں مصرعوں میں قافیہ ہو تو وہ مُصرّع کہلاتی ہے ورنہ خصی، ولی کی تمام رُباعیوں میں تیسرا مصرع بغیر قافیہ ہے۔ اس لئے انھیں خصی کہنا چاہئے لیکن آج کل یہ کوئی عیب نہیں ہے بلکہ عام رواج یہی ہو گیا ہے کہ تین ہی مصرعوں میں قافیہ ہو۔ مثال کے طور پر ولی کی ایک رباعی لکھی جاتی ہے

دیوانِ ازل بیچ خدائے بیچوں   یہ حکم کیا عام کہ ہاں کُن فیکوں
افراد دو عالم کا بندھا شیرازہ   اس دفتر کونین پہ فہرست ہے توں

مثنوی | یہ نہایت مفید صنف نظم ہے۔ اس میں اوّل سے آخر تک ابیات ہی ابیات ہوتے ہیں جن کا قافیہ اور اگر کسی بیت میں ردیف ہو تو ردیف بھی، ہر بیت کے بعد تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس میں رزم و بزم دونوں پہلو دکھائے جاتے ہیں۔ ولی نے ایک نہایت مختصر مثنوی شہر سورت کے متعلق کہی ہے جس میں محاکات کی شان جلوہ گر ہے۔ یعنی بالکل تصویر کھینچ دی ہے

اب ولی کے کلام کی خصوصیات پر مختصر تبصرہ کیا جاتا ہے۔

خصوصیات | مزاج میں شوخی ہے اجیسا کہ اس شعر سے بھی ظاہر ہے ؎

کچھ بھلا نہیں رقیب کو لگتا   ایک پاپوش خوب لگتی ہے

مگر استخفاف انبیاء و اولیاء سے پرہیز کرتے ہیں تضحیک واعظ و ناصح میں چند شعر کہے ہیں لیکن ان میں بھی ایسی تذلیل و تحقیر نہیں کی

ولی کے ہر شعر سے ایک مسلمان کا کلام ہونا ظاہر ہوتا ہے ہر حالت میں مذہب مدنظر رہتا ہے۔ وہ اس کے خلاف کچھ نہیں کہتے اور نہیں کہہ سکتے ولی کسی بادشاہ یا وزیر کا قصیدہ نہیں کہتے خود ہی بادشاہ ہیں۔ روپے کی خاطر جھوٹی سچی مدح پسند نہیں کرتے۔ کہتے ہیں۔

ولی کو نہیں مال کی آرزو   خدا دوست نہیں دیکھتے زر طرف

ولی کسی کی ہجو نہیں کرتے حالانکہ اکثر بڑے لوگ اس معصیت سے ملوث ہو جاتے ہیں مگر ولی مبرا ہیں۔ اُن کا کلام ہجو سے پاک ہے۔

ولی کے یہاں حقیقت و مجاز دونوں ہیں۔ اور انھوں نے خود بھی صاف صاف کہہ دیا ہے۔ کہتے ہیں ؎

در وادیٔ حقیقت جس نے قدم رکھا ہے   اوّل قدم ہے اُس کا عشق مجاز کرنا

طریقت صوفیہ کے مطابق جب کسی سے دلی تعلق ہو جاتا ہے تو صاف دل اور پاک باطن ہونے کی وجہ سے نام بھی ظاہر کر دیتے ہیں جو بھلا معلوم ہوا اسی کی تعریف کر دی۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

مقصود دل ہے اُس کا خیال اے ولی مجھے   جیوں مجھ زباں کا ورد محمد مراد ہے

ہے بسکہ آب رنگ حیا کیم داس میں   آتا نہیں کسی کے خیال و قیاس میں

خصوصیات کلام کے بعد صنائع لفظی و معنوی جو ولی کے کلام میں موجود ہیں اُن کا نہایت مختصر طور پر ذکر کیا جاتا ہے (یہ وہ صنعتیں ہیں جن کا اب تک اس مضمون میں کسی طرح ذکر نہیں آیا)

تشبیہ | جب دو چیزیں کسی خصوصیت مشترک کی وجہ سے ایک دوسرے جیسی بتائی جاتی ہیں تو اُسے تشبیہ دینا بولتے ہیں۔ تشبیہ کی ضرورت تشبیہ کے فوائد۔ تشبیہ کے اقسام پر روشنی ڈالنے کا یہ محل نہیں صرف اُن صنعتوں کی طرف اشارہ کیا جائے گا جو ولی کے کلام میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ ولی کہتے ہیں ؎

لخت دل پر خط لکھا ہوں یار کو   داغ دل مہر سر مکتوب ہے

دل کو خط سے یا محبت کو مضمون سے (یہ نہایت لطیف کنایہ ہے) اور داغ دل کو اس مُہر سے تشبیہ دی ہے جو لفافے یا خط کے اوپر لگائی جاتی ہے نہایت اعلیٰ تشبیہ ہے اور رازداری کی طرف بھی نہایت لطیف اشارہ ہے۔ کہتے ہیں ؎

موج دریا کی دیکھنے مت جا   دیکھ اُس زلف عنبریں کی ادا

اس تشبیہ کو تشبیہ اضمار کہتے ہیں۔ اس شعر میں زلف کو موج دریا سے تشبیہ دی ہے لیکن ظاہر یہ کیا ہے کہ گویا تشبیہ دینی مقصود نہیں ہے۔
اسی طرح اور بہت سی عمدہ تشبیہات ولی کے کلام میں دکھائی جا سکتی ہیں۔

استعارہ | جب کوئی لفظ اپنے اصلی اور لغوی معنی میں استعمال نہیں ہوتا بلکہ کسی مناسبت کی وجہ سے کسی دوسرے معنی میں یعنی معنی مستعار

میں استعمال کیا جاتا ہے تو اُسے استعارہ کہتے ہیں۔ ولی کے یہاں استعارہ ہے لیکن بہت کم اور نہایت سریع الفہم۔ مثلاً کہتے ہیں ع

کیا ہے ابر نے رحمت سے گوہر افشانی

یہاں بارش کی بجائے گوہر افشانی کہا گیا ہے۔

تجنیس | جب دو لفظ اپنے تلفظ اور حروف میں (یا محض حروف میں یا اکثر حروف میں) ایک دوسرے جیسے ہوں اور با ایں ہمہ اُن کے معنی ایک دوسرے سے مختلف ہوں تو اُن کے درمیان صنعت تجنیس ہوتی ہے۔ تجنیس کی بہت قسمیں ہیں یہاں صرف ایک دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں جو ولی کے کلام میں خاص طور پر جاذب نظر ہیں۔ کہتے ہیں ؎

اے سنگ دل عاشقوں پہ یوں نہ کر جور و ستم
خیر اور شر کی حقیقت میں ہے اک شغال فال

شغال فال میں تجنیس مکرر ہے یعنی ہم جنس الفاظ متصل واقع ہوئے ہیں۔

ترے بن رات دن پھرتا ہوں بن بن ڈھونڈ
اپس کی کھ اُپر رکھ کر گل کی بانسلی انکھیاں

بِن = بغیر۔ بَن = جنگل۔ بِن اور بَن میں تجنیس محرّف ہے یعنی حرکت کے سوا جو ایک میں زیر اور دوسرے میں زبر ہے حروف دونوں کے ایک ہی ہیں اور معنی مختلف۔

تلمیح | تلمیح یعنی لطیف پیرایہ میں کسی واقعہ کی طرف اشارہ کرنا۔ مندرجہ بالا شعر میں اس کی مثال موجود ہے۔

ایہام | جب کلام میں کوئی ذو معنی لفظ استعمال ہوتا ہے اور اس سے بجائے قریب الفہم کے بعید الفہم معنی مقصود ہوتے ہیں تو اسے صنعت ایہام کہتے ہیں۔ ولی کہتے ہیں ؎

مذہب عشق میں تری صورت
دیکھنا ہم کو فرض عین ہوا

عین کے معنی آنکھ اور دوسرے معنی بالکل ہیں۔ یہاں دوسرے معنی مراد ہیں۔

موتی جو تک دیکھے تجھ دانت کا تماشا
اس کو پسینہ ہووے سے پھر ہو تماشا

یہاں پسینہ سے تو معمولی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے حالانکہ یہاں پسینہ سے مراد آب ہے اور یہ نہایت مشکل کام ہے۔

حسنِ طلب | نہایت خوبصورتی سے سوال کرنا۔ یہ بھی بڑی صنعت ہے۔ ولی کہتے ہیں ؎

بے نوا سے جس میں تنہا بخش ولی سے پیار
نیت صد حیف جو اس وقت میں درماں نہ کرو

تجاہل عارفانہ | جب کوئی شخص کسی شے کو اچھی طرح جاننے کے باوجود انجان پن ظاہر کرے تو اسے تجاہل عارفانہ کہتے ہیں۔ ولی اپنے محبوب کے متعلق کہتے ہیں ؎

شاخِ گل ہے یا نہالِ راز ہے — سرو قد ہے یا سراپا ناز ہے ۔

عکس — اس صنعت کے لئے یہ اہتمام کیا جاتا ہے کہ بجائے پورے شعر یعنی دو مصرعے بنانے کے ایک مصرع بنایا جائے اور اُس کے دو ایسے برابر کے ٹکڑے ہوں کہ دوسرا ٹکڑا پہلے اور پہلا ٹکڑا بعد میں کر دینے سے بھی معنی پیدا ہوں اور یہی منقلب مصرع شعر کا مصرعِ ثانی سمجھا جائے مثلاً حافظ کا یہ شعر ؎

دلبرِ جاناں من، بُرد دل و جانِ من — بُرد دل و جانِ من دلبرِ جاناں من

ولی کہتے ہیں ؎

مجھ کو ہے دارالامن پیو کا نقشِ چرن — پیو کا نقشِ چرن مجھ کو ہے دارالامن

ردّ العجز علی الصدر — جب ایک جملے کا آخر اور دوسرے جملے کا شروع ایک ہی لفظ کی تکرار سے ہو تو صنعت ردّ العجز علی الصدر رونما ہوتی ہے ۔ اس نام کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ صدر پہلے مصرع کے اوّل رکن کا نام ہے اور عجز دوسرے مصرع کے آخری رکن کا کسی شعر کے ارکان کے یہ نام ہوتے ہیں

صدر ——— عروض
حشو
ابتدا ——— عجز

ولی نے اس صنعت کے ساتھ ایک اور اہتمام بھی کیا ہے اور وہ یہ کہ جہاں پہلے مصرع کا شروع وہی ہے جو دوسرے مصرع کا آخر ہے وہاں دوسرے مصرع کا شروع بھی وہ ہے جو پہلے مصرع کا آخر ہو کہتے ہیں:۔

دلربا آیا نظر میں آج میری خوش ادا — خوش ادا ایسا نہیں دیکھا ہے دُوجا دلربا

پوری غزل ایسی ہی ہے ۔

قول بالموجب — جب کہنے والا ایک بات کہتا ہے اور سُننے والا اُسے سُن کر دوسرے معنی میں توڑ مروڑ لیتا ہے تو اُسے قول بالموجب کہا جاتا ہے ۔ ولی کہتے ہیں ۔

میں کہا تیرے بدن پر کیا بھلی لگتی ہی الکھ — ہنس کہا جوگی پہ سر کر خاک لگتی ہے بھلی

ایراد المثل — اور اسی کو ضربِ المثل اور ارسال المثل بھی کہتے ہیں ۔ جب کوئی بات کہی جائے اور پھر اُس پر کوئی مثل بھی بیان کر دی جائے تو اُس کے یقین کرنے میں کچھ تامل نہیں ہوتا اور بات کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے ۔ ولی کہتے ہیں

معشوق کو ضرر نہیں عاشق کی آہ سے — بجھتا نہیں ہے بادِ صبا سے چراغِ گل

پہلا مصرع ایک دعویٰ بلا دلیل تھا اُسے دوسرے مصرع سے گویا ثابت کر دیا ہے ۔

کیونکہ سیری ہو حُسن سے تیرے — دھوپ کھانے سے پیٹ بھرتا نہیں ۔

یہاں حسن کو دھوپ اور سیری نیت کو سیری شکم سے تعبیر کرکے ولی نے اپنے محبوب کو برابر دیکھے جانے کی ایسی وجہ بیان کی ہو کہ اب وہ ولی کو دیکھنے سے منع نہیں کرسکتا یہ بے مثل بیان کرنے کا قاعدہ،

مندرجہ بالا بیان سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ولی کے کلام میں بہت صنعتیں ہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ شعراء دور حاضر کے کلام سے بہت کم ہیں لیکن ہیں ضرور۔ اس کمی پر بھی تمام صنعتوں کا استیعاب اس مقام پر نہیں کیا جاسکتا صرف وہ صنعتیں بیان کی گئیں جو ولی کے کلام میں خواہ خواہ اپنی طرف توجہ منعطف کرلیتی ہیں

بیساختگی صفائی بیان۔ سلاست ترفع خیال اور سوز و گداز میں کہیں کہیں ولی کا کلام میر سے ٹکرا جاتا ہے اس کی مثالیں بھی اصناف سخن کے تحت میں دیکھی جاسکتی ہیں

ولی جنھوں نے شاعری میں کسی کے آگے زانوے ادب تہ نہیں کیا بلکہ الشعراء تلامیذ الرحمن کا پورا پورا ثبوت دیا ان کا کلام موجودہ اردو شاعری کا سرچشمہ معلوم ہوتا ہے اردو کے شاعروں نے تقریباً انھیں اصناف سخن میں ترقی کی ہے جن کی ولی آج سے دو سو سال قبل طرح ڈال گئے تھے۔

چاسرِ ہند

(از)

سید عباس حسین صاحب نقوی امید متعلم بی اے (عثمانیہ)

ولی جس پہ ہے ناز اہلِ دکن کو — دکن کیا بلکہ خود ملکِ سخن کو
وہ خاکِ خطۂ اورنگ آباد — دلاتی ہے جو عالمگیر کی یاد
وہ بھومی ہے ولی خوش بیاں کی — بنی تربت شہ ہندوستاں کی
ولی کا ہے وہی اردو میں رتبہ — جو انگریزی میں چاسر کا ہے درجہ
وہی نسبت ہے انکی شاعری کی — جو کچھ ہے فارسی میں رودکی کی
نہ مانیں کیسے اہلِ ہند احسان — تنِ اردو میں جس نے ڈالدی جان
ولی ہی سے ہے آبِ آبرو بھی — انہیں کا خوشہ چیں ہے آرزو بھی
کھلا سن سے ولادت کے نیا حال — ہزار اور اسپہ شتر پہ تھے نو سال
وطن سے علم کے لے کر خزانے — گئے گجرات میں تعلیم پانے
جبھی تو ان کو گجراتی سمجھکر — ہے سب گجراتیوں کو ناز ان پر
جو پلٹے آپ وہاں سے بن کے کامل — ہوی شعر و سخن پر طبع مائل
ہیں اصنافِ سخن جتنے جہاں میں — کیے سب جمع اردو کی زباں میں
شمالی ہند میں دو بار جا کر — بٹھایا اپنا سکہ سب کے دل پر
جو تھے اشعار ان کے ریختے میں — پڑھے جانے لگے ہر ہر گلی میں
کلام ان کا جو تھا ہر اک کو مرغوب — جہاں میں ان کی شہرت ہوگئی خوب
جو ستھرا تھا مذاقِ طبع ان کا — بجا ہندوستاں میں ان کا ڈنکا

جو تھا صحبت کا انکی شوق سب کو
ہوا شعر و سخن کا ذوق سب کو

طبیعت دار جو درد آشنا تھے
وہ دل سے نام پر اُن کے فدا تھے

نہیں دیکھا کہیں ان کو اکیلا
لگا رہتا تھا ان کے ساتھ میلا

ہوئی جب چار جانب انکی شہرت
ہر اک کی خود ہوئی مائل طبیعت

ولی کا جو بجا عالم میں ڈنکا
ہوا شیدا ہر اک شعر و سخن کا

پڑا ہر اک کو چسکہ شاعری کا
ہوا یوں بول بالا شاعری کا

ولی استاد ان کا نام نامی
غزل گوئی میں تھا انداز جامی

تعصب سے بری تھی ذات انکی
سراپا شعر تھی بات اُنکی

ہیں اردو شاعری کے جتنے اصناف
جھلکتے ہیں ولی کے اُن میں اوصاف

قدامت معترف انکی زباں کی
ہے دلچسپی معتبر حسنِ بیاں کی

ترنم، سادگی، حسنِ سلاست
فصاحت وہ، فدا جس پر بلاغت

تکلف طبع میں ان کے کہاں ہے
ہے آمد یا کوئی دریا رواں ہے

تھے علمی قابلیت میں بھی یکتا
جبھی ہے مستند ہر قول اُن کا

ہیں اہلِ ہند پر احساں ولی کے
مجدد ہیں یہ اردو شاعری کے

ادب کی ہند میں بنیاد یہ ہیں
حقیقت میں "جہاں استاد" یہ ہیں

ہمارے درسگاہوں کی یہ تعمیر
ولی کے خواب کی یکسر ہے تعبیر

لگائی تھی جو شاخ اُس معتقد نے
کیا سرسبز اس کو جامعہ نے

حقیقت میں ہیں قدرت کے عجب کام
وہ اک آغاز تھا اور یہ ہے انجام

دکھنی شعرا کا سفر شمالی ہند

از

جناب خلیق احمد صاحب نعمانی (عثمانیہ)

شاعر شعر کہنے سے زیادہ سنانے کا شائق ہوتا ہے، لکھنے سنانے اور پھر تکیف ہونے میں وہ زندگی کی بے شمار مسرتیں پنہاں سمجھتا ہے۔ اس کو اس کا موقع بادشاہوں کے درباروں اور امیروں کی بارگاہوں میں ملتا ہے۔ شعر و شاعری کی گرم بازاری شخصی حکومت کے سایہ میں ہوا کی ہے، نہ کہ جمہوریت کے نقار خانہ میں، کہ واں شخصی امتیاز، و ذاتی برتری نفس اجتماعی کے تابع رہتی ہے۔ شخصی حکمرانوں کے لیے شاعری ایک دلچسپ مشغلہ رہی ہے۔ جس سے خوش ہونے اور ذاتی وقار کا پرچار کرنے کا سامان فراہم ہو جاتا ہے۔ شاعر بقائے نام اور اظہارِ مفاخرت کا ایک ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے فتح و کامرانی کے ساتھ باکمال شعرا بھی دربار میں طلب کیے جاتے تھے۔ اور انہیں اعلیٰ رتبہ تک پہنچایا جاتا تھا۔ سلطان محمود نے خوارزم سے جن اربابِ علم و فضل کو غزنی میں بلا بھیجا تھا ان میں ابو الخیر خمار ابو ریحان بیرونی کے علاوہ عراقی بھی تھا۔
جب ایران میں ہندوستان کے بادشاہوں اور امیروں کی فیاضیوں، اور نکتہ سنجیوں کی صدائیں پہنچیں، تو وہاں کے باکمال شاعروں نے اس طرف کا رُخ کیا۔ اور بڑے بڑے خطابات سے سرفراز اور انعام و اکرام سے نہال ہوئے۔ سلطان محمد تغلق نے بدر چاچی کو "فخر زمان" کا خطاب عطا کیا۔ اکبر نے غزالی مشہدی کو ملک الشعرا کے خطاب سے سرفراز کیا۔ جہانگیر نے طالب آملی، اور شاہجہاں نے کلیم ہمدانی کو ملک الشعرا کے خطاب سے نوازا۔ شمالی ہند میں شاہجہانی دور تک فارسی شعر و شاعری کی قدر افزائی میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا لیکن عالمگیر کی تخت نشینی سے فارسی شاعری کو نامعلوم دھکا لگا۔ صوفی سرمد کے قتل اور احکام شریعت کی پابندی اور احتساب نے فارسی شاعری کی بے لگام مبالغہ آرائی کو روکا۔ بزم شعر و شاعری کی بجائے رزم کی بساط بچھی، اور پیادہ گردی شروع ہو گئی۔ عالمگیر دکن کی فتح میں محو ہو گیا۔
دکھنی ہندوستانی کی اس قدر افزائی نے عالمگیری اُمرا کو بھی اُس کی طرف متوجہ کیا۔ پھر بھی فارسی شاعری کی شمع عالمگیر کے چند ایک جانشینوں تک جھلملاتی رہی اور بیدل کے ساتھ فارسی شاعر کا جنازہ نکلا۔ بیدل (متوفی ۱۱۳۳ھ)

کی یاد میں تاریخ وفات کے دن چراغاں ہوتے اور تلامذۂ بیدل جمع ہو کر شعر کیا پڑھتے، گرم گرم آنسو بہاتے کہ فارسی شعر کہنے کا زمانہ نہ رہا۔ ناصر علی، شیخ علی حزیں اور مرزا جان جاناں مظہر، سراج الدین علی خان آرزو کی چشکیں زمانہ کی ناساز گاری کے طعنے تھے۔

جب گجرات سلطنت مغلیہ میں شامل ہو گیا تو وہاں کے ارباب علم و فضل اور شعراء بجائے دہلی جانے کے بیجاپور چلے آئے، جہاں ابراہیم عادل شاہ ثانی نے بے نظیر فیاضی دکھائی۔ ہندوستانی کی سرپرستی اور بادشاہ کی فیاضی کا شہرہ سن کر عبدل بھی اسی کے عہد میں بیجاپور آیا اور "ابراہیم نامہ" تصنیف کیا۔ اگرچہ عالمگیر نے نصرتی کی بڑی قدر افزائی اور خطاب سے سرفراز کیا۔ لیکن اس نے شمالی ہند کا سفر نہ کیا۔ ولی ہی پہلا دکھنی شاعر ہے جس نے شمالی ہند کا سفر کیا۔

دورِ اول
سنہ ۱۰۹۰ تا ۱۱۳۰ھ

"دکھنی شعراء کا سفر شمالی ہند" کو تین دوروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور ۱۰۹۰ھ ہجری سے ۱۱۳۰ھ ہجری تک ہوگا۔ اس دور کو ۱۰۹۰ھ ہجری سے شروع کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ولی نے دہلی کا سفر اس سنہ کے بعد کیا جب کہ شاہ گلشن دہلی میں موجود تھے اور پھر دوسرا سفر عالمگیر ہی کے زمانہ ۱۱۱۲ھ میں کیا۔ اشرف نے اپنی مثنوی "جنگ نامہ حیدر" میں فرخ سیر کو مخاطب کیا ہے۔ جو ۱۱۳۰ھ ہجری میں تخت دہلی پر متمکن تھا۔ اسی سنہ میں ولی کا مرتبہ دیوان دلی پہنچا، اور حاتم نے اس کا تتبع کیا۔ جس سے باقاعدہ اردو شاعری کا آغاز ہوا۔ اس لیے فطری طور پر یہ دور ۱۱۳۰ھ ہجری تک قرار دیا جانا چاہیے۔

اس دور کا نصف اول عالمگیر کے عہد حکومت سے تعلق رکھتا ہے اس زمانہ میں ولی، آزاد، فراقی، بیجاپور سے دہلی گئے۔

یہ زمانہ ان لوگوں کے لیے جو گولکنڈہ اور بیجاپور سے تعلق رکھتے تھے، نہایت پر آشوب تھا۔ اہل دہلی عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ جب عادل شاہی اور قطب شاہی خزانوں سے کئی کروڑ نقد اور کروڑوں روپے کے جواہرات اور طلائی ظروف ہاتھ آئے تو عالمگیری سپاہ، اور امراء پر انعامات و اکرامات کی بارش ہوئی۔ مغلوں کے تمول میں اضافہ ہوا۔

ولی اور ان کے دکھنی معاصرین نے دہلی کے خوش حال ماحول میں "مرغ زرین" کی مداح سرائی نہیں کی بلکہ ان شاعروں نے اپنے شاعرانہ کمال کی داد چاہی اور فارسی کے مشہور شاعر ناصر علی کو ولی کے "اعجاز سخن" کا قائل

ہونا پڑا۔ لیکن اُس نے اپنے تخلص — علی — کی مناسبت سے وَلی پر اپنی فضیلت جتلائی۔

اِن کا کلام اُن کے دہلی جانے سے قبل ہاتھوں ہاتھ "عزیزوں کی بیاض" کے ذریعہ پہنچ چکا تھا۔ لیکن "جواہر کو پرکھ کر" "معدان" سے مطلب رکھنے والوں کی حسرت کا ٹھکانا نہ رہا جب وَلی نے پیہم اصرار پر شاہجہاں آباد کا دوسرا سفر ۱۱۱۲ھ میں اختیار کیا۔ اور دکھنی "شراب تازہ" کے رنگین جام لنڈھائے گئے جب آزاد اور فراقی بھی شریک کار ہو گئے، تو ساقی گری کا ایک دور قایم ہو گیا۔ وَلی کے دہلی جانے سے بڑا فائدہ تو یہ ہوا کہ فارسی گو شعرا نے وَلی کی شہرت اور قدر و منزلت سے متاثر ہو کر "دکھنی ہندوستانی" میں شعر کہنا شروع کیا۔ خواہ وہ "بیمن تفول" ہی کیوں نہ ہی چنانچہ موسوی خاں فطرت (متوفی ۱۱۱۱ھ) بیدل (۱۱۳۳ھ) اور عبد الغنی قبول (۱۱۳۹ھ) کے شعر تذکروں میں ملتے ہیں۔ فارسی شاعری سے بیزاری کا یہ اعلان "ہندوستانی" کی ترویج کا باعث ہوا۔ تاریخ ادبیات میں اس طرح کی اور بھی مثالیں ملتی ہیں جب کہ ایک ملک کے شعرا نے دوسرے ملک کا سفر کر کے وہاں علم و ادب اور شعر و سخن کا بیج بویا تھا، چنانچہ اس سلسلہ میں یونان قبل مسیح کے واقعات سے اس بات کا کافی ثبوت ملتا ہے کہ ایتھنز کے نامور مصنفین اور شعرا نے سیراکیوز کا سفر معزز و محترم مہمانوں کی حیثیت سے کیا۔ ہیرو اول کے عہد حکومت میں سیراکیوز کو ایسکلیس، پنڈار، سایمنڈیس، اور باکلیڈس، نے، اور ڈائنی سیس دوم کے دور حکمرانی میں افلاطون نے اپنے قدوم سے شرف بخشا۔

اِن کی آمد کے سو سال بعد نہ صرف نادر روزگار مہندس اور انجینیر آرشمیدس نے بلکہ تھیوکریٹس جیسے مطرب خوش نوا، اور دہقانی شاعری کے موجد نے سیراکیوز میں جنم لیا۔

اس دکھنی "خوشہ پروین" نے جو وَلی، آزاد، فراقی، بیچارہ، اور اشرف پر مشتمل تھا، پچھم کے افق پر نمودار ہو کر شعر نور کی بارش کی جس کے سو سال بعد دہلی سے مرزا غالب کی نغمہ فشانی نے دنیائے اُردو کو خیرہ کر دیا۔

اس دور کے نصف آخر میں پایہ تخت پر تباہی و بربادی کی بدلیاں چھانے لگیں۔ جہاندار شاہ کا قتل، فرخ سیر اور سادات بارہہ میں کشیدگی، فرخ سیر کے قتل کے بعد سیدوں کا غلبہ مرہٹوں کی ستم رانیاں، اور بادشاہ گردی نے اہل دہلی کے امن چین میں خلل ڈال دیا۔ اِس دور اختلال میں اُردو شاعری کا آغاز کیسے ہوتا؟ مگر اشرف اور طالب اُس وقت دہلی میں موجود تھے۔ ایک نے مثنوی کہی، اور دوسرے نے کئی ایسے دکھنی شعرا کے کلام سے روشناس کرایا جنھوں نے دہلی کا سفر نہیں کیا تھا۔ اِس دور کی ایک دکھنی یادگار "بیاضِ طالب" کا ذکر مخزنِ نکات میں کیا گیا ہے۔

ولی بحیثیت سیاح ولی کی شخصیت پر اُس کی شاعرانہ شہرت نے پردہ ڈال دیا۔ تذکرہ نویسوں کی بے اعتنائی کہیے، یا "کمالِ شہرت" کی برکت، کہ اُن کی تمام تر زندگی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ پہلے شاعر کے کلام کو محض کلام کی خاطر دیکھا جاتا تھا۔ لیکن اب وہ زمانہ نہ رہا۔ حیاتِ شاعر کی روشنی میں شاعر کے کلام کا مطالعہ کیا جانے لگا ہے۔ یہی وجہ ہے جو ولی کے کلام کی برتری نے اربابِ اردو کو اُن کی حیاتِ گم شدہ کی تلاش میں سرگرداں کر رکھا ہے۔

میر پہلے تذکرہ نویس ہیں جنھوں نے ولی کو اورنگ آبادی لکھا۔ لیکن گردیزی نے "در دکن چہرۂ ہستی افروختہ"، لکھ کر بحث کی طرح ڈالی۔ اگر تذکرہ ریختہ گویاں (گردیزی) اور نکات الشعراء (میر) کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ گردیزی نے ولی کے کلام کا میر کے تذکرے سے انتخاب کیا، لیکن چونکہ اسے میر سے بیر تھا، اس لیے یہ چھپانے کے لیے کہ اُس کے پیشِ نظر میر کا تذکرہ نہیں تھا، ولی کے حالات میں مذبذب تحقیق کا ایک شاخسانہ لگا دیا۔ اور "در دکن چہرۂ ہستی افروختہ" کہہ کر گریز کیا۔

ولی کے بارے میں قائم کا ایقان "ولی"، کے دیوان کے مطالعہ کا نتیجہ ہے، انھوں نے ٹھوکر پر ٹھوکر کھائی۔ شاہ وجیہ الدین سے والہانہ شیفتگی کو پڑھ کر ولی کو اُن کا فرزند لکھ مارا۔ اور پھر حضرت شاہ صاحب کے گجراتی ہونے کی وجہ سے ولی کو بھی گجراتی سمجھا۔ "فراقِ گجرات" والے قطعہ سے ان کے خیال کو اور بھی تقویت ہوئی۔ مابعد تذکروں کے یہی تین ماخذات ہیں۔ سرور اور قاسم نے گردیزی کے بیان پر اکتفا کر کے ولی کو باشندہ دکن لکھا۔ اور خاموش ہو رہے۔ علی ابراہیم، فائق اور آزاد نے قائم کا اتباع کیا۔ میر صاحب کے پُر زور مؤیدین میں شفیق اور عبد الجبار خاں ملکاپوری ۔ اصل اختلاف قائم اور میر کے درمیان پایا جاتا ہے۔ قائم کا بیان قیاسی اور صرف دیوان کے مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ اس لیے اُن کے بیان پر کیسے اعتماد کیا جا سکتا ہے؟ اوّل تو یہ کہ میر صاحب نہایت محتاط تذکرہ نویس تھے۔ اُنھوں نے شک کو اپنے تذکرہ میں بہت کم جگہ دی ہے۔ دوسرے یہ کہ دکھنی شعراء کے بارے میں "بیاضِ عزلت" میر صاحب کا واحد ماخذ تھا اور عزلت خود سورتی تھے۔ اگر ولی کا مولد گجرات ہوتا تو وہ کیسے خاموش رہتے۔ اگر میر نے غلط بیانی کی ہوتی تو گردیزی کو موقع تھا کہ وہ اِسے غلط محض بتاتا۔ کیونکہ اس نے بھی بیاضِ عزلت سے استفادہ کیا تھا۔ پس عزلت اور میر سے زیادہ ثقہ روایت کس کی ہو سکتی ہے؟ ولی خود کہتے ہیں ؎

دکھنی زبان میں شعر سب لوکاں لبھیا ہیں اے ولی۔ لیکن نہیں بولا ہے کئی اک شعر خوش تر زیں نمط

علاوہ ازیں جس قطعہ کو سند میں پیش کیا جاتا ہے اُس میں بعض ایسے کھلے اشارے ہیں جن سے اس دعوے کی تکذیب ہوتی ہے ؎

ہجرت سے دوستاں کی ہوا جی مرا گداز — عشرت کے پیرہن کو کیسا تار تار دل
افسوس ہے تمام کہ آخر کو دوستاں — اس میکدہ سوں اُٹھ کے چلا سدھ بسار دل

دوستوں کی یاد اور اُن کی مفارقت کو بیان کرنا اور عزیز و اقربا کی طرف اشارہ تک نہ کرنا اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ اس کا وطن گجرات نہیں تھا۔ بلکہ "فراق گجرات" احباب کی یاد سے بیتاب ہو جانیکی صدا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ "قطعہ در فراقِ گجرات" درد بھرے دل سے نکلا ہے۔ لیکن یہ آتش بیانی دراصل نتیجہ ہے اپنے مرشد نورالدین صدیقی سہروردی داداپیر حضرت شاہ وجیہہ الدین قدس سرہ اور سید ابوالمعالی سے تعلق خاطر کا۔ اسی قطعہ کے ایک شعر ؎

اس سیر کے نشہ سوں اول تر دماغ تھا — آخر کو ہیں فراق میں کھینچا خمار دل

سے گجرات میں بطور سیر و سیاحت آنے کی تصدیق ہوتی ہے۔ وطن جائے قیام ہے نہ کہ سیرگاہ۔ نیز احسن مارہروی صاحب کا قیاس ہے کہ "شہر گجرات کے لئے یہ قطعہ کہا گیا ہے۔ جبکہ وہ سید ابوالمعالی کے ہمراہ صوبہ پنجاب میں سرہند وغیرہ تک گئے ہیں" ہماری رائے اس کے خلاف ہے، ولی نے سید ابوالمعالی کے ہمراہ دہلی کا پہلا سفر جوانی کے زمانہ میں کیا ؎

اول سوں تھا ضعیف یہ پابستہ سوز میں — جیوں بال ہے اگن کے اُپر بے قرار دل

اس شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو بڑھاپے کی بات تھی۔ ولی نے زمانۂ شیب میں ایک دور دراز سفر حجاز مقدس کا کیا۔ یہ سفر نہ صرف خطرناک تھا بلکہ طویل بھی۔ ولی سے رہا نہ گیا، بے اختیار رو دیئے اور فراق گجرات میں مرثیہ پڑھا۔ لیکن حج کی برکت اور "فیض حق" سے اُنھیں یقین تھا کہ وہ گجرات واپس ہوں گے ؎

لیکن ہزار شکر ولی حق کے فیض سوں — پھر اس کے دیکھنے کا ہے امیدوار دل

ولی گجرات حصول علم کی خاطر اُس زمانہ میں گئے، جبکہ وہ سن شعور کو پہنچ چکے تھے۔ حسن گجرات اور اُس کی دلکشی کو دیکھ کر وہیں پڑے رہے۔ ابوالمعالی سے محبت ہوگئی۔ اور اُن ہی کے ہمراہ دہلی کا سفر کیا۔ واپسی پر گجرات آئے، اور پھر اپنے وطن اورنگ آباد لوٹ گئے۔ اور یہیں سے دہلی کا دوسرا سفر کیا۔ اِس زمانہ میں اُن کے اشعار قدر و منزلت سے دیکھے جاتے تھے دہلی جانے سے پہلے ولی کا کلام دلی پہنچ چکا تھا ؎

سخن صاحب سخن کا سن کے ملنے کی ہوس مت کر — جواہر جب ہوئے حاصل تو پھر معدن سوں کیا مطلب

ولی نے دہلی کا سفر مادی ترغیبات کی خاطر نہیں کیا۔ بلکہ وہ "سخن آشنا سوں آشنا" تھے ؎

گر سخن فہم تجھ کو پاؤں گا — حال دل کا تجھے سناؤں گا

گلشن عشق تصنیف ملک الشعرا نصرتی کا ایک صفحہ

''بلاک ساختہ ہاف ٹون ورکس''

اور اپنے کمال کا پرچار اُن کا مقصدِ زندگی ہے

آیا تری طرف[۱] جو ولی تو عجب نہیں — آتے ہیں تجھ گلی منیں صاحبِ کمال چل

اس صاحبِ کمال کی دہلی میں جو قدر افزائی کی گئی وہ محض لطفِ سخن کی حد تک تھی۔ ولی کی وارفتہ مزاجی کا کام تو اس قدر تھا کہ

کیوں نہ ہووے عشق سوں آباد سب ہندوستاں؟

ہے سبزہ زارِ حسن سراپا سوادِ ہند — خوباں بانمک سوں بھرا ہے بلادِ ہند

عشاق باصفا کے ہے سینہ میں یادِ ہند — پیتم کی زلف پیچ دسا مجھ سوادِ ہند

اس راہ مار پیچ ہے لے دل سنبھال چل

غرض یہ کہ وہ دہلی میں خاموش نہیں رہے، جب تک رہے شعر و سخن کے چرچے گھر گھر رہے۔ مگر وطن کی یاد نے انھیں بے چین کردیا۔ اور دہلی کے قدر دانوں سے یہ کہتے ہوئے رخصت ہوگئے۔

یو تجھ کی شمع سوں روشن ہے ہفت اقلیم کی مجلس — ولی پروانگی لڑتا تری ملک دکن بہتر

اس ایقان کے ساتھ کہ

ہے شمع کی نمن تو ہر اک چمن منیں — گلزار نو بہار رہے جب تک دکن منیں

آزاد | فقیر اللہ نام ہے، لیکن بعض تذکرہ نویس[۲] محمد فاضل کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ مولد و منشا حیدرآباد دکن، بچپن میں یتیم ہوگئے۔ شروع سے طبیعت لااُبالی تھی۔ عاشق مزاج واقع ہوئے تھے۔ انکی یہ افتادِ طبیعت جوانی میں رنگ لائی فراقی سے بہت ربط ضبط تھا۔ دونوں ایک ساتھ دہلی گئے۔

اس زمانہ میں ولی کا طوطی بول رہا تھا، شاہجہاں آباد کی صحبتوں میں جہاں "شرابِ تازہ" (دکھنی کلام) کے رنگین جام لنڈھائے جا رہے تھے، آزاد کا وجود شب و شینہ کی سرمستیوں میں اضافہ کا باعث ہوا۔ ولی کو ایک اور ساقی ملا۔ اب تو ساقی گری کا ایک دور ہی قائم ہوگیا۔ غزل کے جواب میں غزل کہی گئی، محفل مشاعرہ میں طرحی غزلیں پڑھی گئیں، معاصرین کے مصرعوں پر گرہ، اور اشعار پر تضمین کی گئی۔ چنانچہ ولی نے آزاد کے مصرعہ پر ایک گرہ لگائی ہے۔

آزاد سے سنیا ہوں یہ مصرعہ متین — جس سے کیا ر ملتا ایسا تو نہ آیا

یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ یہ گرہ شاہجہاں آباد میں ہی لگائی گئی۔ آزاد "بھاگ نگر" کے رہنے والے اور ولی

۱ـه "تیری طرف" سے مراد دہلی ہے جس کا انھوں نے ایک مخمس میں ذکر کیا ہے۔ اسی مخمس کے ایک بند کو ہم نے اس مضمون میں درج بھی کیا ہے۔
۲ـه گردیزی، شفیق، اور کریم الدین یا فیلن۔

"خجستہ بنیاد" کو بیس برس کی عمر میں چھوڑ، احمد آباد میں رہنے لگے تھے۔ اور وہیں سے دہلی کی راہ لی۔ گئے آئے، اور پھر گئے، آزاد سے وہیں ملاقات ہوئی ہوگی، معاصرانہ چشمک[۱] سے بھی اسکی تائید ہوتی ہے۔

تمام تذکرے آزاد کو ولی کا معصر بتلاتے ہیں۔ لیکن شفیق شاگرد سمجھتا ہے اور لکھتا ہے کہ آزاد "خود را یکے از شاگردان او می پنداشت" "غالباً یہ رائے ولی کے اس شعر کی بنا پر قائم کی گئی ہے۔ جس میں آزاد کے "مصرعہ مناسب" کا ذکر ہے۔ حالانکہ اس سے آزاد کا معصر، اور ہم پلہ شاعر ہونا ثابت ہوتا ہے۔ کریم الدین یا فیلن نے انکی ایک مثنوی کا ذکر کیا ہے کہ " ایک کتاب بنام ظفر نامہ تصنیف کی ہے جس میں بیان کیا ہے، ان فتوحات کا جو کہ محمد حنیف ابن حنیفہ نے کئے۔"[۲]

اس بیان کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔ نمونہ کلام بھی درج نہیں کیا۔ ظفر نامہ جس کا موضوع وہی "محمد حنیف کی جنگوں کے حالات" ہے، غلام علی خاں لطیف کی بھی تصنیف ہے۔ جو عبداللہ قطب شاہ کے زمانہ کا قزلباش امیر تھا۔ اسی موضوع پر ایک اور مثنوی "جنگ نامہ" ملتی ہے۔ اس کا مصنف سیوک ہے۔ یہ بھی اسی عہد کی پیداوار ہے۔ افسوس کہ آزاد کا یہ ظفر نامہ ابتک دستیاب نہیں ہوا۔

ان کی وہ مشہور غزل تک دستیاب نہیں ہوئی، جس کے ایک مصرعہ پر ولی نے گرہ لگائی ہے۔ قدیم تذکروں میں "مصرعۂ مناسب" والا شعر ملتا ہے۔ جدید تحقیقات نے بھی اسوقت تک آزاد کا کلام پیش نہیں کیا۔ چنانچہ "دکن میں اردو" "اردو شہ پارے" اور "یورپ میں دکھنی مخطوطات" اس بارے میں بالکل خاموش ہیں۔ آزاد کی نسبت میر جیسے نقاد سخن نے یہ رائے لکھی ہے "بسیار بصفا حرف می زد" میر حسن بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔ آزاد کا شعر یہ ہے۔

سب صنعتیں جہاں کی آزاد ہم کو آئیں   پر جس سے یار ملتا ایسا ہنر نہ آیا

فراقی | فراقی کے متعلق شمال و دکن کے تذکرے خاموش ہیں۔ تعجب ہے کہ میر نے آزاد کا ذکر روا رکھا اور نہ یاد لیا تو فراقی کو! حالانکہ اس کے تین چار سال بعد ۱۱۶۸ھ میں قائم اپنے تذکرہ میں آزاد کے ساتھ فراقی کے ذکر کو ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

"ہر دو باتفاق برائے دیدن شہ احمد یار خاں صوبہ دار دہلی) بدار الخلافت آمدند چوں شتی کلامش بنا بر کثرت صحبت خاطر نشین ایشاں گردید۔ تتبع او گشتند چنانچہ از روئے اشعار ایں ہر دو بزرگوار پیدا است۔"

قائم کے بعد قاسم اور میر حسن نے فراقی کا تذکرہ کیا ہے۔ قاسم نے خاص اہتمام سے فراقی کے اشعار پر بحث بھی کی ہے۔ میر حسن کا بیان ہے کہ "فراقی تخلص از مردم دکھن بود ہمراہ فقیر اللہ آزاد بہ ہند آمدہ بود" اس زمانہ میں محمد یار خاں دہلی کے صوبہ دار تھے۔ شاہجہاں آباد ولی اور آزاد کی دکھنی نغمہ سنجیوں سے گونج رہا تھا۔

فراقی شاعر ہے لیکن ولی کی ٹکر کا نہیں۔ فراقی نے گو اس کا بھی ثبوت نہیں ملتا، کوس لمن الملکی بجایا ہو گا تب ہی تو

---

[۱] دیکھو ثبوت میں فراقی کا ذکر۔ [۲] طبقات شعرا ہند۔ ۵۳ بلوم ہارٹ

ولی کو لکھ کر جواب بناتے ہیں :-

ترے اشعار ایسے ہیں فراقی — کہ جس پر رشک آویگا ولی کوں

باوجود اس کے کہ ولی نے اظہار یگانگت اور اعتراف سخن کی بنا پر فراقی کے ایک مصرعہ پر گرہ لگائی ہے کہتا ہے :-

ولی مصرع فراقی کا پڑھوں تب جبکہ وہ ظالم — کمر سوں کھینچتا خنجر، چڑھاتا آستیں آوے

فراقی کا شعر یہ ہے :-

فراقی کشتہ ہوں اس آن کا جس دم کہ وہ ظالم — کمر سوں کھینچتا خنجر، چڑھاتا آستیں آوے

"مجموعۂ نغز" میں ایک اور غزل کا مطلع بھی مندرج ہے جسے قاسم نے کسی قدیم بیاض سے نقل کیا ہے :-

ہمنا کے دل کو جس دم تم لے چلے پیارے — مونہہ تکتے رہ گئے یہ ہمدم سبھی بچارے

فراقی خوش قسمت ہے کہ اس کی دو غزلیں بحر گمنامی میں غرق ہونے سے محفوظ رہیں جو ہاشمی صاحب کی تلاش سے ان کی تصنیفات میں طبع ہو گئی ہیں۔ ایک غزل وہ ہے جو محمد تقی ولد ابو المعالی کے مملوکہ اور مکتوبہ دیوان ولی سے نقل کی گئی ہے جسے ہم ذیل میں درج کرتے ہیں :-

باغ ہے سیر ہے نظارا ہے — سبزہ ہے لالہ ہے ہزارا ہے

کان میں یار کے دُر بالی — مہر ہے ماہ ہے ستارا ہے

نگہ شوخ، قاتل خونخوار — تیغ ہے بانک ہے دو دھارا ہے

آ تو آ دوست میں حجاب [illegible] — [illegible] ہے اندھارا ہے

ملک دل کے خراب اپنے لوں — شاد ہے خوش ہے نقارا ہے

مجکوں ہر دم فراق میں اندری[1] — آہ ہے نالہ ہے پکارا ہے

مضمون کی شوخی اور بیان کی صفائی اس غزل کے جوہر ہیں۔

فراقی کے منتشر کلام کو جواب تک دستیاب ہو سکا، یکجا کرنے کے خیال سے ایک اور غزل درج ذیل کیجاتی ہے اس سے شاعر کے کلام، انداز بیان، اور تجربات کے ارتقاء کا اندازہ ہوتا ہے :-

مدینے میں اگر پیدا ہوا ہوتا تو کیا ہوتا! — محمد کی گلی بیتر فنا ہوتا تو کیا ہوتا!

جنت خواں کی گلیوں میں عمر توں صرف کیا ایدل — مدینے کی زیارت کوں گیا ہوتا تو کیا ہوتا!

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات بحوالۂ دیوان دکنی ۱۰۱۵ آکسفورڈ لائبریری۔

ارے مجنوں ہوا بدنام توں لیلیٰ کو دل دیکر   اگر میرے نبیؐ کو دل دیا ہوتا تو کیا ہوتا!
ازل کی دین میں یارب اگر مفلس بھکاری ہوں   نبیؐ کے آستانے کا گدا ہوتا تو کیا ہوتا!
منجہ اس کتب مجازی میں جو عشق استاد نہ ہوتا   تو میرے دل کی کثرت کا سبق بربادنا ہوتا
نظر ہے علم منطق ہور معانی میں فراقیؔ کوں   اگر علم حدیث مصطفےٰ ہوتا تو کیا ہوتا![1]

بیچارہ | گولکنڈہ کے باشندے تھے۔ ہاشمی صاحب کے بیان کے بموجب دہلی بھی گئے تھے۔ ان کا ایک شعر میر اور میر حسن کے تذکروں میں مندرج ہے[ہ]

پی سے جدا ہونا: بھا جاہا خدا کا یوں اہما   جز صبر اب چارہ نہیں بیچارہ ہور رہنا پڑا[2]

اشرف | سید اشرف نام اور اشرفؔ تخلص سنت الجماعت اور اہل بیت کرام سے خاص عقیدت رکھتے تھے۔ یہ عالمگیر کے زمانہ کے شاعر تھے۔ اندرونی شہادت کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ وہ مقبول شاعر اور اُستاد فن تھے۔ ولیؔ کے ہمعصر شعراء میں شمار کئے جاتے ہیں اس زمانہ میں ولیؔ دہلی میں موجود تھے جہاں حسن نے اشرفؔ کے مصرعہ پر آزاد اور فراقیؔ کی طرح گرہ لگائی ہے[ہ]

اشرفؔ کا یہ مصرع ولیؔ مجلوں ہے دلچسپ   "الفت ہے دل و جاں کوں میرے پیم نگر سوں"

اس کی تصدیق کہ اشرفؔ دہلی گئے تھے ان ہی کے بیان سے ہوتی ہے جس کی طرف "جنگ نامۂ حیدر" میں اشارہ کیا ہے مضمون کی افادیت میں اضافہ ہو جاتا، اگر ہاشمی صاحب ان اشعار کو بجنسہ نقل کر لیتے جن کے مطالعہ کے بعد انھوں نے یہ رائے قائم کی ہے۔

ڈاکٹر زور صاحب کا بیان ہے کہ اس نے اپنی مثنوی میں ہمعصر بادشاہوں، بہادر شاہ، جہاندار شاہ اور فرخ سیر کا ذکر کیا ہے۔ جنگ نامۂ حیدر ۱۱۲۵ھ کی تصنیف ہے۔

.. کیا شعر غریب کری طور میں ! سو فرخ سیر کے کیا دور میں [ہ]

"جنگ نامۂ حیدر" آٹھ سو تریسٹھ ابیات پر مشتمل ہے۔ یہ کوئی فارسی جنگ نامہ کا منظوم دکھنی ترجمہ ہے۔ نمونہ درج ذیل کیا جاتا ہے:

مدینے تے مغرب طرف یک شہر   کہتے دور ہی بہوت اس کا سفر
برس ایک پر چھ مہینے کی راہ   اتھا روم کے مُلک میں بادشاہ
بڑے شہر کتے لبستان میں   نہ ایسا کتیں ملک اسمان میں
عجب نام اس کا حصار کتے   او کافر ملک ہر نگار اس کتے
کھے نام اس بادشاہ کا فضل   اتھی ایک دختر اُسے خوش شکل

---

[1] بحوالہ دکن میں اردو   [2] نکات الشعراء

اتھا نام اس کا سجل دختری — او شیر خدا کی اتھی استری
عجب خوبصورت تھی وہ خوش نگار — جو قربان تھے اس پہ پریاں ہزار[۱]

اڈنبرا کی بیاض میں اشرف کے تیرہ مرثیے شامل ہیں جن میں (۱۴۰) اشعار ہیں۔ اشرف کے مرثیوں کا اسلوب بیان نہایت اثر آفریں اور درد انگیز ہے چنانچہ

بانو کہیں اصغر نہیں اب میں جھلاؤں کس کے تئیں — سونا ہوا ہے پالنا اب میں سولاؤں کس کے تئیں
نہلا کے میں کپڑے پہنا اس کو بناتی گل بدن — وہ پھول کھاں بریں اب میں بتاؤں کس کے تئیں
سوتا تھا وہ جب نیند بھر پیئے دو دھ کوں — بیدم ہے دیکھو آج وہ اب میں جگاؤں کس کے تئیں
جب مسکرا تا وہ بچا میں شادی ہوتی دل سے — بے جاں پڑا ہے گود میں اب میں ہنساؤں کس کے تئیں
جب شہ کو نگیں دیکھتی لیجا کے دیتی گود میں — سو یا کفن وہ اوڑھ کر اب میں لیجاؤں کس کے تئیں
جاتے تھے شہ جب رن منے اصغر کو میں چھاتی لگا — دکھ میں بہولاتی اس کہ اب میں کھلاؤں کس کے تئیں[۲]

اصغر معصوم کی شہادت جس پر آنسو بہائے گئے ہیں وہ ایک نہ بھولنے والی واردات ہے!

اشرف نے مخزینہ کے صرف ایک پہلو "اصغر کی زندگی" پر آنسو بہا کر اور دوسرے پہلو "ظالموں کی شقاوت" کو پس پردہ رکھکر اثر و کیف کا ایک درد انگیز عالم بپا کر دیا اور خصوصاً حضرت علیؓ پر جو مرثیہ لکھا گیا نہایت ہی لاجواب ہے[۳] ہمیں گو اس کا علم نہیں لیکن اشرف کے ہم آہنگ ہو کر ماننا پڑتا ہے ؎

کیا ہوں بے بدل یو مرثیہ جب سوں اماموں کا — ہوا مشتاق ہر یک شاعر ملک دکھن میرا

اور یہ قبولیت در اصل نتیجہ ہے اس کی اہل بیت کرامؓ سے بے انتہا وفاداری کا۔!

ہوس گلگشت رضواں کی کرے کیوں عندلیب دل — محبت کی گلی میں شاہ دیں کے ہے وطن میرا

قدیم تذکروں میں اشرف نامی شاعر کے یہ دو شعر ملتے ہیں ممکن ہے کہ یہ اشرف دکھنی ہی ہو!

پیا بن میرے تئیں بیراگ بھایا ہے جو ہونی ہو سو ہو جاوے[۴] — بھبوت اب جوگیوں کا رنگ لایا ہے جو ہونی ہو سو ہو جاوے

توں شاہ ہے سب خوبوں کا بندہ ہے میں تیرے سب شاہ — میں بھی اس کو بندہ تیرا نہ کہوں تو کیا کہوں؟

کچھ دن ہوئے کہ رسالۂ اردو میں شیخ چاند صاحب مرحوم نے اشرف پر ایک مضمون شائع کیا تھا۔ اس میں اشرف کی سات غزلیں

[۵] اردو شہ پارے۔

جو انجمن ترقی اردو کے نسخے میں لی گئی ہیں درج ہوئی ہیں۔

شیخ چاند صاحب مرحوم نے ان کے کلام پر جو رائے قائم کی ہے وہ یہ ہے کہ "اشرف کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پختہ گو شاعر تھا۔ کلام کا عام رنگ بھی وہی ہے جو ولی کے کلام کا ہے۔ اپنے زمانہ میں اس کو اچھی خاصی شہرت حاصل تھی"

خواجہ خاں حمید نے لکھا ہے "طبع رنگینے داشت۔ شعرش در نواح گجرات شہرت دارد و دیوان لطیف تصنیف نمودہ" [۵]

ذیل میں دو غزلوں کے منتخب اشعار درج کئے جاتے ہیں ۵

جب سجن مکھ اوپر نقاب کیا ۔۔۔ چشم عاشق کو جوں سحاب کیا
جو پیا ہے پیا کے لب کی شراب ۔۔۔ نقل خاطر جگر کباب کیا
تجھ جدائی میں چشم اشرف سوں ۔۔۔ جوش دریائے خون آب کیا

اے ہوش ربا سندر مجھ پاس ٹک آتے جا ۔۔۔ رشتے کوں محبت کے بازو پہ بندھاتے جا
یوں دل منے ہے خواہش تجھ گھر کی طرف آؤں ۔۔۔ ٹک ناؤں بتاتے جا یا ٹھاؤں بتاتے جا
لاگی ہے نظر جن کی اے رشک پری تجھ کوں ۔۔۔ دو بیم کے انجھر سوں ان پاس چھڑاتے جا
اے کان ادا سندر! اشرف ہے ترا طالب ۔۔۔ ٹک پیار ستی اس کوں چھاتی سوں لگاتے جا

طالب مرزا ابو طالب کا تخلص طالب تھا۔ میر حسن کا بیان ہے کہ وہ گولکنڈہ کے باشندے تھے۔ لیکن قایم جو ان سے ذاتی طور پر واقف تھا کہتا ہے کہ قصبہ بلندہ (؟) نواح اورنگ آباد کے متوطن تھے۔ ۱۱۱۹ھ میں بہادر شاہ اول نے اپنے چھوٹے بھائی کام بخش کی جو دکن کا صوبہ دار تھا۔ سرکوبی کیلئے حیدر آباد پر چڑھائی کی۔ اور ۱۱۲۰ھ میں کامیاب مراجعت عمل میں آئی۔ مرزا رفیع سودا کے چچا سے جو اس لشکر کے ایک سپاہی تھے۔ طالب کی دوستی ہو گئی وہ ان کے ساتھ ستر سال کی عمر میں اپنی جاگیر کے معاملہ کو طے کرنے کے لئے دہلی گئے جبتک رہنا ہوا ان ہی کے مکان پر فروکش رہے۔

سخن گو سے زیادہ "سخن شناس" ہونیکی بنا پر ان کے تذکرے کو اس صحبت میں نہیں بھلایا جا سکتا۔ دکھنی شعراء کے جو نام شمالی ہند کے تذکروں میں پائے جاتے ہیں۔ ایسے ہی بزرگوں کے شعر دوستی کا نتیجہ ہیں۔ عزلت کی بیاض سے میر اور گردیزی نے استفادہ کیا تو قایم نے بیاض طالب سے!

---

[۵] گلشن گفتار مرتبہ سید محمد صاحب ایم۔ اے۔ عثمانیہ۔

قائم نے محقق کے تذکرے میں اس کا حوالہ دیا ہے کہ "ایں یک شعر بنام او بر پشت بیاض کہنہ کہ ملکیت ابو طالب مرحوم بود در ذیل شاہان دکھنی نوشتہ دیدہ" لیکن اکثر دکھنی شعرا کے تذکرے کو مرزا رفیع کے توسط سے طالب کی زبانی خاص اہتمام سے درج کیا ہے چنانچہ لکھا ہے کہ "بعضے ازیں احوال اشعار کہ سابق مرقوم شدہ زبانی مرزا ابو طالب مسطور بہ مرزا صاحب رسیدہ بود وازیشاں علی سبیل کرد مذکور بہ فقیر معلوم گردید"

ان کا وہی ایک شعر درج کیا جاتا ہے جس کو قائم نے مخزن نکات میں درج کیا ہے۔ جدید تحقیقات اس بارے میں بھی خاموش ہیں

تمنا کے خون چشم سے آلودہ کب کرے   وہ پگ[1] جسے گرانی ہے رنگ حنا ستی

دور دوم (۱۱۳۰ھ تا ۱۱۷۵ھ)

دکھنی شعرا کے سفر شمالی ہند کا دوسرا دور ۱۱۳۰ھ سے ۱۱۷۵ھ تک کے زمانہ پر مشتمل ہے اور یہ دور فطری طور پر دو ذیلی زمانوں میں منقسم ہو جاتا ہے۔ اس دور کا تقریباً نصف اول ۱۱۳۰ھ سے ۱۱۵۰ھ تک کے زمانہ پر مشتمل ہے اور نصف آخر نادر گردی کے بعد سے ۱۱۷۵ھ تک کے زمانہ پر۔ محمد شاہ رنگیلے کی بزم عیش میں ارباب نشاط پرے جمائے رہتے تھے۔ ایسے ایسے مطربان خوش نوا کہ نادر شاہ جیسے احمد جرنیل نے نوربائی کو ہم جلیس بنانے کی تمنا ظاہر کی۔ بسنت کی رنگ رلیاں عرس خلد منزل کی بزم رندانہ، کسل پورہ اور ناگل کے میلہ کی رنگینیاں جذبات میں ہیجان بپا کرتی اور شعر و سخن کا شوق پیدا کرتی تھیں۔ الغرض شاہ جہان آباد کے چپہ چپہ سے شراب شعر کی مستی ٹپکتی تھی۔ اگر ولی کی زندگی وفا کرتی اور اسے محمد شاہ رنگیلے کا زمانہ نصیب ہوتا تو وہ باوجود کمال استغنا کے

نہیں منصب و جاگیر نہیں روز وظیفہ   کہتا ہوں حرف راست اگرچہ ادب نہیں

دہلی جاتا اور محمد شاہ کا ملک الشعرا بنتا اور شاہجہاں آباد کی رنگین محفلوں کے لطف کو دوبالا کرتا۔

سراج ولی کے سچے جانشین کی حیثیت سے دکھنی شاعروں کی دہلی میں نمایندگی کر سکتے تھے لیکن وہ تو نشہ بیخودی میں چور تھے اور وہ حضرت شاہ برہان الدین غریبؒ کا آستانہ چھوڑ کر کہیں جانے والے بھی نہ تھے۔

اس ساز گار ماحول میں ممکن ہے بعض دکھنی شعرا دہلی میں موجود ہوں لیکن ان کا وجود بے بہت۔ کلام ولی کے آگے جھلملاتے تاروں سے زیادہ وقیع نہ تھا۔ ولی کا مرتبہ کلام ۱۱۲۹ھ میں دہلی پہنچا۔ جہاں اسے قدر دانی نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور آنکھوں پر رکھا دیوان ولی کی چند ہی سال کے عرصہ میں کئی نقلیں کی گئیں جسکی وجہ سے شمال میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک دکھنی شاعری کا آوازہ گونجنے لگا۔ حاتم، آبرو، احسن، یکرنگ اور ناجی جیسے [illegible]

---

[1] پگ (ن مخزن نکات)

اسی عرصہ میں ۱۱۲۹ھ سے ۱۱۶۹ھ تک ایک ضخیم دیوان مرتب کیا جو ولی کے کلام کے باقاعدہ تتبع کا نتیجہ تھا۔ وہ خود "دیوان زادہ" کے دیباچہ میں ولی کی استادی کا اعتراف کرتا ہے چنانچہ "حاتم در ریختہ ولی را استاد می داند" اس میں اتنی جسارت بہم پہنچائی کہ کہنا پڑا "زبانش بازبان ولی دکنی مناسبت دارد"[1] حاتم، آبرو، مضمون اور ولی کے کلام کا تقابلی مطالعہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ ان دہلوی شاعروں نے اپنے استاد کے طرز کی کہاں تک تقلید کی۔ حاتم نے اپنے اس مختصر سے انتخاب "دیوان زادہ" میں تیرہ غزلوں پر صراحت کر دی ہے کہ یہ ولی کی طرز اور تقلید میں لکھی گئی ہیں[2]۔ غرضکہ ولی کا کلام درجہ استناد حاصل کر چکا تھا۔ اس طرز کے مخالفین کو آبرو نے کہا تھا کہ "جو جو حرف یہ از رفتہ ہے" ورنہ تس کے ریختہ میں حرف ہے جو اس سے روگرداں ہوگا۔ یہ تھا وہ ماحول جس میں ولی کے کلام نے قبولیت پائی!

اس دور کا نصف آخر نادر گردی کے بعد ۱۱۵۱ھ سے شروع ہوتا اور کم و بیش ۱۱۸۰ھ پر ختم ہوتا ہے۔ نادر شاہ نے شاہ جہاں آباد کو قزلباشوں سے لٹوا کر اور نہتے بے بس شہریوں کو قتل و غارت کر کے سلطنت کی تباہی کا سامان بہم پہنچایا۔ اس رستخیز نے اہل دہلی پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ پھر وہ پنپ نہ سکے۔ اردو شاعری میں اس کے اثرات نمایاں ہیں اور خصوصاً ایہام کی تنوطیت کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے۔

دو دکھنی نوجوان شاعروں نے نادر گردی کو بچشم خود دیکھا۔ دردمند اور درگاہ۔ دونوں کے عنفوان شباب کا زمانہ تھا۔ دردمند کو دہلی میں رہتے ہوئے پندرہ برس ہو چکے تھے اس وقت ان کی عمر بیس برس کی تھی۔ شاہ ولی اللہ اشتیاق اور مظہر جان جاناں انھیں چاہتے تھے۔ نواب درگاہ قلی خاں حضرت آصف جاہ بہادر کے ہمراہ ۱۱۵۱ھ میں دہلی گئے۔ جہاں چار سال تک رہنا ہوا۔ اس عرصہ میں وہ شاہ جہاں آباد کی رنگین بزموں اور بے تکلف صحبتوں میں شریک رہے اور شاعروں اور مسالموں میں داد سخن دی۔ ان اثرات و کیفیات کی ایک یادداشت خان دوراں درگاہ نے مرتب کی جو حال ہی میں "مرقع دہلی" کے نام سے شائع ہو گئی ہے۔ اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دہلی میں ریختہ گوئی کا باقاعدہ آغاز ہو چکا تھا۔

مرثیہ گوئی دہلی میں عروج پر تھی۔ یہ ترقی و گیرائی دراصل دکھنی مرثیوں کا نتیجہ تھی۔ جسے عالمگیر کے بعد دہلی میں شاہی سرپرستی حاصل ہوئی۔ شاہ قلی خاں شاہی کے مرثیوں کو شمال میں ۱۱۲۰ھ کے بعد سے فروغ نصیب ہوا۔ یہ ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے اور مجلسوں میں پڑھے جاتے تھے۔ قادر، روحی، اور مرزا کے مرثیوں سے بھی دہلی والے آشنا نہ رہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ نکات الشعرا سے اس صنف کلام پر روشنی نہیں پڑتی۔ گردیزی نے ایک دو مرثیہ گویوں اور قائم (۱۱۶۸ھ) نے پانچ چھ مرثیہ گویوں کا ذکر کیا ہے اس سے مرثیوں کی قبولیت پر کسی قدر روشنی پڑتی ہے۔

---

[1] ایک نامعلوم الاسم قلمی تذکرہ بحوالہ شعر الہند [2] تاریخ لسانیات

دکھنی مرثیوں کی اس قبولیت نے دہلی والوں کو اس طرف متوجہ کیا۔ ندیم، حزیں، مسکین، غمگین اور عاشق نے اس طرف توجہ کی چنانچہ "مسکین، حزیں، و غمگین ہر سہ برادر اند و وے بزبان ریختہ مرثیہ گفتن چہار تے تمام دارند، در ہمہ شہر کلام اینہا شہرت دارد و در واقع ہر سہ کس بسیار خوب مرثیہ میگویند و الفاظ الم آور بمضامین حسرت انگیز بکار می کنند"[51] ان میں ان لوگوں نے اس قدر کمال حاصل کیا تھا کہ درگاہ نے ندیم کے ذکر میں صراحت کی ہے کہ "مضامینے در ریختہ می آرد کہ فارسیان مضامین فارسی پیچ می شوند"[52] اور طرفہ یہ کہ حزیں و ندیم کے مرثیوں کو پڑھنے کے لئے میر عبداللہ جیسا مرثیہ خواں نصیب ہوا کہ "استادان موسیقی متفق اللفظ اند کہ بایں خوبی مرثیہ خوانی بعالم ایجاد نگذاشتہ و بایں مواد تشید و بایں سامان آہنگ سرے از کارخانہ تکوین بیروں نکشید"[53] دکھنی مرثیہ گوئی کا زبان و بیان سے سودا کے زمانہ تک تعلق رہا گیا۔ چنانچہ سودا کے مراثی کی زبان "دکھنی آمیز" رہی۔

نادر گردی کے بعد سے اردو شاعری کو بیحد فروغ ہوا۔ فارسی کو شاعروں نے اس طرف خاص توجہ کی بقول صاحب نکات الشعراء سراج الدین علیخاں آرزو نے "برائے تفنن طبع دو سہ شعر ریختہ فرمودہ"[54] اور شاہ ولی اللہ اشتیاق "گاہے فکر ریختہ میکرد"[55] قزلباش خان امید نے اس پر فخر کیا کہ "من ہم دریں ایام دو شعر ریختہ موزوں کردہ ام"[56] مرزا گرامی جو باوصف مولویت فارسی شعر کہتے اور اپنے اس کمال کو مشاعرہ میں جتلاتے پھرتے وہ بھی "چوں دید کہ ہنگامۂ ریختہ گرم شدہ خود ہم نیز شعر ریختہ گفت"[57]

الغرض اس زمانہ میں دہلی میں شعر و سخن کی گرم بازاری تھی۔ اعلیٰ سے لیکر ادنیٰ، امیر سے لیکر غریب، اور بادشاہ سے لیکر ایک پیشہ ور حجام کو بھی دعوے سخن دانی تھا۔ ہندوؤں نے بھی اسکی سرپرستی کو فخر جانا اور فرنگیوں نے بھی اسے منہ لگایا!

اس زمانہ میں دہلی میں میر، سودا، قائم، درد، اثر، تاباں، سجاد، بقا، سوز، یقین، داد سخنوری دیرہے تھے۔

عزلت بھی (سنہ ۱۱۶۲ھ) اس بزم میں شریک ہو گئے۔ یہ دور اخذ و ترک کی بنا پر خاص اہمیت رکھتا ہے۔ میر صاحب کو عزلت کے کمال کا اعتراف کرنا پڑا۔ عزلت کا تعلق گجرات سے تھا لیکن انھیں دکھنی شعراء کی نمایندگی کا فخر حاصل تھا۔ میر صاحب نے بھی انھیں دکھنی شعراء کی ذیل میں شمار کیا ہے۔ جب گجرات فتح ہو کر سلطنت مغلیہ میں شامل ہوا تو گجرات کے ارباب علم اور شعراء گولکنڈہ اور بیجاپور کی طرف متوجہ ہوئے جسکی وجہ سے گوجری اور دکنی کو ملاپ کا موقع ملا۔ ولی کی وجہ سے دکنی کو گجرات میں جو فروغ نصیب ہوا وہ کسی مزید توضیح کا محتاج نہیں۔ "پنجاب میں اردو" کے قابل مؤلف کا بیان ہے کہ محمد امین نے اپنی مثنوی یوسف زلیخا بعہد عالمگیر سنہ ۱۱۰۹ھ میں نظم کی ہے۔ باوجودیکہ وہ صاف دکنی اردو میں لکھتا ہے تاہم وہ اس کو گوجری کے نام سے یاد کرتا ہے ع لکھی گوجری میں نئے یوسف زلیخا " اس لحاظ سے دکنی اور گوجری سنہ ۱۱۰۹ھ کے بعد سے دو جداگانہ زبانیں نہیں رہی تھیں۔ ان کی شاعری کا اسلوب بیان بھی اس بات کا شاہد ہے! اور پھر عزلت کی زندگی کا آخری زمانہ دکن ہی

---

۵۱ تا ۵۳ ۔ مرقع دہلی [illegible]

میں [illegible]ھ میں پیوندِ خاک ہوئے۔ ان کی ابتدائی شاعری کی قدر و منزلت دکن ہی میں ہوئی۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ ہم انھیں دکنی شعراء کے نمایندوں میں شمار نہ کریں؟

نادر گردی کے بعد دہلی کی مرکزیت رفتہ رفتہ ختم ہو گئی۔ طوایف الملوکی کا دور دورہ شروع ہوا اور ایک دربار کی بجائے کئی دربار قائم ہو گئے اور کئی سرپرستوں نے بے سہارا شاعروں کو دامانِ عاطفت میں لیا۔ فرخ آباد، رامپور، لکھنؤ، مرشد آباد، عظیم آباد شاعری کے مرکز قرار پائے۔ "دریں ایام کہ رشتہ سلک انتظام مردم بادشاہی بصدمۂ انقلاب سلطنت از ہم گسیخت و ہر یکے چوں لآلی ابدا برخاک مذلت افتادہ رو بہر سو نہادہ"[1] فغاں (۱۱۶۴ھ سے پہلے) نے "بپاس آبروئے خویش" اور غریب (۱۱۶۶ھ سے پہلے) نے "بسبب پریشانی روزگار" بنگالے کی راہ لی۔ دکھنی شعراء عزلت اور دردمند بھی عظیم آباد اور مرشد آباد چلے گئے۔ عبدالوہاب بیتکل نے بھی خجستہ بنیاد سے مرشد آباد کی راہ لی۔ چند سے قیام کیا۔ پھر عزلت اور وہ دکن آ گئے۔ دردمند نے وہیں گذران کی اور وہیں انتقال کیا۔[1]

ہزار حیف کہ دہلی سا شہر ویراں کر ... کیا ہے یاروں نے آباد ملک پورب کو ... (درد آیت)

اکثر شاعروں نے دکھن کا رُخ کیا جہاں پہلے سے شعر و سخن کی گرم بازاری تھی۔ قطب شاہیوں کی تباہی کے بعد حیدرآباد میں شعر و سخن کی رفتار کو دھیمی ہو گئی لیکن اس کا خاتمہ نہیں ہوا اور چند سال تک اورنگ آباد اور برہانپور شاعری کے مرکز بنے رہے، اور جب عاجز دہلی سے نکلے تو برہانپور ہی میں ٹھہرے۔ سلطنت آصفیہ کے قیام (۱۱۳۶ھ) کے بعد سے حیدرآباد میں شعر و سخن کی پھر وہی گرم بازاری شروع ہو گئی اور فرخندہ بنیاد شمالی شعراء کا ماویٰ و ملجا قرار پایا۔

دردمند | محمد فقیہ تخلص بہ دردمند۔ اورنگ آباد ضلع بیدر کے نجباء سے تھے۔ ان کی پیدائش ۱۱۳۶ھ میں اودگیر میں ہوئی۔ پانچ سال کی عمر میں (۱۱۴۱ھ) اپنے والد کے ساتھ دہلی گئے۔ شاہ ولی اللہ اشتیاق سرہندی ان پر بہت نظرِ عنایت رکھتے تھے۔ بعد میں وہ مرزا مظہر جان جاناں کے ظلِ عاطفت میں چلے گئے۔ ان دونوں بزرگوں کی صحبت کے اثرات دردمند پر مرتب ہوئے۔ شاہ اشتیاق کے فیضِ صحبت سے دردمند فارسی میں شعر کہنے لگے اور مظہر جان جاناں کی تحریک سے ریختہ گوئی شروع کی۔ چنانچہ دردمند نے "ساقی نامہ" میں مظہر کی محبت اور مہربانی کو اصل وجہ تحریک گردانا ہے[1]

کہاں تھا مجھے ریختہ کا خیال ... ہوا واجب ایک امر امتثال
محبت نے مجکوں کیا لاجواب ... وگرنہ میں اور ریختہ کیا حساب

اگر آزاد بلگرامی کے اس بیان کو صحیح مان لیا جائے کہ وہ ۱۱۶۶ھ میں بنگال گئے تو اس حساب سے ان کا قیام دہلی میں بیس سال تک رہا۔

---

[1] مخزن نکات۔

جب تک جیے مرزا مظہر کے حلقۂ ارادت سے قدم باہر نہ نکالا۔ مرزا بھی انھیں بہت چاہتے تھے۔ چنانچہ ان کا ایک مشہور شعر درد مند کے بارے میں آزاد نے سروِ آزاد میں لکھا ہے ؎

مظہر مباش غافل از حالِ درد مند لعلے ست ایں کہ در کرۂ روزگار نیست

دہلی کے درباروں میں ان کی خاطر خواہ آؤ بھگت ہوتی تھی۔ اکثر امیروں مثلاً نواب عمدۃ الملک امیر خان انجام اور نواب محمد علی خان احسن کی اپنی مثنوی میں تعریف و توصیف کی ہے، سے دوستانہ تعلقات تھے۔ نادر گردی (۱۱۵۱ھ) کے بعد ۱۱۶۶ھ میں بنگال گئے اور چند مدت عظیم آباد میں بود و باش کی اور رفاقت میں نواب غلام حسین خاں اور نواب اعظم خاں کے بیٹے کی گذران معاش کی۔ بعد اس کے [illegible] وہاں رہے پھر نواب سید محمد خاں [illegible] جنگ کے [illegible] نواب وردی خاں مہابت جنگ کے بلانے پر شاہجہان آباد سے مرشد آباد میں [illegible] بود و باش وہیں ٹھہرائی۔ رفاقت میں نواب مذکور کی البتہ ایک فارغ حال ہوا۔ آخر ۱۱۷۶ھ میں مرشد آباد کے اندر انتقال ہوا۔[1]

درد مند خوش اختلاط، یار باش انسان تھے علی ابراہیم خاں اور امیر حسین خان سے دوستانہ روابط تھے۔ آزاد بلگرامی سے غائبانہ خلوص تھا۔ چنانچہ "فی مابین فقیر و مشار الیہ غائبانہ خلوص بسیار است و ہمیشہ طریق مراسلت مسلوک"۔ ان کے کلام کے متعلق آزاد بلگرامی کی رائے ہے کہ "شعر فارسی و ریختہ [illegible] خوب میگوید" اس زمانہ کے اساتذہ نے ان کے فارسی کلام پر بہت [illegible] رائیں دی ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کا فارسی کلام مقبول اور مشہور تھا۔[2]

درد مند ریختہ کی طرف کم مائل تھے۔ قدیم تذکروں میں چند متفرق اشعار اور ایک دو رباعیاں ملتی ہیں ؎

ہے غم سے رقیبوں کے مراد دل ناشاد اس دھڑکے سے بانٹے ہیں سبھی عیش بباد
پرویز کے شیشہ خانۂ عشرت پر نالہ آیا ولیکن سخت آیا فرہاد

قفس تک بھی نہ پہنچے اور پڑے دور آشیانے سے عجب ساعت میں بچھڑے تھے ہم اپنے آستانے سے

اکھیں مت کسی کو پیش بیخ و انتظار آوے ہمارا دیکھئے کیا حال ہو جب تک بہار آوے

درد مند کا "ساقی نامہ" اردو زبان کی تاریخ میں نہایت اہمیت رکھتا ہے اس لحاظ سے کہ یہ پہلا ساقی نامہ ہے اور اس نے

[1] گلشن ہند [2] شیخ چاند مرحوم ایم اے ال ال بی عثمانیہ

بحث اور تنقید کے لئے ایک میدان فراہم کر دیا۔ چنانچہ عزلت نے ۱۱۶۳ھ میں "بیان ظہور" کے نام سے ایک ساقی نامہ قیام دکن کے زمانہ میں درد مند کے جواب میں نظم کیا۔ فتوت نے ۱۱۶۸ھ میں ایک مثنوی لکھی ہے[۱] "ساقی نامہ" کی شہرت کا اندازہ عزلت اور فتوت کے تتبع کے علاوہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ تمام تذکرے متفق اللفظ ہو کر اس کی داد دیتے ہیں۔ آزاد بلگرامی:- "ساقی نامہ ریختۂ او مشہور است کہ مقبول طبائع گردیدہ۔" شفیق:- "ساقی نامہ ریختۂ او کہ مشہور آفاق است" قاسم:- "ایں ساقی نامہ خیلے مشہور و برزبان خلق جاری است۔" ساقی نامہ کے ابیات تقریباً ایک سو نوے ہیں۔

اسیر قفس کے خیالات نمونتاً پیش کئے جاتے ہیں ؎

کہ ایام اسیری کے کیا خوب تھے ۔۔۔ خصوصاً مجھے سخت مرغوب تھے
پھنسے تھے سبھی ہم نفس ایک بار ۔۔۔ ہمیں داغ لگتا تھا باغ و بہار
عجب تھا مزا درد و اندوہ کا ۔۔۔ عجب جشن تھا مرگ انبوہ کا
توجہ تھی ہم ساتھ صیاد کو ۔۔۔ پہونچتا تھا تہمت فریاد کو
موافق تھی دام و قفس کی ہوا ۔۔۔ سب آپس میں کرتے تھے جی کو فدا
نہ تھے آشنا داد و بیداد کے ۔۔۔ کہ تھے سب اسیر ایک صیاد کے
پڑا اب کے سال اس طرح اتفاق ۔۔۔ کہ جاتے رہے سب وہ اہل وفاق
چمن کی ہوا مجھ پہ اب تنگ ہے ۔۔۔ مری زندگی موت کا ننگ ہے
نہ لگتا ہے جی صحبت غیر میں ۔۔۔ نہ کھلتا ہے دل باغ کی سیر میں
نہ کچھ ذوق ہے آب و دانہ ستی ۔۔۔ بھر آتا ہے جی آشیانہ ستی
مجھے گل کی صورت لگے ہے زبوں ۔۔۔ چمن ہے نظر میں مری حوض خوں
اکیلے کو کب خوب لگتا ہے باغ ۔۔۔ جلا ہے رفیقوں کی دوری کا داغ

سیر شب ماہتاب اور اس کے اثرات ملاحظہ ہوں:- ؎

پڑا آج ہے رات یوں اتفاق ۔۔۔ کہ سب ہو گئے جمع اہل وفاق
کہ شبخون کر لشکر خواب پر ۔۔۔ سبھی جا کے بیٹھے لب آب پر
مرا جی گیا ڈوب مہتاب دیکھ ۔۔۔ جیسے مرگی والے کا جی آب دیکھ

---

[۱] تفصیل کیلئے دیکھو رسالۂ اردو جولائی ۱۹۳۴ء ص ۵۲ "ساقی نامہ" رسالۂ اردو جولائی ۱۹۳۲ء میں شائع ہو گیا ہے یہ اشعار اسی سے ماخوذ ہیں۔

ثبوت دیا وہ بھلایا نہیں جاسکتا درگاہ چار سال تک دہلی میں رہے اور یہ زمانہ ان کے ریعان شباب کا تھا۔ شاہجہاں آباد کی رنگینیوں میں شریک رہے لیکن لوٹ آتے اور دامن بچاتے ہوئے دہلی کے تاثرات کو ایک یادداشت کے طور پر مرتب کیا تھا جس کو حال ہی میں شائع کیا گیا ہے۔ اسکے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مظہر جان جاناں، حزیں، آرزو، راسخ اور بعضوں کی بے تکلف صحبتوں میں شریک ہوتے تھے۔ مظہر کبھی کبھی ان کے ہاں بھی آیا کرتے تھے۔

سنہ ۱۱۔۔ھ میں نواب آصف جاہ بہادر کے ہمراہ دکن کو مراجعت کی، عرصہ تک اورنگ آباد کے صوبہ دار رہے۔ جہاں "باغ دلکشا" میں علمی محفل منعقد کرتے شعرا اور علماء مدعو کئے جاتے۔ آزاد بلگرامی اور شفیق اس صحبت میں شریک ہوتے تھے۔ خود بھی شعر کہتے تھے۔ نواب ذوالقدر علاوہ غزل پڑھنے کے اکثر نہایت برجستہ فی البدیہہ شعر بھی کہتے تھے۔

ایک قصیدے کے چند شعر ذیل میں درج کیے جاتے ہیں ؎

اسی تردد و افکار میں لگی تھی نیند | کہ ناگہ خواب میں دیکھا تو وقت سحر
طرف سے آکے رہا نے یہ پیر نورانی | لطیف منظر خوش منظر و خجستہ سیر
کہا کمال عنایت سے دیا نے مجھے | ہے تیرے کام کا حامی امام جن و بشر
شہ سریر کرامت امیر کل امیر | ولی حضرت مولیٰ وصی پیغمبر
امام جن و ملک تاجدار ملک و ملک | کہا ہے لحمک لحمی جسے شہ سرور

میر سعادت علی صاحب رضوی ایم اے۔ نے درگاہ کے مرثیوں پر "مرقع سخن" میں اپنے ایک مضمون کے ذریعہ تفصیلی روشنی ڈالی اور یہ رائے ظاہر کی ہے کہ عربی، فارسی یا دکھنی جس کسی زبان میں وہ لکھتے ہیں قلم برداشتہ لکھتے ہیں۔ آمد ہی آمد معلوم ہوتی ہے۔ صفحے کے صفحے پڑھ ڈالئے کہیں تعقید یا ٹھونس ٹھانس نہ ملے گی اس سے انکی غیر معمولی قدرت بیان کا اظہار ہوتا ہے۔ اشعار خود زبان حال سے کہتے ہیں کہ ان کا لکھنے والا ایک کہنہ مشق شاعر تھا۔ شستہ الفاظ اور برجستہ ترکیبیں انہوں نے ایسی استعمال کی ہیں جن میں پڑھتے وقت ایک قسم کی موسیقیت پیدا ہو جاتی ہے۔" بعض مرثیوں میں عربی، فارسی اور ہندی کے برجستہ الفاظ اور اشعار کا ایسا استعمال کیا ہے جس سے ان کی قادر الکلامی کا اظہار ہوتا ہے۔

نمونہ کلام

ہے آج کربلا کا بیاباں لہو لہو | صحرائے دلفگار کا داماں لہو لہو
سب دشت کوہ و جنگل و میداں لہو لہو | وہ رزمگاہ شاہ شہیداں لہو لہو

خلق میں پھر ہے جو شور ماتم | سوگ میں پھر جو ہوا ہے عالم

مشتعل آتشِ غم سے شعلۂ ہم ‏ ‏ جب آگا یا وہ محرم بے علم
آہ غم آمد بر خواست فغاں ‏ ‏ دیدۂ دل شدہ گریاں بریاں
ان فی الخلق بکاء و حزن ‏ ‏ لعلیٍ و حسینٍ و حسن

درگاہ اقدس کا طواف ہے منتہائے دعا ‏ ‏ عاصی کوں غالب ابتلا ہے دم است التجا
اے صاحب حاجت روا جلدی سیں تو آکر کوں ملا ‏ ‏ اس غم تے لیں دو کر صاحب کدہ بولا لکھا
سر گسائیں ہے بغل اداس تیشیا جاں ‏ ‏ شاہ تھا سے او میں لواں یہی شب اماں
کمینہ بندہ درگاہ سید اشہدا ‏ ‏ برائے خدمت جاروب روزہ شب بدعا

درگاہ قلی نے سنہ ۱۱۹۰ھ میں انتقال کیا اور اورنگ آباد میں دفن کئے گئے۔

عزلت | سید عبد الولی نام اور عزلت تخلص تھا۔ سنہ ۱۱۰۴ھ میں بمقام سلون ضلع سورت تولد ہوئے۔ آپ کے والد شاہ سعد اللہ سورت کے مشہور روزگار عالم بزرگ تھے۔ کتب فارسی کی تحصیل والد ہی سے کی۔ طبیعت نہایت بے تکلف پائی تھی۔ ہر قماش کے لوگوں سے ملاقات تھی۔ [illegible] تھی۔ شاید اسی وجہ سے صاحب تحفۃ الشعرا نے انھیں "ملامتیہ مشرب" کا پیرو گردانا اور صاحب گلزار ابراہیم نے "خالی از بیدلی نبود" لکھا۔ مگر تمام تذکرے متفق ہیں کہ "ظاہر و باطن محلّیٰ است"۔ فارسی اور عربی زبانیں نہایت اچھی طرح جانتے تھے۔ قرآن کے حافظ اور قاری بھی تھے۔ دونوں میں شعر کہتے تھے۔ دلی جانے سے پہلے فارسی میں ایک دیوان ترتیب دیا تھا۔ آزاد بلگرامی نے سرو آزاد میں ان اشعار کو درج کیا ہے جو عزلت ہی کے انتخاب کئے ہوئے تھے۔ بتحقیق ان کا فارسی کلام چار ہزار ابیات کا بتلاتے ہیں۔ آزاد سے پہلی مرتبہ اس وقت ملاقات ہوئی جبکہ وہ حج بیت اللہ سے مشرف ہونیکے بعد سندھ سورت بر[illegible] سے بتحقیق ا[illegible] گردیزی ان کا احترام کرتے تھے۔ درد، مند، مظہر اور یقین سے ملاقات تھی نیز تو ان کے گہرے دوست تھے۔ دوستی کے تعلقات کی حد ناپ پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں " با فقیر جوششہا میکند"۔ شاید اسی لئے [illegible]۔ پاس تعلقات نیز نے نواب خواجہ قلیخاں کا صرف ایک مصرعہ اس لئے درج کیا ہے کہ "از معتقدان سید صاحب است"۔

سید صاحب کہنے کو تو عزلت مشہور تھے لیکن انھیں جہاں گرد کہنا چاہیئے۔ سورت سے اورنگ آباد گئے اور وہاں سے ۲۰ رجمادی الاول سنہ ۱۱۶۴ھ کو دہلی پہنچے۔ دہلی میں دو سال مقیم رہ کر ۱۱۶۶ھ کے قریبی زمانہ میں مرشد آباد چلے گئے اور وہاں چند سے مقیم رہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب دلی کے خرمن پر تباہی و بربادی کی بجلیاں گر رہی تھیں۔ مرشد آباد میں ان کی

کافی آؤ بھگت ہوئی۔ علی وردی خاں مہابت جنگ کے دور عنایت رہی۔ ان کے انتقال کے بعد اورنگ آباد لوٹ آئے یہاں چند سال قیام کیا۔ نواب ناصر جنگ شہید کی خدمت میں باریاب ہوئے۔ بلدۂ فرخندہ بنیاد میں ایسے آئے کہ یہیں کے ہو رہے۔ نواب صلابت جنگ بہادر نے بڑی قدر و منزلت کی دو گاؤں مرحمت ہوئے۔

عزلت بڑے شاعر دوست بھی تھے چنانچہ قائم نے اسکی تصریح کی ہے کہ "شاعر دوستی در مزاج او بمرتبہ بود بلکہ برائے مناسبت این طائفہ گاہ گاہ خود هم دو سہ بیت موزوں میکرد" خود اپنے مکان پر مجلس مشاعرہ منعقد کرتے، شعراء کی ضیافت میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتے تھے خوش صحبت تھے۔ خود خوش ہوتے اور اوروں کو لطف اندوز کرتے۔ انکی شاعر دوستی رنگین مزاجی اور رندی ان کے کلام میں اپنی جھلکیاں دکھاتی ہیں۔ ولی دور اول کے قافلہ سالار ہیں تو عزلت عہد دوم کے۔ انھوں نے شاہجہاں آباد کی شاعرانہ سرزمین پر اپنے کمال کے ناقابل فراموش جوہر دکھائے۔ میر صاحب نے ان کی باکمالی اور وسیع المشربی کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے "با ایں ہمہ کمال بیقدر وسعت مشرب بہم رسانیدہ اند کہ دو رنگی چون آب بہ آمیزند" بعض شعراء کے نام قدیم دہلوی تذکروں میں درج ہیں۔ ان کا اصل ماخذ "بیاض عزلت" ہے اس بیاض سے میر نے بعض شعراء کی حالات فائدہ اٹھایا اور گردیزی نے کو استفادہ کیا لیکن میر کی طرح حوالہ نہیں دیا۔ گمان کیا جاتا ہے کہ قائم نے بھی استفادہ کیا ہوگا

عزلت کو مصوری، خطاطی اور موسیقی سے بھی شغف تھا۔ مصوری اور خطاطی کے چند نمونے موجود ہیں۔ عزلت کے ہاتھ کی ایک تصویر آغا حیدر حسن صاحب کے کتب خانے سے جشن یوم ولی کے سلسلہ میں قلمی مخطوطات اور مرقعوں کی نمائش میں منظر عام پر آچکی ہے۔ ان کی موسیقی سے آزاد بلگرامی بھی لطف اندوز ہوئے تھے اور اس فن پر فنکارانہ دسترس کا ثبوت ان کی مثنوی "راگ مالا" سے ملتا ہے۔ مثنوی "راگ مالا" میں چھ راگ ہیں ہر ایک راگ میں پانچ راگنیاں ہیں اور ہر ایک راگنی میں آٹھ حصے ہیں۔ مرحوم عبدالجبار ملکاپوری عزلت کو "طوطی دکن" کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ امیر خسرو علیہ الرحمہ کی طرح عزلت نے کہہ مکرنیاں، پہیلیاں، دوہے، جھولنے اور کبت بھی کہے اور بارہ ماسی تالیف کی۔ شفیق نے اپنے تذکرہ میں اسکی چند مثالیں دی ہیں۔
عزلت کے کمال کا اصلی جوہر ان کی ریختہ گوئی ہے۔ دہلی جانے سے پہلے نہ صرف شعر کہنے لگے تھے بلکہ ان کے اورنگ آباد اور سورت میں کئی شاگرد ہو گئے تھے۔ مرشد آباد جانے تک اپنے اردو کلام کو مرتب کر لیا تھا۔ چنانچہ صاحب گلزار ابراہیم کا بیان ہے کہ "اشعارش مدون بہ نظر این خاکسار درآمد"۔ میر انھیں ریختہ گوئی کے لئے موزوں خیال کرتے ہیں چنانچہ لکھتے ہیں "مزاج وشان میلان ریختہ بسیار دارد۔ نسبتے تمام بسخن دارند از اسالیب کلام شان واضح میگردد کہ بہرہ بسیارے از دردمندی دارند۔" دردمند کے مشہور "ساقی نامہ" کے جواب میں ایک ساقی نامہ حیدرآباد میں نظم کیا جس میں تین سو اکتیس ابیات ہیں

(صہ) ماہانہ سے زیادہ نہیں ملے۔ ملک خاقانی ہند کا خطاب پایا۔ اسی زمانہ میں دکن میں شمس الامرا اور چندو لال کی بارگاہوں سے اکثر باہر سے آنیوالے شاعروں کو (صہ) روزینہ مقرر تھا۔ ظفر جب سریر آرائے سلطنت دہلی ہوئے تب کہیں "استاد شہ" کو خلعت اور جاگیر عطا ہوئی۔ غالب کو بھی اپنی "بے ماہی" کی شکایت رہی۔ شمالی ہند کے باکمال شعرا، شاہ نصیر، شاہ حفیظ، مشتاق، لطف، منت، بیان، دکن چلے گئے جہاں نواب ارسطو جاہ اور میر عالم اور مہاراجہ چندو لال اور شمس الامرا بہادر اپنی فیاضیاں دکھا رہے تھے۔ اس عرصہ میں اہل دکن اپنے محاورہ کو ترک کر کے دہلی کی زبان میں شعر کہنے لگے۔

۲۰۔ سنہ ۱۱۸۰ھ

کارساں دتاسی کے کتب خانہ پیرس میں ہے۔

۲۱۔ سنہ ۱۱۸۵ھ

مولوی سبحان اللہ خاں صاحب کے کتب خانہ گورکھپور میں ہے

۲۲۔ سنہ ۱۱۸۷ھ

۲۸ جمادی الثانی آغا حیدر حسن صاحب پروفیسر نظام کالج حیدرآباد کے کتب خانہ میں ہے۔

۲۳۔ سنہ ۱۱۹۱ھ

کاتب مومن لعل بمقام کتابت حیدرآباد دکن از السید محی الدین قادری زور پروفیسر عثمانیہ کالج کے کتب خانہ میں ہے۔

۲۴۔ سنہ ۱۱۹۴ھ

گارساں دتاسی کے کتب خانہ میں ہے۔

۲۵۔ سنہ ۱۲۱۲ھ

کنگس کالج کیمبرج کے کتب خانہ میں ہے

۲۶۔ سنہ ۱۲۱۳ھ

حیدرآباد دکن میں لکھا گیا۔ جامعہ عثمانیہ کے کتب خانہ میں ہے۔

۲۷۔ سنہ ۱۲۲۹ھ

۲۱ جمادی الاول کاتب محمد علی۔ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد۔

۲۸۔ سنہ ۱۲۴۱ھ

۲۷ ربیع الثانی۔ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد۔

۲۹۔ سنہ ۱۲۴۵ھ

۲ ربیع الاول۔ بمقام کتابت پونہ لکھی۔ برٹش میوزیم لندن میں موجود ہے۔

۳۰۔ سنہ ۱۲۴۹ھ

مرتبہ گارساں دتاسی۔

۳۱۔ سنہ ۱۲۵۰ھ

دتاسی کے کتب خانہ پیرس میں موجود ہے۔

۳۲۔ سنہ ۱۲۶۱ھ

نواب سالار جنگ بہادر کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

۳۳۔ سنہ ۱۲۹۰ھ

۲۷ ذی الحجہ۔ کاتب غلام محمد۔ انڈیا آفس لندن کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

دیوان ولی کے ایسے نسخے جن پر تاریخ کتابت درج نہیں ہے

۱۔ انڈیا آفس لندن کے نسخے

۳۴۔ ۱۱۲۰ … ورق میں خط نستعلیق اس دیوان پر فورٹ ولیم کالج کی مہر ثبت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ کالج کی ملک رہا ہے۔

داسی اشبھو سنتوش تی شکپیر نے دیا تھا۔ (۱۲۶) صفحات ہیں۔

۵۱۔ نفیس تحریر، صحیح، و تغیر و تبدل کے ساتھ (۲۴۲) صفحات ہیں۔

۵۲۔ یہ مخطوطہ مکمل اور اچھی حالت میں ہے۔

۵۔ نواب سالار جنگ بہادر کے کتب خانے کے نسخے

۵۳۔ ایک نسخہ بیاض کی شکل میں ہے زرین جدول کے ساتھ خوشخط لکھا گیا ہے۔

۵۴۔ خوشخط ہے۔ اس کے ساتھ سراج اورنگ آبادی کا دیوان بھی شامل ہے۔

۵۵۔ ایک قدیم نسخہ جس کا کاغذ بھی قدیم ہے۔

۵۶۔ ایک قدیم خوشخط نسخہ جس کے حاشیے پر مرثیے بھی درج ہیں۔

۵۷۔ دیوان ولی کے ساتھ اور چار کتابیں "احوال قیامت" از محیط "معراج نامہ" از بلاقی "بکٹ کہانی" از "افضل" "کاک سندیسہ" از اکرم۔

حیدرآباد دکن کے متفرق نسخے

۵۸۔ کتب خانہ آغا حیدر حسن صاحب۔

شعرا مثلاً نصرتی وغیرہ کی غزلیات بھی موجود ہیں۔

۵۹۔ محمد علیم الدین صاحب کتب فروش اسٹیشن روڈ

۶۰۔ صاف خط سے مملوکہ مولوی سید محمد صاحب

٥١				۔	١٢٢٠ھ	آغا حیدر حسن صاحب
٥٢	مجموعۂ مثنویات			١٠٠٠ھ		جامعہ عثمانیہ
٥٣		نصرتی		۔	١١٩٣ھ	نواب سالار جنگ بہادر
٥٤			۔		١٢٢٩ھ	جامعہ عثمانیہ
٥٥						
٥٦	دیوان عبداللہ قطب شاہ	سلطان عبداللہ وفات ١٠٨٣ھ		قبل ١٠٨٣ھ		آغا حیدر حسن صاحب
٥٧	مولود حضرت فاطمہؓ			١٠٩٩ھ		نواب سالار جنگ بہادر
٥٨	قصۂ شاہ روم ١٠٩١	فائز		١٠٩٤ھ	رمضان ١٢٤٣ھ	۔
٥٩	علی نامہ	نصرتی	۔	١٠٧٢ھ		
٦٠	معراج نامہ	بلاقی		١٠١٠ھ	١١٤٩ھ	
٦١	۔	۔				
٦٢	۔					۔
٦٣	رسالۂ وجودیہ	شاہ امین الدین اعلیٰ	۔	قبل [illegible]ھ		
٦٤	رسالۂ تصوف	۔		۔		
٦٥	معراج نامہ	مختار	۔	١٠٩٤ھ	١٢٠٢ھ	آغا حیدر حسن صاحب
٦٦	قصیدہ	عاجز		١٠٩٩ھ		نواب سالار جنگ بہادر
٦٧	یوسف زلیخا	ہاشمی				
٦٨	۔	۔	۔			آغا حیدر حسن صاحب
٦٩	۔	۔	۔	۔		جامعہ عثمانیہ
٧٠	دیوان ریختی	۔	۔			نواب سالار جنگ بہادر
٧١	خزانۂ عبادت	شاہ محمد	۔	١١٠٠ھ	١٢٦١ھ	۔

۹۳		〃	〃	〃	سنہ ۱۱۸۶ھ	آغا حیدر حسن صاحب
۹۴	〃	〃	〃	〃	سنہ ۱۱۹۱ھ	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
۹۵	〃				سنہ ۱۲۱۳ھ	جامعہ عثمانیہ
۹۶	〃	〃	〃	〃		علیم الدین صاحب تاجر کتب
۹۷	بیاض نثر تیاؤلی و نثرقی					آغا حیدر حسن صاحب
۹۸	ظفرنامۂ عشق	سید مظفر		سنہ ۱۱۲۰ھ		نواب سالار جنگ بہادر
۹۹	مصطفیٰ نامہ	۔۔ مصطفیٰ	〃	سنہ ۱۱۲۶ھ	سنہ ۱۲۶۶ھ	آغا حیدر حسن صاحب
۱۰۰	روضۃ الشہدا	میاں محمد فیاض ولی ویلوری	〃	سنہ ۱۱۳۰ھ	سنہ ۱۱۵۹ھ	نواب سالار جنگ بہادر
۱۰۱		〃	〃	〃	سنہ ۱۲۲۴ھ	〃
۱۰۲	〃			〃	سنہ ۱۲۳۱ھ	〃
۱۰۳	〃	〃		〃	سنہ ۱۲۵۵ھ	
۱۰۴		〃	〃	〃		〃
۱۰۵	پنچھی باچھا	وجدی		سنہ ۱۱۳۴ھ	سنہ ۱۲۵۰ھ	جامعہ عثمانیہ
۱۰۶	کلیات ایجاد	نقد علی خاں	نظم			نواب سالار جنگ بہادر
۱۰۷	〃	〃				
۱۰۸	سوال و جواب حضرت موسیٰ		نثر		سنہ ۱۱۷۴ھ	〃
۱۰۹	طوطی نامہ	محمد قادری		سنہ ۱۱۴۲ھ		جامعہ عثمانیہ
۱۱۰	تنبیہ	سید محمد خاں عشرتی	نظم	سنہ ۱۱۴۳ھ	سنہ ۱۲۹۶ھ	نواب سالار جنگ بہادر
۱۱۱	ایک پلنگ	〃	〃			〃
۱۱۲	چت لگن	〃	〃			〃
۱۱۳	دیوان قاسم	شاہ قاسم اورنگ آبادی	〃		سنہ ۱۱۶۰ھ	〃

۱۱۴	پنچھی بچھاچا	شیخ وجہ الدین وجدی	〃	سنہ ۱۱۵۵ھ	سنہ ۱۲۵۲ھ	〃
۱۱۵	〃	〃	〃	〃	سنہ ۱۲۲۶ھ	〃
۱۱۶	〃	〃	〃	〃	〃	
۱۱۷	جنگ نامہ محمد حنیف	میزبان	〃		سنہ ۱۱۵۵ھ	آغا حیدر حسن صاحب
۱۱۸	دیوان عثمان خاں سرور	عثمان خاں سرور	〃			نصیر الدین صاحب ہاشمی
۱۱۹	محشر نامہ	توفیق	〃	سنہ ۱۱۶۱ھ		نواب سالار جنگ بہادر
۱۲۰	قصہ ملکہ مصر	عبد اللطیف	〃	سنہ ۱۰۰۱ھ		جامعہ عثمانیہ
۱۲۱	دیوان سراج	شاہ سراج الدین اورنگ آبادی		〃		نواب سالار جنگ بہادر
۱۲۲	〃	〃	〃		سنہ ۱۲۵ھ	جامعہ عثمانیہ
۱۲۳	〃	〃	〃	سنہ ۱۱۶۱ھ	سنہ ۱۱۶۱ھ	پروفیسر عبد الرحمن خاں صاحب
۱۲۴	پنج گنج				سنہ ۱۰۸ھ	جامعہ عثمانیہ
۱۲۵	بوستان خیال	شاہ سراج الدین	نظم	سنہ ۱۱۰۳ھ	سنہ ۱۲۱۲ھ	نواب سالار جنگ بہادر
۱۲۶	بیاض مراثی	نواب درگاہ قلی خاں		سنہ ۱۱۵۵ھ		〃
۱۲۷	روضۃ الاطباء	نواب حسن علی خاں شیدا		سنہ ۱۱۰۳ھ	سنہ ۱۱۰۳ھ	〃
۱۲۸	〃		〃		سنہ ھ	〃
۱۲۹	〃	〃			سنہ ۱۲۱۲ھ	〃
۱۳۰		〃		〃		
۱۳۱	〃	〃				آغا حیدر حسن صاحب
۱۳۲			〃	〃		نواب ناصر الدین قادری
۱۳۳	لعل و گوہر	عاجز		سنہ ۱۱۱۰ھ	سنہ ۱۱۹ھ	نواب سالار جنگ بہادر
۱۳۴	〃	〃	〃	〃		ادارۂ ادبیات اردو

۱۵۶	سراج الایمان	حافظ احمد بن محمد		سنہ ۱۲۰ھ		جامعہ عثمانیہ
۱۵۷	بیاض العارفین	اسحق	نظم	سنہ ۱۲۰۶ھ	سنہ ۱۲۳۷ھ	نواب سالار جنگ بہادر
۱۵۸	〃	〃	〃			جامعہ عثمانیہ
۱۵۹	علم نبی	خادم نبی	〃	سنہ ۱۲۰۰ھ		نواب سالار جنگ بہادر
۱۶۰	دیوان مستانہ	عمدۃ الامراء	〃			نصیر الدین ہاشمی
۱۶۱	ریاض الجنان	محمد باقر آگاہ	〃	〃	سنہ ۱۲۴۰ھ	نواب سالار جنگ بہادر
۱۶۲	انوار ہری	کرامت علی	〃	سنہ ۱۲۱۳ھ		جامعہ عثمانیہ
۱۶۳	فوائد در فوائد	محمد باقر آگاہ	〃	سنہ ۱۲۱۰ھ	سنہ ۱۲۵۰ھ	〃
۱۶۴	قصۂ حاتم طائی	مہمان	〃	سنہ ۱۲۱۶ھ		نواب سالار جنگ بہادر
۱۶۵	مثنوی حاتم طائی	〃			سنہ ۱۲۷۳ھ	آغا حیدر حسن صاحب
۱۶۶	〃	〃		〃	〃	
۱۶۷	نکات الوجود	مخدوم شاہ حسینی بیجا		سنہ ۱۲۱۹ھ		〃
۱۶۸	معجزات حسینی مختار نامہ	سلام الدین بسو			سنہ ۱۲۰۷ھ	نواب سالار جنگ بہادر
۱۶۹	ہشت بہشت	محمد باقر آگاہ		سنہ ۱۲۰۰ھ	سنہ ۱۲۶۹ھ	جامعہ عثمانیہ
۱۷۰	〃				سنہ ۱۲۵۴ھ	[illegible]
۱۷۱			〃		سنہ ۱۲۶۲ھ	
۱۷۲						
۱۷۳	دوازدہ مجلس	غلام	〃		سنہ ۱۲۲۲ھ	جامعہ عثمانیہ
۱۷۴	گلشن احسان	احسان علی	〃	سنہ ۱۲۳۲ھ	سنہ ۱۲۲۴ھ	نواب سالار جنگ بہادر
۱۷۵	فقہ المبین		نثر		سنہ ۱۲۲۳ھ	جامعہ عثمانیہ
۱۷۶	مجموعہ رسائل فقہ				سنہ ۱۲۲۴ھ	〃

۱۷۷	اسرار عشق	محمد	نظم	۱۲۲۵ھ	۱۳۰۰ھ	نواب سالار جنگ بہادر
۱۷۸	محبوب القلوب	باقر آگاہ		۱۲۰۵ھ	۱۲۵۵ھ	جامعہ عثمانیہ
۱۷۹	دیوان فیض	شمس الدین فیض	نظم	۱۲۳۰ھ		ڈاکٹر سید محی الدین قادری
۱۸۰	تحفۃ النساء	باقر آگاہ		۱۱۸۵ھ		نواب سالار جنگ بہادر
۱۸۱	گلزار عشق		"	۱۲۲۶ھ	۱۲۴۹ھ	"
۱۸۲	ریاض الجنان	باقر آگاہ	"	۱۲۲۰ھ	"	جامعہ عثمانیہ
۱۸۳	واحد باری	اشرف	"		۱۲۲۶ھ	نواب سالار جنگ بہادر
۱۸۴	مثنوی ہیر جنتی	آگاہ بیجاپوری	"	۱۲۱۴ھ		جامعہ عثمانیہ
۱۸۵	مولود شریف	قاسم	"	۱۲۰۹ھ	۱۲۴۶ھ	نواب سالار جنگ بہادر
۱۸۶	قصص الانبیاء		نثر		۱۲۶۵ھ	آغا حیدر حسن صاحب
۱۸۷	مدینۃ الانوار	نامی	نظم مذہبی	۱۲۱۳ھ	۱۲۱۶ھ	نواب سالار جنگ بہادر
۱۸۸	"		"	"	"	"
۱۸۹	معجزات	حبیب اللہ قادری	"	۱۲۱۴ھ	ــــــ	"
۱۹۰	عقائد باقر آگاہ	باقر آگاہ	"	قبل ۱۲۰۰ھ	۱۲۵۳ھ	"
۱۹۱	اسرار ہادی	محمد غوث بدو میاں			۱۲۶۸ھ	جامعہ عثمانیہ
۱۹۲	چہار درویش	شوق	نظم	۱۲۱۴ھ		نواب سالار جنگ بہادر
۱۹۳	ملکہ زماں کام لعدلا		نثر		۱۲۳۴ھ	"
۱۹۴	ابلیس نامہ	عاجز	نظم و نثر	۱۲۰۰ھ	۱۲۵۴ھ	"
۱۹۵	عقائد اہل سنت				۱۲۳۸ھ	جامعہ عثمانیہ
۱۹۶	ترجمہ قصیدہ بردہ	عاجز	نظم			نواب سالار جنگ بہادر
۱۹۷	مفتاح الصلوٰۃ	شاہ سعید الدین	نثر	۱۲۴۱ھ	۱۲۶۴ھ	"

۲۲۰	رسالہ فقہ و چہار مسائل	اشرف	نظم		۱۲۶۵ھ	نواب سالار جنگ بہادر
۲۲۱	وفات نامہ حضرت خاتون جنت		"		۱۲۷۵ھ	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
۲۲۲	[illegible]نامہ حضرت خاتون جنت		"		۱۲۷۰ھ	"
۲۲۳	نل دمن		"		۱۲۶۳ھ	جامعہ عثمانیہ
۲۲۴	قصہ باز و فاختہ		"		۱۲۷۵ھ	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
۲۲۵	تفسیر ہندی	کمال شاہ دکنی			"	جامعہ عثمانیہ
۲۲۶	روضۃ الشہدا	ولی ویلوری	نظم		۱۲۷۴ھ	"
۲۲۷	"	"	"	"	۱۲۷۵ھ	محمد علیم الدین صاحب تاجر کتب
۲۲۸	چندر بدن و مہیار	واقف	"	۱۲۲۷ھ	۱۲۷۰ھ	نواب سالار جنگ بہادر
۲۲۹	"	"	"	"	۱۲۶۰ھ	"
۲۳۰	غوث نامہ	لعل خاں شاہ			۱۲۷۷ھ	جامعہ عثمانیہ
۲۳۱	راحت دل	اشفاق	نظم	۱۲۴۵ھ		نواب سالار جنگ بہادر
۲۳۲	من موہن	آزاد	"	۱۲۴۷ھ	۱۲۷۵ھ	"
۲۳۳	وفات نامہ آنحضرتؐ		"		۱۲۸۰ھ	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
۲۳۴	شرح تمثیلات	آزاد	نظم و نثر	۱۲۵۱ھ		نواب سالار جنگ بہادر
۲۳۵	نکات الاسرار	شاہد چشتی	نظم	۱۲۶۲ھ	۱۲۶۲ھ	"
۲۳۶	دیوان شاہد	"	"	"	"	"
۲۳۷	ترجمہ گلشن زار	آزاد	"	۱۲۸۶ھ	۱۲۸۶ھ	"
۲۳۸	معجزہ حضرت خاتون جنتؑ		"		"	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
۲۳۹	وفات حضرت خاتون جنتؑ		"		۱۲۸۴ھ	"
۲۴۰	تنبیہ النساء		"		۱۲۶۶ھ	"

۲۴۱	روضۃ الشہداء	میر حسن جعفری	نظم			نواب سالار جنگ بہادر (دس جلد و نفیس)
۲۴۲	روضہ ہندی	محکم	"			" (بارہ جلد و نفیس)
۲۴۳	دیوان ایمان	ایمان			سنہ ۱۲۹۶ھ	جامعہ عثمانیہ
۲۴۴	دیوان حسینی	حسینی	نظم		"	نواب سالار جنگ بہادر
۲۴۵	ہدایۃ الہندی	شیخ داؤد دکمنی	"		سنہ ۱۲۶۱ھ	جامعہ عثمانیہ
۲۴۶	کنز الاکمان	عابد شاہ حسینی			سنہ ۱۲۵۷ھ	"
۲۴۷	بوستان خیالی	سراج	نثر		"	نواب سالار جنگ بہادر
۲۴۸	انوار بدریہ	شاہ علی	"		سنہ ۱۲۵۸ھ	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
۲۴۹	کلام روپ کلا		"		سنہ ۱۲۴۳ھ	نواب سالار جنگ بہادر
۲۵۰	دستور الصبیان	تو ندرات	نظم		سنہ ۱۲۷۶ھ	"
۲۵۱	قادر باری	قربان علی خاں	"		"	"
۲۵۲	دیوان تمیز	بدرالدین خاں تمیز	"		سنہ ۱۲۸۳ھ	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
۲۵۳	مجموعہ دو دواوین	مظفرالدین خاں مزاکی	"		سنہ ۱۲۹۱ھ	"
۲۵۴	قصہ بدرالدین و مہرو	یار محمد خاں	"	سنہ ۱۲۸۸ھ		جامعہ عثمانیہ
۲۵۵	حبل الورید				سنہ ۱۳۰۰ھ	"
۲۵۶	دیوان رباعیات عصر	میرزا محمد علی عصر	نظم		سنہ ۱۳۱۳ھ	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
۲۵۷	دیوان وزیر	آصف یار الملک	"		سنہ ۱۳۳۱ھ	"
۲۵۸	دیوان فیض	فیض	"			نواب سالار جنگ بہادر
۲۵۹	رسالۃ التصوف	خواجہ حسینی بادشاہ	نثر			"
۲۶۰	نقبن ودیک	محمد قلی قطب شاہ	نظم			"
۲۶۱	کلیات ایجاد	ایجاد	نثر			"

۲۶۲	باب المعرفت	حیات	نثر			نواب سالار جنگ بہادر
۲۶۳	تنبیہ الریاضین	سرمد	نظم			″
۲۶۴	[illegible]	″	نثر			″
۲۶۵	کرامات شیخ [illegible]	عطا	″			″
۲۶۶	رسالہ [illegible]	آزاد	نثر، مذہبی			″
۲۶۷	جنگ نامہ محمد حنیف		مثنوی			″
۲۶۸	″		″			جامعہ عثمانیہ
۲۶۹	[illegible] نامہ	خالدی	نظم			″
۲۷۰	[illegible]		نثر			نواب سالار جنگ بہادر
۲۷۱	[illegible] نامہ	عاجز	نظم			″
۲۷۲	رسالۂ آزاد	آزاد	نظم و نثر			″
۲۷۳	قصۂ حضرت عیسیٰؑ	لمتہون	نظم			″
۲۷۴	قصۂ گریہ [illegible]		″			″
۲۷۵	قصۂ منصور		″			″
۲۷۶	ترجمہ قصیدۂ اسرار		″			″
۲۷۷	خلاصۂ تصوف		نثر			″
۲۷۸	قصص الانبیاء	غوثی	نظم			″
۲۷۹	زاد المومنین		″			″
۲۸۰	مسائل فقہ		نثر			″
۲۸۱	صراط المستقیم	خیر الدین لایق	نظم و نثر			″
۲۸۲	وفات نامہ حضرت فاطمہؓ		نظم			″

۲۸۳	قصۂ دنیا		نظم			نواب سالار جنگ بہادر
۲۸۴	اصول العقائد ترجمہ حدیث شمائل	شیخ باقر	نثر			〃
۲۸۵	مجموعۂ معجزات	محی الدین قتالی	نظم			〃
۲۸۶	سب رس	شاہ محمد ولی اللہ قادری	〃			〃
۲۸۷	معجزنامہ	قادر	〃			〃
۲۸۸	مثنوی آصف	آصف	〃			〃
۲۸۹	کنز الہدایا		〃			〃
۲۹۰	پنج رسالہ منظوم	معظم	نثر			〃
۲۹۱	بیاض مراثی	رضا وغیرہ	نظم			〃
۲۹۲	تنبیہ النساء	شاہ رحمت اللہ	〃			〃
۲۹۳	مجموعۃ المسائل		نثر			〃
۲۹۴	کنز المومنین	نواب الدین خدام اعلیٰ شاہ	〃			〃
۲۹۵	رسائل	شاہ صدر الدین	نظم		بزمانۂ مصنف	آغا حیدر حسن صاحب
۲۹۶	مجموعۂ دواوین	بہاری لعل رمز	〃			ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
۲۹۷	دیوان آصفی	آصفی حسام الملک خانخاناں	〃			〃
۲۹۸	اساس فقہ					جامعہ عثمانیہ
۲۹۹	رسائل قادریہ					〃
۳۰۰	تاریخ سلاطین بہمنیہ					〃
۳۰۱	مجموعۂ ملفوظات اولیائے دکن					〃
۳۰۲	شمائل نامہ					〃
۳۰۳	مجموعۂ مثنویات دکن					〃

۳۰۴	رسالۂ تصوف دکھنی					جامعہ عثمانیہ
۳۰۵	رموز العارفین					״
۳۰۶	رسالۂ کلمۃ الاسرار					״
۳۰۷	مثنوی چھو منتر	ذو الفقار علی خاں صفا				״
۳۰۸	اعجاز احمدی	نوازش علی خاں شیدا				״
۳۰۹	شمائل الاتقیاد	میراں یعقوب				״
۳۱۰	ترجمہ حملۂ حیدری					״
۳۱۱	بیاض کلام شعرائے دکن		نظم			״
۳۱۲	قواعد عروض	محمد باقر آگاہ				״
۳۱۳	انتخاب کلام شعرائے دکن		نظم			״
۳۱۴	مثنوی دکھنی درسیر		״			״
۳۱۵	فقہ دکھنی	باقر آگاہ	״			״
۳۱۶	جنگ سلوک					نصیر الدین صاحب ہاشمی
۳۱۷	فقہ ہندی	مہدی				״
۳۱۸	نورس					مرزا حسین علی خاں صاحب
۳۱۹	نوحہ جات و سلام آصفی	آصفی				عباس حسین صاحب نقوی
۳۲۰	تاج الحقائق					بعطیۂ غفور احمد صاحب مجددی
۳۲۱	دیوان ولی	ولی	نظم			
۳۲۲	״	״	״			
۳۲۳	دیوان عصر	عصر	״			
۳۲۴	رباعیات عصر	״	״			
۳۲۵[1]	״	״	״			

[1] نوٹ۔ یہ وہ کتابیں تھیں جو نمایش کے دور وز قبل تک وصول ہو چکی تھیں بعد میں اور متعدد کتابیں وصول ہوئی تھیں جنکی تفصیلی فہرست تیار نہ ہو سکی اس لیے یہاں درج نہ ہو سکیں۔

فہرست نمائش تصاویر قلمی

قدیم قلمی تصاویر از کتب خانۂ نواب سالار جنگ بہادر

۱۔ سلطان قلی قطب شاہ بانی گولکنڈہ۔
۲۔ فرزندان سلطان قلی قطب شاہ۔
۳۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ۔
۴۔ 〃 〃 〃 دیگر
۵ ابوالحسن تانا شاہ
۶۔ 〃 〃 〃
۷۔ 〃 〃 〃
۸۔ مادنا۔ دیوان قطب شاہی۔
۹۔ 〃 〃 〃 دیگر
۱۰۔ بیاض قطب شاہی۔
۱۱۔ ابراہیم عادل شاہ نورس۔
۱۲۔ نورس پیکر۔
۱۳۔ جشن طرب نورس۔
۱۴۔ چاند سلطانہ۔
۱۵۔ 〃 〃 〃 دیگر
۱۶۔ 〃 〃 〃 〃

قدیم قلمی تصاویر از کتب خانۂ آغا حیدر حسن صاحب

۱۷۔ سکندر عادل شاہ بیجاپوری۔
۱۸۔ میر مومنؔ حیدرآبادی۔
۱۹۔ حضرت علیؑ بعمل عبدالولی عزلت۔
۲۰۔ حضرت محبوب سبحانیؒ۔
۲۱۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ۔
۲۲۔ شیخ فرید الدینؒ شکر گنج۔
۲۳۔ حضرت خواجہ نظام الدینؒ اولیا۔
۲۴۔ حضرت قطب الدینؒ بختیار کاکی۔
۲۵۔ حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی۔
۲۶۔ ابراہیم عادل شاہ نورس۔
۲۷۔ بوبوجی خانم زوجہ یوسف عادل شاہ۔
۲۸۔ محمد عادل شاہ۔
۲۹۔ محمد عادل شاہ اور انجا رانی۔
۳۰۔ جمشید قطب شاہ۔
۳۱۔ محمد قلی قطب شاہ۔
۳۲۔ 〃 〃 〃 دیگر

۳۴۔ ابراہیم عادل شاہ اول۔
۳۵۔ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر۔
۳۶۔ نواب آصفجاہ اول۔
۳۷۔ نواب میر نظام علی خان آصفجاہ ثانی۔
۳۸۔ نواب سکندرجاہ آصفجاہ ثالث۔
۳۹۔ نواب ناصرالدولہ آصفجاہ رابع۔
۴۰۔ نواب میر محبوب علی خان آصفجاہ سادس۔
۴۱۔ ماہ لقا بائی چندہ۔
۴۲۔ حضرت خواجہ بندہ نوازؒ۔
۴۳۔ میر عالم بہادر دیوان دکن۔
۴۴۔ مادنا۔ دیوان گولکنڈہ۔
۴۵۔ شاہ ہاشم بیجاپوری۔
۴۶۔ شاہ بہاؤ الدین باجن۔
۴۷۔ سکندر جاہ۔
۴۸۔ ماہ لقا بائی۔

قدیم قلمی تصاویر از کتب خانۂ سید قاسم صاحب

۴۹۔ خواجہ عثمان ہارونیؒ۔

۵۰۔ عبدالرحمٰن جامیؒ۔
۵۱۔ مہارانی ہے۔
۵۲۔ شاہ عبدالرزاق قادری بیجاپوری۔
۵۳۔ شاہ رضا حسینی۔

حال کی قلمی تصاویر از کتب خانہ نواب سالار جنگ بہادر

۵۴۔ سلطان قلی قطب شاہ۔
۵۵۔ جمشید قلی قطب شاہ۔
۵۶۔ ابراہیم قلی قطب شاہ۔
۵۷۔ محمد قلی قطب شاہ۔
۵۸۔ محمد قطب شاہ۔
۵۹۔ عبداللہ قطب شاہ۔
۶۰۔ ابوالحسن تانا شاہ۔
۶۱۔ آصفجاہ اول۔
۶۲۔ میر نظام علی خاں آصفجاہ ثانی۔
۶۳۔ نواب سکندر جاہ آصفجاہ ثالث۔
۶۴۔ نواب ناصرالدولہ آصفجاہ رابع۔
۶۵۔ نواب افضل الدولہ آصفجاہ خامس۔
۶۶۔ نواب میر محبوب علی خاں آصفجاہ سادس۔
۶۷۔ نواب میر عثمان علیخاں خلد اللہ ملکہ۔
۶۸۔ مہاراجہ چندو لال۔
۶۹۔ نواب مختار الملک۔
۷۰۔ مہاراجہ نرندر پرشاد۔
۷۱۔ نواب عماد السلطنت۔
۷۲۔ نواب منیر الملک۔
۷۳۔ نواب آسماں جاہ۔
۷۴۔ نواب وقار الامراء۔
۷۵۔ مہاراجہ کشن پرشاد۔
۷۶۔ نواب سالار جنگ بہادر۔
۷۷۔ نواب خورشید جاہ۔
۷۸۔ نواب معین الدولہ بہادر۔
۷۹۔ سلطان قلی قطب شاہ۔
۸۰۔ ابراہیم قلی قطب شاہ۔
۸۱۔ جمشید قلی قطب شاہ۔

۸۱۔ ابراہیم قلی قطب شاہ۔
۸۲۔ محمد قلی قطب شاہ۔
۸۳۔ محمد قطب شاہ۔
۸۴۔ عبداللہ قطب شاہ۔
۸۵۔ ابوالحسن تانا شاہ۔
۸۶۔ ابراہیم عادل شاہ نورس۔
۸۷۔ سلطان علی عادل شاہ ثانی۔

حال کی قلمی تصاویر جو قیوم صاحب کی بنائی ہوئی ہیں

۸۸۔ ایجنٹا کی پیدائش۔
۸۹۔ چاند بی بی معرکہ قلعہ احمد نگر میں۔
۹۰۔ ٹیپو سلطان شہید۔
۹۱۔ پرتھال اور برہمن۔

دیگر تصاویر جو مختلف اصحاب نے پیش کیں

حال کی قلمی تصاویر جو سٹی کالج کی جانب سے تیار کرائی گئیں

۹۲۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ۔
۹۳۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ۔
۹۴۔ اعلیحضرت میر محبوب علیخاں غفراں مکاں۔
۹۵۔ ہز ہائینس پرنس آف برار نواب اعظم جاہ بہادر
۹۶۔ آنریری جنرل شہزادہ والاشان نواب معظم جاہ بہادر۔

۹۷۔ شہزادی درشہوار دردانہ بیگم صاحبہ۔ ۹۸۔ شہزادی نیلوفر فرحت بیگم صاحبہ۔
۹۹۔ نواب مکرم جاہ بہادر۔ ۱۰۰۔ نواب سالار جنگ بہادر۔

انتخاب کلام ولی

کیتا ہوں ترے ناؤں کوں میں وردِ زباں کا
کیتا ہوں ترے شکر کوں عنوان بیاں کا

جس گرد اُپر پاؤں رکھیں تیرے رسولاں
اُس گرد کوں میں کحل کروں دیدۂ جاں کا

مجھ صدق طرف عدل سوں اے اہل حیا دیکھ[1]
تجھ علم کے چہرے پہ نہیں رنگ گماں کا

ہر ذرۂ عالم میں ہے خورشید حقیقی ؛
یو بوجھ کہ بلبل ہوں ہر اک غنچہ دہاں کا

کیا سہم ہے آفات قیامت ستی اس کوں
کھایا ہے جو کئی تیر تجھ ابرو کی کماں کا

کہتا ہے ولی دل ستی یو مصرع رنگیں ؛
ہے یاد تری مجکو سبب راحت جاں کا

الٰہی! کر مجھے تو خاک پا اہل معانی کا
کہ کھلتا ہے اسی صحبت سے نسخہ نکتہ دانی کا

عزیزاں بعد مرنے کے نہ بوجھو تم کہ تنہا ہوں
لکھا ہوں پردۂ دل پر خیال اُس یار جانی کا

پرت کی بزم میں تا سرخ روئی مجکو ہو حاصل
نین سوں پینے لے ساغر شراب ارغوانی کا

ترے مکھ کی صفائے حیرت افزا کم سکے کیونکر
قلم ہے جوہر آئینہ نا صاف مانی کا

شراب جلوۂ ساقی سوں مت کر منع اے زاہد
یہی ہے مقتضا عالم میں ہنگام جوانی کا

ہوا ہے دل مرا مشتاق تجھ چشم شرابی کا
خراباتی اُپر آیا ہے شاید دن خرابی کا

کیا بیہوش مجھ دل کو انیندی نین ساقی نے
عجب رکھتا ہے کیفیت زمانہ نیم خوابی کا

نہ جاؤں صحن گلشن میں کہ خوش آتا نہیں مجکو
بغیر از ماہ رو ہرگز تماشا ماہتابی کا

ترے غم میں نکلتا ہے جو باہر نین سوں آنسو
در یا گوہر کہاں ہے جگ میں اسکی آبداری کا

---

[1] بمبئی کے چھپے ہوئے دیوان میں یہ مصرع اس طرح ہے۔ اس صاد صداقت کی طرف اہل حیا دیکھ

طالب نہیں ماہ و مشتری کا — دیوانہ ہوا جو تجھ پری کا

کفار فرنگ کوں دیا ہے — تجھ زلف نے درس کافری کا

پایا ہے جو کوئی دولت فقر — مشتاق نہیں سکندری کا

پھیکی لگے اُس کوں شان دولت — چاکھا جو مزہ قلندری کا

کہتا ہے ولی پکار یو بات — بندہ ہوں پیا کی دلبری کا

یکایک مجھ دسا یک شہ جواں اسوار تازی کا — کہ جن نے حق سوں پایا ہے خطاب عاشق نوازی کا

نزک میرے کرم کو کر فصاحت ھور بلاغت سوں — کہا وہ سرو قد مجکوں سخن یو سرفرازی کا

محبت یار بے پروا کی سینے میں ہے رات ھور دن — یہی مطلب ہے رات اور دن نمازی اور نیازی کا

مجھے بولیا کہ تو واقف نہیں عشق حقیقی سوں — تو بہتر یوں ہے جا دامن پکڑ عشق مجازی کا

سنیا ہوں جب سوں یہ نکتہ ولی شیریں سخن سیتی — لگیا ہے تب سوں شیوہ جی کو میرے عشق بازی کا

شغل بہتر ہے عشق بازی کا — کیا حقیقی و کیا مجازی کا

ہر زباں پر ہے مثل شانہ مدام — ذکر اُس زلف کی درازی کا

ہوش کے ہاتھ میں عناں نہ رہی — جب سوں دیکھا سوار تازی کا

تیں دکھا کر آپس کے مکھ کی کتاب — علم کھویا ہے دل سوں قاضی کا

آج تیری نگہ نے مسجد میں — ہوش کھویا ہے ہر نمازی کا

گر نہیں راز فقر سوں آگاہ — فخر بیجا ہے فخر رازی کا

دیکھنا ہر صبح تجھ رخسار کا — ہے مطالع مطلع الانوار کا

بلبل و پروانہ کرنا دل کے تئیں — کام ہے تجھ چہرۂ گلنار کا

صبح تیرا درس پایا تھا صنم — شوق دل مشتاق ہے تکرار کا

ماہ کے سینے اُپر اے شمع رو — داغ ہے تجھ حسن کی جھلکار کا

دل کو دیتا ہے ہمارے پیچ و تاب — پیچ تیرے طرۂ طرار کا
اے ولی کیوں سن سکے ناصح کی بات — جو ہے دیوانہ پری رخسار کا

یاد کرنا ہر گھڑی اس یار کا — ہے وظیفہ مجھ دل بیمار کا
آرزوئے چشمۂ کوثر نہیں — تشنہ لب ہوں شربت دیدار کا
عاقبت ہووے گا کیا معلوم نہیں — دل ہوا ہے مبتلا دلدار کا
گر ہوا ہے طالب آزادگی — بند مت ہو سبحہ و زنار کا
مسند گل منزل شبنم ہوی — دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا
اے ولی ہونا سری جن پر نثار — مدعا ہے چشم گوہر بار کا

جیوں لالہ بجز آتش خاموش لب یار — مرہم نہیں عالم میں ولی داغ جگر کا

اپس کی زلف کافر کیش کی جھلکار ٹک دکھلا — کہ زاہد بے خبر دم مارتا ہے پارسائی کا
مرے دل کی حقیقت یوں ہوی ہے شہرۂ عالم — کہ جیوں مشہور ہے مذکور تیری دلربائی کا

گزر ہے تجھ طرف ہر بوالہوس کا — ہوا مدعا شہائی ہر کس کا
اپس گھر میں رقیباں کو نہ دے بار — چمن میں کام کیا ہے خار و خس کا
نگہ سوں تیری ڈرتے ہیں نظر باز — سدا ہے خوف داں کوں مگس کا
بجز رنگیں ادا دوجے سوں مت مل — اگر مشتاق ہے توں رنگ و رس کا

چاروں طرف کھلیا ہے گلزار رنگ و رس کا — اس سیر جاں فزا سوں سینہ کھلیا ہوس کا
تجھ مکھ کے دیکھنے کوں اے آفتاب طلعت — مشتاق دل سوں میرے شعلہ اٹھا ہوس کا
دریا میں بیم کے یہاں گرداں ہے کشتی عقل — اس موج شعلہ زن میں کیا آسرا ہے خس کا

کوتوال

بھر بھر ولی ترے کن آتا ہے جیوں کہ سائل
ترے مٹھے بیاں کا جب سوں پڑیا ہے چسکا

عیاں ہے ہر طرف عالم میں حُسن بے حجاب اُس کا
بغیر از دیدۂ حیراں نہیں جگ میں نقاب اُس کا

ہوا ہے مجکو شمع بزم یکرنگی سوں یو روشن
کہ ہر ذرّے اُپر تاباں ہے دائم آفتاب اُس کا

کرے عشاق کوں جیوں صورت دیوار حیرت سوں
اگر پردے سوں وا ہووے جمال بے حجاب اُس کا

اگرچہ حسب ظاہر میں ہے فرقت درمیاں لیکن
تصور دل میں میرے جلوہ گر ہے صبح و شام اُس کا

محبت کے مرے: ہووے پتا ہووے سند مجکوں
لکھیا ہوں صفحۂ سینہ پہ خون دل سوں نام اُس کا

کفر کوں توڑ دل سوں دل میں یکبکر نیت خالص
ہوا ہے رام بن حسرت سوں جا لچھمن سوں رام اُس کا

روح بخشی ہے کام تجھ لب کا
دم عیسیٰ ہے نام تجھ لب کا

حُسن کے خضر نے کیا لبریز
آب حیواں سوں جام تجھ لب کا

منطق و حکمت و معانی پر
مشتمل ہے کلام تجھ لب کا

نہیں ور کار تا بولے بیاں اپنی زباں سیتی
عیاں ہے اشک کے طومار سوں احوال عاشق کا

نہ جاوے ملک بیتابی سوں یک لمحہ کدھی باہر
زمین بیقراری میں گڑیا ہے نال عاشق کا

ولی یو مصرع رنگیں ہوا ہے ورد جان و دل
فدا ہے عشق میں دلبر کے جان و مال عاشق کا

دیکھا ہوں قد و زلف و دہن جب سوں پیو کا
کرتا ہوں تب سوں ورد الف لام میم کا

پری رویاں کے کوچے میں خبرداری سوں جا اے دل
کہ اطراف حرم میں ڈر ہمیشہ ہے حرامی کا

حقیقت سوں تری مدت سوں ہم واقف ہیں اے زاہد
عبث ہم پختہ مغزاں سوں نہ کر اظہار خامی کا

دل کو گر مرتبہ ہے درپن کا
مفت ہے دیکھنا سری جن کا

جامہ زیبوں کوں کیوں تجوں کر مجھے — گھیر رکھتا ہے دور دامن کا
اے زباں کر مدد کہ آج صنم — منتظر ہے بیان روشن کا
حکمت عشق بوعلی سوں نہ پوچھ — نہیں قانوں شناس اس فن کا
آئینہ تجھ سے ہو کے ہم زانو — حیرت افزا ہوا ہے گلشن کا
دل صد پارہ تجھ پلک سوں ہے بند — خرقہ دوزی ہے کام سوزن کا

گلتا ہے مجکو پنجہ خورشید رعشہ دار — دیکھا ہوں جب سوں دست نگاریں نگار کا
ہر ذرہ اس کی چشم میں لبریز نور ہے — دیکھا ہے جن نے حسن تجلی بہار کا
طاقت نہیں کسی کو جو یک حرف سن سکے — احوال گر کہوں میں دل بیقرار کا

پڑیا ہے لعل میں پرتو سجن تجھ مکھ کی لالی کا — بیاں ہے مہ سوں روشن تر تری صاحب کمالی کا
ترا ہر مصرع برجستہ دیوان خوبی ہے — تری یو بیت ابرو شعر دستا ہے ہلالی کا
ترے لب کی حلاوت نے کیا مجھ طبع کو شیریں — ہوا ہے نقل مجلس ذکر مجھ شیریں مقالی کا
نزاکت تجھ کمر کی دل نشیں ہے اس سبب ساجن — ہوا ہے شہرہ عالم میں مری نازک خیالی کا
رنگیلے شوخ کا کہنا کیا تھا ترک مدت سوں — ترا یو قد ہوا ہے پھر کے باعث فکر عالی کا
ولی تجھ شعر کوں سن کر ہوے ہیں مست اہل دل — اثر ہے شعر میں تیرے شراب پرتگالی کا

عبث غافل ہوا ہے گا فکر کر پی کے پانے کا — صفا کر آرسی دل کی سکندر ہو زمانے کا
چراغ دل اگر گل ہے تو کر جیوں گل اسے روشن — کہ یہ تحفہ ہے سالک کوں نزک حق کے لے جانے کا
نہ پاوے دین کی لذت جسے دنیا کی ہے خواہش — تغل ہے لذت دنیا حقیقت کے خزانے کا

لگی ہے لگن تم سے چھڑا کون سکے گا — اب مجکوں وطن اپنے لجا کون سکے گا
مارا ہے جو ظالم نے ادایاں سوں ہمن کو — اس جگ میں مری داد دلا کون سکے گا

پھرتی ہیں سب یہ مست ہو شمشیر نظر لے — بن نیندان انکھیاں کو پکڑ کون سکے گا

جس وقت لے سری جن تو بے حجاب ہوگا — ہر ذرہ تجھ جھلک سوں جیوں آفتاب ہوگا
مت جا چمن میں لالن بلبل پہ مت ستم کر — گرمی سوں تجھ نگہ کی گل گل گلاب ہوگا
مت آئینہ کو دکھلا اپنا جمال روشن — تجھ مکھ کی تاب دیکھے آئینہ آب ہوگا
نکلا ہے وو ستمگر تیغ ادا کوں لے کر — سینہ کا عاشقاں کے اب فتح باب ہوگا
رکھتا ہے کیوں جفا کوں مجھ پر روا اے ظالم — محشر میں تجھ سوں میرا آخر حساب ہوگا

تجھ لب کی صفت لعل بدخشاں سوں کہونگا — جادو ہے تری نین غزالاں سوں کہونگا
دی حق نے تجھے بادشہی حسن نگر کی — جا کشور ایراں میں سلیماں سوں کہونگا
تعریف ترے قد کی الف وار سری جن — جا سرو گلستاں میں خوش الحاں سوں کہونگا
زخمی کیا ہے دل تری پلکاں کی انی نے — یو زخم ترا خنجر و پیکاں سوں کہونگا
دیکھا ہیں تجھے خواب میں اے مایۂ خوبی — اس خواب کو جا یوسف کنعاں سوں کہونگا

وو صنم جب سوں بسا دیدۂ حیراں میں آ — آتش عشق پڑی عقل کے ساماں میں آ
ناز دیتا نہیں گر رخصت گلگشت چمن — اے چمن زار حیا دل کے گلستاں میں آ
حسن تھا پردۂ تجرید میں سب سوں آزاد — طالب عشق ہوا صورت انساں میں آ
حاکم وقت ہے تجھ گھر میں رقیب بد خو — دیو مختار ہوا ملک سلیماں میں آ

کتاب حسن کا یہ مکھ صفا تیرا صفا دستا — ترے ابرو کے دو مصرع سوں اس کا ابتدا دستا
ترا مکھ حسن کا دریا و موجاں چیں پیشانی — اوپر ابرو کی کشتی کے یو تل جیوں ناخدا دستا
ترے لب ہیں بظاہر حوض کوثر مخزن خوبی — یہ خال عنبریں تس پر بلال آسا کھڑا دستا
اشارت کر انکھاں سوں گرچہ ہوں بیمار ہیں لیکن — ترا لب اے مسیح وقت قانون شفا دستا

یو خط کا حاشیہ گرچہ ولی ہے مختصر لیکن — مطول کے معانی کا تمامی مدعا دستا

مت آتش غفلت سوں مرے دل کوں جلا جا — مشتاق ہوں تجھ درس کا ٹک درس دکھا جا
آزردہ نہ ہو، غصہ نہ کر، بات مری سن — ڈرتا ہنیں یک بات کی سو بات سنا جا
جلتا ہوں میں مدت ستی اے حسن کے دریا — ٹک مکھ کوں دکھا، آگ مرے دل کی بجھا جا
خواہش ہے مجھے درد کے پڑھنے کی ہمیشہ — یکبار کسو طرز سوں ٹک اسم بتا جا

دل کوں لگتی ہے دلربا کی ادا — جی میں بستی ہے خوش ادا کی ادا
گرچہ سب خوبرو ہیں خوب ولے — قتل کرتی ہے میرزا کی ادا
حرف بیجا بجا ہے گر بولوں — دشمن ہوش ہے پیا کی ادا
نقش دیوار کیوں نہ ہو عاشق — حیرت افزا ہے بیوفا کی ادا
گل ہوے غرق آب شبنم میں — دیکھ اس صاحب حیا کی ادا
اشک رنگیں میں غرق ہے ہنس دل — جن نے دیکھی ہے تجھ حنا کی ادا
اے ولی درد سر کی دارو ہے — مجکوں اس صندلی قبا کی ادا

دیکھا ہے جن نے تیرے رخسار کا تماشا — نہیں دیکھتا سورج کی جھلکار کا تماشا
رشتے کوں بندگی کے ڈالیا اپس گلے میں — دیکھا جو تجھ صنم کے زنار کا تماشا

موسیٰ اگر جو دیکھے تجھ نور کا تماشا — اس کوں پہاڑ ہووے پھر طور کا تماشا
کثرت کے پھول بن میں جاتے نہیں ہیں عارف — بس ہے موحداں کوں منصور کا تماشا

تیرے شکر لب کو اب مثل عسل بولنا — بلکہ عسل ہے نقل اس کوں اصل بولنا

تجھ حسن عالم تاب کا جو عاشق و شیدا ہوا — ہر خوبرو کے حسن کے جلوے سوں بے پروا ہوا
ہیں مصلح گل کے جوہراں میرے سخن سوں جلوہ گر — از بسکہ وسعت مشربی سوں دل مرا دریا ہوا
پایا ہے جگ میں اے ولی وہ لیلی مقصود کوں — جو عشق کے بازار میں مجنوں نمن رسوا ہوا

تجھ مکھ کے مصحف کے بجز آیت جو دیکھی قہر کی — ہیبت سوں جیوں زیر و زبر دل ٹوٹ سی پارا ہوا
غافل نہ رہ اے سنگدل ہرگز ولی کے حال سوں — جس آہ کی آتش کوں سن خارا کا دل پارا ہوا

جب صنم کو خیال باغ ہوا — طالب نشۂ فراغ ہوا
فوج عشاق دیکھ ہر جانب — نازنیں صاحب دماغ ہوا
رشک سوں تجھ لباں کی سرخی کے — جگر لالہ داغ داغ ہوا
دل عشاق کیوں نہ ہوں روشن — جب خیال صنم چراغ ہوا
اے ولی گلبدن کوں باغ میں دیکھ — دل صد برگ باغ باغ ہوا

مسجود آفتاب ہوا ہے شرف سوں آج — وہ نقش پا کہ زینت روئے زمیں ہوا

پھر میری خبر لینے وہ صیاد نہ آیا — شاید کہ مرا حال اُسے یاد نہ آیا
مدت ستی مشتاق ہیں عشاق جفا کے — بیداد کہ وہ ظالم بیداد نہ آیا
جاری کیا ہوں جوئے رواں اشک بڑاں سوں — افسوس کہ وہ غیرت شمشاد نہ آیا
جس غم منیں موزوں کیا ہے آہ کا مصرع — وہ مصرع دلچسپ پری زاد نہ آیا
پہنچی ہے ہر اک گوش میں فریاد ولی کی — لیکن وہ صنم سننے کو فریاد نہ آیا

صد حیف کہ وہ یار مرے پاس نہ آیا — میرا سخن راست اُسے راس نہ آیا
بیگانی لگی بات یگانے کی عجب ہے — آخر کو اُسے غیر سوں وسواس نہ آیا

بلبل کی نمط نالہ و زاری میں ہوں نت دن　　افسوس وہ گلدستۂ خوش باس نہ آیا
اس یار وفادار سوں مجھ آس تھی لیکن　　ہرگز وہ بجھانے کو مری پیاس نہ آیا

دل میں جب عشق نے تاثیر کیا　　فرد باطل خط تدبیر کیا
بند کرنے دل وحشی زدہ کوں　　دام در زلف گرہ گیر کیا
جز الم اُس کو نہ ہووے حاصل　　عشق نے پیر کوں جن پیر کیا
گریہ و گرد ملامت سوں ولی　　خانۂ عشق کوں تعمیر کیا

کتنے دل کوں ترے ناز نے تسخیر کیا　　فوج مجنوں کوں تری زلف نے زنجیر کیا
عاشق زار مجھ سوں ہوا ہے بیزار　　بعد دل دے کے میں دلدار کو دلگیر کیا
رو غم آب نین دو کے معمار نے　　خانۂ عشق جگر سوز کوں تعمیر کیا

برائی جو کہاتے ہیں اُسے کچھ پیار کرنا کیا　　ہوئی جوگن جو کُٹیا کی اُسے سنسار کرنا کیا
جو پیو سے پریت کا پانی اُسے کیا کام پانی سوں　　جو بوجھن دکھ کا کرتا ہے اُسے آدھار کا کیا

معنی طرف چلیا ہے صورت سوں بول اول　　صورت ستی چلیا ہے تجھ بے جہاز گویا
یک نگہ میں تری ہے موج محبت　　ہر تار تجھ نگہ کا ہے تار ساز گویا

باعث شہرۂ دو بالا ہے　　حُسن صورت کے ساتھ حُسن ادا
اے ولی مجھ سخن کو وہ بوجھے　　جس کوں حق نے دیا ہے فکر رسا

حق نے کو لولاک لما حق میں محمد کے کہا　　ان سوا کون سے مرسل نے یہ رتبہ پایا

جب سوں وہ نازنیں کی میں دیکھا ہوں چھب عجب ۔۔۔ دل میں مرے خیال ہے تب سوں عجب عجب
جاتا ہے دن تمام اُسی مکھ کی یاد میں ۔۔۔ ہوتا ہے فکر زلف میں احوال شب عجب

بے تاب ہو کے مثل گدایاں نزیک جا ۔۔۔ بیباک ہو کے تب یو کیا میں طلب عجب
دو نین سوں ترے ہے دو بادام کا سوال ۔۔۔ سُن یو سوال دل میں رہا بستہ لب عجب
بولیا مری نگاہ کی قیمت ہے دو جہاں ۔۔۔ جس دیکھنے سوں دل میں ترے ہے طرب عجب
اس دولت عظیم کوں یوں مفت مانگنا ۔۔۔ لگتی ہے مجکوں بات تری بے ادب عجب

مجھے احباب خود بینی سوں دائم عکس ہے دل میں ۔۔۔ کیا جو ترک زینت کوں اُسے درپن سوں کیا مطلب
سخن صاحب سخن کا سُنکے ملنے کی ہوس مت کر ۔۔۔ جواہر جب ہوے حاصل تو بحر معدن سوں کیا مطلب
ولی جنت منیں رہنا نہیں درکار عاشق کوں ۔۔۔ جو طالب لامکان کا ہے اُسے مسکن سوں کیا مطلب

ہمیشہ ہے بہار سرو آزاد ۔۔۔ نہ جاوے دولت حُسن خداداد
وفا کو ترک مت کر ہرگز اے مل ۔۔۔ محبت ہے وفا بن سست بنیاد

مت پست فطرتاں سوں مل اے سرو نازنیں ۔۔۔ تجھ قد کا نام جگ میں ہے نام خدا بلند

سخن شناس کے نزدیک کم نہیں زیزید ۔۔۔ کسی کے مطلب رنگیں کوں جو کیا ہے شہید
یہ زلف و خال سیہ نے دیا ہے جگ کوں فریب ۔۔۔ دغا کے دینے میں یک رنگ ہیں یہ پیر و مرید
کھُلا ہے عقدۂ دل تجھ پلک کی سوزن سوں ۔۔۔ ترے نین کا اشارہ ہے قفل دل کی کلید

سجن تجھ گلبدن کا آج نہیں ثانی چمن بھیتر ۔۔۔ غلط بولا چمن کیا بلکہ جنات عدن بھیتر

ب جدائی نہ کر خدا سوں ڈر　　بے وفائی نہ کر خدا سوں ڈر

راست کیشاں سوں اے کماں ابرو　　کج ادائی نہ کر خدا سوں ڈر

مت تغافل کوں راہ دے اے شوخ　　جگ ہنسائی نہ کر خدا سوں ڈر

ہے جدائی میں زندگی مشکل　　آ جدائی نہ کر خدا سوں ڈر

عاشقاں کو شہید کر کے صنم　　کف حنائی نہ کر خدا سوں ڈر

اے ولی غیر آستانۂ یار　　جبہہ سائی نہ کر خدا سوں ڈر

رحم بیجا ستم برابر ہے　　توں رقیباں اُپر کرم مت کر

عالم میں ہے وہ تیر ملامت کا نشانہ　　جس تن سوں ترے غم کا گیا تیر گزر کر

تجھ حسن کی جھلکار سوں کیا بدر کوں نسبت　　جو کوئی کہ تجھے بدر کہے اُس کو بدر کر

اُس ظالم خونخوار کوں حق بخش کیا بول　　جس عشق نے عالم کوں دیا زیر و زبر کر

دل لگا یار سوں اُس دل کا چھڑانا مشکل　　عشق کا زخم لگا اُس کا سلانا مشکل

حسن کے دام بلا زلف میں دو کالے ناگ　　جس کے تئیں ناگ ڈسا اُس کا جلانا مشکل

آتش عشق نے بہتوں کا کیا خانہ خراب　　آگ دریا کوں لگی اُس کا بجھانا مشکل

یو وکر لے کیوں لیا تجھ میں من کا مٹکا　　دل اُپر بوجھ پڑت من کا اٹھانا مشکل

راز مخفی ولی ظاہر نہ کسو سوں کرنا　　ہاتھ سوں بات گئی اُس کا پھر آنا مشکل

جیوں گل شگفتہ رو ہیں سخن کے چمن میں ہم　　جیوں شمع سر بلند ہیں ہر انجمن میں ہم

قسمت تری ہے حق پہ نہ ہو نا امید یہاں　　نہیں ہے قفل کوں غیر توکل کلید یہاں

سختی کے بعد عیش کا امیدوار رہ　　آخر ہے روزہ دار کوں اک روز عید یہاں

ظلمات میں یہ فیض کہ تم لے گا تجھ آب خضر
دامن تلے ہے رات کے روز سفید یہاں
سب کام آپس کے ہونپ کے حق کو نجنت رہ
یہ ہے تمام مقصد گفت و شنید یہاں

دل ہوا ہے مرا خراب سخن
دیکھ کر حسن بے حجاب سخن
راہ مضمون تازہ بند نہیں
تا قیامت کھلا ہے باب سخن
گو ہر اس کی نظر میں جا نہ کرے
جن نے دیکھا ہے آب و تاب سخن
ہے تری بات اے نزاکت فہم
لوح دیباچہ کتاب سخن

یک بار مری بات اگر گوش کرے توں
ملنے کو رقیباں کے فراموش کرے توں
ہے بسکہ تری نین میں کیفیت مستی
یک دید میں کونین بیہوش کرے توں
اے سرو گل اندام اپس نقش قدم سوں
بر جا ہے اگر صحن کوں گل پوش کرے توں
اے جان ولی وعدۂ دیدار کو اپنے
ڈرتا ہوں مبادا کہ فراموش کرے توں

چلنے منیں اے چنچل ہاتی کوں لجاوے توں
بے تاب کرے جگ کوں جب ناز سوں آوے توں
گویا کہ شفق پیچھے خورشید ہوا ظاہر
جب اوٹ میں پردے کی چہرے کوں دکھاوے توں
لوٹی فلک مکھ میں انگشت تحیر سے لے
جب پاؤں نزاکت سوں مجلس میں بجاوے توں
یک تان سنانے میں جی جان لیا سب کا
اب دل سوں گزر جاویں، گر بجاؤ بتاوے توں

کیا کہوں تجھ قد کی خوبی سرو عریاں کے حضور
خود بخود رسوا ہے اس کوں پھر کے رسوا کیا کروں

خدایا ملا صاحب درد کوں
کہ میرا کہے درد بے درد کوں
کرے غم سوں صد برگ صد پارہ دل
دکھاؤں اگر چہرۂ زرد کوں

مجلس ادارت اموسی سنہ ۱۳۴۶ف

کیمیاگری ہوتا ہے ولی زر کے تئں زرد — جب باندھ کے آتا ہے تو دستار زری کوں

پڑے سنکر اچھل جیوں مصرعِ برق — اگر مصرع لکھوں ناصر علی کوں

فدائے دلبر رنگیں ادا ہوں — شہیدِ شاہدِ گلگوں قبا ہوں
ہر اک مہ رُو کے ملنے کا نہیں شوق — سخن کے آشنا کا آشنا ہوں
کیا ہوں ترکِ نرگس کا تماشا — طلبگار نگاہِ باحیا ہوں
نہ کر شمشاد کی تعریف مجھ پاس — کہ میں اُس سروِ قد کا مبتلا ہوں
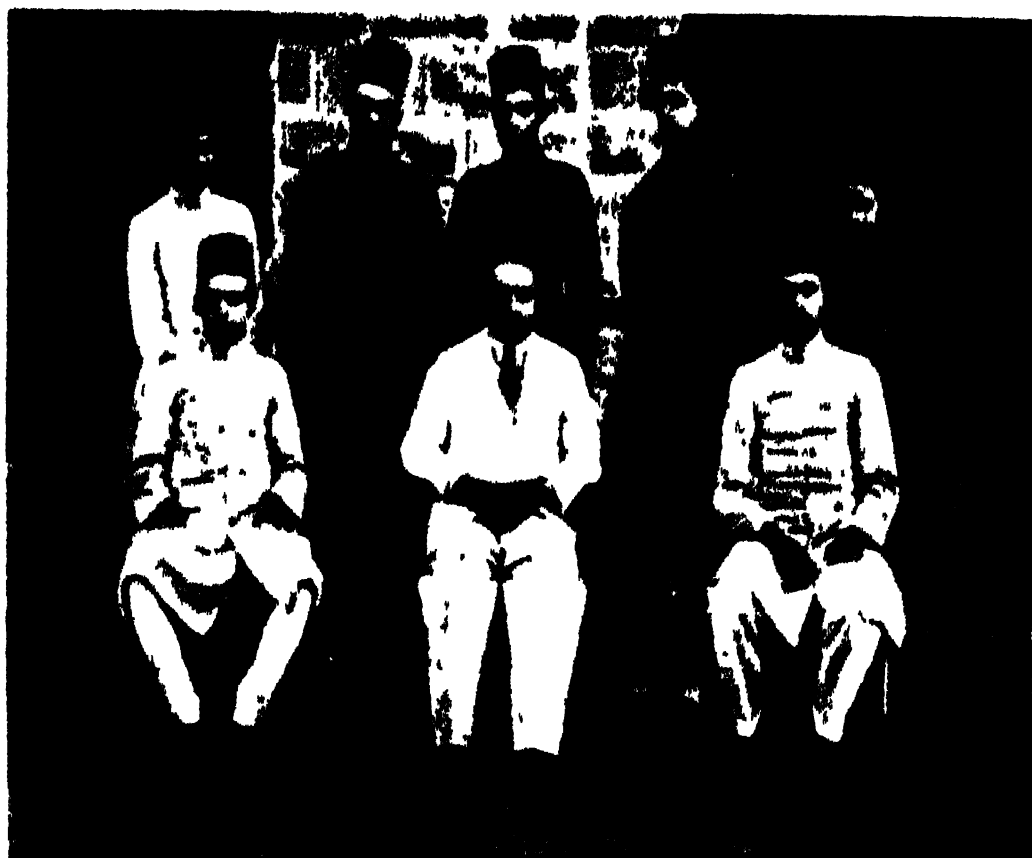
پیدا ہوا ہے جگ میں ولی صاحبِ سخن — میری طرف سوں جالے لہوانوجی کے تئیں

تیری تواضع دیکھکر یہ جا ہے اے جانِ ولی — گر بوعلی سینا لکھے دفتر ترے اخلاق میں

دل نے تسخیر کیا شوخ کوں حیرانی میں — آرسی شہرۂ عالم ہے پری خوانی میں
خط کے آنے نے خبردار کیا گلرو کوں — نشہ ہوش ہے اس بادۂ ریحانی میں
جوہر آئینہ تجھ خط کی سنا جب سوں خبر — موج گوہر کی نمن غرق ہوا پانی میں
خط کا آخر کوں ہوا نقش پہ پری رو کے گزر — مور کوں راہ ملی ملکِ سلیمانی میں
دل بے تاب کہ اک آن نہیں اُس کوں قرار — زلفِ دلدار سوں ہمسر ہے پریشانی میں

کیوں کہ سیری ہو حُسن سوں تیرے — دھوپ کھانے سوں پیٹ بھرتا نہیں

مجکوں تجھ بن کسی سوں کام نہیں — فکرِ ناموس و ننگ و نام نہیں
صفِ عشاق کوں بکعبہ قسمہ — غیر آوارگی امام نہیں

گرچہ بچپن ترا ہے رام ولے
اے سجن تو کسی کا رام نہیں

زندگی جامِ عیش ہے لیکن
فائدہ کیا اگر مدام نہیں

عشق اُس کا ہے ناتمام جسے
پی کی خاطر کا اہتمام نہیں

خوب رُو خوب کام کرتے ہیں
یک نگہ میں غلام کرتے ہیں

دیکھ خوباں کوں وقت ملنے کے
کس ادا سوں سلام کرتے ہیں

کم نگاہی سوں دیکھتے ہیں ولے
کام اپنا تمام کرتے ہیں

کھولتے ہیں جب اپنی زلفاں کو
صبح عاشق کوں شام کرتے ہیں

صاحب لفظ اُس کوں کہہ سکیے
جس سوں خوباں کلام کرتے ہیں

گرد خجلت کوں ندامت کے انجھو سا تو ملا
موردِ رحمتِ حق اس ستی تعمیر کرو

عشق کہتا ہے ولی آکے بہ آواز بلند
اے جواناں تمھیں سب درد کوں دل گیر کرو

چاہو کہ پی کے پگ تلے اپنا وطن کرو
دل اُس کوں عجز میں نقش چرن کرو

سفرِ عشق کا اگر ہے خیال
ہمت دل کوں زاد راہ کرو

عاشقاں! عاشقی کے دعوے پر
آہ و زاری کوں دو گواہ کرو

گل و بلبل کا گرم ہے بازار
اس چمن میں جدھر نگاہ کرو

پاکبازاں میں ولی ہے مشہور
اُس سوں چہرے کوں چھپایا نہ کرو

فکرِ جمعیت اپس دل میں کئے ہیں زہاد
زلف کو کھول غریبوں کو پریشاں نہ کرو

غفلت میں وقت اپنا نہ کھو ہشیار ہو ہشیار رہو　　کب تک رہیگا خواب میں بیدار ہو بیدار رہو
گر دیکھنا ہے مدعا اس شاہد معنی کا رُو　　ظاہر پرستاں سوں سدا بیزار ہو بیزار رہو
وو نو بہار عاشقی ہے جیوں سحر جگ میں عیاں　　اے دیدہ وقت خواب نہیں بیدار ہو بیدار رہو

سجن تم مکھ ستی کھولو نقاب آہستہ آہستہ　　کہ جیوں گل سوں نکلتا ہے گلاب آہستہ آہستہ
ہزاراں لاکھ خوباں میں سجن میرا چلے یوں کر　　ستاروں میں چلے جیوں ماہتاب آہستہ آہستہ
سلونی سانوری پیتم ترے موتی کی جھلکاں نے　　کیا عقد ثریا کوں خراب آہستہ آہستہ

ہے مرا رونا کہ ہے تیری ہنسی　　آپ بس نہیں پر بسی ہے پربسی
کل رقیبوں میں کرم میرے اُپر　　جز رسی ہے جز رسی ہے جز رسی
رات دن جگ میں رفیق بیکساں　　بیکسی ہے بیکسی ہے بیکسی
شست ہونا عشق میں تیرے صنم　　ناکسی ہے ناکسی ہے ناکسی
باعث رسوائی عالم ولی　　مفلسی ہے مفلسی ہے مفلسی

اُس کوں حاصل جگ میں ہو کیوں کر فراغ زندگی　　گردش افلاک ہے جس کوں ایاغ زندگی
بے عزیزاں سیر گلشن ہے گُل داغ الم　　جنت احباب ہے معنی میں باغ زندگی
آسماں میری نظر میں کلبۂ تاریک ہے　　گر نہ دیکھوں تجکوں اے چشم و چراغ زندگی
لالۂ خونیں کفن کے حال سوں ظاہر ہوا　　بستگی ہے خال سوں خوباں کے داغ زندگی
کیوں نہ ہووے اے ولی روشن شب قدر حیات　　ہے نگاہ گرم گلرویاں چراغ زندگی

جسے عشق کا تیر کاری لگے　　اُسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے
نہ چھوڑے محبت دم مرگ تک　　جسے یار جانی سوں یاری لگے
نہ ہووے اُسے جگ میں ہرگز قرار　　جسے عشق کی بیقراری لگے

ہر اک وقت مجھ عاشق زار کوں   پیارے تری بات پیاری لگے
ولی کوں کہے تو اگر یک بچن   رقیباں کے دل میں کٹاری لگے

تعریف اس پری کی جسے تم سناؤ گے   تا حشر اس کے ہوش کوں اس میں نہ پاؤ گے

چھوڑ اے شوخ طرز خودکامی   مت ہو ہر دیدہ بازکادامی
تجھ لب و زلف کے تماشے کوں   چل کے آئے ہیں مصری و شامی
اے ولی غیر عشق حرف دگر   پختہ مغزاں کے نزد ہے خامی

آغوش میں آنے کی کہاں تاب ہے اس کوں   کرتی ہے نگہ جس قد نازک پہ گرانی
مت دور ہو یک آن ولی پاس سوں ہرگز   اے باعث جمعیت ایام جوانی

نہ وہ بالا نہ وہ بالی بلا ہے   بلائے عاشقاں ناز و ادا ہے
تغافل شوخ کا عاشق کے حق میں   ستم ہے ظلم ہے جور و جفا ہے
نہ جاوے تجھ کوں چھوڑ اے گلشن ناز   مرا دل بلبل باغ وفا ہے

صنم میرا سخن سوں آشنا ہے   مجھے فکر سخن کرنا روا ہے
تغافل نے ترے زخمی کیا مجھ   تری یہ کم نگاہی نیمچا ہے
نہیں واں آب غیر از آب خنجر   شہادت گاہ عاشق کربلا ہے
غنیمت بوجھ ملنے کو ولی کے   نگاہ پاکبازاں کیمیا ہے

دیکھا ہوں جسے وہ مبتلا ہے   خوباں کی نگہ نہیں بلا ہے
گر تجھ کوں ہے عزم سیر گلشن   دروازۂ آرسی کھلا ہے

اک دل نہیں آرزو سے خالی — ہر جا ہے محال اگر خلا ہے
تسخیر کیا ہے گوش گل کوں — بلبل کا ولی عجب گلا ہے

ساقی و مطلوب آج ہیں ہم رنگ — نشۂ بے خودی دو بالا ہے
کیوں نہ ہر ذرہ رقص میں آوے — جلوہ گر آفتاب سیما ہے

عشق کے مفتی نے یوں فتوے دیا — دیکھنا خوباں کا درس خوب ہے
تخت دل پر خط لکھا ہوں یار کوں — داغ دل مہر سر مکتوب ہے
غمزہ و ناز و ادائے نازنیں — ظلم ہے طوفان ہے آشوب ہے
للہ یا یوسف غلامی خط تجھے — گرچہ نور دیدۂ یعقوب ہے

عاشقاں کی قید تیرا حسن عالمگیر ہے — عاقلاں کوں بند کرنے موج گل زنجیر ہے
تجھ نین کی ہے نگاہ راست تیر بے خطا — کج ادائی تجھ بھواں کی جوہر شمشیر ہے

موسم خط میں نکر کر اے گل رنگیں ادا — سبزۂ گلزار خوبی کا ہنوز آغاز ہے
زندگی میں طائر دل کوں خلاصی کیوں کہ ہو — پنجۂ عشق ستمگر چنگل شہباز ہے
دردمنداں کوں سدا ہے قول مطرب دلنواز — گرمی افسردہ طبعاں شعلۂ آواز ہے

شوق کے مکتب کوں راہ عشق میں — اے سجن تیری نگہ مہمیز ہے
ہر پلک تیری کرے تیغ فرنگ — عاشقاں کے مارنے کوں تیز ہے
ہاتھ میں میرے نہ بھیجو تم بیساں — شوخ کے ملنے کی دست آویز ہے

خاطر سوں گئی ہے خواہش اسباب دنیوی کی — ہمت بدرقہ کی رہ میں مجھ زاد راہ بس ہے

جو صاف دل ہیں اُن کوں درکار نہیں ہے زینت / جیوں آرسی، نمد کی سر پر کلاہ بس ہے

اسباب جنگ رکھنا درکار نہیں ہے ہم کوں / دشمن کے مارنے کوں اک تیر آہ بس ہے

نہیں آرزو کہ بیٹھوں مسند پہ سلطنت کی / تیری گلی میں آنا، یہ دستگاہ بس ہے

درکار نہیں ہے مسجد سجدے کوں عاشقاں کے / محراب تجھ بھواں کی لے قبلہ گاہ بس ہے

مت تیر اور کماں کی کر فکر اے خوش ابرو / عاشق کے مارنے کوں سیدھی نگاہ بس ہے

دل لے گیا ہمارا جادو سوں وو پری رُو / دیوانگی ہماری اس پر گواہ بس ہے

جس کو تجھ حُسن کی نہیں ہے خبر / بے گماں دو جہاں میں غافل ہے

عشق کی راہ کے مسافر کوں / ہر قدم تجھ گلی میں منزل ہے

اے ولی طرزِ عشق آساں نہیں / آزمایا ہوں میں کہ مشکل ہے

ہر ایک سوں متواضع ہو سروری یہ ہے / سنبھال کشتیِ دل کوں قلندری یہ ہے

نکال خاطرِ ناتر سوں جامِ جم کا خیال / صفا کر آئینۂ دل سکندری یہ ہے

تو جان بوجھ، اجانا ہوا سو میں بوجھا / کہ زندگی منیں مقصود زرگری یہ ہے

خیالِ یار کوں رکھ اپنے دل میں محکم کر / کہ عاشقاں کے نزک شیشۂ پری یہ ہے

بسا عزیز ہیں تجھ مکھ کے آفتاب پرست / تو جلوہ گر ہو کہ اب ذرہ پروری یہ ہے

مفلسی سب بہار کھوتی ہے / مرد کا اعتبار کھوتی ہے

کیوں کہ حاصل ہو مجکوں جمعیت / زلف تیری قرار کھوتی ہے

ہر سحر شوخ کی نگہ کی شراب / مجھ انکھاں کا خمار کھوتی ہے

کیوں کہ ملنا صنم کا ترک کروں / دلبری اختیار کھوتی ہے

عشق بے تاب جاں گدازی ہے / حُسن مشتاق دل نوازی ہے

اشکِ خونیں سوں جو کیا ہے وضو | مذہبِ عشق میں نمازی ہے
جو ہوا رازِ عشق سوں آگاہ | وو زمانے کا فخرِ رازی ہے
پاکبازاں سوں یوں ہوا معلوم | عشق مضمونِ پاکبازی ہے
جا کے پہنچی ہے حدِ ظلمت کوں | بس کہ تجھ زلف میں درازی ہے
تجربے سوں ہوا مجھے ظاہر | نازِ مفہومِ بے نیازی ہے
اے ولی عشقِ ظاہری کا سبب | جلوۂ شاہدِ مجازی ہے

کوچۂ یار عین کاسی ہے | جوگیِ دل وہاں کا باسی ہے
پی کے بیراگ کی اُداسی سوں | دل بھی بیراگی و اُداسی ہے
اے صنم تجھ جبیں اُپر یہ خال | ہندوے ہردوار باسی ہے
زلف تیری ہے موج جمنا کی | پاس تِل اُس کے جیوں سناسی ہے
گھر ترا ہے یہ رشکِ دیوامہیں | اس میں مدت سوں دل اُداسی ہے
یہ سیہ زلف تجھ زنخداں پر | ناگنی جیوں کنوئیں پہ پیاسی ہے

ترا مکھ مشرقی، حسن انوری، جلوہ جمالی ہے | نین جامی، جبیں فردوسی، و ابرو ہلالی ہے
ریاضی فہم و گلشن طبع و دانا دل، علی فطرت | زباں تیری فصیحی و سخن تیرا زلالی ہے
جگہ میں فیضی و قدسی سرشت طالبِ شیدا | کمالِ بدر دل اہلی و انکھیاں سوں غزالی ہے
توہی ہے خسرو روشن ضمیر و صائب و شوکت | ترے ابرو یہ مجھ بیدل کوں طغرائے وصالی ہے
ولی تجھ قد و ابرو کا ہوا ہے شوقی و مائل | تو ہر اک بیت عالی اور ہر اک مصرع خیالی ہے

باعثِ دلربائی عاشق | خوش نگاہوں میں خوش نگاہی ہے

مت تصور کرو مجھ دل کوں کہ ہرجائی ہے | چمنِ حسنِ پری رو کا تماشائی ہے

اے ولی رہنے کوں دنیا میں مقام عاشق ۔ کوچۂ یار ہے یا گوشۂ تنہائی ہے

شکر، وہ جان گئی، پھر آئی ۔ عیش کی آن گئی پھر آئی

تیرے آنے ستی اے راحت جاں ۔ شہر کی جان گئی پھر آئی

پھر کے آنا ترا اپنے باعثِ شوق ۔ جس طرح تان گئی پھر آئی

تجھ مکھ کا رنگ دیکھ کنول جل میں جل گئے ۔ تیری نگاہ کرم سوں گل گل پگھل گئے

صافی ترے جمال کی کہاں لگ بیاں کروں ۔ جس پر قدم نگاہ کے اکثر پھسل گئے

در نعت حضرت خیر البشر صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم

عشق میں لازم ہے اول ذات کوں فانی کرے ۔ ہو فنا فی اللہ دائم یاد یزدانی کرے

یاد کے گلزار پر دو نین کر ابر بہار ۔ پیچ کھا سینے میں دل کوں سنبلستانی کرے

مرتبہ خلت پناہی کا وہ پاویگا جو کوئی ۔ مثل اسماعیل اول جی کوں قربانی کرے

جوش دے یکبارگی دریا لوں دل کے لہو تی ۔ گوہر انجھواں کوں رو رو رنگ مرجانی کرے

جو اپس تن کو گلاوے عشق میں ہر صبح و شام ۔ وہیچ کامل ہو سو جیسے ماہ تابانی کرے

سرخرو ہو آبرو دو جگ میں پاوے اے عزیز ۔ دل کو لوہو کر اول لوہو سوں جو پانی کرے

عشق کی آتش میں جلتے تن کوں جو کوئی رات دن ۔ وہ قیامت لگ سو جیوں سورج درخشانی کرے

وہیچ پاوے مطلبِ راضیۃ مرضیۃ ۔ محض للہ جگ میں جو اعمال پنہانی کرے

ورد پڑھنے درد کا انجھواں کی تسبی ہاتھ لے ۔ دل کوں کرسی پارۂ غم ذکر قرآنی کرے

عشق سوں فارغ جو کوئی وہ نحس اکبر ہے مدام ۔ ساتویں کھنڈ پر اگر ایوان کیوانی کرے

وہیچ دانا ہے تجے کر دوں دوں کوں ائیعزیز ۔ مٹ کے دنیا کوں جو کوئی جگ میں خدا دانی کرے

اپنے مطلب کے سوں لیلیٰ کا وہی دیکھے جمال ۔ عشق میں دل کو جو مجنون بیابانی کرے

پر کھنے معرفت کا جوہر صاف — اپس کے فرض سوں کر دل کوں صاف

نین یوں شوق کے دل کھول جیوں گل — اسی گل کے اُپر کر دل کوں بلبل

مجھے دے نقش گل سوں دل میں اماں — مرے مقصد کے روشن کر چراغاں

برہ کی بارگہ میں مجکوں جا دے — مجھے اس شوق کی عشرت سدا دے

یہ دل معمور کر جیوں شیشۂ مُل — پریشانی نہ دے مانند سنبل

محبت کی عطا کر مے پرستی — اپس کی معرفت کی بخش مستی

جہاں کی فکر سوں آزاد کر مجھ — اپس کی یاد سوں آباد کر مجھ

برہ کے باغ میں دے آبداری — ہمیشہ رکھ جھڑی نیناں کی جاری

مجازی کی مجالس سوں جدا رکھ — مجھے اس پنتھ سوں ناآشنا رکھ

حقیقت کی زلف کا کھول بستار — سو یک یک تار کا مجھ کر گرفتار

شتابی سوں دے اے ساقی مہرباں — برہ کا جام جیوں سورج درخشاں

کہ خورشید نبوت کی صبح میں — کنول کا دل کھلا سینہ کے دح[1] میں

محمد وہ کہ جس کے حق میں لولاک — کہا ہے خالق املاک و افلاک

عجب گلزار ہے وہ مظہر گل — کہ ہے جس باغ کا خورشید اک گل

وہی ہے بیدلاں کا دل کشا باغ — وہی ہے عاشقاں کا مرہم داغ

اُسی کا ذکر ہے ایمان مومن — اُسی کی یاد اطمینان مومن

وہی ہے باغ اقدس سرور دیں — کہ جس کے باغ کا رضواں ہے گل چیں

کھلا کونین میں وہ دین کا گل — دو جگ مشتاق اُس کے مثل بلبل

دو عالم جسم وہ ہے جان عالم — نبیاں امرا وہ ہے سلطان عالم

دکھایا عاشقاں کوں عشق کی راہ — کیا عارف کوں عرفاں بیچ آگاہ

ہوا جو کوئی اُس گل سوں معطر — رہا وہ مست ہو، تا روز محشر

---

[1] منتخب اللغات میں اس لفظ کے معنی کسی چیز کا زمین میں پوشیدہ کرنے کے لکھے ہیں مگر یہاں ربط کلام سے [illegible] باغ کا مخفف قیاسی معلوم ہوتا ہے۔

کیا حق اُس ابو الارواح ناظر — مرتب چار دیوار عناصر
ہوا جب چار باغ دیں روشن — شریعت کا کھلا اُس بیچ گلشن
سنواری گرد اُس کے چار دیوار — حقیقت میں سمجھ، ہیں یار وہ یار
وہ ہیں مقبول درگاہ صمد کے — وہی ہیں منتخب اس چار حد کے
دے، لے ساقی پیالے جام دو چار — کہ مائل ہوں اُسی مے کا میں لاچار
جو بخشے وہ مجھے یک جوش مستی — فراموشی میں بھوے خود پرستی

مثنوی در تعریف شہر سورت

عجب شہراں میں ہے پُر نور یک شہر — بلا شک وہ ہے جگ میں مقصد دہر
اہے مشہور اُس کا نام سورت — کہ جاوے جس کے دیکھے سب کدورت
جگت کی آنکھ کا گویا ہے یہ نور — اچھو اُس نور سوں ہر چشم بد دور
شہر جیوں منتخب دیوان ہے سب — ملاحت کی وہ گویا کان ہے سب
سرج سن آب اُس کی جگ میں کا نیا — سمندر موجزن رگ رگ میں کا نیا
کنارے اُس کے اک دریائے تپتی — کہ دنیا دیکھنے کوں اُس کے تپتی
کیا سب تن خجالت سوں یہ جیوں عرق — ہوا دریا اپس کے عرق میں غرق
شہر سوں ہے وہ ہم بازو ہمیشہ — دریا سوں ہے وہ ہم پہلو ہمیشہ
کہ آب خضر کی ہے اُس میں تاثیر — ہوا دیتی ہے اُس کی یاد کشمیر
وہاں اشنان جب کرتا ہے عالم — صبح اور شام جب کرتا ہے عالم
عجب قلعہ ہے واں اک با قرینہ — انگوٹھی میں دنیا کے جیوں نگینہ
نزک قلعے کے بارا گھاٹ ہے واں — کہ دائم گل رخاں کی ہاٹ ہے واں
رہے اس حاشیے پر جائے آرام — طلسمی باغ واں ہوتا ہے ہر شام
اے بلبل پاک بینی سوں نظر کر — کثافت کی نظر سوں بس حذر کر
کھلے ہیں ہر طرف رخسار کے گل — ہر اک گل کے نزک واں پر ہے سنبل

جو کئی دیکھا ہے اُن کا باغ رخسار ہوا اک دید میں وہ محو دیدار

جو ہیں وہ محض تصویرات اخلاص سو عاشق پر دری میں وصچہ ہیں خاص

کہاں ہے ساقی اخلاص انگیز محبت کی کرے مے مجھ اُپر ریز!

صفائی سوں کھلے مجھ جیو کا باغ کروں اُس درد مے کوں ہم داغ

اچھے صورت حقیقت کی نشانی کہ ہیں معمور وہاں اہل معانی

شرافت میں یہ ہے جیوں باپ مکہ تو ہے سب ملک پر اُس کا جو سکہ

اگر دیکھے ہیں لوگاں شام و تبریز نہ دیکھا کوئی ایسا ملک زرخیز

کہ اُس بھیتر کتے ایسے ہیں تجار کہ تاروں کوں نہیں اُن کے نزل بار

اپنی آتش پرستاں کی ہے بستی سکھے نمرود واں آتش پرستی

فرنگی اس میں رہتے ہیں کلہ پوش عدد وہاں جنکی گنتی میں ہے بیہوش

وہاں ساکن رہتے ہیں اہل مذہب کہ گنتی میں نہ آویں اُن کے مشرب

اگرچہ سب ہیں وہ ابنائے آدم ولے بینش میں رنگا رنگ عالم

بھری ہے سیرت و صورت سوں سورت ہر اک صورت ہے وہاں نوال مورت

ختم ہے امرداں پر رو صفائی ولے ہے بیشتر حسن نسائی

سبھا اندر کی ہے ہر اک قدم میں چھپا اندر سبھا کو لے عدم میں

کشن کی گوپیاں کی نہیں ہے یہ نسل کہ ہیں سب گوپیاں وہ نقل یہ اصل

زلف اور مکھ کے طالب سوں پچھو بات بسے ہر دن ہے عید، ہر رات شب برات

ہزاراں اس سبب شیدا ہیں بلبل کہ ہیں وہاں غنچہ لب دائما گل

نہ کئی وقت سوں کھینچے شوخ چنچل وہ مکھ کے باغ کن دیوار انچل

نظر بھر کر دیکھو ہر گل بدن کوں کہ ہے پردے سوں بے پروا اُنن کوں

رہے وہاں عاشقاں کو عام آواز کہ نہیں پردہ بغیر از پردۂ ناز

کسی کوں نہیں نظر بازی بنا چین کھلے ہیں رات دن سب غرفۂ نین

ہر اک لب ہیں سوں جیوں یاقوت انمول کرے وہ بات جب میٹھے لباں کھول

وہ باتاں نہیں سراپا ہے سہاتن۔ کہ جن باتاں اُپر ہے نیشکر بند
پڑا شیریں بچن سُن اُن کے بس جو پھنسا اس شہد میں جا کر مگس ہو
ہوا اُن کو نکلنا کام دشوار رہا تھا آخری دم تک گرفتار
شہر بھبتر جو آوے نہان کا دن ہندو کی قوم کے اشنان کا دن
ہر اک جانب دکھوں میں فوج در فوج تجلی کے سمندر کی اُٹھے موج
نین کی بیٹھ کشتی پر تو لے پال یہ طے کر سہج میں موج خطرناک
مہرباں ہو کے اے ساقیٔ کوثر کرم سوں کشتیِ مے مجکوں دے بھر
اپس کے لطف سوں کر دے عطائے جو اس نشے میں دریا کوں کروں طے
عبث باتاں میں بس کر اے ولی تو نہ کر مقصد سوں اپنے کاہلی تو

قطعات در فراقِ گجرات

گجرات کے فراق سوں ہے خار خار دل بے تاب ہے سنے منیں آتش بہار دل
مرہم نہیں ہے اس کے زخم کا جہاں منیں شمشیر ہجر سوں جو ہوا ہے فگار دل
دل سوں تھا ضعیف پہ پابستہ سور میں جیوں بال ہے اگن کے اُپر بیقرار دل
اس سیر کے نشے سوں دل تر دماغ تھا آخر کوں اس فراق میں کھینچیا خمار دل
میرے بسنے میں آکے حسن دیکھ عشق کا ہے جوش خوں سوں تن میں مرے لالہ زار دل
حاصل کیا ہوں بات میں دایا شکستگی دیکھا ہے مجھ شکیب سوں صبح بہار دل
ہجرت سوں دوستاں کے ہوا جی مرا آلدا عشرت کے پیرہن کوں کیا تار تار دل
ہر آشنا کی یاد کی گرمی سوں تن منیں ہر دم میں بیقرار ہے مثل شرار دل
سب دوستاں حضور اچھے پاک سرخ رو اپنا اپس لہو سوں کیا ہے فگار دل
حاصل ہوا ہے مجکوں ثمر مجھ شکست سوں پایا ہے چاک چاک ہو شکل انار دل
مجمر نہیں ہوا ہے بدن سوز ہجر سوں اسپند کی مثال ہے آتش سوار دل
افسوس ہے تمام کر آخر کو دوستاں اس میکدے سوں اُٹھکے چلا سادہ بسار دل

لیکن ہزار شکر ولی حق کے فیض سوں — پھر اُس کے دیکھنے کا ہے امیدوار دل

حسن دلبر کا خواب میں دیکھا — نور حق تھا حجاب میں دیکھا
خود فنا ہو کے ذات میں ملنا — یہ تماشا جباب میں دیکھا

مُستزاد

بے تاب کیا شوق نے مجھ دل کوں بدن میں — گل پیرہناں کا
جیوں غنچہ کیا بند محبت کے چمن میں — رنگیں دھناں کا
مجھ دل کی نمن عشق سوں گردش میں ہمیشہ — تنہا نہیں خورشید
مشتاق ہو پھرتا ہے سدا ماہ گگن میں — سیمیں بدناں کا
مت بوجھ کہ ہے آپ سوں وحشت منیں آہو — اے کشتہ خوباں
پھیلا ہے سحر جا کے یہ اطراف ختن میں — جادو نیناں کا
رکھتا ہے محبت کا سدا داغ جگر پہ — ہے لالۂ رنگیں
تجھ عشق سوں کیا حال ہے ٹک دیکھ چمن میں — خونیں کفناں کا
فرداؤ کی آتی ہے سدا روح صبا ہو — مجھ شعر کو سننے
مذکور ہے از بسکہ ولی میرے سخن میں — شیریں بچناں کا

ولہ

لاگی ہے لگن تم سوں چھڑا کون سکے گا — ہے کس میں یہ قدرت
اب مجکوں وطن اپنے لجا کون سکے گا — کر دل سوں رفاقت
ہے نقش کناری کا ترے جامے کے اوپر — لے ہند کے بانکے

سرشار تجھ نین کے نشے سوں ہے جام مل — حق تجھ عذار دیکھ سو چا ہے رنگ گل

پیدا ترے لباں ستی شہد وشکر کیا

تیری معاونت میں ہیں نت مرتضیٰ علیؓ — تو اس سبب سوں ملک سخن میں ہوا ولی

خورشید کی نمن ہے تری طبع منجلی — تیرا یہ شعر جگ میں مؤثر ہے اے ولی

تو دل منیں ہر ایک کے جا کر اثر کیا

رُباعیات

مینخانہ جگ کا جسے سرجوش کیا — اس ہاتھ سوں عالم نے قدح نوش کیا

اس سید عالم کوں جو دیکھا یکبار — یکبارگی عالم کوں فراموش کیا

دل، جام حقیقت ستی جو مست ہوا — ہر مست مجازی سوں زبردست ہوا

یہ باغ دسا نظر میں تنکے سوں کم — اور عرش عظیم پگ تلے پست ہوا

یہ ہستی موہوم دسے مجکوں سراب — پانی کے اُپر نقش ہے یہ شکل حباب

ایسے کے اُپر دل کوں نہ کر ہرگز بند — آپس کوں نہ کر خراب لے خانہ خراب!

تجھ مکھ کا ہے یہ پھول چمن کی زینت — تجھ شمع کا شعلہ ہے اگن کی زینت

فردوس میں نرگس نے اشارے سوں کہا — "یہ نور ہے عالم کے نین کی زینت"

رکھ دھیان کوں ہر آن تو معبود طرف — رکھ سیس کوں ہر حال میں مسجود طرف

معدوم کوں، موجود سوں کیا نسبت ہے — اولیٰ ہے کہ مائل ہو تو موجود طرف